تفسیر سروری

جلد اوّل

ISLAM INTERNATIONAL PUBLICATIONS LTD

تفسیر سروری

(جلد اوّل)

Tafsīr-e-Sarwarī — Vol. 1 (Urdu)
A Commentary of the Holy Quran
by
Ḥaḍrat Syed Muhammad Sarwar Shah[ra]

First Published in the UK in 2026

© **Islam International Publications Ltd.**

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

For more information, please visit
www.alislam.org

Cover design by: Asifah Wahab Mirza

ISBN: 978-1-83596-004-2
(*Tafsīr-e-Sarwarī – 5 volume set*)

پیش لفظ

سلسلہ احمدیہ کے ایک بزرگ اور جید عالم حضرت سید سرور شاہ صاحبؓ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ

آپ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں قرآن کریم کی تفسیر کا درس دیتے رہے اور آپ کی تفسیر اسی زمانہ میں ایک رسالہ میں شائع ہونا بھی شروع ہو گئی۔ حضرت اقدسؑ کے زمانہ میں حضرت مولوی صاحب کی تفسیر کی اشاعت کے لئے خاص اہتمام کرتے ہوئے صدر انجمن کی طرف سے ایک ماہور رسالہ **"تعلیم الاسلام"** جاری کیا گیا۔ آپؓ ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ جولائی 1906ء تا اپریل 1907ء اس کے دس شمارے شائع ہوئے۔ جن کے 336 صفحات میں تفسیر شائع ہوئی۔

ان شماروں کے بعد یہ رسالہ بند کر کے **"ریویو آف ریلیجنز (اردو)"** میں بطور ضمیمہ اس تفسیر کی اشاعت کا انتظام مناسب سمجھا گیا۔ چنانچہ جلد 6 نمبر 5 تا جلد 7 نمبر 1 (مئی 1907ء تا جنوری 1908ء) اور جلد 8 نمبر 4 (اپریل 1909ء) کے شمارہ جات میں 212 صفحات پر یہ تفسیر شائع ہوئی۔

ایک سہ ماہی رسالہ **"تفسیر القرآن"** خاص طور پر اسی تفسیر کی اشاعت کے لئے صدر انجمن، نے جاری کیا۔ جو مارچ 1908ء سے دسمبر 1912ء تک جاری رہا، اس رسالہ کے 1616 صفحات میں تفسیر درج ہوئی۔ پہلا شمارہ مارچ 1908ء میں طبع ہوا لیکن اسے جلد 3 کا پہلا شمارہ قرار دیا گیا۔ غالباً رسالہ "تعلیم الاسلام" اور ضمیمہ ریویو میں شائع شدہ تفسیر کو دو جلدیں قرار دیا ہو گا۔ سو رسالہ "تفسیر القرآن" جلد 3 نمبر 1 سے جلد 7 نمبر 3 دسمبر 1912ء تک جاری رہا اور یوں تفسیر القرآن کے نمبر زشائع ہونے کا سلسلہ بند ہو گیا۔

بندش کی ایک بنیادی وجہ اس وقت کے حالات کے تناظر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک مخصوص گروہ خود اپنے نام سے ایک اور تفسیر القرآن کو شائع کرنے کی کوششوں

میں مصروف تھا جیسا کہ حضرت مولوی سید محمد سرور شاہ صاحبؓ کے اپنے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

''مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب میرے شاگرد تھے۔ اور مجھ سے قرآن شریف پڑھتے رہے ہیں۔ جب میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں قرآن شریف کی تفسیر لکھنی شروع کی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے مقبول ہوئی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی اسے بہت پسند فرمایا اور حضور کی زندگی میں رسالہ ''تفسیر القرآن'' کے نام سے شائع ہوتی رہی تو پہلے مولوی محمد علی صاحب نے کہا کہ رسالہ ''تفسیر القرآن'' علیحدہ شائع کرنے کی بجائے ریویو آف ریلیجنز کے ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جایا کرے۔ اور اس طرح میری تفسیر ریویو آف ریلیجنز کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوتی رہی۔ پھر جب مولوی محمد علی صاحب خود انگریزی میں تفسیر لکھنے لگے تو کہنے لگے کہ تفسیر مختصر ہونی چاہئے۔ پھر جب ان کے دلوں میں وسوسہ پڑ گیا اور اختلافی مسائل کا ذکر ہونے لگا۔ اور میرے خیالات کا ان کو اچھی طرح علم تھا تو پھر اور قسم قسم کی روکیں ڈالنے لگے اور تفسیر کو اور زیادہ مختصر کرنے پر زور دینے لگے اور میرے لکھے ہوئے مضمون میں دخل دینے لگے۔ تب میں نے کہا کہ مولوی صاحب! اگر تفسیر القرآن کا ضرور ہی گلا گھونٹنا ہے تو پھر ایسی تفسیر لکھنے اور شائع کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اس پر میں نے تفسیر لکھنی بند کر دی!۔''

(اصحابِ احمدؑ جلد 5 صفحہ 517-518)

بہر حال (تفسیر القرآن جلد 7 نمبر 2 میں ''خریداران تفسیر کو اطلاع'' کے عنوان سے درج ہے کہ ''آئندہ کے لئے تجویز کی گئی ہے کہ تفسیر موقت الشیوع نہ رہے۔ بلکہ جس وقت سو دو سو صفحہ کا مضمون مل جائے شائع کر دیا جایا کرے..... آئندہ جب کوئی نمبر تفسیر کا شائع ہو گا اس ماہ کے رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں اعلان کر دیا جایا کرے گا۔ تا خریداران کو تشویش نہ رہے۔'') اس کے بعد تفسیر القرآن جلد 7 نمبر 3 شمارہ ہی ملا ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر تینوں رسالوں کے 2334 صفحات پر یہ تفسیر شائع ہوئی۔

سورۃ الفاتحہ سے سورۃ البقرۃ آیت 40 تک کی تفسیر کے 564 صفحات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں شائع ہوئے۔ آپ نے اس تفسیر میں نہایت قابلیت سے نہ صرف حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ کی تفسیر ہی محفوظ کی ہے بلکہ نہایت محققانہ اور فاضلہ انداز میں اس پر اضافے کئے۔ اور عہد خلافت اولیٰ میں مزید 1770 صفحات پر مشتمل تفسیر شائع ہوئی۔ جو کہ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 40 تک ہے۔

سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنے مکتوب (مرقومہ مورخہ 4 نومبر 2010ء میں متعلقہ ادارہ کو ارشاد فرمایا:

"اگر کچھ زائد وقت دے کر یہ تفسیر اکٹھی کر سکتے ہوں تو کر لیں یا کسی کو اس کام کے لئے ساتھ لگا لیں اور جب ساری جمع ہو جائے اور اشاعت کے لئے تیار ہو تو مجھے بتائیں۔"

اسی طرح حضورِ انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مورخہ 26 اپریل 2013ء کے ایک مکتوب میں ازراہِ شفقت اس تفسیر کا نام **"تفسیر سروری"** پسند فرمایا۔

تعمیل ارشاد میں ریسرچ سیل نے رسالہ جات میں مندرج اس تفسیر کی مسلسل عبارات کو کتابی صورت میں ترتیب دیتے ہوئے اسے مناسب پیراجات میں تقسیم کیا ہے اور بعض جگہوں پر ہیڈنگز بھی لگائی گئی ہیں۔ تفسیر سروری کو پانچ جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر جلد کے شروع میں آیات اور ہیڈنگز کی فہرست مرتب کر کے شامل کی گئی ہے۔

نئی آیت جس کی تفسیر شروع ہو رہی ہو، اسے نئے صفحہ سے شروع کیا گیا ہے۔

متن میں جہاں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں، ان آیات کا ترجمہ تفسیر صغیر سے حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔

تفسیر کے اندر جہاں احادیث، دیگر عربی اور فارسی فقرات و اشعار کا ترجمہ درج نہیں تھا، وہاں پر ان کا ترجمہ حاشیہ میں درج کیا گیا ہے۔

تفسیر سروری میں مندرج آیات اور احادیث کی تخریج کر کے ان کا حوالہ ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ جہاں آیات کا حوالہ پرانی طرز پر (جیسے 1 / 1، یعنی پہلے پارے کا پہلا رکوع) دیا گیا تھا، وہاں پر جدید طرز سے آیت کا حوالہ درج کیا ہے۔ (یعنی سورۃ نام اور آیت کا نمبر)

متن میں اگر کسی جگہ پر تصحیح یا وضاحت کی ضرورت پیش آئی تو اسے حاشیہ میں دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر جن شمارہ جات میں شائع ہوتی رہی ان کی تفصیل بھی الگ صفحات میں دی جارہی ہے۔

اس کام کی تکمیل میں جن احباب نے حصہ لیا اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس
ایڈیشنل وکیل التصنیف لندن
31 مئی 2026

تفسیر سروری جن رسائل و شمارہ جات میں شائع ہوئی ان کی تفصیل

رسالہ تعلیم الاسلام

نمبر شمار	جلد	نمبر	رسالہ صفحہ	سال	تفسیر سورۃ
.1	1	1	1 تا36	جولائی1906ء	سورۃ الفاتحہ۔ آیت 1 تا7
.2	1	2	41تا82	اگست1906ء	سورۃ الفاتحہ۔ آیت 7
.3	1	3	89تا124	ستمبر1906ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 1 تا3
.4	1	4	129تا160	اکتوبر1906ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 3 تا4
.5	1	5	169تا196	نومبر1906ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 4 تا5
.6	1	6	205تا228	دسمبر1906ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 5 تا7
.7	1	7	245تا276	جنوری1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 8 تا12
.8	1	8	285تا316	فروری1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 12 تا16
.9	1	9	325تا360	مارچ1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 17 تا21
.10	1	10	364تا401	اپریل1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 17 تا21

ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز (اردو)

.11	6	5	1تا20	مئی1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 22،23
.12	6	6	21تا40	جون1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 24،23
.13	6	7	41تا60	جولائی1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 25،24
.14	6	8	61تا80	اگست1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 26،25
.15	6	9	81تا100	ستمبر1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 27،26

نمبر شمار	جلد	نمبر	رسالہ صفحہ	سال	تفسیر سورۃ
.16	6	10	101تا120	اکتوبر1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 27
.17	6	11، 12	121تا160	نومبر، دسمبر1907ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 27تا29
.18	7	1	1تا20	جنوری1908ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 29
.19	8	4	81تا112	اپریل1909ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 86تا88

رسالہ تفسیر القرآن

.20	3	1	21تا58	مارچ1908ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 30تا40
.21	3	2	59تا118	اپریل تاجون1908ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 48تا60
.22	3	3	119تا166	جولائی تاستمبر1908ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 61تا63
.23	3	4	167تا228	اکتوبر تادسمبر1908ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 64تا74
.24	4	1	1تا80	جنوری تامارچ1909ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 75تا86
.25	4	2	113تا159	اپریل تاجون1909ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 89تا94
.26	4	3	160تا239	جولائی تاستمبر1909ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 95تا106
.27	4	4	240تا340	اکتوبر تادسمبر1909ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 107تا197
.28	5	1	1تا100	جنوری تامارچ1910ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 198تا261
.29	5	2	101تا 200	اپریل تاجون 1910ء	سورۃ البقرہ۔ آیت 261تاآخر۔ سورۃ آل عمران۔ آیت 1تا31
.30	5	3	201تا300	جولائی تاستمبر1910ء	سورۃ آل عمران۔ آیت32تا130
.31	5	4	301تا400	اکتوبر تادسمبر1910ء	سورۃ آل عمران۔ آیت131تاآخر سورۃ النساء۔ آیت 1تا23
.32	6	1	1تا98	جنوری تامارچ1911ء	سورۃ النساء۔ آیت24تا113

نمبر شمار	جلد	نمبر	رسالہ صفحہ	سال	تفسیر سورۃ
.33	6	2،3	99تا300	اپریل تا ستمبر 1911ء	سورۃ النساء۔ آیت 114 تا آخر۔ سورۃ المائدہ۔ آغاز تا آیت 51
.34	6	4	301تا400	اکتوبر تا دسمبر 1911ء	سورۃ المائدہ۔ آیت 52 تا آخر
.35	7	1	1تا100	جنوری تا جون 1912ء	سورۃ الانعام۔ آیت 1 تا 83
.36	7	2	101تا200	جولائی تا ستمبر 1912ء	سورۃ الانعام۔ آیت 84 تا 145
.37	7	3	201تا300	اکتوبر تا دسمبر 1912ء	سورۃ الانعام۔ 146 تا آخر سورۃ الاعراف۔ آیت 1 تا 40

رسالہ تعلیم الاسلام میں شائع ہونے والے کل صفحات (506)

ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز میں شائع ہونے والے کل صفحات (212)

رسالہ تفسیر القرآن میں شائع ہونے والے کل صفحات (1616)

میزان کل صفحات (2334)

مختصر سوانحی خاکہ حضرت سید محمد سرور شاہ صاحبؓ

آپ کا نام سید محمد سرور شاہ صاحبؓ ہے اور آپ کے والد کا نام سید محمد حسن شاہ صاحب ہے۔ آپ مورخہ 10 ستمبر 1873ء کو ضلع مظفر آباد کشمیر کے ایک گاؤں گھنڈی میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کا خاندان حضرت سیّد عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے۔ 1892ء میں جب حضورؑ دیوبند جاتے ہوئے لدھیانہ ٹھہرے تو اس دوران آپؓ کو حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر تین گھنٹے تک صحبت سے مستفید ہونے کی سعادت ملی لیکن ابھی بیعت نہ کی بلکہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی بابت دعاؤں میں لگے رہے۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ مختلف خوابوں کے ذریعہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی کے بارے میں آگاہ کیا۔

آپ نے بیعت کا خط لکھنے کا تہیہ کر لیا اور اس کا اظہار آپ نے اپنے چند دوستوں سے بھی کیا۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ سرِ دست آپ بیعت نہ کریں کیونکہ اس علاقے کے لوگ ابھی تک احمدیت سے بکلی نا آشنا ہیں اور اگر آپ نے بیعت کر لی تو یہ لوگ آپ سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے بلکہ مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن اگر اسی حالت میں رہ کر آپ انہیں سمجھاتے رہیں گے تو سب نہیں تو اکثر آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت اس بات کو پسند نہ کرتی تھی اور تاخیر برداشت سے باہر تھی۔ آخر آپ نے مناسب سمجھا کہ اس بارہ میں حضور علیہ السلام سے رہنمائی لیں چنانچہ آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں تحریر کیا کہ یہ امر یقینی ہے کہ میرے اعلان احمدیت پر یہ لوگ میرے مخالف ہو جائیں گے اور اس ملازمت سے برخاست کر دیں گے۔ برخواستگی مجھے ناپسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں پہلے استعفیٰ دوں پھر اعلان کروں۔ احمدی احباب مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ میں دو تین ماہ تک اسی حالت میں

رہوں اوراس کے بعد بیعت کروں لیکن میں چاہتاہوں کہ حق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھول دیا ہے اور میں بیعت کرلوں۔ اس پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا آپ کو جوابی خط ملا کہ احمدی احباب کا مذکورہ مشورہ صحیح نہیں کیونکہ اپنے نفس کا حق اپنے اوپر دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے اپنی اصلاح دوسروں کی اصلاح سے مقدم ہوتی ہے پس آپ فوراً بیعت کا اعلان کردیں اور استعفیٰ کے متعلق خیال صحیح نہیں۔

ایک دن حضرت سید محمد سرور شاہ صاحب ظہر کی نماز پڑھا کر ابھی بیٹھے دعائیں ہی پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا خط آپ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جب آپ نے اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا تو اس کے پہلے الفاظ یہ تھے کہ آپ فوراً بیعت کا اعلان کردیں۔ آپ نے اتنا حصہ پڑھ کر اگلا حصہ پڑھے بغیر اعلان کر دیا کہ میری بیعت کی قبولیت کا خط قادیان سے آگیا ہے اور آج سے میں احمدی ہو گیا ہوں۔ حضرت سید محمد سرور شاہ صاحبؓ نے 1897ء کے آغاز میں حضرت اقدس علیہ السلام کی بیعت کی سعادت پائی۔ آپؓ 1901ء میں ہجرت کر کے قادیان آ گئے۔ آپؓ علمی دنیا میں ایک نام رکھتے تھے اور مدرسہ سہارنپور میں مدرس کے طور پر بھی فرائض بجالاتے رہے، بیعت کے بعد آپ کا علم و عمل گویا نورٌ علیٰ نور ہو گیا اور احمدیت میں حضرت اقدس مسیح موعود اور خلفائے سلسلہ کی اطاعت میں محو ہو کر حقیقی معنوں میں ایک عالم اور عارف باللہ کی زندگی بسر کی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سید سرور شاہ صاحبؓ کے علمی مقام و مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اسی طرح اس زمانہ میں ہماری جماعت میں کوئی اچھے پائے کا فلسفی اور منطقی دماغ رکھنے والا آدمی نہ تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے مولوی سیّد محمد سرور شاہ صاحب کو ہدایت دے دی اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد آپ پشاور میں پروفیسر مقرر ہوئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد قادیان کی محبت نے غلبہ کیا اور آپ قادیان تشریف لے آئے اور دستی بیعت کی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مولوی صاحب سے فرمایا۔ آپ یہیں رہ جائیں چنانچہ آپ یہیں رہنے لگ گئے۔ بعض لوگوں نے زور دیا کہ مولوی صاحب کالج میں

پروفیسر ہیں اور اچھی جگہ کام کر رہے ہیں۔ انکی ملازمت سے سلسلہ کو فائدہ ہو گا اور ان کے ذریعہ تبلیغ ہو گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مولوی صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے اجازت لے کر واپس آگئے اور قادیان میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں مولوی صاحب کا مُدّ کا مباحثہ مشہور ہے۔ اس زمانہ میں مولوی صاحب مدرسہ احمدیہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ آپ نے کالج کی پروفیسری چھوڑ کر سکول کی مدرسی اختیار کی۔ اسوقت آپ کو پندرہ بیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ میں بھی ان دنوں سکول میں پڑھتا تھا اور کچھ عرصہ میں نے بھی مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کی ہے ..... جب مدرسہ احمدیہ کالج کی شکل اختیار کر گیا تو آپ کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا ..... میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ حضرت خلیفہ اوّلؓ درسی کتب کے بعض مشکل مقامات کے متعلق مولوی سیّد سرور شاہ صاحبؓ سے فرماتے کہ آپ اس کا مطالعہ کر کے پڑھائیں مجھے اس کی مشق نہیں۔ چنانچہ مولوی صاحب وہ مشکل مقامات طالب علموں کو پڑھاتے۔ مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اوّلؓ نے سیبویہ کتاب کے متعلق بھی مولوی صاحب کو فرمایا کہ اس کے بعض مقامات مجھ پر حل نہیں ہوئے۔ اس لئے آپ یہ کتاب طالب علموں کو پڑھائیں۔ ایسی ایک دو اور کتابوں کے متعلق بھی حضرت خلیفہ اوّلؓ نے فرمایا کہ مولوی صاحبؓ آپ یہ طالب علموں کو پڑھا دیں اور جب مولوی صاحب طالب علموں کو پڑھاتے تو حضرت خلیفہ اوّلؓ بھی سنا کرتے۔"

(اصحاب احمد جلد 5 صفحہ 331 تا 332)

قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرے خیال میں حضرت خلیفہ اوّلؓ کے بعد احمدی علماء میں بلحاظ علم و فضل اور وسعتِ معلومات ان کا پایہ بہت بلند تھا اور حضرت مسیح موعودؑ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مُدّ کے مباحثہ میں ان کو جماعت کی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اسی طرح نواب صاحب رامپور نے جب احمدی مسائل پر گفتگو کرانے کی خواہش کی تو حضرت مسیح موعودؑ نے اس کام کے لئے حضرت مولوی سرور شاہ صاحبؓ کو منتخب کیا۔ مجھے ان کا ایک

خاص واقعہ خوب یاد ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے مسجد مبارک قادیان میں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ حضرت مسیح موعودؑ بھی اس نماز میں شامل تھے اور حضورؑ نے گھر میں آکر حضرت ام المؤمنینؓ سے فرمایا کہ آج مولوی سرور شاہ صاحب نے بہت اچھا خطبہ دیا۔ یہ بات میرے کانوں نے سنی اور مجھے اب تک یاد ہے۔"

(اصحاب احمد جلد 5 صفحہ 322 تا 323)

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے عربی قصیدہ اعجازیہ میں انہیں "غَضَنْفَر" یعنی شیر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ نیز آپ کی نسبت فرمایا کہ آپ کو روح امین یعنی روح القدس سے قوت دی گئی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے عہد مبارک میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی غیر موجودگی میں آپ ہی درس دیا کرتے تھے۔ اور خلافتِ اولیٰ میں بھی یہی صورت قائم رہی جب تک کہ آخری ایام میں حضرت خلیفہ اوّلؓ نے امامت صلوٰۃ اور درس کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو مقرر نہیں فرما دیا۔ اسی طرح آپ کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ آپ کی اقتدا میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے نمازیں اور جمعے ادا کئے۔ اسی طرح آپ کے علمی مقام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام کے عہد مبارک میں ہی آپ کی یہ تفسیر شائع ہونی شروع ہوگئی۔ حضرت مصلح موعودؓ سفر پر جاتے ہوئے عموماً آپ کو امام الصلوٰۃ اور بعض دفعہ اس کے علاوہ امیر جماعت بھی مقرر فرماتے تھے۔

آپ مدرسہ احمدیہ کے ہیڈ ماسٹر اور پھر جامعہ احمدیہ کے پہلے پرنسپل، اور تاوفات مفتی سلسلہ رہے۔ آپؓ سلسلہ احمدیہ کے پہلے مفتی تھے۔ اور عرصہ دراز تک سیکرٹری بہشتی مقبرہ بھی رہے ۔ آپ کی وفات 3 جون 1947ء میں ہوئی۔ اور بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن ہوئے۔ آپ کا وصیت نمبر 303 تھا۔

آپؓ کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے آپؓ کی بیٹی محترمہ فاطمہ کبریٰ صاحبہ کی شادی حضرت حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے صاحبزادہ حضرت عبد الحی صاحبؓ سے ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب شادی کے قریباً اڑھائی سال بعد وفات پا گئے۔ کچھ عرصہ بعد موصوفہ محترم سیّد محمود اللہ شاہ صاحب پسر حضرت ڈاکٹر سیّد عبد الستار شاہ صاحبؓ کے عقد میں آئیں۔

18/ مئی 1918ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار روپیہ مہر پر نکاح کا اعلان فرمایا۔ قریباً ساڑھے چھ سالہ ازدواجی زندگی کے بعد محترمہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ مرحومہ دو چھوٹے چھوٹے بچے اپنی نشانی چھوڑ گئی ہیں صاحبزادگان سیّد مسعود مبارک شاہ صاحب اور سیّد داؤد مظفر شاہ صاحب ہیں۔ سیّد داؤد مظفر شاہ صاحب کی شادی سیدہ حضرت امۃ الحکیم صاحبہ دختر سیّدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الثانیؓ) سے ہوئی۔ دوسری بیگم سے بھی آپ کی اولاد ہوئی۔ جن میں سے ایک مکرم کمال یوسف صاحب سیکنڈے نیوین ممالک کے مبلغ آپؓ کے نواسے ہیں۔

مضمون	صفحہ
انٹروڈیکشن اور اس رسالہ کے آغاز کا سبب	1
تعلیم الاسلام موضوع کی عظمت وضرورت	3
تفسیر فاتحہ	4
آیت 1: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔	4
رحمت کے اصل معنی	7
تمام سورتوں کے آغاز اور سورۃ التوبہ کے آغاز میں فرق کی وجہ	8
سورۃ التوبۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ	11
سورۃ الفاتحہ میں ترقی کی راہ کا بیان	13
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کی تفسیر	15
سورۃ الفاتحہ میں مذکور چار صفات کے انتخاب کی وجہ	19
الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے تکرار کی وجہ	20
ہدایت کے چھ معنے ہیں	30
منعم علیہ گروہ	34
اس امت میں سے منعم علیہم کا ہونا	40
یہود و نصاریٰ کا سورۃ الفاتحہ میں ذکر	46
تینوں گروہوں کے ذکر میں ترتیب	47
سورۃ فاتحہ خدا کی طرف سے عرضی اور قرآن عظیم کا متن	49
سورۃ الفاتحہ ام القرآن ہے	50
سورۃ الفاتحہ جامع دعا	50
مسلمانوں کے تنزل کی پیشگوئیاں	52
موجودہ نسل دعا سے انکاری ہیں	53

مضمون	صفحہ
خدا ساری دعائیں قبول نہیں کرتا	59
اسلام میں استخارہ کا طریق	63
قرآن کے شروع کرتے وقت دعا ضرور مانگنی چاہئے	64
پہلی امتوں اور اس امت کو سکھلائی جانے والی دعا میں فرق	65
ایمان بالغیب	76
اللہ تعالیٰ کی اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات	79
توکل علی اللہ	80
دعا	80
سعی اور محنت	82
عبادت	82
توحید	83
ہمدردی خلائق	83
صحیح اور سچے تجارب کا حصول	84
صادقوں کی معیت اور بدوں سے اجتناب	84
تفسیر سورۃ البقرۃ	85
آیت 2: الٓمّٓ	85
متشابہات کے معنی کسی کو معلوم ہو سکتے ہیں یا نہ	86
متشابہ بھی محکم ہو جاتی ہے	88
متشابہ کے محکم ہونے کی مثال	89
کبھی ایک شخص کی نسبت متشابہ ہوتی ہے اور دوسروں کی نسبت محکم	90

مضمون	صفحہ
حروف مقطعات کے معنے	91
اسم اشارہ کی بحث	98
کتاب کے معنے	101
رَیْبٌ کے معنے	101
الٓمّٓ کے معنے	102
اس کتاب کے نَازِلٌ مِنَ اللہِ ہونے میں کیوں شک نہیں	104
اس کتاب کے لَارَیْبَ فِیْہِ ہونے کی پہلی دلیل	105
اس کتاب کے لَا رَیْبَ فِیْہِ ہونے کی دوسری دلیل	106
لَارَیْبَ فِیْہِ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب	108
قرآن مجید کی پہلی سورۃ کا پہلا دعویٰ لَارَیْبَ فِیْہِ کیوں لکھا ہے	109
خداوند کریم اپنی معرفت کی تعلیم کس سے شروع کرتا ہے	111
ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر	113
تقویٰ کے معنے	113
تقویٰ کے مراتب جو کہ بعض نے بیان کئے ہیں	113
یہ مراتب صحیح نہیں ہیں	114
متقی کے صفات	114
تقویٰ کے آثار و ثمرات	116
ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ پر ایک اعتراض	118
اس اعتراض کا دوسرا جواب	119

مضمون	صفحہ
دوسرے جواب کا نقص	121
اس اعتراض کا تیسرا اور اصل جواب	122
خلاصہ جواب ثالث	126
اس کتاب کے منجانب اللہ اور اسلام کے فطرتی مذہب ہونے کی دلیل	126
لَا رَیْبَ فِیْہِ اور ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں ترتیب کا بیان	127
آیت 4: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ..... وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔	128
ایمان کے معنے	128
نزاع لفظی اور نزاع حقیقی میں فرق	128
احادیث کے لحاظ سے ایمان کی تعریف	135
ایمان کے چار معنے	138
اسلام کا صحیح مفہوم	139
ایمان اور اسلام میں ارتباط	140
ایمان اور اسلام ایک ہی چیز	141
حقیقی اور غیر حقیقی اسلام	142
یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنی پر ہونیوالا ایک اعتراض اور اس کا جواب	144
ایمان بالغیب کا مسئلہ عالم گیر مسئلہ ہے	147
متقیوں کے لئے ترقی کی ہدایت	151
انسان میں دو طاقتیں	152
صلوٰۃ ایک خاص عبادت	153

مضمون	صفحہ
صلوٰۃ کی اقامت سے مراد	154
صلوٰۃ پہرہ دار ہے	155
صلوٰۃ کی کیفیت	156
حضرت مسیح موعودؑ کا طریق نماز	157
نماز میں اپنی زبان میں دعا کرنا	157
ظاہری اعمال پر توجہ کا نتیجہ اور اس کا حل	158
صلوٰۃ کے بارہ میں بعض کا اپنی رائے پر انحصار	159
ترجیح کی پیروی کا نتیجہ	160
قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ کا کثرت سے ذکر	160
اقامت صلوٰۃ ایک مجرب نسخہ	160
نماز مومن کا معراج ہے	161
اہل اسلام کا نماز کی جان حضور کو چھوڑنا	162
تعوذ، تسمیہ اور سورۃ فاتحہ	162
رکوع اور قیام	163
پہلا سجدہ	164
دو سجدوں کے درمیان قعدہ	165
دوسرا سجدہ	165
دوسری رکعت	165
نماز کا اختتام	166
رفع یدین	167
باجماعت نماز کی سخت تاکید ہے	167
باجماعت اور انفرادی نماز میں چنداں فرق نہیں ہوتا	168
مقتدی پر امام کی اتباع ضروری ہے	168
فوت شدہ رکعتوں کو کیسے پورا کیا جائے	169
لطیفہ	169
بلند آواز سے آمین کہنا	170
امام کو باجماعت نماز میں رعایت کرنی چاہئے	170
نمازوں میں رسول کریم ﷺ کون سی سورتیں پڑھا کرتے تھے	171
نماز باجماعت میں امام بنانے کی اصل غرض	172
احمدی غیر احمدی امام کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟	172
نماز کے متفرق مسائل	174
سجدہ سہو	174
سفری نماز اور حد سفر	175
وتروں کی ادائیگی کا طریق	175
نماز کے بعد پڑھے جانے والے مسنون کلمات	175
آیت 4: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔	176
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں مذکور قابل ذکر باتیں	177
متقی کون ہوتے ہیں	178
اللہ کی راہ میں قربانی کرنا ہی اصل مقصد ہے	178
حضرت ابو بکرؓ کی بے مثال مالی قربانی	179
قرآن مجید راہنمائی کا ذریعہ	179

مضمون	صفحہ
آیت 5: وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ... هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ۔	181
مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ اور مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ سے کیا مراد ہے	181
اس آیت میں کون سے مومن مراد ہیں	182
اٰلۡاٰخِرَۃِ سے مراد	182
صحابہ رسولؐ کا علم اور خیالات وسیع تھے	183
حضرت مسیح موعودؑ سے قبل زمانہ کی حالت	184
آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کی بعثت ثانیہ	185
حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ زمانۂ نبوت ہے	185
تفسیر کا اصول	186
وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کے دو معنی	187
عیسائیوں کا ایک دجل	188
فقط ایک معصوم حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم	189
معانی کثیرہ کے فوائد	189
ایک سوال اور اس کا جواب	190
اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ سے کون سے متقی مراد ہیں	191
بجز اہل اسلام کے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہے	191
قرآن مجید سب کے لئے ہدایت ہے	192
ہر فرد قرآن کریم کی ہدایت کا محتاج ہے	193
آیت 6: اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔	194

مضمون	صفحہ
ربّ سے مراد	194
قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظہر اور بطن ہوتا ہے	195
ہدایت حاصل کرنے کا طریق	196
آیت 7: اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ۔	201
قرآن مجید میں بیان کافروں کی نشانیاں	202
اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا... لَا یُؤۡمِنُوۡنَ میں کفار کا ایمان نہ لانے کا سبب	206
قرآن مجید پر ہونے والے ہر اعتراض کا جواب قرآن میں موجود ہے	206
ہر ایک سورۃ میں ایک اصل مدعیٰ ہوتا ہے	208
فاتحہ قرآن کا متن اور باقی اس کی شرح ہے	212
آیت 8: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ ... وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ۔	214
خدا کے کافروں کے دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے سے مراد	214
کفار کی حالت	216
کفار کی حالت اپنے افعال کی وجہ سے ہے	217
اللہ کا دلوں پر مہر لگانے کی حقیقت	220
مختلف مقامات پر بصر، قلوب اور سمع کو مقدم رکھنے کی حکمت	222
علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟	223

مضمون	صفحہ
آیت 9: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ.....وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔	226
منافقین کی حالت	228
آیت 10: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .....وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔	230
نفس کی حقیقت	230
قرآن مجید پر زیادہ اعتراضات کی وجہ	232
استہزاء کے معنی	235
آیت 11: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔	245
خدا نے ہر گز کفار کے مرض کو زائد نہیں کیا	246
جسمانی اور روحانی قویٰ کا مرکز	249
آیت 12-13: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا .....وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔	253
آیت 14: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ... كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ۔	256
منافق مومنین سے کیوں ملتے ہیں؟	256
منافقین کا فساد	260
ہر نبی کے دور میں منافقین کا گروہ ہوتا ہے	262
آیت 14: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ.....وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔	265
منافق کمزور دل ہوتے ہیں	267
منافقین کی بزدلی اور ان کی نشانیاں	269

مضمون	صفحہ
آیت 15: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا .....اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔	272
آیت 16: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔	274
اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ پر وارد ہونے والے اعتراض اور ان کے جواب	274
استہزاء کے اعتراض کے جواب کا خلاصہ	281
موجودہ زمانہ میں منافقین سے مراد کون سا فرقہ ہے	284
آیت 17: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ.....وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔	289
آیت 18: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ.....ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔	293
منافقوں کی مثال	296
نور سے کیا مراد ہے؟	298
آیت 19: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔	301
منافقین کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے سے مراد	301
آیت 20 تا 21: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ .....اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔	304
منافقوں کی حالت	308
بارش والی مثال کا خلاصہ	308

مضمون	صفحہ
وحی الٰہی کے نزول کی مثال بارش سے ہے	309
خدا کے عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ہونے کا مفہوم	312
خدا کے قدیر ہونے کا غلط دیوبندی مفہوم	313
عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ پر وارد ہونے والے شبہات کا رفع	313
سورۃ الفاتحہ قرآن کی تفسیر اور شرح	316
قرآن میں موجود منافقوں کی علامات	317
منافقین سے احتراز	331
شیعوں کے نزدیک حضرت علیؓ نے تقیہ کیا	332
شیعہ حضرات کی منافقت	335
حضرت علیؓ کی نسبت تین امور	348
خلفاء کو خدا تعالیٰ کی تائید حاصل تھی	349
شیعہ صاحبان اور حضرت علیؓ کی خلافت	350
شیعہ صاحبان اور خلافت	351
خلافت کی اصل	352
رسالت و خلافت میں فرق	353
نبوت فضلی اور وہبی نعمت ہے	355
قرآن میں ہر قسم کے نزاع کا فیصلہ موجود ہے	357
خلیفہ بنانے کا اختیار صرف خدا کا ہے	360
خلافت کے متعلق شیعہ عقائد کا ردّ	361
آیت 22-23: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ.....وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۔	365

مضمون	صفحہ
اُعۡبُدُوۡا کی تفسیر	381
الَّذِیۡ کے متعلق اعتراض اور اس کے جواب	394
آسمان سے متعلق قرآنی نظریہ پر اعتراض کا جواب	396
آیت 24-25: وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا.....اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ۔	402
یہاں پر متکلم انسان ہے یا خداوند کریم	405
مخالفین مثل لانے سے عاجز رہے	429
امتیاز اور شناخت کا معیار	431
صداقت کا معیار	441
آیت 25: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا.....اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ۔	444
آگ سے کیا مراد ہے	457
تفجیر سے کیا مراد ہے	458
اُعِدَّتۡ کے معنے	459
فَاتَّقُوا النَّارَ کے معنی	461
آیت 26: وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ.....تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ۔	463
وَبَشِّرْ کا عطف کس پر ہے	463
اٰمِنُوۡا اور عَمِلُوۡا بلفظ ماضی کیوں لائے	464
بشارت کی تفسیر	465
بشارت کی مشہور تفسیر پر اشکال اور اس کا حل	466
بَشِّرْ کے معنے	466
کیوں کفار کو خطاب کیا اور مومنوں کو نہ کیا	466

مضمون	صفحہ
موصول کیوں لایا ہے	471
جَنّٰتٌ کے معنے	471
لَھُمْ کو جنت کے لئے لانے کی حکمت	472
مِنْ کے معنی	477
آیت 26: كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا .....وَأُتُوا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔	480
مفسرین کا جواب	485

مضمون	صفحہ
وَأُتُوا بِهٖ مُتَشَابِهًا سے مراد	489
آیت 26: وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ۔	493
عورتوں اور مردوں کے حقوق میں فرق	495
مُطَهَّرَةٌ کے معنی	497
جنت کی نعماء	501

افتتاح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ۔[1] اٰمِیۡن۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیۡتَ عَلٰی اِبۡرَاھِیۡمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبۡرَاھِیۡمَ اِنَّکَ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکۡ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکۡتَ عَلٰی اِبۡرَاھِیۡمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبۡرَاھِیۡمَ اِنَّکَ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ۔[2]

قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔[3] (صحیح البخاری کتاب بدء الوحی حدیث 1)

انٹروڈکشن اور اس رسالہ کے آغاز کا سبب:

ناظرین یہ تعلیم الاسلام کا پہلا پرچہ ہے اور اس کے ابتدا کو ایڈیٹر کے لکھے ہوئے انٹروڈکشن سے خالی پاکر اور اولڈ فیشن کا افتتاح ہی دیکھ کر کوئی نیو فیشن کے دلدادہ صاحب پڑھنے سے پہلے ہی اس کو ردی میں نہ پھینک دیں۔ ایسے صاحبان کے راضی کرنے کے لئے میرے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ اس کی ابتدا انٹروڈکشن سے شروع کروں۔ لیکن قرآن مجید وسنت کی اتباع اور صلحائے امت کے اسوۂ حسنہ نے (کہ جن کی طرف قوم کو توجہ دلانا اس

---

[1]۔ (میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)۔ ہر (قسم کی) تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے (جو) تمام جہانوں کا رب (ہے)۔ بے حد کرم کرنے والا، بار بار رحم کرنے والا۔ (اور) جزا سزا کے وقت کا مالک ہے۔ (اے خدا)! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا ہے جن پر نہ تو تیرا (بعد) میں غضب نازل ہوا (ہے) اور نہ وہ (بعد میں) گمراہ (ہو گئے) ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2] اے اللہ! محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل پر رحم فرما۔ جیسا کہ تو نے ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی آل پر رحم کیا۔ یقیناً تو بہت ہی خوبیوں والا (اور) بڑی شان والا ہے۔ اے اللہ! تو محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل پر برکت نازل فرما جیسی کہ تو نے ابراہیمؑ پر اور ابراہیمؑ کی آل پر برکت نازل کی۔ یقیناً تو بہت ہی خوبیوں والا (اور) بڑی شان والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اعمال تو نیتوں ہی پر ہیں۔ (از مرتب)

رسالہ کی اصل غرض ہے) مجھے اس طرف متوجہ کیا کہ اس کی ابتدا قرآن مجید اور کتب معتبرہ سنت کے مطابق کروں تا کہ صلحائے امت کے اسوۂ حسنہ پر شروع ہو۔

پس چونکہ قرآن مجید کا افتتاح سورۂ فاتحہ شریف سے تھا۔ اور کتب سنت کی معتبر ترین کتاب کی پہلی حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ تھی۔ تا کہ مصنف اور پڑھنے والا اپنی نیت کی اصلاح کر سکے۔ لہٰذا میں نے ان دو سے شروع کیا۔

رہا انٹروڈکشن تو جب میں نے دیکھا کہ اصل موضوع اظہار مقاصد اور ان کی ضرورت اور عظمت کا اثبات ہوتا تھا۔ اور اب محض اپنی طراوت لسانی اور جودت بیانی کی داد لینی مد نظر ہے اور مجھے ان دونوں کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ اوّل تو ہم نے اشتہاروں میں کھول کر بتا دیا ہے کہ اصل غرض اس رسالہ کی کیا ہے اور پھر عیاں را چہ بیاں۔[1] اس کے مضمون کو دیکھتے ہی بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے اور تفسیر بھی وہ جو کہ نور دین کے درس قرآن مجید کا مجموعہ ہے اور نور دین بھی وہ جو کہ مرزا غلام احمدؑ کی غلامی کو اپنا فخر جانتا ہے اور مدت دراز سے آپ کے قدموں میں رہتا اور اس کو اپنی ساری عمر کی گراں قیمت کمائی اور نعمت یقین کرتا ہے اور مرزا **غلام احمدؑ** بھی وہ جس کی نسبت خداوند کریم فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ... وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ۔[2] (الجمعہ: 3 تا 4) اور كُلٌّ بَرَكَةٍ مِّنْ مُحَمَّدٍ ﷺ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ۔[3] (تذکرہ صفحہ 194) اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔[4] (تذکرہ صفحہ 230) اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ اَوْلَادِیْ۔[5] (تذکرہ صفحہ 325) یَحْمَدُكَ اللّٰهُ مِنْ عَرْشِهٖ۔[6] (تذکرہ صفحہ 371) جَرِیُّ اللّٰهِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَاءِ۔[7] (تذکرہ صفحہ 63)

---

[1]۔ جو چیز ظاہر و باہر ہو اس کی وضاحت بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ (از مرتب)

2۔ وہی خدا ہے جس نے ایک ان پڑھ قوم کی طرف انہی میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا... اور ان کے سوا ایک دوسری قوم میں بھی (وہ اسے بھیجے گا) (تفسیر صغیر)

3۔ ہر ایک برکت محمدؐ کی طرف سے ہے پس بڑا مبارک وہ ہے جس نے تعلیم دی اور جس نے تعلیم پائی۔ (تذکرہ ص 194)

4۔ وہ رحمٰن ہے جس نے قرآن سکھلایا۔ (تذکرہ صفحہ 230)

5۔ تو مجھ سے بمنزلہ اولاد کے ہے۔ (تذکرہ صفحہ 325)

6۔ اللہ عرش سے تیری تعریف کرتا ہے۔ (تذکرہ صفحہ 371)

[7]۔ جری اللہ نبیوں کے حُلّوں میں۔ (تذکرہ صفحہ 63)

تعلیم الاسلام موضوع کی عظمت وضرورت:

رہا قرآن مجید تو اس کی عظمت اور ضرورت کے لئے کسی بیان کی ضرورت نہیں۔ اہل اسلام کے زمانہ حال کے سب اخبار ورسائل اور لیکچر ومواعیظ اور چھوٹی بڑی کمیٹیاں اور مجالس پھر وہ سب کتابیں جو کہ اہل اسلام کے عروج ونزول پر لکھی گئی ہیں۔ یا عرب کی حضیض نشینی اور اوج پردازی اور اس کے علل واسباب پر موافقوں اور مخالفوں نے شائع کیں یہ اور ان کے سوائے اور بہت سے امور ہیں جو کہ اس کی عظمت اور ضرورت کے شاہد ناطق ہیں یا یوں کہیے کہ تعلیم الاسلام موضوع کی عظمت وضرورت کو بیان کر رہے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ایک عرصہ دراز سے اس کا انٹروڈکشن دے رہے ہیں۔ رہی طراوت لسانی کی داد تو تعلیم الاسلام کے ایڈیٹر کو نہ اس داد کا شوق ہے اور نہ فصیح وبلیغ ہونے کا دعویٰ ہے۔ ہاں اس کو یہ دعویٰ ہے کہ میرا مقصود مخدوم اور سید ومولیٰ (فرقان حمید اور قرآن مجید) اعجازی فصاحت وبلاغت کی تاجداری میں وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ[1] ہے جس کی شہادت سے سب عرب وعجم طوعاً وکرہاً رطب اللسان ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے آقا نام دار کے حضور میں ایک ادنیٰ عجمی غلام کا امیدوار داد فصاحت ہونا بعینہٖ ایسا ہے جیسا سورج کے سامنے کرم شب چراغ کا امیدوار تعریف ہونا یا حسن یوسف کے سامنے ایک مکروہ الصورت کا خواہاں تحسین ہونا۔ اس وجہ سے انٹروڈکشن لکھنے کا ارادہ ملتوی کیا گیا۔

ہاں اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ اس رسالہ میں عموماً حضرت مولانا حکیم الامت کے درس قرآن کے نوٹ ہوں گے اور بعض باتیں خاکسار ایڈیٹر کی طرف سے ہوں گی۔ تو امتیاز کے لئے حضرت مولانا موصوف کے نوٹ کے ابتداء میں ''حکیم الامت'' یا ''ح'' لکھوں گا اور جو خاکسار ایڈیٹر کی طرف سے ہو گا اس کے اوّل میں ''محمد سرور'' یا ''م'' ہو گا۔

[1]۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ (از مرتب)

تفسیر فاتحہ

آیت 1: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔[1]

ح۔ با بہت سے معانی کے لئے آتی ہے اور یہاں پر استعانت کے لئے ہے وَاللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ۔[2](یوسف:19) اور خصوصاً اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔[3](الفاتحۃ:5) اس کے مؤید ہیں۔ استعانت کسی فعل میں ہوتی ہے اس فعل میں بہت کچھ بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ آنحضرت ﷺ کو شروع میں اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ[4](العلق:2) ارشاد ہوا تھا لہٰذا کتاب اللہ کے افتتاح کے وقت فعل قرأت (اِقۡرَاۡ) میں استعانت بہت موزون ہے۔

اسم۔ نام کو کہتے ہیں اس میں زمانۂ دراز سے بحث چلی آئی ہے کہ اس کا ماخذ اور اصل سَمَوٌ ہے جو بمعنی علو ہے یا وَسۡمٌ ہے جو بمعنی علامت ہے۔ لیکن اب حضرت امام ہمامؒ واجب الاتباع اور مطاع نے (جس کی نسبت مخبر صادقؐ نے خبر دی تھی کہ وہ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ[5](ھود:46) کی طرف سے حَکَم عدل ہو کر آئے گا) یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اسم وَسۡمٌ سے بنایا ہوا ہے اور وہ اپنے مسمّٰی پر دال اور علامت ہوتا ہے۔

م۔ اور زبان عرب میں جو کہ ام الالسنہ ہے ہر ایک اسم اپنی وجہ تسمیہ کا خود شاہد ناطق ہے جیسا کہ حضرت امام علیہ السلام نے ثابت کیا ہے کہ عربی ہر ایک نام اپنے اصلی معنوں کے لحاظ سے اپنے مسمّٰی کے کل خواص واغراض اور فوائد وکمالات پر دال ہے جس سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان اسماء کا واضع وہی حکیم مطلق خالق ہے کہ جس نے ان کے مسمیات میں یہ عجیب وغریب حکمتیں بوقت خلق مرکوز رکھی ہیں۔

ح۔ اللہ نام ہے اس ذات کا جو کہ سب نقصوں سے پاک اور سب کمالات کی جامع ہے اور یہی اس کے معنے ہیں۔

---

[1]۔ (میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اللہ سے ہی مدد مانگی جا سکتی ہے (اور اسی سے مدد مانگی جائے گی)۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ اپنے ربّ کا نام لے کر پڑھ۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر (بہتر اور درست) فیصلہ کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

م۔ اور یہی اس معبود حقیقی کا اسم ذات ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔[1](الاعراف:181) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔[2](طٰہٰ:9) اور قرآن مجید میں سب صفات اور اسمائے حسنیٰ کا موصوف اسی کو بنایا گیا ہے جو کہ اس کے معنے اس کے اسم ذات ہونے کا بیّن ثبوت ہے اور یہی وجہ ہے کہ زبان عرب میں یہ نام کسی بت یا کسی سردار پر نہیں بولا گیا۔ یہ بھی عربی زبان کی خصوصیات میں سے ہے۔ بعض نادانوں نے اس نام کے کمالات پر رشک کھا کر یہ چاہا ہے کہ اس سے زبان سنسکرت کو عزت دیں چنانچہ اس خیالی پلاؤ کے لئے انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ عربوں نے سنسکرت سے لیا ہے پر ان کے کذب کو طشت از بام کرنے کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ جس قدر اس کے مشتقات اس کی اصل حقیقت کو لئے ہوئے زبان عرب میں موجود ہیں یہ مُردہ زبان ان سے خالی ہے مثلاً کافور اور کیمفر میں اگرچہ ایک انگریزی زبان کا حامی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ کافور کیمفر سے لیا ہوا ہے۔ لیکن اس کے دعوے کی تردید کے لئے اسی قدر بس ہے کہ عربی زبان میں کفر کے ایک خاص معنے ہیں پھر اس سے بہت سے مشتقات مثل كَفَرَ يَكْفُرُ كَافِرٌ كُفَّارٌ كَفُوْرٌ كَافُوْرٌ وغیرہا ان معنوں میں مشترک پائے جاتے ہیں اور انگریزی میں ایسا ہرگز نہیں جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ امر بالعکس ہے۔

ح۔ اَلرَّحْمٰنُ: اس کے معنے ہیں بن مانگے اور بے عوض رحمت کرنے والا جیسا کہ قرآن مجید کے استعمال سے ثابت ہے مثلاً فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔[3](الرحمٰن:2تا5)

اَلرَّحِيْمُ:۔ وہ ہے جو نیک اعتقاد اور نیک اعمال اور نیک اخلاق پر اور مانگنے سے رحمت کرنے والا ہو۔ اس پر قرآن مجید کا استعمال شاہد ہے مثلاً فرمایا۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔[4](الاحزاب:44)

---

[1]۔ اور اللہ کی بہت سی اچھی صفات ہیں۔(تفسیر صغیر)

[2]۔ اللہ (وہ ذات ہے کہ اس) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی بہت سی اچھی صفات ہیں۔(تفسیر صغیر)

[3]۔ (وہ) رحمٰن (خدا) ہی ہے۔ جس نے قرآن سکھایا ہے۔ اس نے انسان کو بنایا۔ اور اسے فصاحت و بیان بخشا۔(تفسیر صغیر)

[4]۔ اور وہ مومنوں پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔(تفسیر صغیر)

م۔ اور یہ دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت کے معنے ہیں مہربانی کے۔ واضح ہو کہ کتب لغت میں جب کسی ایسے لفظ کے معنے کرتے ہیں جو کہ موالید ثلاثہ (جمادات، نباتات، حیوانات) یا ان کی قسم میں استعمال ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کی تشریح کرتے ہوئے ایسے الفاظ بول دیتے ہیں جو کہ اس کے معنوں کے عموم کو باطل کر کے خاص مستعمل فیہ سے مختص کر دیتے ہیں۔ مثلاً غضب کے اصل معنے ہیں انتقام پر آمادہ ہونا جو کہ انسان یا حیوان کیا اجسام کے ساتھ بھی مخصوص نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے لئے بھی ذُوانْتِقَامٍ[1] (آل عمران:5) اور غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ[2] (الفتح:7) آیا ہے لیکن چونکہ اہل لغت کی مد نظر وہ مستعمل فیہ تھا جو کہ عرف عام میں ہے اور وہ انسانی یا زیادہ سے زیادہ حیوانی غضبانی حالت ہے تو اس کی تشریح کتب لغت میں یوں کی گئی خون قلب کا جوش زن ہونا ہے انتقام لینے کے لئے۔

پس چونکہ قلب اور خون قلب یہ دونوں جسم سے کیا بلکہ حیوان سے مخصوص ہیں۔ لہٰذا یہ معنے اب عام نہیں رہے بلکہ حیوان سے مخصوص ہو گئے۔ لیکن ایسے مقام میں ان لوگوں نے بڑی سخت غلطی کی ہے جنہوں نے عرف عام کے کثیر الاستعمال مستعمل فیہ کی ان خصوصیات کو اعتبار کر کے اصل معنوں میں داخل خیال کیا ہے جو کہ کتب لغت میں بیان کی گئی ہیں اور اس اعتبار و خیال سے اس عام لفظ کو سوائے اس خاص مستعمل فیہ کے اور مواضع سے روک دیا ہے اسی نکتہ پر غور نہ کرنے سے کتب تفاسیر میں خداوند کریم کی نسبت بعض الفاظ کے استعمال کرنے میں بے فائدہ بحث کو طول دیا ہے چنانچہ منجملہ ان کے غضب اور رحمت بھی ہیں غضب میں تو چونکہ قلب اور خون کا ذکر آ گیا تھا اس وجہ سے خداوند تعالیٰ کی نسبت اس کے استعمال میں دقّت محسوس کی گئی اور رحمت میں چونکہ رقت قلب لی گئی تھی کہ جس سے اللہ جلشانہٗ منزّہ ہے اس وجہ سے اس کا استعمال بھی یہاں پر قابل بحث خیال کیا گیا۔

---

[1]۔ سزا دینے والا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اللہ نے ان پر غضب نازل کیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

لیکن یاد رہے کہ یہ خصوصیات اصل معنوں میں ہر گز دخل نہیں رکھتیں بلکہ یہ عرف عام کے کثیر الاستعمال مستعمل فیہ میں عام معنوں کے لئے جانے کی کیفیت کی تشریح ہے جس کو اصل معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رحمت کے اصل معنی:

پس رحمت کے اصل معنے مہربانی کے ہیں جو کہ سب سے اکمل اور اتم اور اقویٰ اور اکثر رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[1](الفاتحہ:2) میں ہے اور جزوی رنگ میں حیوانوں میں ہے ہاں حیوانوں میں یا یوں کہو کہ انسانوں میں رقت قلب کے ساتھ ہوتی ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ کی تشریح ہے اس کے مطابق اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ اللہ کے نام کی مدد سے (جو بن مانگے اور بے عوض دینے والا اور دعاؤں پر اور محنتوں پر عمدہ مطالب دینے والا ہے) ہم پڑھتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ الخ اور چونکہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی فاعل کا فعل کسی موصوف سے متعلق ہو تو وہ صفت اس فعل کی علت ہوا کرتی ہے جیسا کہ کہا جائے کہ زید کی تعظیم کر جو تیرا باپ ہے اور شریر عمر کے پاس نہ بیٹھ۔

تو اس سے صاف ثابت ہو گا کہ زید کی تعظیم کی علت اس کا باپ ہونا ہے اور عمر کے پاس نہ بیٹھنے کی علت اس کا شریر ہونا ہے لہٰذا یہاں پر استمداد فی القرأت کی علت رحمٰن اور رحیم ہونی چاہئے یعنی اَلْحَمْدُ کے پڑھنے میں ہم اس لئے اللہ کے نام سے مدد لیتے ہیں کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ نفس تعلیم قرآن اگرچہ صفت رحمان کا مقتضی ہے جیسا کہ فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔[2](الرحمٰن:2تا3) لیکن اس کے معارف اور حقائق اور حکم پر اطلاع ایمان اور تقویٰ اور مجاہدہ پر ملتی ہے جو کہ الرَّحِیْمُ کا مقتضی ہے جیسا کہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا۔[3](التوبۃ:124) اور اَلَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔[4](محمد:18)

---

[1]۔ تمام جہانوں کا رب۔(تفسیر صغیر)

[2]۔(وہ) رحمن (خدا) ہی ہے۔ جس نے قرآن سکھایا ہے۔(تفسیر صغیر)

[3]۔ جو لوگ مومن ہیں (ان کے پہلے ایمان کے نتیجہ میں) ان کے ایمان کو اس (سورۃ) نے بڑھایا ہے۔(تفسیر صغیر)

[4]۔ وہ لوگ جو کہ ہدایت پاتے ہیں اللہ ان کو ہدایت میں زیادہ کرتا جاتا ہے۔(تفسیر صغیر)

لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔[1](الواقعۃ:80)قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔[2](طٰہٰ:115) وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔[3](البقرۃ:283)وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[4](العنکبوت:70) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اَلرَّحمٰنُ اللہ کے نام سے استمداد لیتا ہے تو خدا کے جامع صفات کاملہ اور الرحمٰن ہونے پر اور نام کے بابرکت ہونے پر ایمان لاتا ہے اور استمداد دعا بھی ہے اور مجاہدہ بھی اور خوف خدا کا نشان بھی ہے۔ پس گویا قاری کہتا ہے اے اللہ تو قرأت اَلْحَمْدُ میں ہماری مدد کر کیونکہ تُو ہی اپنے فضل سے تعلیم قرآن دیتا ہے اور پھر دعاؤں سے علم قرآن کو ایزاد کرتا ہے۔

تمام سورتوں کے آغاز اور سورۃ التوبہ کے آغاز میں فرق کی وجہ:

یہی وجہ ہے کہ خداوند کریم نے سورۂ فاتحہ بلکہ سوائے سورۂ براءۃ کے اور سب سورتوں کا افتتاح بِسْمِ اللّٰہِ سے کیا ہے۔ اور سورۂ براءۃ میں بِسْمِ اللّٰہِ کے نہ ہونے کی وجہ عموماً مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ جب حضرت عثمانؓ قرآن مجید کو جمع کرنے لگے تو آپ نے سورۂ انفال کا موقع مناسب تو یہی پایا کہ اعراف اور توبہ کے درمیان ہو لیکن یہاں پر رکھنے سے یہ نقص لازم آتا تھا کہ سورۂ بقرہ سے لے کر سورۂ رعد سے پہلے جس قدر سورتیں ہیں وہ مِائَیْنِ(100) سے ہیں یعنی ان کی آیتیں سو یا سو سے زیادہ ہیں چنانچہ سورۂ توبہ جو انفال کے بعد ہے اس کی آیتیں ایک سو انتیس ہیں لیکن انفال مِائَیْنِ(100) سے ہرگز نہیں کیونکہ اس کی آیتیں پچھتر ہیں لہٰذا آپ نے اس بے ترتیبی کو رفع کرنے کے لئے انفال اور براءۃ کو ملا دیا اور ان دونوں کے درمیان سے بِسْمِ اللّٰہِ کو اڑا دیا اور چونکہ آنحضرت ﷺ اس کو جدا سورۃ قرار دے چکے تھے اس لئے درمیان سے اس کا نام نہ مٹایا۔ یہ وہ وجہ ہے کہ مفسرین نے بتائی ہے لیکن یہ یقیناً غلط اور نہایت غلط ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں اوّل تو یہ کہ بِسْمِ اللّٰہِ کا کسی سورۃ کے اوّل میں رکھنا یا نہ رکھنا یہ کسی انسان کا نہ فعل

---

[1]۔ اس (قرآن) کی حقیقت کو وہی لوگ پاتے ہیں جو مطہر ہوتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اور (مجملاً یہ) کہتا رہ کہ اے میرے ربّ! میرے علم کو بڑھا۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور چاہئے کہ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور (اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں علم دے گا۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ اور وہ (لوگ) جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشیں گے۔ (تفسیر صغیر)

ہے اور نہ اس کے اختیار میں ہے بلکہ حدیثوں میں صاف طور پر آیا ہے کہ ہر ایک سورۃ کے اوّل میں بِسۡمِ اللّٰہِ نازل ہوتی رہی ہے چنانچہ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ کے نزول سے معلوم کیا جاتا تھا کہ پہلی سورۃ ختم ہو گئی ہے اور نئی سورۃ شروع ہونے لگی ہے۔

(شعب الایمان از بیہقی جلد 4 صفحہ 21 فصل فی ابتداء السورۃ... حدیث 2126 مکتبۃ الرشد ناشرون 2004ء)

تو جب ہر ایک سورۃ کے اوّل میں بِسۡمِ اللّٰہِ نازل ہوئی تو پھر کسی صحابی کی یہ کیا مجال تھی کہ وہ باوجود خدا کے نازل فرمانے کے پھر بھی کسی سورۃ کے اوّل سے بِسۡمِ اللّٰہِ کو محو کر دے۔ اور اگر خداوند کریم نازل نہ فرماتا تو پھر کسی کے لئے جائز نہ ہوتا کہ وہ خدا کی محفوظ کتاب میں یہ ایزاد کرتا کہ ہر ایک سورۃ کے اوّل میں بِسۡمِ اللّٰہ لکھ دیتا۔

دوم یہ کہ قرآن مجید میں خود موجود ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ۔[1] (القیامۃ:18) جس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کا جمع کرنا خداوند کریم کا اپنا فعل ہے پھر خداوند کریم اس کو کتاب فرماتا ہے اور فرماتا ہے فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ۔ مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۔ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَةٍ۔ کِرَامٍۢ بَرَرَةٍ۔[2] (عبس:14 تا 17) جس سے اس کا مکتوب ہونا ثابت ہے اور اگر یہ مانا جاتا کہ قرآن مجید آنحضرتؐ کے وقت میں مرتب مجموع مکتوب نہ تھا اور بعد میں جمع کیا گیا اور کچھ حصہ کسی کے پاس سے لکھا ہوا ملا کچھ کسی کی یاد سے لیا گیا اور بعض آیات بجز ایک صحابی کے نہ کسی کے پاس لکھی ہوئی تھیں اور نہ کسی کو یاد تھیں تو وہ اس کی زبانی جمع کرنے کے وقت قرآن مجید میں داخل کی گئیں اور بعض ایسی سورتیں یا آیتیں بھی داخل کی گئیں کہ جن کے قرآن مجید سے ہونے میں بھی خلاف تھا وَغَیۡرُ ذَالِكَ جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے تو پھر قرآن مجید کے ثبوت میں وہی گڑبڑ پڑتی جو کہ انجیل وغیرہ کی نسبت ہے حالانکہ بجز شیعہ کے اور سب اہل اسلام کا عقیدہ اس کے خلاف ہے۔

پس بجائے اس کے کہ عقل اور نقل کے خلاف ایسے امور کو مان کر قرآن مجید جیسی قطعی اور یقینی اور محفوظ کتاب کو ظنّی اور مشتبہ اور غیر محفوظ قرار دیا جائے یہ بہتر بلکہ

---

[1] ۔ اس کا جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ (یہ قرآن ایسے) صحیفوں میں ہے، (جو) عزت والے، بلند شان اور پاک ہیں۔ وہ (صحیفے لکھنے والوں اور دور دور) سفر کرنے والوں کے ہاتھوں میں (ہیں)۔ (ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں) جو معزز ہیں اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہیں۔ (تفسیر صغیر)

ضروری اور از بس ضروری ہے کہ ان روایات کی تردید کی جائے جو کہ عقل اور نقل کے خلاف قرآن مجید کی ارفع ترین شان پر حرف لاتی ہیں کیا جبکہ یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ جو حدیث کتاب اللہ کی کسی آیت کے خلاف ہو تو وہ مردود ہے خواہ وہ کیسی ہی سند رکھتی ہو یا کسی کتاب میں مذکور ہو تو جو اقوال مرویہ قرآن مجید کے اعتبار اور ثبوت کی بیخ کنی کرتے ہوں وہ مردود نہیں کیا سب اہل اسلام شیعہ کے سوا اس امر کے قائل نہیں کہ قرآن مجید تواتر کے ساتھ ہمارے تک پہنچا ہے تو جب بعض آیات فقط ایک ہی شخص کی زبانی اور بعض دو اور بعض تین کی زبانی درج ہوں تو پھر ان کی نسبت تواتر کا دعویٰ ہو سکتا ہے؟

اصل بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ جب شیعہ نے دیکھا کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے ہمارے مباحثات کا ناطقہ بند ہے تو انہوں نے قرآن مجید کو نظر اعتبار سے گرا کر روایات پر اتر آنے کے لئے اہل اسلام میں ایسی روایات بنا کر پھیلا دیں کہ جن کی بنا پر قرآن مجید کو بیاض عثمانی کہہ سکیں یا اس کو محرف مبدّل اور ناقص قرار دے کر روایات پر ان کو لا سکیں۔ شیعہ لوگ اپنی کتابوں میں اس کی تصریح کرتے ہیں چنانچہ ان کی معتبر کتاب تفسیر صافی میں ایسا ہی لکھا ہے۔

اور پہلے زمانہ میں کسی روایت کو اعتبار دلانا کوئی مشکل امر نہ تھا۔ کسی ملک میں جا کر چند روز رہ کر اپنا اعتبار پیدا کر کے کسی مشہور معتبر سند کے ذریعہ سے کوئی بناوٹی بات سنا دی تو باقی سند تو عام طور پر مسلم ہی تھی رہا یہ سنانے والا تو یہ اپنا اعتبار ثابت کر ہی چکا تھا اب کون ہے کہ روایت کے لحاظ سے اس مصنوعی روایت کو رد کر سکے اور راوی کی نظر اصول روایت تک ہی محدود رہتی ہے۔ ہاں محدثین (شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہُمْ[1]) نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ سچی حدیثوں اور مصنوعی روایتوں کو مختلف طریق کے ساتھ علیحدہ کیا ہے اور ہزارہا ایسی مصنوعی روایتوں کا پتہ لگا کر ان کو رد کر دیا ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی بعض ابواب میں بعض مصنوعی روایات (جو کہ روایت کے لحاظ سے ردنہ ہو سکتی تھیں) باقی رہ گئی ہیں کہ جن کا پتہ انہی کے قائم کردہ اصول وروایت سے بعد میں لگتا رہا ہے اور اب بھی لگتا رہتا ہے غرض کہ قرآن مجید کو غیر معتبر قرار دینے سے ہزارہا درجہ یہ کہنا بہتر ہے کہ اس زمانہ کے کسی راوی نے

[1] ۔ اللہ ان کی کوشش کی جزا دے۔ (از مرتب)

جھوٹ بولا ہے کہ جس کی نسبت مخبر صادق (فِدَاہُ اَبِیْ وَاُمِّیْ[1]) نے خدا کی وحی سے فرمایا ہوا ہے کہ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ یفشی[2] الْکَذِبُ۔[3]

(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جزء اوّل مقدمۃ التحقیق صفحہ 21 دار الکتب العلمیۃ بیروت 2005ء)

اور جبکہ باوجود اس وعید شدید کے (کہ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہُ مِنَ النَّارِ۔)[4] (صحیح البخاری کتاب العلم باب اِثم من کذب علی النبیؐ حدیث نمبر 110)

پھر بھی یَفْشُو الْکَذِبُ کے زمانہ میں آنحضرتؐ کی طرف منسوب کر کے ہزارہا حدیثیں بنائی گئیں تو صحابہ کی نسبت روایات گھڑنے میں ان کے لئے کون سے مشکلات تھے اور جبکہ تقیہ کے ثابت کرنے کے لئے ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ جیسے صدیق نبی اور رسول کی نسبت روایت بنا دی کہ آپ نے تین جھوٹ بولے تھے تو قرآن مجید کے اعتبار کے مٹانے کے لیے چند صحابہ پر ان روایات کے تھوپ دینے میں ان کو کونسا امر مانع ہو سکتا تھا۔

سورۃ التوبۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ:

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سورۂ براءۃ کے پہلے اور سورتوں کے خلاف بِسْمِ اللّٰہِ کیوں نہیں لکھی گئی۔ یہ تو کہنا بالکل غلط ہے کہ کسی سورۃ کے اوّل میں کسی انسان نے بِسْمِ اللّٰہِ رکھ دی ہے یا کسی سورہ کے اوّل نہیں رکھی یا اٹھادی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جن کے اوّل میں ہے وہ بھی اس اللہ کریم حکیم نے خود رکھی ہے اور جس سورۃ کے اوّل نہیں وہاں پر بھی اسی حکیم مطلق نے نہیں رکھی ہاں اس کی وجہ کہ جہاں رکھی ہے تو کیوں رکھی ہے اور جہاں نہیں رکھی تو اس کی کیا وجہ ہے؟ رکھنے کی وجہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور جہاں نہیں رکھی وہ ایک سورۂ براءۃ ہی ہے اور اس کی وجہ صلح حدیبیہ کی اس حدیث سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے جو کہ بخاری کی کتاب الصلح[5] میں مذکور ہے جس میں لکھا ہے فَدَعَا النَّبِیُّ ﷺ

---

[1]۔ میرے ماں باپ اس پہ قربان ہوں۔ (از مرتب)

[2]۔ رسالہ تعلیم الاسلام میں یَفْشِی الْکَذِب ہے۔ لیکن حوالہ میں یَفْشُو الْکَذِب ہے۔ (از مرتب)

[3]۔ لوگوں میں سے بہترین میرے زمانہ کے لوگ ہیں۔ پھر جو ان کے قریب ہیں پھر جو ان کے قریب ہیں۔ پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔ (از مرتب)

[4]۔ جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے تو چاہیے کہ وہ آگ میں اپنا ٹھکانا بنالے۔ (از مرتب)

[5]۔ نوٹ: یہ حدیث کتاب الصلح کی بجائے الفاظ کے فرق کے ساتھ کتاب الشروط میں ہے۔ (از مرتب)

الْكَاتِبَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اُكْتُبْ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ اَمَّا الرَّحْمٰنُ فَوَاللهِ مَا اَدْرِيْ مَا هُوَ وَلٰكِنِ اُكْتُبْ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ كَمَا كُنْتَ تَكْتُبُ فَقَالَ الْمُسْلِمُوْنَ وَاللهِ لَا نَكْتُبُهَا اِلَّا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اُكْتُبْ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ۔
(صحیح البخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد حدیث نمبر 2731)

یعنی جب سہیل نے صلح نامہ لکھنے کے لئے آنحضرتؐ کو کہا تو آپ نے کاتب کو بلایا اور فرمایا لکھ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو سہیل نے کہا واللہ میں نہیں جانتا کہ الرَّحْمٰنُ کیا ہے لیکن لکھ بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ۔ جیسا کہ تو پہلے لکھا کرتا تھا تو مسلمانوں نے کہا واللہ ہم نہ لکھیں گے مگر بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو آپؐ نے فرمایا لکھ بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ۔ اور قرآن مجید میں بھی آیا ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا۔ (الفرقان:61) یعنی جب ان کو کہا جاتا ہے کہ رحمان کے لئے سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمان کون ہے کیا ہم اس کو سجدہ کریں کہ جس کے لئے تو ہمیں حکم کرتا ہے اور اس سے ان کی نفرت زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے اس قدر ثابت ہے کہ مشرکین مکہ کو رحمان کے نام سے نفرت اور انکار تھا۔ لہٰذا سورۃ براءۃ میں اس نام کے ساتھ مسنون افتتاح کو ترک کر کے ان کو یہ بتایا کہ اسی نام کے فیض سے تم اب تک بچے ہوئے تھے لیکن اب چونکہ تمہاری ناشکری اور نفرت حد سے بڑھ گئی ہے لہٰذا اب تم اس نام کے فیض سے محروم کئے جاتے ہو۔

لو اب ہم حکم دیتے ہیں فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔[1] (التوبۃ:5) اور کہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔[2] (التوبۃ:28) اور کہ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ۔[3] (التوبۃ:7) یعنی عزت والے چارہ ماہ کے بعد ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور مسجد حرام کے قریب بھی نہ ہونے پائیں اور نہ ان کے عہد کا کچھ اعتبار کرو۔

---

[1]۔ پس جب وہ چار مہینے گزر جائیں جن میں (عرب کے کافروں سے اوپر کی آیات میں) لڑائی سے منع کیا گیا تھا (مگر پھر بھی وہ معاہدہ کی طرف راغب نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس سے پہلے مسلمانوں سے لڑ رہے تھے) تو مشرکوں کے اس خاص گروہ کو جہاں بھی پاؤ قتل کرو۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ مشرک لوگ حقیقتاً گندے (اور ناپاک) ہیں پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب مت آئیں۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اللہ اور اس کے رسول مشرکوں سے کس طرح عہد و پیمان کر سکتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ تو استمداد واستعانت کے لئے ابتدا میں لائی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ استمداد واستعانت تو اللہ کریم سے ہوتی ہے نہ اس کے نام سے پس کیا وجہ ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ میں اسم کا لفظ ایزاد کیا ہے۔

پس واضح ہو کہ اسم کا ایزاد ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے قابل قدر نکتہ پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی سکھاتی ہے اور وہ ایسی ترقی ہے کہ قیامت تک اس کا سلسلہ ممتد ہے مثلاً ایمان میں اس نے پہلا مرتبہ ایمان بالغیب کا رکھا جیسا کہ فرمایا ہے یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ[1]۔ (البقرۃ:4) پھر اس کے بعد دلائل اور نشانات سے اس کو قوی کرنے کا طریق بتایا اور اس میں بھی بہت سے مراتب قائم کئے ہیں۔

پھر اس سے ترقی کی راہ بتا کر تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ۔[2] (حٰمٓ السجدۃ:31) اور یُوۡحِیۡ اِلَیۡہِمۡ اور کَلَّمَ اللّٰہُ کے مرتبہ تک پہنچایا ہے۔ پھر وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔[3] (الانفال:18) اور اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ۔[4] (الفتح:11) اور قُلۡ یٰعِبَادِیۡ۔[5] (الزمر:54) کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا ہے غرض کہ ایمان بالغیب سے چل کر اکمل ترین مشاہدات اور اتم انعامات وافضال اور اعظم ترین اکرام واجلال تک کی راہ بتائی اور وہ لوگ بتائے جو اس راہ پر چلے اور واقعات نے شہادت دی اور دے رہے ہیں کہ وہ ان مراتب تک پہنچے۔

سورۃ الفاتحہ میں ترقی کی راہ کا بیان:

فاتحہ شریف جو اُمّ الکتاب اور قرآن عظیم کا سالم متن ہے اس میں بھی خداوند کریم نے ترقی کی راہ بتائی ہے اس کو مفصل طور پر تو انشاء اللہ فاتحہ کی تفسیر کے خاتمہ پر بتاؤں گا یہاں پر اسم کے ایزاد کے واسطے اس قدر بتا دیتا ہوں کہ خداوند کریم نے فاتحہ شریف میں پہلے اپنا نام بیان فرمایا پھر حمد کا ذکر کیا ہے پھر رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مٰلِکِ یَوۡمِ

---

[1]۔ غیب پر ایمان لاتے...ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ ان پر فرشتے اتریں گے۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور جب تو نے پتھر پھینکے تھے تو تو نے نہیں پھینکے تھے بلکہ اللہ نے پھینکے تھے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ صرف اللہ کی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ تو (ان کو ہماری طرف سے) کہدے اے میرے بندو!۔ (تفسیر صغیر)

الدِّیْنِ کے ساتھ اپنے کچھ صفات کا ذکر کیا پھر اِیَّاکَ نَعْبُدُ اور وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا پھر ہدایت کا پھر منعم علیہم کا پھر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کا تو علاوہ اور معارف کے اس ترتیب میں یہ بتایا ہے کہ پہلی آشنائی اور واقفیت نام تک ہوتی ہے مثلاً کہا کرتے ہیں کہ مجھے اور واقفیت نہیں البتہ نام سنا ہوا ہے۔

پس اگر کوئی اللہ کے نام ہی کی واقفی پیدا کر کے اس کے نام ہی سے استمداد اور استعانت لیتا ہے جیسا کہ مثلاً سائل لوگ اپنے سوالوں میں ایسا کرتے ہیں تو ضرور اس پر ثابت ہو جائے گا کہ فی الحقیقت اللہ ہی سب حمد اور تعریفوں کا حقدار ہے یہاں تک کہ وہ پکار اٹھے گا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ اور جب وہ اس معرفت اور شکر گذاری تک پہنچ جائے گا تو اس سے اس کو بہت سی امہات صفات کا یقین پیدا ہو کر معرفت اسمی سے معرفت صفتی تک ترقی حاصل ہو گی پھر جب ان جمالی اور جلالی صفات کی معرفت سے اس کا سینہ کھل جائے گا تو اس سے بقدر امکان معرفت ذاتی حاصل ہو کر اس قدر اس کی روح جذب ہو گی کہ یہ بجائے یا اللہ یا رحمان کے اِیَّاکَ سے اس کو مخاطب کر کے اس کی توحید اور اپنی عبودیت کا اقرار کر اٹھے گی پھر جس قدر اس مقام پر ثابت قدمی سے عبادت بجالائے گا اسی قدر اس پر اپنے عجز اور اس کے علو و رفعت کی معرفت بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ اس کی روح اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور اِہْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الخ پکارنے لگے گی۔

یہاں تک کہ وہ منعم حقیقی اس کو اپنے منعم علیہم بندوں میں داخل کر دے گا تب یہ پہلے انعام کے قیام و دوام کے لئے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ اور آئندہ کی ترقی کے لئے وَلَا الضَّآلِّیْنَ کی دعا مانگتا رہے گا۔ پس اس ترقی کے ابتداء کے لئے خداوند کریم نے اس لفظ کو ایزاد فرمایا۔

ح۔ ال کے معنے جنس، کل، وہ، کامل کے عموماً ہوا کرتے ہیں اور یہاں پر یہ سب ہی معنے ہو سکتے ہیں حمد کہتے ہیں کسی کی تعریف توصیف کرنے کو۔

لِ کے بہت سے معنے ہیں۔ اور یہاں پر اس کے معنے ہیں اختصاص اور استحقاق کے یعنی اس کا ماقبل مابعد کے ساتھ مختص ہے اور مابعد ماقبل کا مستحق ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ، الرَّحِیْمُ کے معنے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

رَبٌّ کہتے ہیں پیدا کر کے کمال مطلوب تک پہنچانے والے کو۔

عَالَمٌ۔ اسم آلہ ہے یعنی جس کے ساتھ معلوم کیا جاتا ہے اور یہ جہان کا نام ہے کیونکہ خدا کی شناخت کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ اور عَالَمِیْنَ اس کی جمع ہے۔

مَالِكٌ۔ مالکانہ تصرف رکھنے والا۔ یَوْمٌ۔ دن اور مطلق وقت۔ دِیْنٌ۔ جزاء وسزاء۔

(محمد سرور) اور مذہب وشریعت اوّل كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ۔[1] اور دوم جیسا اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔[2] (آل عمران:20)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر:

پس اس کے معنے ہوئے سب تعریفیں یا کامل تعریف اللہ ہی کے لئے ہیں (یا ہے) جو سب جہانوں کو پیدا کر کے کمال مطلوب تک پہنچانے والا، بن مانگے اور بے عوض دینے والا، دعاؤں اور محنتوں پر عمدہ مطالب دینے والا، جزاء وسزاء کے دن (یا وقت) کا مالک (یا) مذہب کے دن کا مالک ہے۔ اگرچہ مفسروں نے پہلے معنے لکھے ہیں اور قرآن مجید میں آیا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔[3] (الانفطار:18) يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا۔[4] (الانفطار:20) یعنی يَوْمُ الدِّيْنِ وہ دن ہے کہ کوئی جی کسی جی کے لئے کسی چیز کا مالک نہ ہو گا۔ لیکن دوسرے معنے بھی عمدہ ہیں اور آیت مذکورہ کے بھی مطابق ہیں کیونکہ مذہب کو ظاہر کرنے کے لئے خداوند کریم نے دو دن مقرر کئے ہوئے ہیں ایک دنیا میں جس کا نام قرآن مجید نے یوم الفرقان رکھا ہے جیسا بدر کے دن کی نسبت فرمایا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ۔[5] (الانفال:42)

پس اس دن میں خدائے قدیر سچے اور جھوٹے مذہب میں فرق کر دیتا ہے پر ظالموں

---

[1]۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ (از مرتب)

[2]۔ اللہ کے نزدیک اصل دین یقیناً کامل فرمانبرداری ہے۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور (اے مخاطب!) تجھے کس نے اس بات کا علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ (یہ وقت) اس دن (ہو گا) جس میں کوئی جان کسی جان کو فائدہ پہنچانے کے لئے کوئی اختیار نہ رکھے گی۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ حق و باطل میں فیصلہ کرنے والے دن... جس دن کہ دونوں لشکر جمع ہوئے تھے۔ (تفسیر صغیر)

کے لئے پھر بھی فیصلہ نہیں ہوتا اور دوسرا آخرت میں جس کا نام قرآن مجید نے یوم الفصل رکھا ہے جیسا فرمایا لِيَوْمِ الْفَصْلِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔[1] (المرسلٰت:14 تا16) اور ظالم نے اگرچہ یوم الفرقان کی تفریق بیّن کے بعد بھی تکذیب کی تھی لیکن یوم الفصل کے بعد بجز تسلیم کے کچھ چارہ نہ ہوگا اور اسی يَوْمُ الْفَصْلِ کو ایک لحاظ سے يَوْمُ الْجَزَاءِ کہتے ہیں۔

پس یہ معنے پہلے معنوں سے عام اور شامل تر ہیں اور علاوہ بریں مذہب کی شناخت کے اصل اصول ہیں۔ یہاں پر چند باتوں کا ذکر ضروری ہے سب تعریفیں اللہ کریم سے کیوں مخصوص ہیں۔ صفات الٰہیہ سے چار صفات کو کیوں مخصوص کیا۔ ان میں یہ ترتیب کیوں رکھی۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو مکرر کیوں بیان کیا۔ کتب منطق میں ایک قسم کے دعاوی بیان کئے ہیں جن کا نام قَضَايَا قِيَاسَاتُهَا مَعَهَا رکھا ہے یعنی ایسے دعاوی کہ جن کے دلائل ان کے ساتھ ہی ہیں۔ جس طرح قرآن مجید کو سب الہامی کتابوں کی نسبت یہ ضربت حاصل ہے کہ وہ اپنے دعاوی کے اثبات میں اپنے ماننے والوں کا ہرگز محتاج نہیں بلکہ سب دعاوی کے متعلق اس نے کثرت کے ساتھ دلائل بیان کر دیئے ہیں اور قیامت تک ہر ایک قسم کے اعتراضوں کے لئے جوابوں کا کافی ذخیرہ اپنے اندر رکھا ہے اسی طرح یہ بھی اس کے خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں قَضَايَا قِيَاسَاتُهَا مَعَهَا نہایت کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں چنانچہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بھی اسی قسم سے ہیں۔ بِسْمِ اللّٰه میں تو میں بیان کر چکا ہوں کہ استعانت کی دلیل کس طرح اس میں موجود ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں اب بیان کرتا ہوں۔

اصل میں یہاں پر دو دعوے ہیں اوّل یہ کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں دوم یہ کہ سب اسی سے مخصوص ہیں پہلے دعوے کی دلیل اللہ ہے جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں اللہ کے معنے ہیں وہ ذات جو کہ جامع صفات کاملہ ہے۔

[1]۔ (ایک) فیصلہ کرنے والے دن کے لئے۔ اور تجھے کیا معلوم ہے کہ فیصلہ کرنے والا دن کیا ہے؟ اس دن جھٹلانے والوں پر تباہی آئے گی۔ (تفسیر صغیر)

پس چونکہ اللہ جامع صفات کاملہ ہے اور ہر ایک تعریف کسی صفت کمال پر ہوا کرتی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر ایک قسم کی تعریف اللہ کے لئے ہے اور دوسرے دعوے کی دلیل رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے کیونکہ میں بیان کر آیا ہوں کہ رَبٌّ کے معنے یہ ہیں کہ پیدا کر کے کمال مطلوب تک پہنچائے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے سوائے اگر کسی کی تعریف ہو گی تو وہ اس کی کسی صفت کمال پر ہو گی اور چونکہ اللہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے اس لئے ہر ایک شے کی ہر ایک صفت کمال اسی کی طرف سے ہے لہٰذا اس کی تعریف حقیقت میں رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی ہے بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ جس کی تعریف بنظر ظاہر کوئی کرتا ہے فی الحقیقت وہ شے قابل تعریف نہیں بلکہ حقیقت میں رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہی استحقاق حمد رکھتا ہے۔ لہٰذا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سے ثابت ہوا کہ سب تعریفوں کا مستحق وہی اللہ ہے جو کہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ آیا ہے وہاں ساتھ ہی رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ بھی آیا ہے۔

پھر اس کے بعد کسی قدر اور بھی تفصیل سے بتایا گیا کہ اللہ کے سوا کوئی فی الحقیقت استحقاق حمد نہیں رکھتا چنانچہ فرمایا الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی اللہ کے سوا اور ان کی جس قدر صفات کمال ہیں یا تو وہ سواء استدعاء اور بے مبادلہ رحمان نے ان کو وہ کمال عطا فرمایا ہوا ہے اور یا کسی دعا یا محنت پر رحیم نے وہ صفت کمال عنایت فرمائی ہوئی ہے۔ پس ان کی کسی صفت کمال کی وجہ سے اگر حمد ہے تو رحمان رحیم کے لئے ہے نہ ان کے لئے۔ پھر اس سے بھی زیادہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں ثبوت دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ سے دو قسم کے دین رہے ہیں ایک وہ جو کہ اس امر کا مدعی رہا ہے کہ سب محامد کا حقیقی مستحق بجز رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے اور کوئی نہیں ہے۔

اور دوم وہ جو کہ اللہ کے سواء اور بھی کسی کو مستحق حمد یقین کرتا رہا ہے پہلے دین کے داعی اور ہادی نبی اور رسول کے نام سے مشہور ہیں اور دنیا پر روشن ہے کہ جب کوئی برگزیدہ رسول آیا ہے تو اس نے اپنی بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں بآواز بلند یہ منادی کر دی ہے کہ دنیا میری مخالفت کرے گی اور بڑے زور سے کرے گی۔ پر میرا خدا (کہ جس کے سوا دوسرا کوئی کسی حمد کا استحقاق حقیقی طور پر نہیں رکھتا ہے) مجھے یہ فرماتا ہے کہ آخر مَیں اور

میری جماعت مظفر و منصور ہو گی اور میرے دشمن ہلاک اور ناکام ہوں گے چنانچہ یہ مقابلہ شروع ہوتا ہے اور دشمن پکار پکار کر کہتا ہے کہ اب وہ عذاب لاؤ پر وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ اس کے لئے میرے ربّ کے نزدیک ایک دن مقرر ہے جو کہ یوم الفرقان ہو گا یعنی صادق اور کاذب یا یوں کہو کہ دین الٰہی اور غیر الٰہی دین میں فرق کر دے گا چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق وہ دن آیا اور وہ ٹھیک ٹھیک یوم الفرقان ہوا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے لئے یوم الفرقان وہ تھا کہ جس میں بنی اسرائیل کے سامنے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ہلاک ہوا اور موسیٰؑ اپنی جماعت کے ساتھ کامیاب ہوا اور سید الرسلؐ کے لئے وہ بدر کا دن تھا کہ جس کی نسبت قرآن مجید فرماتا ہے یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ۔[1] (الانفال:42)

پس یہ دن بیشک یَوۡمُ الۡفُرۡقَانِ اور یَوۡمُ الدِّیۡنِ ہوتا ہے اس دن جیسا کہ یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ فلاں صادق اور فلاں کاذب ہے اور فلاں دین منجانب اللہ ہے اور فلاں نہیں ایسا ہی یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ ہی اپنے دین کے پیروؤں کی مدد کر کے ان کو مظفر و منصور فرماتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ناکام ہلاک کرتا ہے اور جن کو کہ اللہ کے سوا اپنا مددگار اور مُعین یقین کرتے تھے وہ ہرگز مدد کرنے کے قابل نہیں چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جب فتح مکہ ہو گئی تو اس وقت آنحضرتؐ نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ اب بھی تم پر ثابت نہیں ہوا ہے کہ یہ بت اپنے پرستاروں کی ہرگز مدد نہیں کر سکتے تو اس نے کہا بیشک اگر وہ کچھ بھی کر سکتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

(المعجم الکبیر جلد 8 صفحہ 11 حدیث نمبر 7264 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت 2002ء)

اور جبکہ یَوۡمُ الۡفُرۡقَانِ سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہی مذہب اور دین سچا ہے جو کہ سوا مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کے اور کسی کو مستحق حمد نہیں قرار دیتا اور وہ مذہب جھوٹا ہے جو کہ مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کے سوا اوروں کو بھی حمد کے قابل بیان کرتا ہے تو ان واقعات کی شہادت سے کہ جن کی طرف مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ اشارہ کرتا ہے ثابت ہو گیا کہ مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کے سوا کوئی حمد کے قابل نہیں۔ اب رہی یہ وجہ کہ یہاں پر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الخ کو کیوں ذکر کیا ہے تو اس کا مفصل بیان فاتحہ کی تفسیر کے اخیر میں انشاء اللہ آئے گا۔

[1]۔ حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے دن... جس دن کہ دونوں لشکر جمع ہوئے تھے۔ (تفسیر صغیر)

سورۃ الفاتحہ میں مذکور چار صفات کے انتخاب کی وجہ:

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سب صفات میں سے ان چار صفات کو کیوں مخصوص فرمایا ہے۔ اس کی پوری تفصیل تو وہاں پر ہو گی کہ جہاں پر ہم فاتحہ کے مطالب پر بحث کریں گے کیونکہ جب تک کسی کو فاتحہ کے مطالب کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ اس بات کو ہر گز نہیں سمجھ سکتا کہ ان چار صفات کو اصل مطالب میں دخل تھا۔ لہٰذا ان کا بالخصوص ذکر کیا ہاں یہاں پر ہم ایک اور مختصر طریق سے ان کے بالخصوص ذکر کرنے کی وجہ بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب خدا کے لئے اس واسطے سب محامد ہیں کہ وہ اللہ ہے یعنی جامع صفات کمال ہے تو ضروری ہوا کہ ان صفات کمال کی تفصیل کی جائے اور چونکہ فاتحہ شریف سارے قرآن مجید کا متن ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک امر کو یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو پھر یہ متن کے انداز اور سبع مثانی ہونے کی حیثیت سے نکل کر قرآن عظیم بن جائے لہٰذا خداوند کریم نے تفصیل صفات کے مقام پر ان چار صفات کو ذکر فرمادیا جو کہ اسم ذات کی طرح اللہ کریم کی سب صفات جلالی اور جمالی کے لئے جامع ہیں کیونکہ جن صفات کو اس میں دخل ہے کہ سب مخلوقات کو پیدا کر کے اس کو کمال مطلوب تک پہنچائے وہ سب رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں آ گئیں اور جن صفات کو بالخصوص حیوانات سے تعلق ہے وہ الرَّحْمٰن میں آ گئیں اور جن کو بالخصوص انسان سے اور ان کے منعم علیہم وغیرہ بننے کے ساتھ تعلق ہے وہ الرَّحِیْم میں درج ہو گئیں اور جزا و سزا دینے میں جن کو دخل ہے وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں مندرج ہیں۔

غرض کہ انسان اور اس کی ضروریات کے متعلق خلق سے لے کر جنت اور دوزخ میں داخل کرنے اور رکھنے تک جس قدر صفات کمال ہیں وہ سب ان چار صفات میں درج ہیں۔ ہمارے اس بیان سے ان چاروں میں جو ترتیب ہے وہ بھی بخوبی خیال میں آسکتی ہے۔ کیونکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ تو وہ وصف ہے جو کہ حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہا سب کو شامل ہے پھر الرَّحْمٰنِ اگرچہ اس سے خاص ہے پر سب حیوانوں میں عام ہے اور الرَّحِیْم دعا اور نیک اعمال کرنے والوں سے مختص ہے۔ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اگرچہ اپنے مفہوم کی وجہ سے الرَّحْمٰنِ سے خاص ہے مگر الرَّحِیْم سے عام ہے کیونکہ وہ سب نیک و بد انسانوں میں پائی جاتی

ہے اور الرَّحْمٰنِ انسان کے علاوہ سب حیوانوں میں اور الرَّحِیْم انسانوں میں سے بھی خاص دعائیں مانگنے اور نیک اعمال بجالانے والے انسانوں سے مخصوص ہے۔

پس عموم و خصوص کے لحاظ سے تو الرَّحْمٰنِ کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور اس کے بعد الرَّحِیْم لانا چاہئے تھا لیکن چونکہ الرَّحِیْم سے نیکوں میں استحقاق انعام حاصل ہوتا ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے اس انعام کا ترتب اور حصول ہوتا ہے لہٰذا الرَّحِیْم کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر مقدم کیا گیا ہے ایک اور طور پر اگر دیکھا جاوے تو بھی ترتیب طبعی یہی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ربوبیت کے ساتھ عدم سے معرض وجود میں لانا ہے اور رحمانیت سے وہ ضروریات ملتی ہیں کہ جن کی ضرورت بعد الوجود ہوتی ہے جیسے آنکھ، کان، ناک وغیرہ۔ اور ان ضروریات وجود کے ملنے کے بعد پھر انسان دعا اور نیک اعمال کرتا ہے یا یوں کہو کہ ان سے مکلف ہوتا ہے اور جب دعاؤں اور نیک اعمال سے بمقتضائے رحیمیت استحقاق انعام حاصل کرلیتا ہے یا اس کی خلاف ورزی سے مستحق سزا ہو جاتا ہے تو پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جزا وسزا مرتب کرتا ہے اور یہی آخری فیصلہ ہے۔

پس اس لحاظ سے بھی ربوبیت جو کہ عدم سے وجود میں لاتی ہے سب سے مقدم ہونی چاہئے اور اس کے بعد وہ رحمانیت ہونی چاہئے جو کہ ضروریات وجود بے دعا اور بے مبادلہ دیتی ہے پھر اس کے بعد وہ رحیمیت ہونی چاہئے جو کہ دعاؤں کو ضائع ہونے اور نیک اعمال کو حبط سے محفوظ رکھ کر انسان کو مستحق انعام بناتی ہے پھر اس کے بعد وہ مالکیت ہونی چاہئے جو کہ اس استحقاق کے مطابق انعام کرتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک اور طریق سے بھی یہ ترتیب ضروری ہے جو کہ مطالب فاتحہ کے بیان میں مذکور ہوگا۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کے تکرار کی وجہ:

اب مَیں آپ کو الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کے تکرار کی وجہ بتاتا ہوں۔ چونکہ نادان دشمنوں نے قرآن مجید پر جا بجا یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں بہت تکرار ہے جو کہ علاوہ مخل فصاحت وبلاغت ہونے کے خدا تو خدا ہے ایک عقلمند انسان کی شان کے بھی شایاں نہیں ہے۔ لہٰذا مَیں اس کا جواب کُلّی رنگ میں بیان کر دیتا ہوں تا کہ ہر ایک مقام پر ناظرین اس

سے مدد لے سکیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام کا مقصد زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ سامع کو جو ایک امر سے بے خبر ہے اس کلام کے ذریعہ سے اس امر کی خبر دی جائے۔

پس جب کسی سامع کو اس کلام کے ذریعہ سے ایک امر کی خبر دے دی ہے تو پھر اگر وہ متکلم اسی سامع کو یہی کلام دوبارہ یا سہ (3) بارہ اخبار کے طور پر سنائے گا تو اس کا یہ فعل لغو ہو گا لیکن باوجود اس کے پھر اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ہم دنیا کے ہر ایک طبقہ کے لوگوں کی بول چال میں مفردات و مرکبات اور جملوں میں کثرت کے ساتھ تکرار دیکھتے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ اس تکرار پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا۔ مثلاً وہی الفاظ مفردہ ہوتے ہیں کہ جن کو مختلف مطالب کے ادا کرنے کے لئے مختلف تراکیب کے ساتھ ایک ہی متکلم ایک ہی سامع کے آگے ہزاروں دفعہ مکرر کرتا ہے اسی طرح مرکب ناقص کو (مثل زید کے نوکر اور مولوی عبدالرحمان وغیرہ کے) طریق مذکور کے ساتھ بار بار تکرار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کہاوتیں اور ضرب المثلیں جو کہ جملہ ہوتی ہیں مختلف مطالب کے اثبات و توضیح کے لئے ایک متکلم ایک ہی سامع کے آگے بار بار تکرار کرتا ہے۔

ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ بہت بہت لمبی عرضیئیں اور اپیلیں حکام کے سامنے پیش کی جاتی تھیں لیکن اب اس قدر اختصار پسند حکام ہیں کہ چند سطور سے زیادہ کی عرضی ہرگز پسند نہیں کرتے پر باوجود اس کے ایک ہی عرائض نویس ایک دفعہ کو مختلف عرائض میں بار بار تکرار کرتا ہے اور ایک ہی جج کے سامنے ہزاروں تک اس ایک دفعہ کے تکرار کی نوبت پہنچتی ہے پر کوئی اختصار پسند جج بھی نہ اس تکرار کو ناپسند کرتا ہے اور نہ اس کو لغو خیال کرتا ہے بلکہ اگر غلطی سے وہ اس دفعہ کا حوالہ دینے سے چوک جائے تو عرضی واپس کی جاتی ہے پھر حساب کے قواعد اور اقلیدس کی شکلوں کے دعاویں جو کہ یقیناً جملہ اور کلام ہیں ایک ہی استاد یا ایک ہی طالب العلم ایک شخص کے آگے مختلف امور کے اثبات میں بار بار مکرر بیان کرتا ہے اور اس کو ہرگز ہرگز لغو خیال نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ہر ایک قوم کی عبادت کے لئے خاص اوراد ہوتے ہیں کہ جن کو وہ اپنے معبود کے آگے ہزاروں دفعہ تکرار کرتے ہیں اور لغو کیا بلکہ اس کو ضروری اور مفید یقین کرتے ہیں۔

پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک جملہ اور کلام کے بولنے سے یہی مقصود نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے سامع کو اس کے مضمون پر مطلع کیا جائے کہ جس پر اس کو اس سے پہلے اطلاع نہیں ہے۔ بلکہ علاوہ اس کے اور مقاصد بھی ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے باوجودیکہ متکلم کو یقین ہوتا ہے کہ سامع کو اس کے مضمون کی پہلے سے خبر ہے پھر بھی اس کے آگے اس کا تکرار لغو نہیں بلکہ ضروری ہوتا ہے چنانچہ دلائل میں سہل ترین راہ سب کے نزدیک یہی قرار دی گئی ہے کہ دلیل ان مقدمات سے مرکب کی جائے جو کہ فریق ثانی کے مسلمات میں سے ہوں پس جبکہ وہ اس کے مسلمات میں سے ہیں تو یقیناً اس کو اس کا علم ضرور ہے پر باوجود اس کے پھر بھی ان مقدمات سے دلیل مرکب کر کے اس کے آگے ان مسلم مقدمات کا تکرار کیا جاتا ہے اور لغو نہیں بلکہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس کو کسی قدر اور واضح کرنے کے لئے یوں خیال کرنا چاہئے کہ اقلیدس میں اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ پہلے لکھے ہیں اور استاد بھی پہلے وہ سکھاتا ہے پھر جب کسی شکل کے اثبات میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بار بار پڑتی ہے تو مصنف اور استاد کو پھر ان کو حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے اسی طرح مقدمات مسلمہ فریق مقابل کو معلوم بلکہ مسلم ہوتے ہیں فقط اسی قدر ہوتا ہے کہ ان مقدمات مسلمہ سے مرتب کرنے کے بعد جو نتیجہ لازم آتا ہے اس کی طرف اس کے ذہن کا انتقال نہیں ہوا ہوتا تو اس وجہ سے مستدل ان کو مرتب کر کے اس کے سامنے تکرار کرتا ہے تاکہ لازم نتیجہ کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو اسی طرح جبکہ ایک قاعدہ یا دلیل سے بہت سے امور ثابت ہوتے ہیں تو مصنف اور استاد اور مستدل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جب وہ ان امور کثیرہ کا اثبات کرتا ہے تو اس قاعدہ یا دلیل کو ان سب کے اثبات کے وقت تکرار کرتا ہے اور یہ معیوب یا لغو کیا بلکہ ضروری ہوتا ہے۔

پس قرآن مجید کے اکثر مکررات کی بڑی بھاری یہی وجہ ہے اگرچہ اس کے سوا اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جو کہ انشاء اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً ہم بیان کرتے رہیں گے۔ یہ وجہ تو ایسی کھلی اور واضح ہے کہ جس کے بیان کی بھی ضرورت نہیں لیکن معترض بھی معذور ہیں کیونکہ سوائے قرآن مجید کے دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں کہ جس کو الہامی کتاب تسلیم کیا جاتا ہو

اور وہ اپنے ہر ایک دعویٰ کا اثبات خود ہی کرتی ہو بلکہ یہ بات صرف قرآن مجید ہی میں پائی جاتی ہے اور اس کے سوا اور جس قدر الہامی کتابیں تسلیم کی گئی ہیں وہ اپنے ہر ایک دعوے کے اثبات میں اپنے پیروکاروں کی محتاج ہیں۔

پس ان کے متبع اگر سمجھیں گے تو یہی کہ الہامی کتاب میں جو عبارت مذکور ہوتی ہے وہ اسی لئے مذکور ہوتی ہے کہ وہ اپنے مضمون کی دنیا کو خبر دے کہ جس کی خبر پہلے نہ تھی۔ اور یہ بات ان کے خیال میں آئے تو کس طرح سے کہ خدا کی کتاب میں بہت سی عبارتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن سے اخبار ہی مد نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ اثبات دعاوی کے لئے ہوتی ہیں۔ پس باوجود ایسی واضح اور کافی وجہ کے پھر بھی ان کا ایسی فاش غلطی میں پڑنا اسی وجہ سے ہے کہ جن کتابوں کو وہ الہامی مانتے ہیں وہ اپنے دعاوی کے اثبات سے خالی ہیں بلکہ اس بھاری بوجھ کو اپنے پیروکاروں کے سر پر ناحق ڈالتی ہیں تو انہوں نے اس سے یہ قیاس کیا کہ قرآن مجید بھی چونکہ الہامی کتاب تسلیم کیا جاتا ہے تو یہ بھی ہماری الہامی کتابوں کی طرح اثبات مطالب اور دعاوی کے دلائل سے خالی ہو گا۔

اب مَیں آپ کو خاص طور پر الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں بتاتا ہوں۔ بسم اللہ کی تفسیر میں مَیں نے بتایا ہے کہ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں استعانت اور استمداد کی وجہ بتائی گئی اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کی تفسیر میں بھی بتایا ہے کہ ان چار صفتوں کی یہاں پر بیان کرنے کی اشد ضرورت تھی تا کہ اللہ کا مستجمع صفات کمال ہونا ثابت ہو کر اثبات محامد اس کے لئے ہو جائے۔ پس بسم اللہ میں تو استمداد و استعانت کی دلیل بیان کرنے کے لئے ان کو ذکر کیا ہے اور اَلۡحَمۡدُ میں اثبات محامد یا تخصیص محامد کی دلیل بتانے کے لئے ان دونوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ نیز ان دونوں کے اعادہ میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے نکتۂ معرفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ بہت ہی قابل قدر نکتہ ہے جو کہ محض اس کے فضل سے مجھ پر کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ مَیں نے بِسۡمِ اللّٰہ میں لفظ اسم ایزاد کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ بسم اللہ میں معرفت کا پہلا درجہ بیان کیا گیا ہے جو کہ معرفت اسمی ہوتی ہے اور پھر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سے مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ تک معرفت صفتی بتائی اور پھر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ الخ سے معرفت ذاتی بتائی ہے الخ اور

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو معرفت اسمی اور معرفت صفتی دونوں میں ذکر کیا ہے بلکہ اسم ذات کو بھی دونوں میں مکرر ذکر کیا ہے۔

پس اسم ذات کے تکرار میں یہ بتایا ہے کہ ان دونوں معرفتوں میں جدا جدا خدا ہوتا ہے جو معرفت اسمی کے وقت میں تھا وہ معرفت صفتی کے وقت میں ہر گز نہیں رہا بلکہ اب اور ہی خدا ہے اور پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے تکرار سے اس کی تشریح کر دی کہ یہ مغائرت اور مباینت یوں نہیں کہ ذاتیں دو(2) ہیں یا مسمّٰی دو(2) ہیں۔ نہیں۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ جو تجلی کہ رحمانیت اور رحیمیت کے ذریعہ سے معرفت اسمی کے وقت میں تھی اور وہ جو کہ ان دو کے ذریعہ سے معرفت صفتی کے وقت ہوتی ہے یہ دونوں بالکل مغائر اور مبائن ہیں۔

پس جس طرح کہ معرفت صفتی کے وقت یہ بندہ وہ بندہ نہیں رہتا جو کہ معرفت اسمی کے وقت تھا بلکہ پہلے اگر نطفہ تھا تو اب انسان ہے اور اگر پہلے جنین تھا تو اب جوان ہے اسی طرح اب وہ اللہ نہیں جو پہلے تھا پہلے اگر یہ اس کو برائے نام رحمان رحیم مانتا تھا تو اب وہ حقیقۃً اور یقیناً الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے۔ پس تکرار میں اس عظیم الشان مغائرت کی طرف اشارہ ہے اور یہ مغائرت مَیں نے اپنے خیال سے قائم نہیں کی بلکہ یہ خدا کے اس برگزیدہ اور فرستادہ کی بتائی ہوئی ہے جو کہ بجائے مردہ مذہب، مردہ کتاب، مردہ نبی اور مردہ خدا کے زندہ مذہب (جو کہ اسلام ہے) زندہ کتاب (جو کہ فرقان ہے) اور زندہ نبی (جو کہ خاتم الانبیاء محمد مصطفی احمد مجتبیٰ رُوْحِیْ فِدَاہُ[1] ہے) اور زندہ خدا (جو کہ مجیب الدعوات اور اپنے مخلص بندوں سے کلام کرنے والا اور اپنے دین کے لئے اپنے مرسلوں کو بھیجنے والا اور ان کی تصدیق کے لئے آیات بینات اور خارق عادت تائیدات دکھانے والا اور مفتریوں کو خائب اور خاسر کر کے ہلاک کرنے والا تھا اور ہے) دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے بلکہ اس زندہ خدا کا مشاہدہ کرا رہا ہے اور یہ نہیں کہ اس خدا کے فرستادہ نے یہ مغائرت اور مباینت زبانی بتا دی یا کتابوں میں لکھ دی ہے بلکہ جو لوگ آپ کی غلامی میں داخل ہو کر سچی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہیں ان کو صاحبِ تجربہ بنا دیا ہے۔ یہاں

[1] ۔ میری جان اس پر قربان ہو۔ (از مرتب)

تک کہ وہ روز مرہ اس کو مشاہدہ کر کے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ۔[1] (الرحمٰن:30) کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ[2]۔

اور یہی وجہ ہے کہ بسم اللہ میں استعانت مذکور ہے اور وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں پھر اس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ جس قدر دونوں معرفتوں میں فرق ہے اور دوسری معرفت کے وقت پہلی معرفت عدم معرفت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ان آثار عبودیت میں بھی فرق ہوتا ہے جن کا دار مدار معرفت پر ہے۔ پس دوسری معرفت کے مقام پر پہلے آثار عبودیت کالعدم معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس وقت سالک بول اٹھتا ہے کہ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ[3] اور یہی وجہ ہے کہ دونوں استعانتوں میں عظیم الشان فرق رکھا گیا ہے جیسا کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

ح۔ إِيَّا۔ ضمیر ہے واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث غائب مخاطب متکلم سب کے لئے آتی ہے۔ فرق کے لئے اس کے ساتھ هُ، هَا، هُمَا، هُمْ، هُنَّ، كَ، كِ، كُمَا، كُمْ، كُنَّ، يَ، نَا لگایا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ ضمیر خطاب ہے اور مخاطب اللہ ہے۔ عبادت کہتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تعظیم کے ساتھ لوازم عبودیت بجا لانے کو۔ عبادت کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے محبت، خضوع، کمال علم اور کمال تصرف کا یقین۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ امید و بیم کے یقین اور جوش محبت کے ساتھ خضوع کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔

م۔ یہی معنے ہیں ایماناً واحتساباً کے جو کہ احادیث صحیحہ میں عموماً عبادات کے ساتھ بطور شرط مذکور ہے۔ قرآن مجید میں جہاں عبادت کا حکم دیا جاتا ہے وہاں پر اکثر یہی حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت کرو جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کی علت نیز اس کا محرک اور باعث ربوبیت اور معرفت ربوبیت ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ عبادت اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہے اور تعظیم کی بنا حسن اور احسان پر ہے یعنی اس میں کوئی خوبی

---

[1]۔ وہ ہر وقت ایک نئی حالت میں ہوتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ ہم اس (بات) پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ (از مرتب)

[3]۔ ہم تیری معرفت اس طرح حاصل نہیں کر سکے جیسا کہ تیری معرفت حاصل کرنے کا حق تھا، ہم تیری عبادت اس طرح نہیں کر سکے جیسا کہ تیری عبادت کرنے کا حق تھا۔ (از مرتب)

اور کمال ہو خواہ اس سے تعظیم کرنے والے کو فائدہ پہنچے جس کو احسان کہتے ہیں یا نہ پہنچے جس کی حسن کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے اور ربّ کے معنے پہلے بیان ہو چکے ہیں جن سے ثابت ہے کہ ربّ وہ ہے کہ جس میں سب حسن اور سب احسان اتم اور اکمل طور پر موجود ہوں بلکہ اس کے سوا اور کسی میں کوئی حسن اور کوئی احسان حقیقی طور پر موجود نہیں جیسا کہ حمد کی تخصیص میں ہم نے بیان کیا ہے۔

لہٰذا ہر ایک اعلیٰ درجہ کی تعظیم اس کے لئے ہونی چاہئے اور اس کے سوا اور کسی میں چونکہ نہ کوئی حسن حقیقت میں ہے اور نہ احسان ہے لہٰذا کوئی اعلیٰ درجہ کی تعظیم اس کے سوا اور کسی کے لئے نہ ہونی چاہئے۔ یہ تو علت ہونے کی وجہ ہوئی۔ باعث اور محرک ہونے کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ یہ فطرتی مسئلہ ہے کہ جس قدر کسی کے حسن واحسان کی معرفت اعلیٰ درجہ کی ہو گی اسی قدر استحقاق تعظیم اس کے دل میں جاگزین ہو گا اور جوش تعظیم موجزن ہو گا۔ اسی طرح جس قدر اس پر اس کی اعلیٰ درجہ کی عظمت ظاہر ہو گی اور اعلیٰ اور اکمل تریں تعظیم کا استحقاق اور وجوب ولزوم اس پر کھلے گا اسی قدر اس کو اپنی عبودیت اور ناکسی اور عجز اور اس اعلیٰ درجہ کی واجب الادا تعظیم کے کماحقہ ادا کرنے سے عہدہ بر آنہ ہونے بلکہ نہ ہو سکنے کا اقرار کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے بعد اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فرمایا ہے یعنی جب معرفت صفتی کی انتہا تک پہنچتا ہے۔ (جو کہ ربوبیت سے شروع ہو کر مالکیت جزاء وسزا تک ختم ہوتی ہے) اور صفات کے آئینہ میں مشاہدہ ذاتی تک ترقی کر کے خطاب کے مقام پر پہنچتا ہے تو اپنی حقیقی عبودیت اور اللہ کریم کی حقیقی معبودیت کا مشاہدہ کر کے بلکہ اس بات کا یقین کامل حاصل کر کے کہ اللہ ہی معبود ہے اور اس کے سوا زمین وآسمان اور مَا فِيْهِمَا سب ہی اس کے بندے ہیں۔ سچی ارادت اور اخلاص کامل سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا اقرار کرتا ہے اور اپنے اور کل ماسوا اللہ کے عجز اور عبادت لازمہ کے حق ادا سے قاصر ہونے کے یقین سے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا اقرار کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اَعْبُدُ اور اَسْتَعِيْنُ نہیں فرمایا بلکہ نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ فرمایا ہے اور اس کی وجہ اور بھی ہے جو کہ مطالب فاتحہ کے بیان میں انشاء اللہ تعالیٰ مذکور ہو گی۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر ایک باطل مذہب کسی یا کئی امور میں افراط یا تفریط کرنے سے پیدا ہوا ہے عبادت اور استعانت دونوں دین اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ہیں اور بہت سے مذاہب باطلہ ان ہی دو مسائل میں افراط اور تفریط کرنے سے پیدا ہوئے ہیں بعضوں نے تو عبادت یعنی اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو اس قدر وسیع کیا کہ جو تعظیم رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے لئے کی جاتی ہے وہی پتھر اور انسان کی پیشاب گاہ تک کے لئے جائز بلکہ واجب قرار دے دی اور بعض نے اس کو دوسری طرف ایسا کھینچا کہ جو ادنیٰ تعظیم کہ خدا کے فرستادوں اور اُولِی الْاَمْر کے لئے خدا نے لازم قرار دی تھی اس کو بھی شرک میں شریک کر کے حرام قرار دے دی ہے اسی طرح بعض نے استعانت کو اس قدر وسیع کیا کہ اسباب ظاہری کیا بلکہ بعض موہوم اشیاء کو اس میں خدا کے ہمسر قرار دے دیا اور بعض نے دوسری طرف پر اس قدر زور دیا کہ ظاہری اسباب سے تمسک کرنا مطلقاً حرام اور خلاف توحید قرار دے دیا۔

اور اس سب کی جڑھ یہ ہے کہ برہموؤں کی طرح اپنی خانہ زاد اور خیالی شریعت پر قدم مارنا چاہا ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ انسان دنیوی بادشاہوں کے دربار کے آداب اور اپنے بنی نوع کی رضامندی کی راہیں بھی بجز بتانے کے خود تجویز نہیں کر سکتا تو اس اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْن اور وراء الوراء ہستی کی رضامندی کی راہ کو از خود کس طرح صحیح صحیح تجویز کر سکتا ہے۔

پس سچی راہ وہی ہے جو کہ خدا نے خود بتادی ہے کہ جو تعظیم خدا نے اپنے لئے مخصوص کی ہے وہ کسی دوسرے کے لئے ہر گز تجویز نہ کی جائے اور جو تعظیم اس نے رسولوں یا اولی الامروں وَغَیْرُھُمْ کے لئے قرار دی ہے اس کو اسی انداز تک بجالانا چاہئے۔ اسی طرح حقیقی موثر اور معین اور کارساز بجز اللہ کریم کے اور کسی چیز کو نہ سمجھا جائے پر اسباب کو بھی محض لغو قرار دے کر اس حکیم خدا کے فعل کو عبث نہ بنایا جائے یہی وہ سچی راہ ہے کہ جس پر خدا کی سب کتابوں اور سب راستبازوں کا اتفاق اور اجماع ہے۔

اس زمانہ میں جیسی غیر اللہ کی پرستش بہت کثرت کر گئی ہے اسی طرح اسباب پرستی کی وبا بھی عالمگیر ہو رہی ہے اور اس کی جڑھ معرفت الٰہی اور ایمان کی کمی ہے اور یہ بالکل سچی

بات ہے کہ خدا کی سچی معرفت سے انسان سچی توحید پر قائم ہو جاتا ہے اور شرک فی العبادت یا شرک فی الاستعانت اس کے دل و دماغ کے نزدیک ہر گز نہیں آسکتی ہے۔

اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یہ دونوں فقرے اپنی ترتیب طبعی کے مطابق مذکور ہوئے ہیں۔ کیونکہ جب تک استعانت کی سچی اور حقیقی ضرورت انسان کے دل پر مبرہن نہ ہو جائے تب تک انسان میں وہ جوش استعانت پیدا نہیں ہوتا ہے جو کہ خدائے معین کی کامل اعانت کے لئے مقناطیس کی مانند جاذب ہوتا ہے۔

اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ استعانت کی سچی ضرورت اس کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جبکہ معرفت صفتی کے آئینہ میں ذات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس وقت جیسا کہ اس پر یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ حقیقی معبود ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور سب اس کے بندے اور اس کے محتاج ہیں جیسا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مفہوم ہے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ باوجود انتہا درجہ کی کوشش کے اب تک اس کی شان کے مناسب مجھ سے عبادت نہیں ہوئی اور نہ میری طاقت میں ہے کہ ایسی عبادت کر سکوں۔

پس جب اس پر یہ یقین غالب آجاتا ہے کہ سب مطالب کے سب اسباب بجز مالک حقیقی کے حکم کے بیکار ہیں اور یہ بھی کہ بجز اس کی مدد کے اس کی شان ارفع کے مناسب حال عبادت ہر گز ہر گز کسی ذریعہ اور طاقت سے نہیں ہو سکتی تو اس وقت بے ساختہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پکارتا ہے۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ دونوں معرفتیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں بیان ہوئی ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ پہلے ہو اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ بعد میں بیان ہو ہاں عبادت سے پہلے بھی ایک استعانت ضروری ہے جو کہ بسم اللہ میں ادا ہو چکی ہے۔ اسلام نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے مضمون پر بہت بھاری تعہد کیا ہے چنانچہ مختصر سے مختصر وظائف میں رکھ کر اس کو بار بار پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ حقیقی معرفت کی طرف لوگوں کو توجہ ہو اور توجہ کے بعد یہ معرفت راسخ ہو اور رسوخ کے بعد قال سے حال کی طرف انتقال ہو۔ مثلاً اسلام کے مختصر وظائف میں ایک سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ[1] ہے اس میں پہلے تسبیح رکھی ہے جس کے معنے ہیں کہ اللہ سب نقصوں سے پاک ہے پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے یعنی سب صفات کاملہ اس میں موجود ہیں تو جب وہ سب نقصوں سے پاک اور سب صفات کاملہ سے موصوف ہے اور اس کے سوا ایسا کوئی نہیں ہے تو اس کا نتیجہ لازمہ یہ ہے کہ لَا اِلٰہَ الخ یعنی پھر اس کے سوا معبود بھی اور کوئی نہیں ہے بلکہ سب اس کے بندے ہیں تو جب وہی معبود ہے اور باقی سب اس کے بندے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ الخ یعنی اللہ ہی بڑا ہے اور کسی بدی اور نقص سے بچنے کی طاقت اور کسی نیکی اور کمال کے حاصل کرنے کی قوت سوائے اللہ کی (معبود حقیقی کے جو کہ جامع صفات کمال ہے) مدد کے نہیں ہے۔

پس اس چھوٹے سے وظیفہ میں بھی پہلے عبودیت کا اقرار ہے اور پھر استعانت کا اظہار ہے۔ اور ان دونوں کی جڑھ معرفت صفاتی کو قرار دیا ہے جو کہ مشاہدہ ذاتی کے لئے بمنزلہ آئینہ ہے۔ اور یہاں پر بھی وہی ترتیب ہے جو کہ فاتحہ شریف میں ہے یعنی پہلے حمد ہے یا بلفظ دیگر معرفت صفتی ہے اور پھر اقرار عبودیت ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ ایک اللہ ہی معبود ہے اور اس کے سوا اور سب اس کے بندے اور اس کی طرف محتاج ہیں اور پھر استعانت ہے یعنی یہ بیان کیا ہے کہ سوائے اس معبود حقیقی کی مدد کے نہ کوئی چیز خود کسی نقص اور ناکامی سے بچ سکتی ہے اور نہ کسی کو بچا سکتی ہے اور نہ کوئی چیز خود کسی کمال اور کامیابی کو حاصل کر سکتی ہے اور نہ حاصل کرا سکتی ہے لہٰذا ہر ایک کو اس سے مدد مانگنی چاہئے۔

اس مقام میں جیسا کہ عارف کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِكَ[2] جو کہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا مفہوم ہے اسی طرح اس مقام پر عارف

---

[1] ۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے، طاقت اور قوت اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ (از مرتب)

[2] ۔ ہم تیری عبادت اس طرح نہیں کر سکے جیسا کہ تیری عبادت کرنے کا حق تھا، طاقت اور قوت تجھ ہی کو حاصل ہے۔ (از مرتب)

پر یہ بھی ہویدا ہو جاتا ہے کہ سب مقاصد کے لئے عموماً اور خداوند کریم کی رضامندی حاصل کرنے اور منعم علیہ بننے کے لئے خصوصاً اللہ حکیم نے جو خاص راہیں مقرر کی ہوئی ہیں بجز ان کے جاننے اور ان پر چلنے کے انسان ہر گز منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اور ان راہوں کا جاننا یا ان پر چلنا بجز اللہ علیم وقدیر کے بتانے اور چلانے کے ہر گز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کے بعد یہ فرمایا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔[1]

(ح) ہدایت کے چھ معنے ہیں:

نمبر 1: یہ کہ قویٰ فطریہ سے کام لینے اور خواص طبعیہ کے اظہار کا طریق فطرت میں رکھنا اور بتانا جیسا کہ فرمایا اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔[2] (طٰہٰ:51)

نمبر 2: یہ کہ مطلوب کا راستہ اور طریق بتانا جیسا کہ فرمایا اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔[3] (الانبیاء:74) اور یہ کہ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔[4] (الشوریٰ:53)

نمبر 3: مطلوب کے طریق اور راہ پر چلانا جیسا کہ فرمایا اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى۔[5] (حٰمٓ السجدۃ:18) اور یہ کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔[6] (القصص:57)

نمبر 4: اعمال صالحہ کو ایک حد تک بجالانے سے ان کے اعلیٰ درجہ پر کرنے کی توفیق دینا یا بعض اعمال صالحہ کے کرنے سے اور اعمال صالحہ کے کرنے کی توفیق اور استطاعت دینا۔

---

[1]۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تونے انعام کیا ہے جن پر نہ تو تیرا (بعد) میں غضب نازل ہوا (ہے) اور نہ وہ (بعد میں) گمراہ (ہو گئے) ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ جس نے ہر چیز کو (اس کی ضرورت کے مطابق) اعضا عطا کیے ہیں اور پھر ان (اعضا) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ (لوگوں کا) امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے ان کو ہدایت دیتے تھے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ تو یقیناً لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف لا رہا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ اور ثمود (کا یہ حال تھا کہ) ہم نے اُن کو ہدایت کا راستہ دکھایا تھا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔ (تفسیر صغیر)

[6]۔ تو جس کو پسند کرے ہدایت نہیں دے سکتا۔ لیکن اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

جیسا کہ فرمایا وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی۔[1] (محمد:18) اور کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔[2] (البقرۃ:4،3)

نمبر 5: مقصود یا نتیجہ لازمہ تک پہنچانا اور حاصل کر دینا۔ جیسا فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا۔[3] (الاعراف:44) اور فَاھْدُوْھُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ۔[4] (الصّٰفّٰت:24)

نمبر 6: (م) کسی کو مہدی بنانا یعنی براہ راست اس کو کامل ہدایت یافتہ بنا کر اوروں کے لئے ہادی برحق بنانا جیسا فرمایا وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی۔[5] (الضحیٰ:8)

یہاں پر یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ ہدایت ہدایت دینے والے کا فعل ہے اور ہدایت پانے کے لئے لفظ اِھْتِدَاءٌ آتا ہے اور اِھْتِدَاءٌ کے مقابل ضلالت ہے اور ہدایت کے مقابل اضلال ہے۔ پس جس قدر معنے ہدایت کے ہیں اسی قدر معنے اِھْتِدَاءٌ کے ہیں اور جس قدر اِھْتِدَاءٌ کے ہیں اسی قدر ضلال کے ہیں اور جس قدر ضلال کے ہیں اسی قدر اِضلال کے ہیں۔ اور جو معنے ہدایت کے لئے جائیں گے اس کے مقابل اضلال میں ہدایت کے ان خاص معنوں کی نفی ہو گی اسی طرح اِھْتِدَاءٌ کے جو معنے لئے جائیں گے اس کے مقابل کے ضلال میں ان معنوں کی نفی ہو گی۔

پس اگر ناظرین اس واضح اور سیدھے قاعدہ کو مد نظر رکھیں گے تو ضالین کے معنوں میں کسی مزید تشریح کے محتاج نہ رہیں گے۔ اور نہ اس سوال کے جواب میں کسی دقت یا تاویل کے محتاج رہیں گے جو کہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا۔[6] (البقرۃ:27) اور مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔[7] (الاعراف:187) پر بعض نادانوں اور عربی زبان کے جاہلوں نے اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ

---

[1]۔ اور وہ لوگ جو کہ ہدایت پاتے ہیں، اللہ ان کو ہدایت میں زیادہ کرتا جاتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو (کچھ) ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ سب تعریف کا اللہ ہی مستحق ہے جس نے ہم کو اس (بہشت) کا راستہ دکھایا۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ پھر ان سب کو جہنم کے رستے کی طرف لے جاؤ۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ اور (جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی محبت میں) سرشار دیکھا تو (ان کی اصلاح کا) صحیح راستہ تجھے بتا دیا۔ (تفسیر صغیر)

[6]۔ (اصل بات یہ ہے کہ) وہ بہت (سے لوگوں) کو اس (قرآن) کے ذریعہ سے گمراہ قرار دیتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[7]۔ جس کو اللہ گمراہ قرار دے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ (تفسیر صغیر)

ہدایت بمعنے اوّل کے مقابل کا اضلال تو یہاں پر کیا کہیں ہو سکتا ہی نہیں کیونکہ خداوند کریم نے فرمادیا ہے کہ ہدایت بمعنے اوّل سب اشیاء کو ہم نے عنایت کر دی ہے چنانچہ فرمایا اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔[1] (طٰہٰ:51) اور ہدایت بمعنی ثانی کے بالمقابل اضلال کا بھی یہی حال ہے اس لئے کہ وہ بھی سب انسانوں کو دے دی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی نسبت فرمایا ہے ھُدًی لِّلنَّاسِ۔[2] (البقرۃ:186) اور ہدایت بمعنے سوم، چہارم، پنجم کا مقابل اضلال ہو سکتا ہے بلکہ ضرور ہے لیکن اس کے اللہ قدوس کی طرف منسوب کرنے میں وہ نقص عائد نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے جو کہ معترض نے پیش کیا ہے کیونکہ ہدایت بمعنے سوم کے مقابل کے معنے ہیں کہ مطلوب کے راستہ پر نہ چلانا نہ یہ کہ اصل راہ سے پھیر کر کسی اور راستہ پر لگا دینا۔

جیسا کہ تقابل سے ظاہر ہے اور راستۂ مطلوب پر نہ چلانے سے کوئی نقص لازم نہیں آتا کیونکہ راستہ پر تو اس کو چلایا جا سکتا ہے جو اس پر چلنا چاہے اور جو چلنا نہیں چاہتا اس کو اگر چلایا جائے تو یہ جبر اور اکراہ ہے اور جبر و اکراہ نہ دین میں ہے اور نہ عقل اس کو تجویز کر سکتی ہے اور نہ ایسے چلانے پر بندہ کا کوئی حسن اور اختیاری فعل پایا جاتا ہے جس پر اجر اور ثواب و انعام کا وہ مستحق ٹھہرے۔ اور ظاہر ہے کہ اس راہ پر وہ چلنا چاہتا ہے جو کہ اس کو تسلیم کرتا ہے۔

پس جو اس راہ کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس پر ہرگز چلنا نہیں چاہتا اور جو چلنا نہیں چاہتا اس کے نہ چلانے میں کوئی نقص نہیں بلکہ اس کے چلانے میں نقص ہے کہ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ[3] لازم آتا ہے جو عقلاً اور نقلاً ممنوع ہے نیز جب چلانا ممنوع ہے تو نہ چلانا کم از کم ضرور جائز ہے اور جائز وہی امر ہوتا ہے جو کہ کسی نقص کو مستلزم نہیں ہوتا۔ اور ہدایت بمعنے چہارم اور پنجم کے مقابل اضلال کی نسبت میں اس وجہ سے کوئی نقص نہیں آتا کہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ یا اور اعمال صالحہ کی توفیق نہ دینا۔ اور مقصود یا نتیجہ لازمہ تک نہ پہنچانا (یعنی جنت یا رضائے الٰہی تک نہ پہنچانا) اور ظاہر ہے کہ جو کسی قسم کا عمل صالحہ نہیں کرتے یا جنت اور رضائے الٰہی کے موجب عقائد اور اعمال صالحہ نہیں رکھتے ان کو اعلیٰ درجہ یا اور اعمال

---

[1] ۔ جس نے ہر چیز کو (اس کی ضرورت کے مطابق) اعضا عطا کیے ہیں اور پھر ان (اعضا) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ تمام انسانوں کے لئے ہدایت (بنا کر بھیجا گیا) ہے۔ (تفسیر صغیر)

[3] ۔ دین میں جبر۔ (از مرتب)

صالحہ کی توفیق نہ دینا یا جنت اور اپنی رضا سے ممتاز نہ کرنا کسی نقص کو مستلزم نہیں بلکہ اس کا خلاف نقص کو مستلزم ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

اسی طرح ہدایت بمعنے ششم کے مقابل اضلال کا حال ہے کیونکہ اس کے معنے ہوئے مہدی نہ بنانا۔ اور ہر ایک انسان جانتا اور مانتا ہے کہ ہادی وہی بنائے جاتے ہیں جو کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے علاوہ خدا سے سچی محبت کا ملہ رکھنے والے اور خلق خدا کے راہ راست پر لانے یا آنے کا سچا جوش اور بے قرار کرنے والی تڑپ اور جلا دینے والا ولولہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو لوگ فاسق فاجر ہوں اور خدا کی راہ میں ایک قدم بھی نہ اٹھاتے ہوں اور نہ اٹھانے کی پروا کرتے ہوں اور خلقِ خدا کو طرح طرح کے دکھ دیتے ہوں ان کو اگر خدا نے لوگوں کے لئے ہادی نہ بنایا تو اس میں کونسا نقص لازم آگیا بلکہ اس کا خلاف جو خلاف عقل و نقل ہے بہت سے نقائص کو مستلزم ہے۔

ہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اس ضلال اور اضلال کے معنے ہیں جو کہ اِھْتِدَاءٌ اور ہدایت کے مقابل ہیں لیکن ضلال کا لفظ بعض اوقات اور معنوں میں بھی آتا ہے جو کہ اِھْتِدَاءٌ کے معنوں کے مقابل نہیں ہوتے چنانچہ صراح میں ہے ضَلَال بِالْفَتْحِ ضائع شدن و کم[1] شدن و مغلوب شدن یُقَالُ ضَلَّ الْمَاءُ فِی اللَّبَنِ اَیْ غُلِبَ بِحَیْثُ لَا یُظْهِرُ اَثَرُهٗ فِی اللَّبَنِ وَمِنْهُ قَوْلُهٗ تَعَالٰی حِکَایَةً عَنْ اِخْوَةِ یُوْسُفَ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ اَیْ مِنَ الْمَغْلُوْبِیْنَ فِیْ عَصَبِیَّةِ الدِّیْنِ[2] الخ۔ نیز اس کے معنے سائل اور محبِ صادق کے بھی ہوتے ہیں۔

اور وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔[3] (الضحیٰ:8) میں یہی معنے مراد ہیں اور پہلے معنوں میں سے

---

[1]۔ صراح میں گُم شدن لکھا ہے۔ (از مرتب)

[2]۔ ضَلال جب فتح سے ہو تو (معنی ہوں گے) ضائع ہونا اور گم ہونا اور مغلوب ہونا۔ کہا جاتا ہے کہ ضَلَّ الْمَاءُ فِی اللَّبَنِ یعنی پانی دودھ میں ایسے حل ہو گیا کہ اس کا دودھ میں کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اور اسی سے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ایک قول ہے کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ یعنی ہمارا باپ دین کے ساتھ اس قدر چمٹا ہوا ہے کہ گویا اس میں مغلوب ہو چکا ہے۔ (از مرتب)

[3]۔ اور (جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی محبت میں) سرشار دیکھا تو (ان کی اصلاح کا) صحیح راستہ تجھے بتا دیا۔ (تفسیر صغیر)

یہاں پر کوئی بھی ہر گز مراد نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن مجید میں آنحضرتؐ کے لئے صاف آیا ہے مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔[1](النجم:3)صِرَاطٌ کہتے ہیں راستہ کو اور صراط مستقیم وہ سیدھی راہ جو کہ سب سے کوتاہ تر ہو۔ اور خدا کی رضامندی کی سب راہوں میں سے صراط مستقیم دین اسلام ہے جس کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ۔[2]

(سنن الترمذی ابواب الایمان باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ حدیث نمبر 2641)

یعنی بہت سی راہوں کو لوگ بزعم خود دین اسلام کہیں گے لیکن ان میں سے وہی طریق دین اسلام ہے کہ جس پر مَیں اور میرے اصحاب ہیں اور اسی بات کو قرآن مجید نے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ[3] الخ (النساء:60) اور فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ[4] الخ (النساء:60) میں بیان فرمایا ہے۔

منعم علیہ گروہ:

اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ جو لوگ کسی مفید راہ پر چل کر کسی مطلوب خیر تک پہنچ جائیں وہ منعم علیہم ہیں لیکن حقیقی اور اکمل اور اتم طور پر وہی منعم علیہم ہیں کہ جن کا ذکر خداوند کریم نے قرآن مجید میں بدیں الفاظ فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا[5](النساء:70) اور غضب کہتے ہیں ایسے ناراض ہونے کو جو آمادۂ انتقام کر دے اور چونکہ انسانوں میں اس کے ساتھ لازم ہے یا یوں کہو کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ قلب کے خون میں جوش پیدا ہو کر باہر کی طرف حرکت کرتا ہے لہٰذا بعض اہل لغت نے اس کی یہی تعریف کر دی جس سے بعضوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ خون قلب کا جوش میں آنا لوازم

---

[1]۔ کہ تمہارا ساتھی نہ رستہ بھولا ہے نہ گمراہ ہوا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ جس پر مَیں اور میرے صحابہ ہیں۔ (از مرتب)

[3]۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ پھر اگر تم (حکام سے) کسی امر میں اختلاف کرو... تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین (میں) اور یہ لوگ (بہت ہی) اچھے رفیق ہیں۔ (تفسیر صغیر)

جسمیت سے ہے جس سے اللہ قدوس پاک ہے لہٰذا غضب کی نسبت اللہ قدوس کی طرف درست نہیں لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اہل لغت نے انسان کے غضب کی کیفیت بیان کی ہے اور یہ لازم نہیں کہ جو کیفیت ایک شے میں ہو وہی دوسری میں بھی لی جائے مثلاً انسان کے کلام کی جو کیفیت ہے یہ لازم نہیں کہ فرشتوں اور خدا میں بھی وہی کیفیت ہو اور چونکہ یہ کیفیت وہاں نہیں ہو سکتی تو اس پر یہ کہا جائے کہ فرشتوں اور اللہ کی طرف کلام کا نسبت کرنا ناجائز ہے۔ ایسا کہنا یا خیال کرنا زبان کی ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

ان آیات کا ترجمہ یہ ہے۔ بتا (یا چلا) ہم کو ایک سیدھی راہ (یعنی) ان کی راہ جن پر تُو نے انعام کیا جن پر غضب نہیں کیا گیا اور جو راہ بھولنے والے (یا راہ پر نہ چلنے والے) نہیں ہیں۔ یعنی ایسے منعم علیہم کی راہ جو مغضوب علیہم اور ضال نہیں ہیں۔

یہ ترجمہ اس وقت ہو گا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یہ دونوں اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی صفت ہوں اور یہی حق ہے جیسا کہ دلائل الاعجاز اور کتاب السیبویہ میں مفصل مذکور ہے۔

اور اگر اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے بدل بنایا جائے تب اس کے معنے یہ ہوں گے ان کی راہ جن پر انعام کیا گیا ہے نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ ان کی جو راہ سے بھولے ہوئے (یا راہ پر نہ چلنے والے ہیں) ان آیات میں بہت سے امور بیان کئے گئے ہیں پہلے تو یہ بتایا ہے کہ عارف اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے مقام پر پہنچ کر اگرچہ ماسوا اللہ کو عاجز اور اس کے بندے یقین کرتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ سلسلہ اسباب کو لغو خیال کر کے خدا کے فعل کو لغو اور باطل قرار دے اور خلاف مشاہدہ کا قائل ہو اور اباحت جیسے ناپاک اور سیاہ گڑھے کے کنارہ پر جا کھڑا ہو بلکہ وہ باوجود اس کے پھر بھی سلسلۂ اسباب کی ایک حد تک پابندی کر کے خداوند کریم سے اپنے ہر ایک مطلوب اور خصوصاً حقیقی مقصود کے حاصل کرنے کے لئے یہ دعا کرتا ہے کہ سیدھی راہ اور ٹھیک ٹھیک ذریعہ بتا اور اس پر چلانا یہ کہ دفعۃً سوائے کسی ذریعہ کے چھونے کے منزل مقصود تک پہنچا۔

غرض کہ نہ وہ سلسلۂ اسباب کو لغو محض خیال کرتے ہیں اور نہ ان کو تاثیر میں مستقل یا خود مختار گمان کرتے ہیں اور باوجود اس کے پھر یہ بھی ان کے زعم میں نہیں ہوتا کہ وہ قادر خدا اسباب کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا یا بالفاظ دیگر یہ کہ وہ ان اسباب عادیہ کے دائرہ سے باہر نکل سکتا ہی نہیں جو کہ ہماری ناقص استقراء اور تجربہ کی حد بست ہو کر نادان، پر شوخ و بے باک انسان کے منہ سے سنت اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے بلکہ وہ یقین کرتے ہیں کہ اگرچہ خداوند کریم نے اسباب مختلفہ کو مظاہر قدرت بنا رکھا ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے وجود اور صفات اور اپنے مرسلوں کی صداقت کے اظہار واثبات کے لئے محض اپنے کرشمۂ قدرت کاملہ سے بڑے بڑے فوق العادت کام ظاہر کرتا ہے جو کہ اسباب عادیہ کے مس سے ملوث نہیں ہوتے اور سنت اللہ کہ جس کی نسبت لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔[1] (الاحزاب:63) وارد ہے اسی امر کو کہتے اور یقین کرتے ہیں جس کو خود خداوند کریم نے اپنی سنت سے نام زد کیا ہو یا اس کا خلاف خدا کے بیان کردہ وعدے اور وعید یا اسمائے حسنیٰ اور صفات عُلیٰی میں سے کسی کے خلاف ہو اور یہود کی مانند اپنی کسی استقراء اور تجربہ کے زنجیروں سے خدا کے ہاتھوں کو مَغْلُوْلَتَانِ (باندھے ہوئے) نہیں کہتے بلکہ اس کے ہاتھوں کو مَبْسُوْطَتَانِ[2] (المائدۃ:65) یقین کرتے ہیں۔

پھر یہ بتایا کہ انسان خواہ کیسا ہی ہو اصل مقصود یعنی اس وراء الوراء خدا کی رضا حاصل کرنے کی ٹھیک ٹھیک اور مختصر اور اسلم اور اسہل اور یقینی راہ تو کیا کوئی راہ بھی اپنی اٹکل سے صحیح تجویز نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس امر کا سخت محتاج ہے کہ ارحم الراحمین خود یہ راہ بتائے۔ انسان تو وہ ہے کہ نہ اپنی ایک بنی نوع اور اپنے جیسے اپنے دیرینہ دوست ہمراہی کی رضامندی کی راہ از خود تجویز کر سکتا ہے اور نہ اپنے جیسے انسان بادشاہ کے آداب دربار خود بخود صحیح طور پر مقرر کر سکتا ہے بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود اس کو کسی طور پر بتائیں تو اس لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔[3] (الشوریٰ:12) اور لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔[4] (الاخلاص:5) خدا کی

---

[1]۔ تو کبھی بھی اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پائے گا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ (دو ہاتھ) کشادہ۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ اور (اس کی صفات میں) اس کا کوئی بھی شریک کار نہیں۔ (تفسیر صغیر)

رضامندی اور آداب حضور کی نسبت اس کی از خود تراشیدہ تجویز صحت کے سرٹیفکیٹ کی مستحق کب یقین کی جاسکتی ہے یا اس پر رضا الٰہی کے حاصل اور مرتب ہونے کا وہ یقین ہو سکتا ہے جو کہ مال وجان کے فدا کرنے اور خواہشات ولذات کے ہزارہا بتوں اور محبوبوں کے توڑنے اور چھوڑنے اور سب جاہ وحشم کے قبلۂ دل پر پیٹھ پھیرنے اور راہ ورسم کے سخت تریں زنجیروں اور مضبوط اور بلند دیواروں کے پاش پاش کرنے اور پھاندنے پر سچے اخلاص وارادت اور دلی شوق ومحبت کے ساتھ آمادہ کر سکے جیسا کہ خدا کے خود بتانے کی صورت میں کر سکتا کیا، کرتا رہا ہے اور کرتا ہے اور جس طرح کہ وہ اس راہ کو از خود تجویز نہیں کر سکتا اسی طرح سوائے خدا کے چلانے کے اس پر چل بھی نہیں سکتا جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ اسی طرح عام مقاصد کا حال بھی ہے۔

اوّل تو انسان ٹھیک ٹھیک ذریعہ دریافت ہی نہیں کر سکتا پھر سب ذرائع سے کسی خاص ذریعہ کو اپنے لئے یقین سے مفید نہیں سمجھ سکتا۔ پھر ان ذرائع کا مہیا کرنا بھی اس کے اختیار سے باہر ہے۔ پھر کسی قدرتی مانع کا پیش نہ آنا بھی اس کی قدرت سے باہر ہے وَغَيْرُهُ ذَالِكَ۔ پس ان سب امور پر نظر کرنے سے صاف صاف ثابت ہے کہ انسان کیا اصل مقصود کی نسبت اور کیا عام مقاصد کی نسبت اس امر کا محتاج ہے کہ خدا ہی اس کو کوئی مفید راہ بتائے اور اس پر چلائے۔

دنیا میں ہمیشہ خدائے رحیم اپنی رضامندی کی راہ بتانے کے لئے انبیاءؑ اور رسلؑ بھیجتا رہا ہے اور ان میں اور ان کے اتباع میں اپنے علم غیب اور بے مثل افعال کے ضمن میں اپنی رضا کے آثار مشاہدہ کرا کے ان کے طریق مسلوک کے موصل الی المقصود ہونے کا ثبوت دیتا رہا ہے لیکن تاہم بہت سے لوگ اپنی شامت اعمال اور باریک درباریک اسباب کی وجہ سے اس سچی اور روشن راہ کو یا تو چمگادڑ کی مانند دیکھ نہیں سکتے یا وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا۔[1] (النمل:15) کے مطابق نہ اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور نہ اس پر چل سکتے ہیں اور بعض

[1]۔ اور انہوں نے اصرار سے ظلم اور تکبر کرتے ہوئے ان (نشانوں) کا انکار کیا، حالانکہ ان کے دل ان پر یقین لا چکے تھے۔ (تفسیر صغیر)

وقت اختیار بھی کرتے ہیں اور چلتے بھی ہیں پر وہ باریک دربار یک امور ان پر مخفی رہ جاتے ہیں جن کا جاننا اور اختیار کرنا اور عمل میں لانا قدم آگے بڑھانے اور ترقی کرنے کے لئے از بس ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا بتایا کہ انسان ہر وقت اس بات کا محتاج ہے کہ وہ ان مشکلات کے حل کے لئے اپنے مولیٰ رحیم کریم سے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کرتا رہے۔

اسی طرح مقاصد عامہ کا حال بھی ہے اور الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے بعد صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو دو(2) وجہ سے ذکر فرمایا ہے۔

اوّل اس وجہ سے کہ انسان کی فطرت ایسی ترقی طلب بنائی گئی ہے کہ سچی خوشی اس کی تب ہی ہو سکتی ہے کہ اس کو ایسی نعمت ملے جو کہ مقدار و کیفیت اور زمان کے لحاظ سے غیر متناہی ہو اور ایسی نعمت کسی انسان کے کسی عمل کی جزاء میں نہیں مل سکتی کیونکہ انسان کا ہر ایک عمل متناہی الکم والکیف اور متناہی الزمان ہے۔ پس اس کے جزاء خواہ دس اور ستر مثل کیا سات سو اور اس کے بھی چند اضعاف ہو تو بھی وہ متناہی ہوتی ہے جو کہ انسان کی فطرت کے لئے خوش کن نہیں ہو سکتی بلکہ ضروری ہے کہ بے انتہا قدرت اور رحم والا خدا اپنی طرف سے اپنے سچے بندے پر ایسا انعام کرے جو کہ اس کی ترقی طلب فطرت کا پرواز گاہ بن سکے۔ جو لوگ انسان کی فطرت پر نظر کرنے والے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ انسان ہر ایک سلسلہ ترقی میں پہلے ایک ادنیٰ اور خفیف سے مرتبہ کا طالب ہوتا ہے۔

اور جوں ہی اس سے کامیاب ہوتا ہے تو اس سے آگے دوسرے مرتبہ کا طالب ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ ایسا ممتد ہوتا ہے کہ کوئی مرتبہ اس کی تیز حرکت کو ہلکا کرنے والا نہیں ہوتا۔ ایک دن قُوت شام کامل جانا اس کی سب امیدوں کا معراج ہوتا ہے۔ پھر وہ دن آتے ہیں کہ سلطنت شام پر بھی وہ تشنہ کام رہتا ہے اور شہنشاہی کا تاج اس کی حرص وآز کے سر کو ڈھانپ نہیں سکتا اور دولت کی بارش اس کی آتش خواہش کو فرو نہیں کر سکتی۔ پھر جس طرف نظر اٹھا کر دیکھو یہی نظارہ دکھائی دیتا ہے۔

قیامت کی نسبت ایک حدیث میں آیا ہے کہ دوزخیوں سے اخیر میں جو جنت میں داخل ہو گا وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ہو گا اور اس کا منہ دوزخ کی طرف ہو گا تو وہ عرض

کرے گا اے میرے رب میرا منہ آگ سے پھیر دے اس کی بُو نے مجھے بہت تکلیف دی ہے اور اس کی سخت حرارت نے مجھے جلا دیا ہے۔ تب خداوند کریم فرمائے گا کیا یہ اندیشہ نہیں کہ اگر میں ایسا کروں تو تُو کچھ اور مانگے گا۔ تو وہ کہے گا اے رب تیری عزت کی قسم ہے کہ میں اور کچھ نہ مانگوں گا اور بہت کچھ عہد و پیمان کرے گا۔ تب خداوند کریم اس کے منہ کو آگ کی طرف سے پھیر دے گا۔ پس جب جنت کی تازگی دیکھے گا تو کچھ عرصہ تک تو خاموش رہے گا لیکن آخر عرض کرے گا کہ اے اللہ مجھے جنت کے دروازہ کے پاس لے جا تو خداوند کریم فرمائے گا کیا تم نے عہد نہ کیا تھا کہ میں اور کچھ نہ مانگوں گا۔ پس وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ تیری سب مخلوقات سے ایک میں ہی محروم رہوں گا۔ پھر خدا اس سے عہد لے گا کہ اور کچھ نہ مانگے گا اور وہ حلفی عہد کرے گا لیکن جب جنت کی تر و تازگی دیکھے گا تو کہے گا اے میرے رب مجھے جنت میں داخل کر دے۔ غرضیکہ وہ اس طرح کرتے کرتے جنت میں داخل ہو جائے گا۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب معرفۃ طریق الرؤیۃ حدیث 451)

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کی فطرت ترقی طلب ہے اسی طرح اس کے مطالب بھی وقتاً فوقتاً بدلتے ہیں۔

پس اس وجہ سے حکیم مطلق نے پہلے سے بتا دیا کہ سالک کو اسی پر بس نہ کرنی چاہئے کہ ہم کو وہ سیدھی راہ بتا کہ جس پر چل کر متناہی اجر اور نتیجہ حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ دعا مانگنی چاہئے کہ ہم کو وہ سیدھی راہ بتا کہ جس پر چلنے سے اسی قدر نہیں کہ اجر ملتا ہے بلکہ تیرا انعام ہوتا ہے جو کہ سب مطالب کو حاوی اور غیر مجذوذ (غیر منقطع) ہوتا ہے۔

پھر سالک کے حصول مقصد کا کامل محل جنت ہے اور اس کی نسبت حدیث میں آیا ہے:

مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔

(صحیح البخاری کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ حدیث 3244)

یعنی جنت وہ چیز ہے جو نہ کسی نے دیکھی اور نہ سنی اور نہ کسی کے خیال و وہم میں آئی ہے۔

پس دعا کے وقت اس کے نصب العین اور ملحوظ کرنے کے لئے اگر کوئی عنوان ہو سکتا

ہے تو یہی کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ اور دوم اس وجہ سے کہ قبول دعاء کے لئے ہوش استدعاء ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اَمَّنْ یُّجِیْبُ الدَّاعِیْ کے بجائے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ۔[1] (النمل:63) فرمایا ہے کیونکہ یہ استجابت دعا کا بیان ہے اور اس کی ضروری بلکہ از بس ضروری شرط جوش استدعا ہے جو کہ مضطر میں قوی تر ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان خواہ بار بار سنتا رہے کہ فلاں ذریعہ سے فلاں مطلوب حاصل ہوتا ہے لیکن اس قدر جوش استدعا اس کو ہرگز پیدا نہ ہوگا جس قدر کہ اس کے نظائر کے مشاہدہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کے نظائر کی طرف متوجہ کرنے اور ان کو نصب العین کرنے کی وجہ سے خداوند حکیم نے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ فرمایا۔

اسی وجہ سے اللہ علیم و حکیم نے اَنْعَمْتَ بلفظ ماضی ذکر کیا یعنی وہ قطعی اور یقینی صراط مستقیم ہمیں بتا (یا ہم کو اس پر چلا) کہ جس کے اختیار کرنے والوں اور چلنے والوں پر تو انعام کرتا رہا ہے۔ فاتحہ شریف چونکہ قرآن مجید کا متن ہے لہٰذا اس کی ہر ایک آیت نہایت جامع ہے اور جس طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب مذاہب باطلہ کی تردید کے لئے کافی ہے اسی طرح اِہْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ سلوک کی سب راہوں پر مشتمل ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا حکیم الامت نے حضرت اقدس کی خدمت میں بیان کیا کہ میں نے فلاں آیت کے ساتھ شیعہ مذہب کی یوں تردید کی تھی تو آپ نے فرمایا مولوی صاحب آپ تو دور چلے گئے میں نے بھی ایک دفعہ اس مذہب کی تردید کی طرف توجہ کی تھی تو مجھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہی اس کی تردید کے لئے کافی معلوم ہوئی کیونکہ اگر آنحضرتؐ کے ارد گرد سو اچند معدودہ اشخاص کے اور سب منافق ہی جمع ہوتے اور ان کی وجہ سے ایسی ہی ناکامی ہوتی جیسی شیعہ لوگ کہتے ہیں تو پھر قرآن مجید کی ابتدا اَلْحَمْدُ سے نہ ہوتی اور نہ اس سورت کی ابتداء اَلْحَمْدُ سے ہوتی جو کہ ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

اس امت میں منعم علیہم کا ہونا:

یہ قصہ میں نے اس لئے لکھا ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح

[1]۔ (نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دعا سنتا ہے۔ جب وہ اس (خدا) سے دعا کرتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

اَلْحَمْدُلِلّٰہ کے ساتھ ان مذاہب کی تردید ہوتی ہے جو کہ اَلْحَمْدُلِلّٰہ کے خلاف خدا کی طرف کسی نقص کو منسوب کرتے ہیں یا کسی صفت کمال کا انکار کرتے ہیں یا کسی صفت کمال میں قولاً یا فعلاً کسی دوسرے کو شریک کرتے ہیں اسی طرح ان مذاہب کی تردید بھی ہو جاتی ہے جو کہ اس بات کے خلاف ہیں کہ آنحضرتؐ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ [1] (النسا:70) کے رئیس اور سرتاج تھے۔ اور جو لوگ حضرت اقدس کی کتابوں پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اتباع انبیاء اور ضرورت امام اور شناخت مامور من اللہ کے متعلق اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الخ سے آپ نے کیا کچھ ثابت کیا ہے۔

جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ مختصر سے کلمات معارف وحقائق کے بحر بلکہ بحار ہیں اور حضرت اقدس علیہ السلام نے اس آیت کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی (جو کہ ثابت کر رہی ہے کہ جو کچھ پہلوں کو ملا ہے وہ آخرین کو بھی مل سکتا ہے) تو سالکوں کی کمریں ٹوٹ جاتیں۔ یہی وہ آیت ہے جو کہ ان دشمنان اسلام کے دانت توڑتی ہے جو کہ بصورت دوست بن کر اسلام کی اس خصوصیت اور مزیت کو چھیننا چاہتے ہیں جو کہ اسلام کی سچائی اور منجانب اللہ ہونے پر کافی شہادت ہے اور مشرکین عرب سے بڑھ کر آنحضرتؐ کو روحانی طور پر بھی ابتر اور لا ولد قرار دیتے ہیں اور افضل الرسل اور خاتم النبیینؐ کو موسیٰؑ سے اور قرآن مجید کو تورات سے اور اسلام کو شریعت موسوی سے اور اہل اسلام کے سب عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ [2] کے تمغہ داروں کو بنی اسرائیل کی عورتوں سے کم تر اور ادنیٰ ٹھہراتے ہیں۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح جلد 5 صفحہ 622 کتاب المناسک باب حرم المدینۃ... حدیث 2731)

جو کہتے ہیں کہ جس طرح مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ (الاحزاب:41) ہے (آنحضرتؐ جسمانی رنگ میں کسی مرد کے باپ نہیں) اسی طرح روحانی طور پر بھی آپ کسی کے باپ اور خاتم النبیین (نبیوں کی مہر) نہیں ہیں کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں

[1] ۔ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔ (از مرتب)

ہوا اور نہ ہو گا کہ جس کے آپ روحانی باپ بنیں اور وہ آپ کی مہر سے کام کر کے آپ کو خاتم النبیینؐ ٹھہرائے اور یہ بھی کہ حضرت موسیٰؑ تو بانی خاندان نبوت تھے اور ان کے آثار وبرکات سے ان کے خدام میں کثیر التعداد انبیاء ہوئے کہ جن میں سے ایک حضرت مسیح بھی ہیں جو کہ خدا کی طرح بہت سے امور میں بے مثل وبے نظیر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن محمدؐ، محمد شاہ رنگیلے کی مانند خاندان نبوت کے برباد کن ہیں اور ایسے بے فیض ہیں کہ قیامت تک ان کے اتباع سے کوئی ادھورا جیسا نبی بھی نہ ہو گا اور نہ اب تک کوئی ہوا ہے اور شریعت موسوی کے فیض اتباع سے بنی اسرائیل کی عورتوں تک مکالمۂ الٰہیہ کا شرف ملا ہے۔ پر اسلام ایسا بے فیض ہے کہ اس کے اتباع سے کسی ایک متنفس کو اس کی بو بھی نہیں مل سکتی۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 1 بابت ماہ جولائی 1906ء صفحہ 1 تا 36)

یہ تو ان دشمنان اسلام کا قول ہے لیکن خداوند کریم اس آیت کے معرفت یہ بتاتا ہے کہ تم مجھ سے مانگو کہ ہمیں اس راستہ پر چلا کہ جس کے چلنے والوں پر تو ہمیشہ انعام کرتا رہا ہے کہ بعض کو نبی اور بعض کو صدیق وغیرہ بناتا رہا ہے تا کہ میں تمہاری دعا قبول کروں اور تم کو اس راستہ پر چلاؤں پھر پہلوں کی طرح تم پر بھی وہ انعام کروں جو پہلوں پر میں نے کیا ہے۔ پس اگر انبیاء اور شرف مکالمہ الٰہیہ رکھنے والے منعم علیہم ہیں اور ضرور ہیں تو یہ آیت کریمہ ضرور یہ بتاتی ہے کہ اس امت مرحومہ میں سے بھی وہ ہوں گے۔ حضرت اقدس کا مذکورہ بالا قول نہایت قابل قدر ہے کیونکہ یہ بالکل سچی بات ہے کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہوتا کہ پہلوں میں سے تو یہ سب منعم علیہم ہوئے ہوں اور اس امت میں کوئی بھی ایسا نہ ہو سکتا تو سالکوں کی ہمتوں کی کمریں ٹوٹ جاتیں اور وہ اپنے خدا کے ساتھ کبھی بھی سچی محبت نہ رکھ سکتے۔ تعجب ہے کہ خداوند کریم تو اپنے قرآن عظیم میں اس امت کو خَيْرَ اُمَّةٍ۔[1] (آل عمران:111) فرماتا ہے اور كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔[2] (الانعام:85) اور اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ

[1]۔ (سب سے) بہتر جماعت۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اسی طرح ہم اچھی طرح کام کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔[1](البقرۃ:258) کے بعد ابراہیمؑ اور عزیرؑ کے اِخْرَاجٌ مِّنَ الظُّلُمَات[2] کو بیان کر کے اور کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔[3](المزمل:16) اور کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔[4](النور:56) وغیرہ کو ذکر کر کے اسلام کے سچے فرمانبرداروں کو انبیاء سابقین کے مساوی بناتا ہے۔

جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے بھی عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل[5] فرما کر اس مساوات کا صریح اظہار فرمایا ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح جلد 5 صفحہ 622 کتاب المناسک باب حرم المدینۃ... حدیث 2731)

لیکن یہ دشمنان خاتم النبیینؐ اور عدوان اسلام واہل اسلام سب امت مرحومہ کو بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی کمتر قرار دیتے ہیں پر اس کی وجہ خداوند کریم نے خود بتادی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرمایا وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔[6](الحشر:20) یعنی جو لوگ خدا کو بھولتے ہیں تو اس کی سزا خداوند کریم ان کو یہ دیتا ہے کہ ان کو اپنی جانیں بھلوا دیتا ہے۔ پس وہ اپنی قدر و منزلت کو جانتے تک نہیں اور جو عزت خداداد ان کو ملی ہوئی ہوتی ہے اس کو اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسے بت پرست کہ جب انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ اپنی جانوں کو بھی بھول گئے اور جو شرف اور عزت کہ خداوند کریم نے انسان ہونے کے باعث ان کو دیا ہوا تھا اس کو اپنے ہاتھ سے وہ ضائع کر بیٹھے اور جو چیزیں کہ ان سے ہزار ہا درجہ کمتر تھیں اور وہ ان سے ہزار ہا درجہ اشرف اور اکرم تھے ان سے بھی اپنے آپ کو ذلیل و حقیر اعتقاد کر کے ان کے آگے سجدۂ تعظیم بجالانے لگے ہیں اور خدا کو بھول جانے کی وجہ خداوند کریم نے خود

---

[1]۔ اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اندھیروں سے نکالنا۔ (از مرتب)

[3]۔ جس طرح فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنادیا تھا۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔ (از مرتب)

[6]۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا سو اللہ نے بھی ان کو اپنی جانوں کا فائدہ بھلا دیا یہ لوگ اطاعت سے باہر نکلنے والے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

ہی بتادی ہے کہ یہ لوگ پہلے حکم عدولی کرنے والے تھے تو فسق کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خدا کو بھول گئے اور خدا کو بھلا دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی جانوں کو بھی بھول گئے۔ اسی طرح ان نام کے مسلمانوں کا حال بھی ہے کہ اپنی حکم عدولیوں کے باعث خدا کو بھول گئے اور خدا کو بھولنے سے اپنی جانوں کو بھول گئے ہیں اور وہ قدر و منزلت جو کہ خدائے رحیم اور ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْم[1] (البقرۃ:106) نے ان کو دی تھی یا یوں کہو کہ وہ خیریت جو کہ اور امم کی نسبت بالخصوص ان کو دی گئی تھی اس کو نَسْیًا مَّنْسِیًّا[2] کر کے اہل اسلام کو بدترین امم اور بنی اسرائیل کو یا یوں کہو کہ یہود کو خَیْرُ الْاُمَمْ[3] قرار دے چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنی جان تک بھول جائیں وہ اپنے مذہب و کتاب اور بانی مذہب کی قدر و منزلت کو کب یاد رکھ سکتے ہیں۔

تعجب ہے کہ یہ لوگ ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں یہ آیات پڑھتے ہیں اور کبھی ان کے خیال میں یہ نہیں آتا کہ وہ انعام حقیقی جو کہ خدا کے بیان کردہ منعم علیہم کو ملا تھا۔ اگر امت محمدیہ کو وہ بالکل نہ ملنا تھا تو پھر خداوند علیم و حکیم نے یہ دعا کیوں تعلیم کی اور روز مرہ اس کو بار بار تکرار کرنے کی کیوں تاکید فرمائی۔

اگر ان کا خیال صحیح ہے تو پھر خدائے حکیم کا ایسا کرنا یقیناً لغو حرکت قرار پاتا ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ الْبُهْتَانِ[4]) سچ تو یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا حضرت مرزا صاحب کے عناد سے ہے جیسا کہ آنحضرتؐ کی مخالفت سے بعض شریروں نے کہہ دیا تھا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ[5] (الانعام:92) اس آیت کریمہ سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس امت مرحومہ اور خَیْرُ الْاُمَمْ میں باقی تین قسم کے منعم علیہم ہوں گے (یعنی صدیق اور شہداء اور صالحین) اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ منعم علیہم کی چوتھی قسم (جو کہ سب سے پہلے قرآن عظیم میں مذکور ہے) ضرور ہو گی۔ بلکہ جس طرح اس آیت کریمہ سے یہ

---

[1] ۔ بڑا فضل کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)
[2] ۔ بھولی بسری۔ (از مرتب)
[3] ۔ امتوں میں سے بہترین۔ (از مرتب)
[4] ۔ ہم اس بہتان سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)
[5] ۔ اللہ نے کسی بندے پر کچھ نہیں اتارا۔ (تفسیر صغیر)

ثابت ہوتا ہے کہ اس امت میں خدا کے بیان کردہ چاروں قسموں کے منعم علیہم ہوں گے اسی طرح ان کی شناخت اور امتیاز کا ذریعہ بھی اسی ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ ان کے بیان کا عنوان جو خدائے علیم و حکیم نے اختیار فرمایا ہے وہ اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ہے اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ عنوان لغو نہیں ہوتا بلکہ خاص عنوان کا اختیار کرنا کسی غرض اور فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ پس ان کی شناخت کا یہی ایک کامل ذریعہ ہے کہ خداوند کریم کا بیان کردہ عنوان اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ان پر صادق آجائے اور یہ عنوان تب صادق آئے گا کہ خدا کے بیان کردہ منعم علیہم پر خدا نے جو جو انعام کئے ہیں اور قرآن مجید میں بڑے بسط کے ساتھ وہ مذکور ہیں (مثل اِظۡہَار عَلَی الۡغَیۡب[1] اور پھر تائید و نصرت اور خاص قسم کے غلبہ اور جذب و تزکیہ وغیرہ کے) اس پر صادق آجائیں اور جب یہ پایا جائے گا تو یہ عنوان بھی ضرور صادق آجائے گا اور جب یہ عنوان صادق آگیا تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ منعم علیہم سے ہے بلکہ فلاں قسم سے ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کا ما قبل کے ساتھ قواعد علم نحو کے لحاظ سے کیا تعلق ہے۔ پس اگر یہ اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ کی صفت ہے اور یہی حق ہے جیسا کہ میں نے اس فن کے بڑے جلیل القدر دو اماموں کا حوالہ دیا ہے۔

(**حکیم الامت**) تو اس صورت میں اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ الخ کا یہ خلاصہ مطلب بنے گا کہ جن قوموں اور امتوں پر انعام ہوتا ہے اور ان میں سے انبیاء وغیر ہم بنائے جاتے ہیں وہ دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ کہ جن پر یہ انعام دائمی رہے۔ کبھی اس انعام کے پانے سے محروم نہ ہوں اور نہ علاوہ محرومی کے خدا کے غضب کے نیچے آئیں۔ اور دوم وہ کہ ان کے شامت اعمال کی وجہ سے یہ انعام ان پر دائمی نہ رہے۔ آگے خواہ اسی پر بس ہو جائے کہ وہ اس انعام سے محروم ہو جائیں یا اس کے علاوہ مَغۡضُوۡب عَلَیۡہِمۡ بھی بن جائیں اور خداوند کریم نے دوسری قسم کے دونوں حصوں کی مصداق اور نظائر قرآن عظیم میں بیان فرمائے ہیں اور قرآن مجید اور احادیث نبویہ نے بڑی بھاری نظیر جو امت مرحومہ کی عبرت کے لئے پیش کی ہے وہ یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نصاریٰ تو پہلے حصہ کے مصداق ہیں

[1]۔ غیب سے آگاہ کرنا۔ (از مرتب)

اور یہود دوسرے حصہ کے۔ چنانچہ اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یہود ہیں اور ضَآلِّيْنَ نصاریٰ ہیں۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 555 مسند عدی بن حاتمؓ حدیث 19600 مطبوعہ عالم الکتب بیروت 1998ء)

پس خداوند کریم نے اس امت کو فاتحہ اور قرآن مجید میں یہ سمجھایا ہے کہ تم یہ دعا کرو کہ ہم کو پہلی قسم کا منعم علیہم بنا اور دوسری قسم کا نہ بنا، نہ اس کا پہلا حصہ اور نہ دوسرا۔ یعنی ہم کو ان منعم علیہم کے صراط مستقیم پر چلا جو کہ منعم علیہم ہونے کے بعد نہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ بنے ہوں اور نہ ضَآلِّيْنَ ہوئے ہوں۔

یہود و نصاریٰ کا سورۃ الفاتحہ میں ذکر:

(محمد سرور) کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جن یہود پر خداوند کریم نے کسی وقت انعام کیا تھا اور پھر وہ اپنے شامت اعمال سے اس انعام سے محروم کیا بلکہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ۔[1] (البقرۃ:91) اور بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔[2] (البقرۃ:62) وہ تو اس امر کے مدعی ہوں کہ قیامت تک انبیاء ہم میں سے ہوں گے لیکن جن کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی دعا سکھلا کر پہلے ہی سے یہ بتایا گیا تھا کہ تم میں یہ انعام دائمی رہے گا وہ اس بات کے قائل ہوں کہ قیامت تک ہم اس انعام سے محروم ہیں اور جو آئے گا وہ انہی مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یہود کا رشتہ دار ہو گا۔ پس اس سے بڑھ کر اور کون سی بد قسمتی ہو سکتی ہے اور اگر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ الخ کو ما قبل کی صفت نہ بنایا جائے جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو پھر خلاصہ مطلب یہ ہو گا کہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک منعم علیہم، دوم مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ، سوم ضَآلِّيْنَ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک کامیاب متمتع اور دوسرا جو کہ مطلوب تک پہنچ تو گیا تھا لیکن اپنی شامت اعمال کی وجہ سے وہ مطلوب اس سے ضائع ہو گیا ہے۔

---

[1] ۔ پس یہ لوگ غضب کے بعد غضب کا مورد ہو گئے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ وہ اللہ کے غضب کا مورد بن گئے۔ (تفسیر صغیر)

تیسرا جو کہ مطلوب تک پہنچ سکا ہی نہیں اور راستہ ہی میں بھول گیا ہے۔ تو خداوند کریم نے ان آیات میں امت مرحومہ کو فرمایا ہے کہ تم دعا مانگو کہ اے خدا ہم کو ان لوگوں کی سیدھی راہ پر چلا جو کہ منعم علیہم ہیں اور ان کی راہ پر ہرگز نہ چلا جو کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہیں یا ضَآلِّيْنَ ہیں۔ لیکن قرآن مجید سے پہلے معنوں کی تصدیق اور دوسرے معنوں کی تردید ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید میں یہود کے بارہ میں آیا ہے۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔[1] (البقرۃ:41) اور پھر انہی یہود کی نسبت فرمایا ہے بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔[2] (البقرۃ:62) اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یہود ہی مراد ہیں۔

(سنن الترمذی کتاب تفسیر القرآن باب ومن سورۃ الفاتحۃ الکتاب حدیث 2954)

پس چونکہ پہلی آیت کریمہ میں یہود کے لئے اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ آیا ہے۔ حالانکہ وہ دوسری آیتوں کے رو سے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ بھی ہیں۔ تو اس سے صاف صاف ثابت ہو گیا کہ اَنْعَمْتُ کے مفہوم میں یہ داخل نہیں کہ جو نعمت ملے وہ ہمیشہ اس سے متمتع بھی رہے۔ کیونکہ یہود کی نسبت اَنْعَمْتُ بولا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اس سے متمتع نہیں رہے بلکہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ بن گئے ہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہود ایسی قوم ہے کہ پہلے وہ منعم علیہ اور پھر مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہو گئی ہے۔ اور امر اوّل سے دوسرے معنوں کی تردید ہو جاتی ہے اور امر ثانی سے پہلے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔

تینوں گروہوں کے ذکر میں ترتیب:

اب رہی اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے درمیان ترتیب تو اوّل اور دوم کے درمیان تو وہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اوّل مقصود ہے جو لازم التقدیم ہے اور دوم اس کا مقابل ہے جو اس کے بعد مذکور ہونا چاہئے۔ نیز اوّل موصوف ہے اور دوم صفت ہے اور موصوف صفت پر مقدم ہوتا ہے۔ لیکن دوم اور سوم میں بظاہر ترتیب بالعکس معلوم ہوتی ہے کیونکہ ضال مرتبہ میں بھی مَغْضُوْب عَلَيْه سے کم ہے اور نیز

[1] ۔ اے بنی اسرائیل! میرے اس احسان کو یاد کرو، جو میں تم پر کر چکا ہوں۔ (تفسیر صغیر)
[2] ۔ وہ اللہ کے غضب کا مورد بن گئے۔ (تفسیر صغیر)

جو مَغْضُوْب عَلَیْہ ہو گا پہلے ضروری ہے کہ وہ کسی قسم یا درجہ کا ضال بنے۔ نیز ضال کے لئے مقصود تک پہنچنا ضروری نہیں اور مَغْضُوْب عَلَیْہ کے لئے ضروری ہے۔ اور یہ تینوں امور چاہتے ہیں کہ ان میں ترتیب بالعکس ہو لیکن باوجود اس کے پھر بھی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ کو ضَآلِّیْنَ پر مقدم کیا ہے اور اس تقدیم کی بہت سی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ ہے کہ چونکہ المَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے مراد یہود ہیں اور ضَآلِّیْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ جیسا کہ قرآن عظیم اور حدیث رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کے لئے نصاریٰ پر تقدم زمانی حاصل ہے لہٰذا ذکر میں بھی مَغْضُوْب عَلَیْہِمْ یعنی یہود کو ضَآلِّیْنَ یعنی نصاریٰ پر مقدم کر دیا تا کہ ترتیب ذکری ترتیب زمانی کے مطابق ہو جائے۔

دوم یہ کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ اور ضَآلِّیْنَ کا یہاں پر ذکر کرنا بطور تقابل ہے اور منعم علیہ کا اصل مقابل مَغْضُوْبِ عَلَیْہ ہے لہٰذا اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کے بعد اس کو ذکر کیا گیا۔

سوم یہ کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ اور مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ طرفین ہیں اور ضَآلِّیْنَ درمیان میں واسطہ ہے اور جب تک طرفین نہ ہوں تب تک واسطہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا پہلے طرفوں کو ذکر کیا اور پھر واسطہ کو ذکر کیا۔

چہارم یہ کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ (یہود) ضَآلِّیْنَ (نصاریٰ) سے سخت کافر اور بدتر ہونے کی وجہ سے تقدیم کو چاہتے ہیں یعنی مَغْضُوْب عَلَیْہِم تو کیا ضَآلِّیْن کی راہ سے بھی بچا جو کہ ان سے کم درجہ پر ہیں۔

یہ وہ وجوہات ہیں جو کہ مفسرین نے لکھی ہیں لیکن جب کہ قرآن مجید اور حدیث صحیح دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے مراد یہود ہیں اور ضَآلِّیْنَ سے نصاریٰ مراد ہیں اور ظاہر ہے کہ یہود کی سب برائیوں کی جڑھ خدا کے فرستادوں کے ساتھ شوخی اور شرارت اور عناد سے پیش آنا ہے اور ان کو نہ ماننا ہے اور نصاریٰ میں رَأْسُ الْخَبَائِث[1] خدا کے ایک فرستادہ اور برگزیدہ پر بندہ کی محبت اور تعریف و مدح میں غلو و اطراء کرنا ہے اور ان دونوں کے یہاں پر ذکر کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ خداوند کریم امت محمدیہ ؐ کو سمجھاتا

[1]۔ برائیوں کی جڑ۔ (از مرتب)

ہے کہ تم میں منعم علیہم اور مَامُوْر مِنَ اللہ اور خدا کے برگزیدہ اور فرستادہ بندے ہوں گے۔ لہٰذا دعا مانگتے رہو کہ اے خداوند کریم ہم کو اس سے بچا کہ جب وہ آئیں تو ہم یہود کی طرح ان کے مخالف ہو جائیں اور ان کے مقابلہ میں شرارت اور شوخی سے کام لیں اور اس سے بھی بچا کہ جب وہ آئیں تو ان کو مان کر پھر نصاریٰ کی مانند ان کی محبت اور مدح سرائی کے غلو اور اطراء کے وبال کے جال میں پھنس کر اس انعام سے محروم رہ جائیں جو کہ ان کے ماننے پر مرتب ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں ترتیب کے بالعکس ہونے کا وہم ہی کیونکر گزر سکتا ہے کیونکہ جب ان دونوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہوئے تو پھر یہاں پر ضلالت سے کوئی مطلق ضلالت مراد نہیں ہو سکتی جو کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ بننے سے پہلے ضروری ہوتی ہے بلکہ یہاں پر تو مراد وہ ہے جو کہ مذکورہ بالا مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں ہرگز پائی جاتی نہیں کیونکہ مذکورہ بالا مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں راستبازوں کی عناد ضروری ہے اور مذکورہ بالا ضَآلِّيْنَ میں ان کی محبت بلکہ محبت میں بے حد مبالغہ ضروری ہے اور یہ دونوں نہ ایک دوسرے سے پہلے ہوتے ہیں اور نہ جمع ہو سکتے ہیں۔ تو جب ضلالت مذکورہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے پہلے ہو سکتی ہی نہیں تو پھر اس کے پہلے لانے کا وہم ہی کس طرح ہو سکتا ہے بلکہ اسی بیان سے صاف صاف ظاہر ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ مقدم ہے کیونکہ جب کوئی فرستادہ آتا ہے تو پہلے ماننے نہ ماننے کا احتمال ہوتا ہے۔ پس اگر نہ مانا تو مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی راہ پر چل پڑا اور اگر مان لیا تو پھر اگر محبت میں اعتدال رکھا تو خیر اور اگر غلو کیا تو پھر ضال ہو گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ضال مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے دو مرتبہ بعد میں ہے۔ لہٰذا اس کو ذکر بھی بعد میں کرنا چاہئے۔ نیز حضرت امام علیہ السلام نے اپنی کتابوں میں بڑے بسط کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دجال (کہ جس کا فتنہ سب سے عظیم الشان اور آخری فتنہ ہے) اس کی خبر وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں دی گئی ہے۔ پس اس لحاظ سے بھی اس کا اخیر میں ہی ذکر کرنا موزوں ہے۔

سورۃ الفاتحہ خدا کی طرف سے عرضی اور قرآن عظیم کا متن:

(حکیم الامت) اب میں سورہ فاتحہ کے مطالب کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں یعنی اس سورت میں خدائے علیم و حکیم نے کیا کچھ بیان فرمایا ہے۔ جو عرضیں پیش کی جاتی ہیں۔

گاہے تو وہ ایسی ہوتی ہیں کہ رعایا خود اپنی عقل سے تجویز کر کے گورنمنٹ میں پیش کرتی ہے۔ اس میں بہت کچھ نقص کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہے مہربان گورنمنٹ خود عرائض کا ایک مسودہ رعایا کو دے دیتی ہے جس میں ان سب نقصوں سے امن ہوتا ہے جن کا پہلی قسم میں اندیشہ ہوتا ہے اور فاتحہ شریف بھی اسی قسم کی عرضی ہے جو کہ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ[1](ھود:46) پر اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ [2](یوسف:65) نے امت مرحومہ کو عنایت فرمائی ہے۔ دوم فاتحہ شریف قرآن عظیم کے لئے متن ہے۔

سورۃ الفاتحہ ام القرآن ہے:

محمد سرور۔ جیسا کہ خداوند کریم نے وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ۔[3](الحجر:88) میں فاتحہ کے مقابل قرآن مجید کو بوصف عظیم ذکر فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ فاتحہ قرآن صغیر ہے اور قرآن مجید اس کی نسبت قرآن عظیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سواء اس تقابل کے مقام کے قرآن مجید کو عظیم کے وصف سے ذکر نہیں کیا۔ اور جو صاحب اللہ کے فضل و کرم سے فاتحہ اور قرآن عظیم کے مطالب و مقاصد سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کا ہر ایک ٹکڑہ سورۂ فاتحہ کے کسی حصہ کی تفسیر اور شرح ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کا نام اُمُّ الۡقُرۡآن رکھا ہوا ہے جیسا کہ محکمات قرآنی کا نام اُمُّ الۡکِتَاب ہے۔ تو جب فاتحہ عرضی اور قرآن عظیم کا متن ہے تو اس کے مطالب پر دو رنگ سے بحث ہونی چاہئے ایک عرضی اور دعا ہونے کی حیثیت سے اور دوم متن قرآن عظیم یعنی جامع علوم قرآن مجید ہونے کے لحاظ سے۔ پہلے ہم پہلے لحاظ سے بیان کریں گے اور پھر دوسرے سے۔

سورۃ الفاتحہ جامع دعا:

پس واضح ہو کہ حدیث میں آیا ہے۔ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الۡعِبَادَۃِ۔

(سنن الترمذی کتاب الدعوات باب منہ حدیث نمبر 3371)

---

[1]۔ سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر (بہتر اور درست) فیصلہ کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور ہم نے یقیناً تجھے سات دہرائی جانے والی (آیات) اور (بہت بڑی) عظمت والا قرآن دیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

دعا عبادت کا مغز ہے اور یہ بالکل سچ ہے جس طرح جسم انسانی یا حیوانی مغز کے تباہ ہونے سے بالکل تباہ اور بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح جب عبادت میں دعا نہ رہے تو وہ بھی بالکل بے کار ہو جاتی ہے اور جس غرض کے لئے عبادت رکھی گئی ہے یا کی جاتی ہے وہ غرض اس پر ہر گز مرتب نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی لذت اور مزہ باقی رہتا ہے اور انسان کا قاعدہ ہے کہ جس کام میں نہ لذت ہو اور نہ اس پر وہ غرض اور فائدہ مرتب ہو کہ جس کے لئے وہ کیا جاتا ہے تو ضرور اس میں پہلے سست ہوتا ہے اور پھر آخر اس کو چھوڑ دیتا ہے اور چونکہ آثار فعل ہی اس فعل کے حق ہونے کے لئے دلیل ہوتے ہیں جو کہ عبادت میں مُخُّ الْعِبَادَت (دعا) کے نہ ہونے کے باعث پائے جاتے ہیں تو انسان عبادات کی حقانیت سے بھی منکر یا کم از کم مذبذب ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان کا قائل بلکہ داعی اور واعظ بھی بنا رہے اور دعا ہی ایک وہ چیز ہے جو کہ قبولیت کے بعد خدا کے وجود اور علیم وقدیر اور رحیم و سمیع ہونے کی تازہ ثبوت ہوتی ہے بلکہ خدا کا اور خدا کے صفات کاملہ کا مشاہدہ کراتی رہتی ہے جو کہ ایمان کی کھیتی کے لئے آب پاشی کا کام دے کر اس کو سرسبز رکھتی ہے۔ اور اگر دعا نہ ہو تو پھر ایمان کی کھیتی کی آب پاشی مفقود ہو کر انسان کے ایمان کا پودا خشک ہو جاتا ہے۔

خداوند کریم نے جہاں شرک یعنی اوروں کے معبود بنانے کی تردید فرمائی ہے وہاں پر فرمایا ہے فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ الخ (الاعراف:195) یعنی جن کی تم عبادت کرتے ہو اگر وہ اللہ کی مانند حقیقت میں معبود ہیں تو پھر تم ان سے دعا مانگو اگر وہ حقیقی معبود ہوئے تو ضرور اللہ کی مانند دعا سنیں گے اور قبول کریں گے لیکن وہ تو کبھی قبول نہیں کرتے جس سے صاف ثابت ہے کہ وہ معبود ہی نہیں ہیں۔ پس یہ آیت کریمہ اس بات کی شاہد ناطق ہے کہ حقیقی معبودیت کی دلیل اور علامت لازمہ یہ ہے کہ وہ دعائیں قبول کرے اور جو دعائیں قبول نہ کرے وہ فی الحقیقت معبود ہی نہیں۔ تو جب قرآن مجید کی بیان کردہ دلیل سے ثابت ہے کہ قبول دعا حقیقی معبود کے ساتھ لازم ہے۔ جس میں یہ ہو وہ معبود ہے اور جس میں یہ نہ ہو وہ معبود نہیں تو اس سے دو امر ثابت ہوئے ایک تو یہ کہ قبول دعا استحقاق

عبادت کی علت ہے اور دوم یہ کہ جو شخص دعا اور قبول دعا کا قائل نہیں وہ علاوہ خداوند کریم کی ایک ضروری صفت کے منکر ہونے کے (جو کہ استحقاق عبادت کی علت اور حقیقی معبود کی مثبت اور باطل معبودوں سے امتیاز دینے والی ہے) نہ لزوم عبادت اور نہ حقیقی معبود کا قائل رہ سکتا ہے کیونکہ لزوم عبادت اور اثبات معبود کی جو دلیل ہے وہ اس کا منکر ہے۔ پس اس کا ایمان تو ہرگز نہیں ہو سکتا جو کہ یقین اور تسلیم کا مجموعہ ہے بلکہ قائل بھی نہیں رہ سکتا اور اگر رہے گا تو اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمے ماند[1]۔

مسلمانوں کے تنزل کی پیشگوئیاں:

آج کل جو ناظرین مسلمانوں کی نسل کو مشاہدہ کر رہے ہیں کہ باوجودیکہ اسلام اور لزوم عبادت کے قائل ہیں لیکن کرتے کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ فی الحقیقت نہ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ لزوم عبادت پر ان کو یقین حاصل ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جب دنیا کے کمزور مجازی حکام کی اطاعت کے وجوب کا ان کو علم حاصل ہو جاتا ہے تو کبھی بھی ان کے روبرو خلاف ورزی تو کیا سستی اور تکاسل اور تساہل تک بھی نہ کرتے ہیں اور نہ روا سمجھتے ہیں بلکہ طبیعت ہی ان کو مجبور کرتی ہے کہ بڑی چستی اور ہوشیاری سے اس وقت مفوضہ خدمات اور آداب کو بجالائیں اور خدا کے معبود حقیقی ہونے اور اس کی عبادت اور اطاعت کے لزوم ووجوب اور اس کے عالم الغیب اور حاضر وناظر اور قادر مطلق ہونے پر یقین کامل رکھ کر اس کی عبادت اور اطاعت کی پرواہ تک نہ کریں۔

پس سچی اور بالکل سچی بات یہی ہے کہ ان کے دل میں ان امور پر یقین نہیں اگرچہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس کا ادعاء کرتے ہیں کیونکہ دعا پر ایمان نہ ہونے اور مُسْتَجَابُ الدَّعَوَات صادقوں کی معیت چھوڑنے سے نہ اپنی قبولیت دعا کے نظائر ان کے ایمان کی جڑھ کو مضبوط اور سرسبز رکھ سکتے ہیں اور نہ صادقوں کی قبولیت دعا کے مشاہدات اس کے لئے نعم البدل یا بدل ہو سکتے ہیں۔

خدائے علیم نے سورۂ بنی اسرائیل میں پہلے معراج کے ذریعہ سے اہل اسلام

[1]۔ اگر زندہ رہنا ہے تو ایک ہی رات زندہ رہو کہ پھر دوسری رات کی نوبت نہ آئے۔ (از مرتب)

کا عروج بتایا پھر بنی اسرائیل کی نسبت لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ[1] الخ (بنی اسرائیل:6،5) بیان فرما کر اہل اسلام کا مکرر تنزل بیان فرمایا اور سورۂ کہف کے فواتح اور خواتیم سے اور اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ[2] الخ (الکہف:95) سے یہ بتایا کہ اہل اسلام کا آخری تنزل دجال کے ہاتھ سے ہو گا جو کہ ابن اللہ کے قائل اور صنعت والے ہوں گے اور وہی یاجوج ماجوج ہیں اور ان کی ہر ایک چیز پر کچھ رقم اور تحریر ضرور ہو گی ان کے ساتھ عموماً کتا ہو گا اور ان کی کوٹھیں شمال مغرب رو ہوں گی اور بڑی مہیب اور بارعب ہوں گی وَغَيْرُ ذَالِكَ۔ اس کے بعد سورہ مریم میں بتایا کہ جنگ کے ساتھ اہل اسلام ان پر غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ ان کا غلبہ محض دعا سے ہو گا اور اگرچہ بادی النظر میں یہ ایک اَن ہونی بات معلوم ہو گی پر جس طرح زکریاؑ کو محض دعا کے طفیل خارق عادت طور پر یحییٰؑ جیسا برخوردار دیا اور مریمؑ کو غیر معمولی طور پر محض دعا سے مسیحؑ جیسا برخوردار ملا اسی طرح اہل اسلام کا دجال اور یاجوج ماجوج پر آخر غالب آنا بھی محض دعا کے ساتھ خارق عادت طور پر ہو گا۔

موجودہ نسل دعا سے انکاری ہیں:

پس خدائے علیم نے تو یہ غلبہ محض دعا سے بتایا ہے لیکن آج کل دنیا میں وہ مدعیان اسلام بھی موجود ہیں جو کہ ایک ایسی نسل کو اس غلبہ اور کامیابی کا بیج یقین کرتے ہیں کہ جس کو برملا طور پر انکار دعا اور قبول دعا کا سبق دیا گیا ہے اور اس انکار کو اب کھلے طور پر وہ دنیا میں شائع کرتی ہیں اور لوگ ان کو کامیابی کی کلؔ کے پرزے خیال کرتے ہیں پر سچی بات یہ ہے کہ این راہ کہ تو مے روی بہ ترکستان است[3]۔ تعجب ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ

---

[1]۔ تم یقیناً اس ملک میں دوبار فساد کرو گے اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی (اختیار) کرو گے۔ اور جب ان دو (بار کے فسادوں) میں سے پہلی (بار) کا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آیا تو ہم نے بعض اپنے ایسے بندوں کو (تمہاری سرکوبی کے لئے) تم پر (مستولی کر کے) کھڑا کر دیا جو سخت جنگجو تھے۔ اور وہ تمہارے گھروں کے اندر جا گھسے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ یاجوج وماجوج یقیناً اس ملک میں فساد پھیلا رہے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ جس راہ پر تو گامزن ہے وہ تو ترکستان کو جاتا ہے (یعنی جو کام تو کر رہا ہے اس سے تیرا مقصد پورا نہیں ہو گا)۔ (از مرتب)

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ[1] کے مدعی اور پھر خدا کی سب کتابوں کی متفقہ شہادت کو پاؤں کے نیچے کچل کر دعا اور قبول دعا سے انکار اور اسلام کا دعوے اور سب انبیاء اور ان کے خلفاء اور نواب کی متفقہ شہادت پر تھوک کر دعا اور قبول دعا اور اس کے قائلوں سے تمسخر اور استہزاء گرولی اینست لعنت برولی[2]۔

قرآن مجید نے دعا اور قبول دعا کے جو نظائر بیان فرمائے ہیں انہوں نے اس امر کی ہرگز گنجائش نہیں چھوڑی کہ کوئی شخص قرآن مجید کے کتاب اللہ ہونے کا قائل ہو کر کسی تاویل اور چالبازی سے قبول دعا کا انکار کر سکے یا قرآن مجید کا منکر ہو کر قبول دعا کے دلائل کی تردید کر سکے بلکہ اس کے اثبات کا اس خدائے حکیم نے ایسا تعہد کیا ہے کہ ہر ایک زمانہ میں خداوند کریم اپنا کوئی ایسا بندہ مبعوث فرما دیتا ہے جو کہ اپنی دعاؤں کے دم نقد نظائر سے ان دشمنان قوم بلکہ بنی نوع کے بیخ کنوں کا ناطقہ بند کر سکے۔ وہ نظائر تو بہت ہیں لیکن نمونہ کے طور پر کچھ لکھے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں جہاں کلی طور پر سب رسولوں اور ان کے مقابلوں کے مقابلہ کا حال اور انجام بیان فرمایا ہے وہاں پر وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِرُسُلِھِمْ لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ[3] الخ (ابراہیم:14) کے بعد فرمایا ہے وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ۔[4] (ابراہیم:16) جس سے صاف صاف ثابت ہے کہ دعا کی اور وہ قبول ہوئی اور اس کے ساتھ وہ ہلاک اور ناکام ہوئے۔

پھر قرآن مجید میں جن رسولوں کا نام لیا گیا ہے ان کی نسبت اس دعا کی تصریح تفصیلاً بھی آئی ہے جیسا آیا ہے فَدَعَا رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ۔ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْھَمِرٍ[5] الخ (القمر:11 تا 12) اور فرمایا فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَھُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

---

[1]۔ میں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔ (از مرتب)

[2]۔ اگر ولی ایسے ہوتے ہیں تو ایسے ولی پر لعنت۔ (از مرتب)

[3]۔ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے (اپنے زمانہ کے) پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمہیں ضرور اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ اور انہوں نے (اپنی) فتح کے لئے دعا کی اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) ہر ایک سرکش (اور) حق کا دشمن ناکام رہا۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ آخر اس نے اپنے رب سے دعا کی اور کہا، مجھے دشمن نے مغلوب کر لیا ہے، پس تو میرا بدلہ لے۔ جس پر ہم نے بادل کے دروازے ایک جوش سے بہنے والے پانی کے ذریعہ سے کھول دیئے۔ (تفسیر صغیر)

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ۔[1] (الشعراء:119 تا121) پھر حضرت لوطؑ کی دعا کی نسبت فرمایا قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ۔[2] (العنکبوت:31) اور قبولیت کی نسبت فرمایا وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔[3] (العنکبوت:36) اور حضرت شعیبؑ کی دعا یوں بیان فرمائی ہے رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ۔[4] (الاعراف:90) اور قبولیت کو اس طور پر ظاہر کیا فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔[5] (الاعراف:79) اور حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کی دعا یہ ذکر کی۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔[6] (یونس:89) اور قبولیت کی خبر دی۔ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا[7] الخ (یونس:90) وَعَلٰى هٰذَا الْقِيَاسْ۔

پھر حضرت زکریاؑ کی دعا ذکر کی ہے جو کہ صالح بیٹے کے لئے تھی چنانچہ فرمایا۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا۔ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔[8] (مریم:4 تا7) اور قبولیت بتائی

---

[1]۔ پس تو میرے اور ان کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر۔ اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو (دشمن کے) شر سے بچا لے۔ پس ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ (شر سے) بچالیا۔ پھر اس کے بعد جو باقی لوگ تھے ان کو غرق کر دیا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اے میرے رب! مفسد قوم کے خلاف میری مدد کر۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اور ہم نے اس بستی کے (واقعہ) کے ذریعہ سے ایک کھلی عبرت کا سامان عقل والے لوگوں کے لئے پیچھے چھوڑا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان سچ کے مطابق فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ اس پر ان کو زلزلہ نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے رہ گئے۔ (تفسیر صغیر)

[6]۔ اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو برباد کر دے اور ان کے دلوں پر بھی سزا نازل کر جس کا یہ نتیجہ نکلے کہ جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں ایمان نہ لائیں۔ (تفسیر صغیر)

[7]۔ (اس پر اللہ نے) فرمایا، تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔ (تفسیر صغیر)

[8]۔ جب اس نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا۔ (اور) کہا، اے میرے رب! (میری حالت تو یقیناً ایسی ہے کہ) میری تمام ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں اور (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے اور اے میرے رب! میں کبھی بھی تجھ سے دعائیں مانگنے کی وجہ سے ناکام (و نامراد) نہیں رہا۔ اور میں یقیناً اپنے رشتہ داروں سے اپنے (مرنے کے) بعد (کے سلوک

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اِسْمُهٗ یَحْیٰی[1] الخ۔ (مریم:8)

پھر ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی دعائیں ذکر فرمائیں۔ چنانچہ فرمایا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔[2] (البقرۃ:127) رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ۔[3] (ابراہیم:38) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔[4] (ابراہیم:40) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔[5] (البقرۃ:129) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ[6] (البقرۃ:130) وَغَیْرُ ذَالِكَ۔ اور دنیا گواہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ سب دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ چنانچہ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا[7] (البقرۃ:127) کی نسبت پہلے سے خبر دی ہوئی ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔[8] (آل عمران:98)

سے) ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، پس تو مجھے اپنے پاس سے ایک دوست (یعنی بیٹا) عطا فرما۔ جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب (سے جو دین و تقویٰ ہم کو ورثہ میں ملا ہے اس) کا بھی وارث ہو۔ اور اے میرے رب اس کو (اپنا) پسندیدہ (وجود) بنائیو۔ (تفسیر صغیر)

[1]۔ (اس پر اللہ نے فرمایا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی خبر دیتے ہیں (جو جوانی کی عمر تک پہنچے گا اور) اس کا نام (خدا کی طرف سے) یحییٰ ہو گا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اے میرے رب اس (جگہ) کو ایک پر امن شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو بھی اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان لائیں انہیں (ہر قسم کے) پھل عطا فرما۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی لا بسایا ہے اے میرے رب! (میں نے ایسا اس لئے کیا ہے) تا وہ عمدگی سے نماز ادا کریں۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے۔ (تفسیر صغیر)

[4]۔ ہر (قسم کی) تعریف کا اللہ ہی مستحق ہے۔ جس نے (میرے) بڑھاپے کے باوجود مجھے (دو بیٹے) اسماعیل اور اسحاق عطا کیے ہیں۔ میرا رب (بہت ہی) دعائیں سننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[5]۔ اے ہمارے رب! اور (ہم یہ بھی التجا کرتے ہیں کہ) ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (بندہ) بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنی ایک فرماں بردار جماعت (بنا)۔ (تفسیر صغیر)

[6]۔ اور اے ہمارے رب! (ہماری یہ بھی التجا ہے کہ تو) انہی میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے۔ (تفسیر صغیر)

[7]۔ اس (جگہ) کو ایک پر امن شہر بنا دے۔ (تفسیر صغیر)

[8]۔ جو اس میں داخل ہو وہ امن میں آجاتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

اور وَارْزُقْهُمْ اور فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً الخ کی نسبت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ[1] الخ (آل عمران:98) پس کون ہے کہ ان دعاؤں کا یا ان کی قبولیت کا انکار کر سکے یا قبول دعا میں اپنی چالاکی سے کوئی تاویل کر سکے کیا اتفاقیات ایسے ہوا کرتے ہیں۔

ساری دنیا اگر بیت اللہ کے امن اور حج و حرمت کی قبولیت کی نظیر اتفاقیات میں دکھانا چاہے تو ہرگز نہیں دکھا سکتی۔ کیا کوئی ایسی وادی کا ایسا ذی امن اور معزز مکان بتا سکتا ہے کہ جس کا حج فرض ہو اور پھر پہلے سے اس کی نسبت یہ خبر بھی دی گئی ہو کہ ہمیشہ یہ ایسا ہی رہے گا اور پھر یہ سارا اتفاق ہو یا محمد رسول اللہؐ جیسے پوتے کی کسی نے اتفاقاً پہلے خبر دی ہو جو آیاتُ اللہ اور مُعَلِّمُ الْكِتَابِ وَالْحِكْمِ[2] اور مزکی عالَم ہو۔ ہرگز نہیں۔ پس یہ وہ نظائر ہیں جو دعا کے اثبات کے لئے کافی ہیں لیکن خداوند کریم ایسے نظائر کے دکھانے کے لئے ہمیشہ اہل اسلام میں اپنا کوئی بندہ مبعوث فرمایا کرتا ہے اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ اس دجالی زمانہ میں دعا کا بڑے زور سے انکار کیا جائے گا۔ لہٰذا اس زمانہ میں بہت بڑا مُسْتَجَابُ الدَّعَوَات مسیح مبعوث فرمایا ہے جو کہ اپنی عظیم الشان فتح کی بناء تیغ وسنان پر نہیں بتاتا بلکہ اپنی فتح کے اسلحہ دعا میں منحصر بتاتا ہے۔ بدبخت گروہ ہمیشہ اپنے انکار پر تلا رہتا ہے اور یہی اس کی ہلاکت دارَین کا موجب ہوتا ہے پر خدا کے فرستادوں کا کام حجت کا پورا کرنا ہوتا ہے لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (الانفال:43) (تاکہ جو ہلاک ہو تو دلیل میں سے اور جو زندہ ہو وہ بھی کھلی دلیل سے) پورا ہو جائے۔ خدا کے اس فرستادہ نے بھی دنیا پر حجت پوری کر دی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے مدعیان اسلام میں سے جو جماعت کہ انکار دعا کی کھلی کھلی مدعی ہے اس کے بانی اور پیر و مرشد پر حجت پوری کرنے کے لئے خدا کے فرستادہ نے خاص طور پر اپنی تحریر شائع کی اور ایسے نمونے استجابت دعا کے پیش کئے کہ جن میں انکار یا تاویل کی گنجائش قطعاً نہ تھی۔ تو اس پر کامل طور سے حجت پوری ہو گئی اور اس کی ساری منطق کا ناطقہ بند ہو کر مبہوت رہ گیا اور ایسے لوگ اگرچہ باوجود حجت پوری ہونے کے اپنے

[1]۔ اور اللہ نے لوگوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اس گھر کا حج کریں۔ (تفسیر صغیر)
[2]۔ کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والا۔ (از مرتب)

پہلے بزرگ کے مطابق وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (النمل:15)(ظلم و تکبر سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کی جانیں ان پر یقین رکھتی ہیں) کے مصداق ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کی فطرت قائل ہو چکی ہوتی ہے جیسا کہ اتمام حجت کا مقتضاء ہے لہٰذا قضاء وقدر کی بعض مجبوریوں کے وقت اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى۔[1](طٰہٰ:71) اور فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ[2](العنکبوت:66) کے موافق ان کی زبان فطرت اور دل کے موافق بول اٹھتی ہے اگرچہ آلْئٰنَ الخ (یونس:92)(کیا اب تو ایمان لایا ہے) کا جواب پاکر اقرار سے کچھ فائدہ نہیں پاتے اور خداوند کریم اس لئے ایسا کرتا ہے تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ ان پر حجت پوری ہو چکی ہے اور ان کا دل اس پر یقین کر چکا ہوا ہے کہ جس کا ظلم وعلو کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں اور یہ کہ وہ اس دعوے میں کاذب ہیں کہ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (ھود:92)(ہم تیری بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتے) اور قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (البقرۃ:89) (ہمارے دل غلافوں میں ہیں) اور اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (ھود:63)(بے شک ہم تردّد میں ڈالنے والے شک میں ہیں) بلکہ یہ خوب جان چکے ہیں اور محض شرارت سے مکذبانہ طریق سے زبانی انکار کر رہے ہیں۔

اسی طرح اس پیر و مرشد کو قضاء وقدر نے ان ہی ایام میں اسی طرح مجبور کیا کہ اپنے ظاہری دعوے کے خلاف اور دلی یقین کے مطابق استدعا دعاء بوساطت کر چکا اور اس کی وہ تحریر اب تک محفوظ رکھی ہوئی ہے اور خدا کے فرستادہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ عام طور پر ساری دنیا کے سامنے اپنی استجابت دعا کے وہ نظائر پیش کئے ہیں کہ جن کے ہر ایک طبقہ اور ہر ایک فرقہ کے ہزاروں بلکہ لاکھوں شاہد رویت ہیں اور آپ کے خدام جو کہ اس وقت کئی لاکھ ہیں وہ بھی پہلے انہی فرقوں میں سے کسی ایک فرقہ میں سے تھے پر ان نظائر استجابت دعا کو مشاہدہ کر کے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ[3](الاحقاف:11) کی

---

[1]۔ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔(تفسیر صغیر)

[2]۔ اور جب وہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنی عقیدت کو خالصتہ اللہ کے لئے کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔(تفسیر صغیر)

[3]۔ باوجود اس کے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ (یعنی موسیٰ) گواہی دے چکا ہے کہ اس کی مانند ایک شخص ظاہر ہوگا۔(تفسیر صغیر)

طرح قبولیت دعا پر سچا ایمان لا کر بلکہ خود صاحب تجربہ ہو کر شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ[1] (البقرۃ:144) ہیں اور پھر علاوہ اس کے بار بار دنیا کو آزمائش کے لئے مدعو کیا اور سب عرب و عجم اور خواص و عوام کو دعا میں مقابلہ کرنے کے لئے چیلنج دیا اور سب پر اتمام حجت کر دیا۔

خدا ساری دعائیں قبول نہیں کرتا:

رہا یہ سوال کہ پھر سب نے مانا کیوں نہیں تو اس کا جواب پہلے راستبازوں اور ان کے عصر کے لوگوں کے حالات سے بخوبی مل سکتا ہے۔ خدا کے ہر ایک فرستادہ نے اپنے مفوضہ کار خدمت کے لئے کافی سے زائد اتمام حجت کیا لیکن سب نے ہر گز نہیں مانا۔ حضرت موسیٰؑ نے بیشک اتمام حجت کیا۔ پر فرعون اور فرعونیوں نے اسی وقت اٰمَنْتُ منہ سے نکالا جب کہ اس جواب کے مستحق ہو گئے کہ اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ[2] (یونس:92) اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے اتمام حجت کیا لیکن سب کے تسلیم کرنے کا مسئلہ ایک صلیب کے واقعہ ہی سے حل ہو جاتا ہے اور یہ نہیں کہ اس بارہ میں ہم گزشتہ قصص ہی سناتے ہیں نہیں خدا کا وہ فرستادہ ابھی تم میں موجود ہے اور ابھی اس نے اس مقابلہ سے نہ ہتھیار اتارے ہیں اور نہ پیٹی کھولی اور نہ تلوار میان میں ڈالی ہے اور نہ چلہ اتارا ہے اور نہ اس نے خدمت مفوضہ سے پہلو تہی کی ہے اور نہ تھکا یا سست ہوا ہے لیکن جو انکار کی ٹھان بیٹھے ہیں وہ نہ کبھی پہلے سامنے آئے اور نہ انہوں نے کبھی ارادت کا قدم اٹھایا اور نہ اب ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ ایسا کریں گے بلکہ اگر کسی دوسرے سے اس ارادت کی بو سونگھیں گے یا جُست وجُو کا شائبہ اس میں محسوس کریں گے تو خَنَّاسُ الْجِنَّةِ وَالْاِنْسِ[3] کی طرح وسوسہ ڈالنے کے ارادہ سے کہہ دیں گے میاں اگر وہ مستجاب الدعوات ہے جیسا کہ دعوے کرتا ہے تو پھر فلاں امر میں اس کی دعا کیوں قبول نہ ہوئی یا ان کا فلاں آدمی کیوں مر گیا یا ان کا فلاں مطلب کیوں ہاتھ نہ آیا یا فلاں مقصود اب تک کیوں حاصل نہیں ہوا۔

---

[1]۔ (دوسرے) لوگوں کے نگران بنو۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ کیا (تو) اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ جن وانس میں سے وسوسہ ڈالنے والے۔ (از مرتب)

پس اگر وہ شخص اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ[1] (الناس:2تا5) نہ پڑھنے والا ہوا تو ان کے دام تزویر میں آکر ابدی ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے اور اگر یہ پڑھنے والا ہوا تو اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ[2] (الاعراف:202) کے مطابق چوکس ہو جاتا ہے اور افعال الٰہی اور دوستوں اور محبوں کے حالات کی تیز کلہاڑی سے ان کے اس شبہ کی جڑھ کاٹ دیتا ہے کیونکہ افعال الٰہی پر غور کرنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک دعا کا قبول ہونا نہ ضروری ہے اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند کریم اپنے بندوں سے کلام کرتا ہے یا بقول ان کے کرتا تھا تو یہ نہیں کہ ہر وقت اور ہر ایک امر کے متعلق کلام کرتا رہتا تھا۔

پھر خدا اپنے رسولوں کو غیب پر مطلع کرتا ہے یا ان کے زعم کے مطابق کرتا تھا تو ایسا ہرگز نہیں کہ ہمیشہ اور ہر ایک کلی اور جزئی امر کی نسبت ایسا کرتا ہو اور نہ ایسا کرتا ہے یا کرتا تھا کہ جس امر کی بابت وہ چاہیں تو خداوند کریم ضرور اس کی نسبت ان سے کلام کرتا ہے یا کرتا تھا یا اس کی نسبت غیب پر مطلع کرتا ہے یا کرتا تھا بلکہ جہاں چاہتا ہے کرتا ہے اور جہاں نہیں چاہتا اور اس کی حکمت غامضہ اس کی مقتضی نہیں ہوتی تو نہیں کرتا اور نہ کرتا تھا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ بارش اور موسم اور وقتوں وغیرہ کا حال ہے اور کوئی نہیں کہ اس سے یہ کہہ دے کہ پھر خداوند کریم بالکل یہ امور کرتا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی انسان کا کوئی دوست ہوتا ہے۔ یا اس کو اس کی خاطر منظور ہوتی ہے تو بے شک وہ اس کی بہت سی باتیں اور فرمائشیں مانا کرتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں کہ سب کی سب ہی مان لے بلکہ بعض اوقات بجائے خود ماننے کے اپنی منواتا ہے تو جب دو انسان دوستوں میں بھی ایسا

---

[1]۔ کہ میں تمام انسانوں کے رب سے (اس کی) پناہ طلب کرتا ہوں۔ (وہ رب) جو تمام انسانوں کا بادشاہ (بھی) ہے۔ اور تمام انسانوں کا معبود (بھی) ہے۔ (میں اس کی پناہ طلب کرتا ہوں) ہر وسوسہ ڈالنے والے کی شرارت سے۔ جو (ہر قسم کے وسوسے ڈال کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اس وقت تقویٰ اختیار کیا جب ان کو شیطان کی طرف سے آنے والا کوئی خیال محسوس ہوا اور وہ ہوشیار ہو گئے اور ان کی آنکھیں کھل گئیں (وہ ہدایت پا جاتے ہیں)۔ (تفسیر صغیر)

ہوتا ہے تو کیا اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ[1] (ھود:46) ہی کو ایسا کمزور خیال کرنا چاہئے کہ وہ اپنے پیارے بندے کی ضرور سب ہی مانتا جائے۔

خداوند علیم و حکیم نے تو پہلے ہی سے اس کا فیصلہ کر دیا ہوا ہے کیونکہ جیسا اس نے اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ۔[2] (المؤمن:61) میں قبول دعا کی خبر دی ہے۔ اسی طرح اس نے وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ۔ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (البقرۃ:156 تا157) (ترجمہ) اور ضرور ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک اور مال و جان اور پھلوں کے ساتھ ابتلاء میں ڈالیں گے اور خوشخبری دے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) فرما کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ بعض اوقات ان کو ہماری بھی ماننی پڑے گی۔

غرض کہ نہ یہ ضروری ہے کہ خداوند کریم سب دعائیں کسی کی قبول فرمائے اور نہ یہ کسی کا دعویٰ ہے تاکہ اعتراض ہو کہ فلاں دعا کیوں قبول نہیں ہوئی اور نہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب بعض قبول ہوتی ہیں اور بعض نہیں تو پھر کیونکر معلوم ہو گا کہ یہ قبولیت دعا ہے اور اتفاق نہیں ہے کیونکہ نہ یہ کلیہ ثابت ہے کہ ہر ایک چیز کی شناخت تب ہی ہوتی ہے کہ وہ کلی طور پر ہو اور نہ خصوصاً دعا کی نسبت عقلاً یا نقلاً یہ ثابت ہوا ہے کہ اس کی شناخت تب ہی ہو سکتی ہے کہ سب ہی دعائیں قبول ہوں اور سواء اس کی نہیں ہو سکتی بلکہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ سواء اس کے بھی شناخت ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی ہے اور اس کے بہت سے طریق ہیں جن میں سے اس وقت میں ایک بیان کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بہت سے اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خداوند کریم اپنے بندہ کی دعا قبول کر کے پہلے ہی سے اپنے بندہ کو خبر دے دیتا ہے کہ میں نے تیری یہ دعا منظور کر لی ہے اور تیرا یہ مدّعا ہو جائے گا حالانکہ ظاہری حالات اس کے مخالف ہوتے ہیں اور مادی نظر والے اور اسباب پرست اس کے نہ

[1] ۔ سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر (بہتر اور درست) فیصلہ کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ مجھے پکارو، میں تمہاری دعا سنوں گا۔ (تفسیر صغیر)

ہونے اور کبھی نہ ہو سکنے کی رائے پاس کرتے ہیں لیکن وہ بندہ خدا کی بات پر پورا پورا یقین رکھ کر بڑے متحدیانہ الفاظ میں اپنی دعا کے مقبول ہونے اور مدعا کے ہو جانے کی اشاعت کرتا ہے اور پھر ایک عرصہ کے بعد ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ خدا کے راستباز بندوں نے شائع کیا ہوتا ہے۔

اس کی بڑی واضح مثال انبیاء علیہم السلام کی وہ دعا ہے جو کہ میں اسی مضمون کے اوّل میں بیان کر چکا ہوں کہ انبیاءؑ پہلے اپنی فتح اور غلبہ کی دعا مانگتے رہے ہیں اور پھر خداوند کریم سے اس کی قبولیت کی خبر پا کر قبل از وقت اپنی فتح اور غلبہ کی خبر اور مخالفوں کے ناکام اور مغلوب ہونے کی پیشگوئی عَلٰی رُؤُوْسِ الْاَشْھَاد شائع کرتے رہے ہیں اور پھر دنیا جانتی ہے کہ ان کے کہنے کے مطابق وہ مظفر و منصور اور مخالف ناکام و مغلوب ہوتے رہے ہیں اور کبھی اس کے خلاف نہیں ہوا۔

اگرچہ قبل اس کے سب مادہ پرست اور اسباب کے بندے بالاتفاق بڑے دعوے اور وثوق سے ان کے خلاف رائے دیتے ہیں اور بغلیں بجا بجا کر کہتے ہیں اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ. وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ (الشعراء:55 تا56) ترجمہ بے شک یہ ایک قلیل گروہ ہے اور یہ ہمیں غضب دلاتا ہے۔ اور یہ کہ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراہیم:14) ترجمہ ضرور ہم تم کو اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ گے۔ اور یہ کہ لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (یٰس:19) ترجمہ ضرور ہم تم کو پتھراؤ کریں گے اور تم کو ہم سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ پس یہ ایسی صورت ہے کہ جس میں بالکل اشتباہ رفع ہو جاتا ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں کسی اتفاق اور اسباب والے نے اپنی کامیابی اور فتح کا ایسا متحدیانہ دعویٰ شائع کیا ہو اور پھر اس کو بیّن فتح اور کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ ہرگز نہیں۔ اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ نہ کبھی ایسا ہوا اور نہ کوئی ایسا ثابت کر سکتا ہے۔ پھر اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی کعبہ اور آنحضرتؐ کی نسبت دعا اور حضرت زکریاؑ کی اس یاس کی حالت میں بیٹے کے لئے دعا یہ سب اسی قسم کی ہیں۔

پس جب دعا مُخُّ الْعِبَادَت (عبادت کا مغز) ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں اور ان کی

قبولیت کے اسی قدر معنے نہیں کہ اور عبادتوں کی طرح ان پر بھی ثواب مل جاتا ہے بلکہ علاوہ ازیں خداوند کریم وہ مدعا دے دیتا ہے کہ جس کے لئے دعا مانگی جاتی ہے تو اس سے صاف ثابت ہوا کہ دعا حصول مقاصد کا زینہ اور سب کامیابیوں کی جڑھ اور نہایت ضروری امر ہے۔ اس ضرورت کے ساتھ جب اس بات پر بھی نظر کی جائے (کہ انسان کس قدر عاجز ہے اور اسباب حصول مقاصد کے لئے مستقل علت نہیں ہیں اور پھر حصول مقاصد کے لئے بہت سے موانع ہوتے ہیں جن کا رفع کرنا انسان کے ہاتھ سے باہر ہوتا ہے بلکہ ان کا رفع کرنا قدرت کے ہاتھ میں پھر اسباب میں سے بھی کچھ حصہ قدرتی ہوتا ہے کہ جس کا مہیا کرنا انسان کے قبضہ میں ہر گز نہیں ہوتا بلکہ خداوند قدیر کے اختیار میں ہوتا ہے اور پھر بعض اوقات مقصد حاصل ہو کر پھر کوئی ایسی قدرتی آفت آپڑتی ہے کہ انسان اس سے متمتع نہیں ہو سکتا تو پھر علاوہ دعا کی اشد ضرورت ثابت ہونے کے اس امر کی ضرورت بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر ایک مقصود یا کم از کم ہر ایک مہم مقصود اور بڑے کام کی ابتداء میں دعا ہونی چاہئے تا کہ دعا کی قبولیت کے بعد خدا کی مشیت اور ارادہ اور تائید شامل حال ہو کر انسان کے ضعف اور اسباب کی بے استقلالی کا جبر نقصان ہو کر اور اسباب مہیا اور موانع رفع ہو کر مقصود حاصل ہو جائے اور حصول کے بعد انسان اس سے متمتع ہو اور انسان کے لئے بابرکت ہو۔ لہٰذا خدائے علیم و حکیم نے اپنی جامع اور کامل کتاب کے افتتاح میں دعا سکھلا کر یہ بتایا کہ ہر ایک مقصد کا افتتاح دعا سے کیا کرو اور یہ بھی کہ اس کتاب کے جاننے کے لئے دعا ضروری ہے۔

اسلام میں استخارہ کا طریق:

صحیح حدیث اور سنت رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین سے ثابت ہے کہ ہر ایک مہم مقصد کے شروع سے پہلے استخارہ کیا جائے جس کے معنے ہیں خیر مانگنا جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک مہم مقصد کے شروع میں دعا خیر مانگنی مسنون ہے۔ لیکن بد قسمتی سے آج کل کے مدعیان اسلام نے استخارہ کے یہ معنے یقین کر رکھے ہیں کہ پہلے خبر ہو جاتی ہے کہ یہ کام کرنا چاہئے یا نہ اور یہ اعتقاد ان میں ایسا عام ہوا ہے کہ مثال کے طور کہا کرتے

ہیں۔ در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست [1]۔ حالانکہ شریعت نے کار خیر ہی میں استخارہ کا حکم دیا تھا نہ کار شر میں۔ اور یہ صریح غلط اور خلاف شرع مقولہ اسی وجہ سے ان میں ضرب المثل بنا ہے کہ انہوں نے استخارہ کے معنے غلط لئے ہیں کیونکہ استخارہ کا لفظ خیر سے ہے جس کے معنے ہیں خیر مانگنا اور اگر یہ مطلب ہوتا جو انہوں نے اعتقاد کر رکھا ہے تو اس کا نام استخارہ کبھی نہ ہوتا بلکہ استخبارہ ہوتا جو کہ خبر سے ہے اور جس کے معنے ہیں خبر مانگنا۔ بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ استخارہ کے یہ معنے یقیناً غلط ہیں اور ان فاسد معنوں کی بنا پر جو مذکورہ بالا مقولہ ان میں مشہور ہے وہ بھی صراحتاً غلط ہے بلکہ کار خیر ہی وہ چیز ہے کہ جس کے لئے استخارہ مسنون کیا گیا ہے۔

قرآن کے شروع کرتے وقت دعا ضرور مانگنی چاہئے:

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہر ایک مہتم بالشان امر اور خصوصاً قرآن مجید کے شروع کے وقت دعا ضرور مانگنی چاہئے تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ہر ایک انسان اپنے فہم کے مطابق خود ایک دعا تجویز کر کے مانگ لیا کرے۔ دوم یہ کہ وہ مہربان اور علیم و حکیم خدا خود ہی ایک جامع دعا سکھلا دے۔ پہلی صورت میں علاوہ اور نقصوں کے دو بڑے بھاری نقص تھے جن میں سے ایک تو وہ ہے کہ جس کی طرف قرآن مجید کی دو آیتوں میں اشارہ ہے اوّل یہ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ [2] (بنی اسرائیل:12) یعنی انسان بعض اوقات ایسی غلط راہ اختیار کرتا ہے کہ اپنے لئے شر کی دعا اس طرح کرتا ہے جیسی کہ خیر کی مانگا کرتا ہے اور بے شک ایسا ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں کفار کی دعا مذکور ہے اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ [3] (الانفال:33) اور اس کے سوا اور بہت سی ایسی دعائیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ پہلوں کو جانے دو قرآن مجید نے تو اسی وجہ سے پہلوں کے یہ حال اس امت کے

---

[1]۔ کارِ خیر میں استخارہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ (از مرتب)

[2]۔ اور انسان شر کو (اسی جوش سے) بلاتا ہے جس جوش سے اللہ اس (بندہ) کو خیر کی طرف بلا رہا ہوتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ اے اللہ! اگر تیری طرف سے یہی (دین) حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہمیں کوئی اور دکھ سے بھرا ہوا عذاب دے۔ (تفسیر صغیر)

سامنے بیان فرمائے تھے تا کہ ہلاکت اور ٹھوکر کے موقعوں سے یہ بچتی رہے پر ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اس امت میں سے بھی بعض لوگ جو دعوئ پیشوائی کرتے ہیں وہ بھی اپنے لئے شر کی دعا کرتے ہیں جیسا کہ خدا کے فرستادہ کے مقابلہ میں مولوی غلام دستگیر قصوری نے یا چراغ دین جموں والے نے اپنے لئے تباہی اور ہلاکت کی بد دعا کی اور دونوں اپنی بد دعا سے ہلاک ہوئے۔

اور دوم یہ آیت ہے عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرۃ:217) قرین قیاس ہے کہ تم ایک شئے سے محبت کرو اور وہ تمہارے لئے شر ہو یعنی بعض اوقات انسان کی عقل صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی حتّٰی کہ شر کو خیر اور خیر کو شر تصور کر لیتی ہے۔ پس اگر خداوند کریم خود اپنے فضل سے دعا نہ سکھاتا تو اس نقص کا بہت اندیشہ ہوتا۔ اور دوسرا نقص یہ لازم آتا کہ اس صورت میں ہر ایک انسان جدا جدا دعا اختیار کرتا تو مقاصد میں وحدت نہ ہوتی اور اس کا نہ ہونا مضر ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ ہم کسی دوسرے مناسب مقام پر اس پر کافی بحث کریں گے۔

پہلی امتوں اور اس امت کو سکھلائی جانے والی دعا میں فرق:

اسی طرح ان کی امتوں اور حضور والا (حضرت محمد مصطفی فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَرُوْحِیْ[1]) کی امت میں جو کہ خیر امت ہے) جذبات کے لحاظ سے عظیم الشان فرق ہے جیسے کہ ان کے کارنامے اور وفادارئیں اور اخلاص و خدمات اور جان نثارئیں اور سچی فرماں بردارئیں اس پر شاہد ناطق ہیں۔ کیا ایک حضور والا کے مغازی اور خصوصاً جنگ بدر میں صحابہ کرام کے کارنامے اور حضرت موسیٰؑ کے اصحاب کا یہ جواب دینا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدۃ:25) (تُو اور تیرا رب جا کر جنگ کرو ہم تو یہاں پر ہی بیٹھنے والے ہیں) اور حضرت مسیح کے حواریوں کا وہ سین جو کہ باغ سے لے کر مرغے کی بانگ تک انہوں نے دکھایا ہے اس تصفیہ اور صحیح فیصلہ کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضور والا کی امت کے پاک اور اطہر جذبات کے مطابق خداوند کریم نے جو دعا سکھلائی ہے اس کے ساتھ وہ بھی نسبت کے قابل نہیں جو کہ ان کی بہتری کے خیال سے ان کے جذبات

[1]۔ اس پر میرے ماں باپ اور میری جان قربان ہو۔ (از مرتب)

سے پاک اور ارفع سکھلائی تھی اور جذبات کے خلاف ہونے کے باعث آخر ان کو بدلنی پڑی۔ چہ جائیکہ وہ نسبت کے قائل ہو جو کہ ان کے پست اور ادنیٰ اور گرے ہوئے جذبات کے مطابق سکھلائی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے حالات پر نظر کرنے سے صاف صاف ثابت ہے کہ حب دنیا اور نفس پرستی کی طرف ان میں بہت میلان تھا۔

پس جب ارض مقدسہ میں واپس آنے کے وقت خداوند کریم نے ان کے جذبات کے ناموافق دعا بتائی تو ظالموں نے اس پر استقامت نہ کی اور فوراً بدل دی اور بدلی بھی ایسی جو کہ خدا کی بتائی ہوئی دعا کے بالکل مغائر اور ان کے ادنیٰ اور سفلی جذبات کے موافق تھی جیسا فرمایا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ۔[1] (البقرۃ:60،59) پھر باوجود یکہ اس ناشائستہ حرکت اور حب دنیا سے فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ[2] (البقرۃ:60) کے مصداق بنے لیکن پھر بھی رخ نہ بدلا اور حب دنیا اور نفس پرستی میں ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ کے آخری خلیفہ کے زاہدانہ وعظ سن کر بھی یہی کہنے لگے هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ[3] (المائدۃ:113) پس اس وقت ان کی پست فطرتی کے مطابق دعا سکھلائی کہ ہم کو شام کی روٹی دے دے۔ پس پہلی دعا میں حِطَّةٌ ہی پر بس تھی کہ جس کے معنے ہیں گرا دے۔ یعنی ہمارے گناہ معاف کر دے۔ اور دوسرے میں روٹی کی استدعا کی گئی اور جو فاتحہ شریف کے معنوں سے واقف ہو وہ یقین کر سکتا ہے کہ ان دونوں دعاؤں کو دعاء فاتحہ سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس کے ساتھ ایک فقرہ بھی ہے جس پر عیسائی لوگ ناز کیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اے خدا جیسی تیری بادشاہت آسمان پر ہے زمین پر ہو لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ جائے ناز نہیں بلکہ جائے شرم ہے کیونکہ

---

[1]۔ اور (اس کے) دروازے میں پوری فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ (کہ ہم) بوجھ ہلکا کرنے کی التجا (کرتے ہیں، تب) ہم تمہاری خطاؤں کو بالکل معاف کر دیں گے اور ہم محسنوں کو ضرور بڑھائیں گے۔ پھر (ان کی شرارت دیکھو کہ) ظالموں نے اس بات کے خلاف جو انہیں کہی گئی تھی ایک اور بات بدل (کر کہنی شروع کر) دی۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ جس پر ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ان کے نافرمان ہونے کے سبب سے آسمان سے ایک عذاب نازل کیا۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ کیا تیرے رب میں طاقت ہے کہ ہمارے لئے آسمان سے (کھانوں سے بھرا ہوا) ایک خوان اتارے۔ (تفسیر صغیر)

ایک جاہل سے جاہل پر خدا کا قائل جانتا اور مانتا ہے کہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی سلطنت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح ہمیشہ سے زمین پر بھی ہے۔ پس یہ معنے تو بالکل ہو سکتے ہی نہیں کہ ہماری دعا سے تو زمین پر بھی بادشاہت کر جیسا کہ تو آسمان پر بادشاہت کرتا ہے بلکہ اس کے صحیح معنے یہ ہوں گے کہ آسمانی بادشاہت تو ہم تیری یقین کرتے ہیں۔ پس اب تو ہم پر یہ بھی ظاہر کر دے اور بتا دے اور سمجھا دے کہ زمین پر بھی تیری سلطنت ہے کیونکہ وہ اس وقت تک یہ یقین نہ رکھتے تھے۔

اگرچہ زبان سے اقرار بھی کرتے ہوں جیسا کہ ان کا یہ قول اس کا شاہد ہے جو کہ قرآن مجید نے ان سے حکایۃً بیان فرمایا ہے کہ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (المائدۃ:113) جو کہ صاف بتاتا ہے کہ وہ اس وقت تک خدا کو اس پر قادر نہ جانتے تھے۔ پس جب اس قدر معمولی امر پر بھی قادر نہ مانتے تھے تو مالک اور رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہاں مان سکتے تھے کہ جس کے لئے قدرت کاملہ ضروری شرط ہے۔ پھر اس کے آگے کے قول میں وہ بڑی صراحت سے اس کا خود اقرار کرتے ہیں۔

چنانچہ کہتے ہیں وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ[1] (المائدۃ:114) کیونکہ حضرت مسیح نے ان سے مائدہ کا کچھ عہد تو کیا ہی نہ تھا تا کہ وہ تصدیق حاصل کرنی چاہتے ہوں بلکہ آپ نے تو خدا کے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہونے کا اظہار فرمایا جس پر یقین حاصل کرنے کے لئے مَآئِدَۃ مانگنا بیان کرتے ہیں۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے۔ اگر بارھویں تخت کا وارث یہودا صاحب خدا کے رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہونے پر ایمان رکھتے تو تیس درہم کے حاصل کرنے کے لئے اپنے پیشوا کو نہ فروخت کرتے اور گیارھویں تخت کو زیب دینے والے پطرس صاحب اگر خدا کے رَبُّ الْعٰلَمِیْن اور اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْن ہونے کے قائل ہوتے تو اپنے بزرگ استاد پر لوگوں کے خوف سے لعنت نہ بھیجتے اور باقی حواری بھی اگر اس پر ایمان رکھتے تو مجازی حکام کے خطرہ سے اپنے صاحب کے پاس سے تِتَّر بِتَّر نہ ہوتے۔ اور یہ بالکل سچی بات

[1] ۔ اور ہمیں یقین ہو جائے کہ تو نے ہم سے سچ بولا ہے اور ہم اس کے بارے میں گواہی دینے کے قابل ہو جائیں۔ (تفسیر صغیر)

ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی معرفت اور اس کے صفات کے علم سے بہت کم حصہ رکھتے تھے بلکہ اس کی کچھ استعداد ہی نہ رکھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود حضرت موسیٰ پر ایمان لانے کے اور ان کی صحبت میں رہنے کے پھر بھی کہہ دیا کہ اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً[1] (النساء:154) گویا اس وقت تک ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ خدائے پاک جسم اور جسمانی لوازم سے پاک ہے۔ یہ تو پھر ابتدائی بات تھی حضرت موسیٰ کے نو کے نو ہی نشان مصر میں دیکھ کر (جو کہ مصریوں پر حجت پوری کرنے کے لئے خداوند کریم نے حضرت موسیٰ کو دیئے تھے جن کی نسبت قرآن مجید میں وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (بنی اسرائیل:102) ضرور ہم نے موسیٰ کو نو کھلے نشان دیئے تھے فرمایا ہے) بلکہ اپنی نجات اور فرعونیوں کا غرق ہونا مشاہدہ کر کے کہ جس کا نام خداوند کریم نے فرقان (حق و باطل میں بیّن طور پر فرق کر دینے والا نشان) رکھا ہے۔ پھر بھی جب دریا سے پار ہوتے ہی ایک بت پرست قوم کو دیکھا تو حضرت موسیٰ کو کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے اگر زیادہ نہیں بناتا تو کم از کم ایک ہی معبود ان کے معبودوں جیسا بنا دے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں یوں فرمایا ہے وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ[2] (الاعراف:139) پھر اس کے بعد بھی ایک مصنوعی گوسالہ کی نسبت ایک شریر انسان کے یہ کہنے سے کہ ھٰذَآ اِلٰھُکُمْ وَاِلٰہُ مُوْسٰی فَنَسِیَ (طٰہٰ:89) (موسیٰ اور تمہارا یہی معبود ہے۔ موسیٰ تو بھول کر وہاں چلا گیا ہے) اس کو اپنا معبود تسلیم کر لیا اور کہا کہ یہی ہم کو مصریوں سے چھوڑالایا ہے اور اسکے لئے عید منائی اور قربانیں ذبح کیں اور پرستش کی۔

پس چونکہ یہ نقص ان میں موروثی قدیم الایام سے چلا آتا تھا اس لئے ان کو یہ دعا سکھائی تا کہ ان کو اس بات پر ایمان نصیب ہو جائے کہ جس طرح خداوند کریم آسمانوں کا

---

[1]۔ تو ہمیں اللہ ظاہر میں دکھادے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار گزار دیا یہاں تک کہ وہ (چلتے چلتے) ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کے سامنے عبادت میں مشغول تھی (تب) انہوں نے کہا اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کچھ ایسے معبود بنا جیسا کہ ان کے معبود ہیں۔ (تفسیر صغیر)

رب ہے اور مالک اور بادشاہ ہے اسی طرح وہ زمین کا اور اس کے اوپر کی سب چیزوں کا رب اور مالک اور بادشاہ ہے لیکن بجائے اس ایمان کے حاصل کرنے کے وہ یہ ایمان بھی کھو بیٹھے ہیں کہ خدا کی سلطنت آسمان پر ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک عاجز ابن آدم کو خدا فرض کر کے یہ تسلیم کر بیٹھے کہ خدا تو معطل اور بیکار ہے اور آسمانی سلطنت بیٹے کو حاصل ہے پر اب دعا کرتے ہیں کہ زمین پر بھی اس کی بادشاہت ہو جائے۔

پس دعا تو اس لئے سکھائی تھی تا کہ خدا کے لئے زمین کی سلطنت تسلیم کریں پر بیٹا تجویز کر کے آسمان سے بھی خدا کو جواب دے بیٹھے اور اب بیٹے کے لئے دعا کرتے ہیں کہ زمین کی سلطنت بھی وہ اختیار کرے۔ شاید اس دعا کی ضرورت بھی اس وجہ سے پیش آئی ہو کہ مسیح نے خود ایک موقع پر اقرار کیا تھا کہ میری سلطنت زمینی نہیں بلکہ آسمانی ہے اور پھر یہود سے مار کھانا اس کا اور بھی مؤید ہے اور چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہود کے خوف سے اب اس طرف آپ نے رخ تو خوشی سے خود بخود کرنا نہیں لہٰذا ہم کچھ التجا کرتے رہیں تا کہ آپ کی ہمت افزائی ہو جائے کہ اب تو کچھ کچھ میرے بہی خواہ اور مددگار بھی ہیں۔ لیکن عیسائی یاد رکھیں کہ آپ کی اس سے کبھی ہمت افزائی نہیں ہوتی کیونکہ وہ ان بہی خواہوں کی وفاداری بھی دیکھ چکے ہیں کہ جن کو تخت نشینیوں کے وعدے بھی دے چکے۔ یہ ہے ان کی دعاؤں کا حال۔

لیکن اب ہم آپ کو اس دعا کا حال سناتے ہیں جو کہ خیر امۃ کو اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡن اور حکیم و علیم قادر مطلق رَبُّ الۡعٰلَمِیۡن نے سکھلائی ہے۔

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ بعض وقت انسان خدا کی بتائی ہوئی دعا پر استقامت نہیں رکھ سکتا اور نیز انسان ایسا ضعیف ہے کہ قادر مطلق کی امداد اور اعانت کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پس اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہو تو نہ انسان میں وہ جوش استدعا پیدا ہو سکتا ہے جو کہ قبول دعا کے لئے بہت ہی ضروری ہے اور نہ وہ خدا کی بتائی ہوئی دعا پر استقامت رکھ سکتا ہے بلکہ فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا[1] الخ (البقرۃ:60) کی طرح بدل دیتا ہے۔ اور نہ مداومت کر سکتا ہے جو کہ جوش استدعا کی مانند قبول دعا کے لئے ضروری شرط ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے حَتّٰی تَمَلُّوۡا۔[2]

(صحیح البخاری کتاب الایمان باب احب الدین الی اللہ... حدیث 43)

---

[1] ۔ پھر (ان کی شرارت دیکھو کہ) ظالموں نے... ایک اور بات بدل (کر کہنی شروع کر) دی۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ مگر تم اُکتا جاؤ گے۔ (از مرتب)

یعنی یہاں تک کہ تم ملول ہو کر دعا کو ترک نہ کر دو۔ اور نہ انسانوں کو دعا کے لئے وقت مل سکتا ہے۔ غرضیکہ اگر خداوند کریم ورحیم کی مدد شامل حال نہ ہو تو پھر نہ انسان دعا اور نہ قبولیت دعا کے شرائط کو مہیا اور جمع کر سکتا ہے اور نہ قبولیت کے موانع کو رفع کر سکتا ہے۔ اس ہی لئے مولانا مولوی رومؒ نے فرمایا۔ ع۔ ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو[1]۔ لہٰذا دعا سے پہلے استمداد ضروری ہوئی اور چونکہ پہلے پہلے محض معرفت اسمی ہوا کرتی ہے اس لئے استمداد بھی اللہ کے نام کی وساطت سے کی گئی اور استمداد کی علت اور محرک بتانے کے لئے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو ایزاد کیا تاکہ استمداد یقین اور جوش سے ہو جو امداد ملنے کے لئے ضروری ہے۔ پس ان وجوہات سے دعا کے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہنا بتایا ہے۔ پھر چونکہ ایک فطرتی مسئلہ ہے کہ ہر ایک سائل جس سے کچھ مانگتا ہے اس کی تعریف بھی ضرور ہی کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو اپنے زمانہ یا قوم یا ملک یا شہر یا محلہ کا یکتا کر دکھاتا ہے اور پھر اس کو مدلّل کرنے کے واسطے کہتا ہے کہ میں دور سے آپ کا نام یا آپ کی تعریف سن کر آیا ہوں۔

پس ان تین باتوں کے پورا کرنے کے واسطے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنا بتایا۔ پھر عام تعریف کے بعد بالخصوص اس کی سخاوت اور غریب پروری کا ذکر کرتا ہے لہٰذا اس کے بعد رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کہنا سکھلایا۔ پھر سائل دو رنگ کے ہوتے ہیں کچھ تو چاہتے ہیں ہمیں بے مشقت اور سوائے مزدوری کرنے کے کچھ عطا ہو جائے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ روزگار مثل ملازمت اور مزدوری کے تلاش کرتے ہیں اور جب اپنے نالائق ہونے یا کسی اور وجہ سے روزگار ہاتھ نہیں آتا تو کسی معزز رحم دل اور کریم النفس سے بطور سوال روزگار مانگتے ہیں۔ اور جب سائل کسی کی غریب پروری بیان کرتا ہے تو جس طریق سے وہ اپنی پرورش چاہتا ہے اسی رنگ میں اس کا غریب پرور ہونا بیان کرتا ہے۔

نیز قاعدہ کی بات ہے کہ جس سے مانگا جاتا ہے جس قدر اس کی محبت اور رحم کو جوش دلایا جاتا ہے اسی قدر قبولیت سریع اور عمدہ ہوتی ہے اور یہ بھی قاعدہ کی بات ہے کہ اپنے پروردہ اور خصوصاً نسل بہ نسل پروردہ کی حالت زار پر محبت اور رحم میں جوش آ ہی جاتا ہے

[1]۔ دعا بھی تجھی سے، قبولیت بھی تجھی سے ہے۔ (از مرتب)

خصوصاً جبکہ وہ اپنے نسلاً بعد نسل نمک خوار اور پروردہ بننے کا اقرار کرے اور اس اظہار کی وساطت سے اس کی محبت اور رحم اور انعامات کو اپنی حالت زار پر متوجہ کرانا چاہتا ہو بلکہ اس کی پرورش کے وسیع وجوہات اور طریقوں کا اظہار کر کے اس کی پرورش کے دائرہ کی وسعت کا اقرار کرتا ہو۔ تو اس وجہ سے الرَّحْمٰنُ (بے عوض دینے والا) الرَّحِيْمُ (عمدہ عوض اور مُزد دینے والا) ایزاد کرنا بتایا۔

نیز عام قاعدہ تو یہی ہے کہ ایسے تعریف کے مقاموں پر کہ جن کو علمی اصلاح میں مقام خطابی کہتے ہیں ظنی اور بے دلیل اور مبالغہ آمیز باتیں کافی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سائل لوگ عموماً ایسی ہی تعریفیں کیا کرتے ہیں کہ جن کی کچھ اصلیت نہیں ہوتی اور اگر کچھ ہوتی ہے تو بہت سا اس کے ساتھ مبالغہ ملا ہوا ہوتا ہے اور دلائل تو بالکل ندارد ہوتے ہیں۔ لیکن خداوند کریم کی مدح میں جو کہ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ [1] (آل عمران:120) اور عالم الغیب ہے نہ یہ کافی ہے اور اس پر وہ راضی ہو سکتا ہے اور نہ اس کا رحم جوش میں آسکتا ہے کیونکہ اس کے آگے دل کی زبان کے ساتھ مطابقت ضروری ہے اور یہ دلائل سے ہو سکتی ہے۔

لہٰذا خداوند حکیم نے حمد کے ساتھ ہی اس کے دلائل بھی رکھ دیئے تاکہ اگر پہلی عادت کے مطابق اور زبانی مدح کرتا ہے تو جب ان بدیہہ دلائل پر اس کی نظر پڑے گی تو یقین سے پُر ہو کر سچے جوش اخلاص کے ساتھ اس کا دل اور زبان بلکہ اس کا رگ وریشہ اپنے حقیقی محسن رب اور مالک کی حمد کرے گا اور وہ دلائل لفظ اللہ (کہ جس کو علمی زبان میں لفظ جَلَالُہٗ بولتے ہیں) اور رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اور الرَّحْمٰنُ اور الرَّحِيْمُ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے مفصل بیان کر چکے ہیں اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا ایزاد اس وجہ سے بھی کیا ہے کہ بعض وقت ایک خود غرض انسان مدح کرتا ہے اور اس کے اثبات کے وجوہات بھی بیان کر دیتا ہے لیکن اس کے دل میں کچھ بھی نہیں ہوتا لہٰذا ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی بتا دیا کہ تو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اگر ہم بناوٹ کریں گے تو پھر آخر جزاء وسزاء کے لئے تیرے آگے پیش ہونا ہے۔

[1] ۔ سینہ کے رازوں تک کو بھی جانتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

اب سائلانہ مدح اعلیٰ درجہ کی ہو گئی جو کہ دلائل اور ترغیب وترہیب پر مشتمل ہونے سے انسان پر سعید اور تدبر کرنے والے انسان کے دل پر اس قدر موثر ہو سکتی ہے کہ حسن واحسان کے آئینہ میں جلال وجمال خداوندی ملاحظہ کر کے اس کے روح آستانۂ رب العزت پر گر کر اپنے راز ونیاز عرض کرے اور جو عظمت اور بزرگی اور جلال خداوندی اس پر بذریعہ صفات کاملہ روشن ہوئے ہیں ان کے مقابلہ میں جو اپنا عجز وانکسار مشاہدہ کر چکا ہے اس کو غلامانہ تذلل سے ظاہر کرے پر چونکہ انسان ضرورت کے وقت یا کسی خاص وقت میں کسی کی غلامی کا اظہار کرتا ہے یا مانتا ہے اور دوسرے وقت دوسرے کا تو اس وجہ سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہنا بتایا۔ پھر ظاہر ہے کہ اگرچہ غلام آقا کی طرف محتاج ہوتا ہے اور آقا کو بالخصوص غلام پر مصیبت کے وقت ضرور ہی رحم آتا ہے۔ پر جب کوئی محتاج بہت سے لوگوں سے مدد لے سکتا ہو اور مانگتا یا لیتا بھی ہو تو اس سے عموماً بے اعتنائی ہو جاتی ہے لہٰذا بتایا کہ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بھی ایزاد کرو۔ اب تمہید سوال میں تو کوئی کسر باقی نہیں بلکہ جہاں تک سوال کی ضروریات اور مناسبات تھے وہ سب ہو گئے۔ اب دعا شروع ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اگرچہ سب مقاصد سے مقدم تر اور اہم اور افضل اور بہت ضروری رضا الٰہی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے مختلف قسم کی ضرورتیں اور حوائج اور مقاصد پیش آجاتے ہیں۔

پس اگر شام کی روٹی والی دعا کی مانند کسی خاص مدّعیٰ کی تخصیص کی جاتی تو بڑی مشکل پیش آتی اور علاوہ اس مشکل کے ایک یہ خرابی بھی ہوتی کہ قبولیت دعا جوش استدعاء سے ہوتی ہے اور جوش استدعاء احتیاج اور ضرورت کے وقت پیدا ہوتا ہے تو اگر ایک ہی مدعا ہوتا تو ہمیشہ جوش استدعاء نہ ہوتا اور نہ اس کے ہونے کا موقع اور محل ہوتا اور نہ اس کی امید ہی ہوتی تو پھر یہ دعا محض خشک اور لسانی اور عادت ہو جاتی لہٰذا مدّعیٰ عام رکھا اگرچہ یہ بھی بتادیا کہ اصل مدّعیٰ رضاء الٰہی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جس سے سوال کیا جاتا ہے اگر اس کی عادت اور طرز کے مطابق کیا گیا تو قبولیت کی امید ہو سکتی ہے اور اگر اس کے خلاف کیا جائے تو پھر قبولیت کی

امید نہیں ہوتی اور جب ہم خداوند کریم کی سنت پر نظر کرتے ہیں تو سواء خاص صورتوں کے اس عالم اسباب میں مقاصد کی تحصیل کے لئے کچھ نہ کچھ اسباب کا سلسلہ رکھا ہوا ہوتا ہے جس کو بالفاظ دیگر ان کے حاصل کرنے کا طریق کہنا چاہئے مثلاً غلہ ترکاری وغیرہ پیدا کرنے کے لئے زمینداری اور اولاد کے لئے بی بی اور تعلقات زن وشوی اور روپیہ کمانے کے لئے تجارت وغیرہ ہے۔

اگرچہ جہاں اس کے وعدہ اور صفات کے خلاف نہ ہو تو اس کے سوا بھی کر سکتا کیا بلکہ بعض اوقات شاذ ونادر کے طور پر کسی خاص مصلحت کے لئے ایسا کر بھی دیتا ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ بجائے مقاصد طلب کرنے کے ان کی تحصیل کے طریقے اور راستے طلب کئے جائیں تاکہ خداوند کریم کی عام سنت کے مطابق ہو کر قبولیت کی امید عام اور کثیر ہو جائے لیکن ہر ایک شئے کے حاصل کرنے کے لئے بہت سے طریق ہوتے ہیں بعض سہل باامن اور مختصر اور بعض اس کے خلاف اور پھر بعض اللہ کریم کی مرضی کے مطابق اور بعض مخالف۔ پھر سچی سعادت اور خوشحالی تب ہی ہوتی ہے کہ انسان کے سب متعلقین بلکہ ساری قوم سعادت مند اور خوشحال ہو۔ نیز اکیلے شخص کی مقصد براری پر اس قدر توجہ نہیں کی جاتی جس قدر کہ قومی متفق علیہ مقصد کی کی جاتی ہے۔ نیز انسان کا بڑا کمال ہے کہ اس کا بجز قومی مقصد کے اور کوئی مقصد نہ ہو اور اس کا ہر ایک قول فعل قومی بہتری اور فائدہ کے لئے ہو بلکہ یہی وہ جوہر ہے کہ جس سے کسی انسانی جماعت کو خیر ہونے کا عالیشان خطاب اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ کی طرف سے مل سکتا ہے جیسا فرمایا کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ (اس لئے کہ تم وہ جماعت ہو جو کہ) اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ (آل عمران:111) جو کہ لوگوں کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے تو ان سب امور کی وجہ سے اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی دعا بتائی کہ جس میں کوئی مدّعی خاص نہیں کیا بلکہ عام رکھا ہے اور مدّعیٰ نہیں مانگا گیا بلکہ اس کا راستہ اور وہ بھی سہل اور مختصر۔ پھر جیسا کہ میں نے پہلے نمبر میں بیان کیا ہے کہ سچی خوشحالی کسی محنت مشقت کے اجر سے نہیں ہو سکتی بلکہ انعام الٰہی سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے مستحق بننے کے لئے بھی پہلے کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور انعام مانگنے سے نہیں ملا کرتے بلکہ اسی طریق سے

ملتے ہیں کہ خدا کے فضل سے انسان کو توفیق مل جاتی ہے کہ وہ ایسے طریق پر چل پڑتا ہے اور ایسے کام کر دیتا ہے کہ آقا کی نظر میں وہ مقبول ہو جاتا ہے اور اس پر اس قدر راضی ہو جاتا ہے کہ اس کے حق الخدمت سے زیادہ اس کو کچھ دے دیتا ہے۔

پس چونکہ انعام ایک ضروری امر ہے اور مانگ سکتا نہیں لہٰذا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے بعد صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ بتایا یعنی ہم کو ان کی راہ اور طریق پر چلا کہ جن کو اجر ہی دینے پر تو نے بس نہیں کی بلکہ ان پر اجر سے بڑھ کر انعام بھی کیا ہے۔ نیز بعض اوقات انسان خود ہی ایک طریق کو طریق مستقیم تصور کر لیتا ہے حالانکہ عند اللہ وہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ دنیا کے جس قدر باطل مذہب ہیں ان کے سب پیرو اپنے اپنے مذہب کو صراط مستقیم کہتے ہیں حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ باطل ہیں۔ پس یا تو صراط مستقیم کی دعا کرے اور یقین نہ کرے کہ وہ فلاں ہے بلکہ اللہ کے علم پر چھوڑ دے یا اللہ علیم کی بتائی ہوئی علامات سے تعیین کرے۔ اور اللہ کی بتائی ہوئی بڑی روشن علامت یہ ہے کہ اس پر چلنے والوں سے مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ بنتے ہوں۔ لہٰذا فرمایا کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہہ دیا کرو۔ نیز جوش استدعاء جو کہ دعا کے لئے نہایت ضروری امر ہے تب ہی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو اور تجربہ ہو کہ اس طریق سے کامیابی ہوتی رہی ہے تو اس وجہ سے بھی صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ایزاد ضروری تھا اور ہے۔

پھر چونکہ جن جن قوموں پر انعام ہوا ہے بعض کچھ عرصہ کے بعد یا بہت جلد اس نعمت کی ناشکری کر کے ایسی مغضوب علیہ بن جاتی رہی ہیں کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ [1] (ابراہیم:8) کے مطابق انعام کا زائد ہونا تو درکنار پہلی نعمت بھی ان سے چھینی جاتی رہی ہے اور اس سے متمتع ہونے کے بجائے اس سے بالکلیہ محروم کئے گئے ہیں جیسا کہ یہود کے ساتھ ہوا ہے۔ نیز بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان پر یہ اعلیٰ درجہ کا احسان وانعام خداوند کریم کرتا ہے کہ اپنے کسی خاص بندہ کو مصلح اور رَحْمَةً لِّلْقَوْمِ [2] بنا کر ان کی سعادت دارین کے لئے ان میں مبعوث فرماتا ہے تو وہ لوگ شکر

[1]۔ (اے لوگو)! اگر تم شکر گذار بنے تو میں تمہیں اور بھی زیادہ دوں گا۔ (تفسیر صغیر)
[2]۔ لوگوں کے لئے رحمت۔ (از مرتب)

کے بجائے کفر اور اطاعت کے عوض اباء واستکبار اختیار کر کے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ٹھہر جاتے ہیں اور بعض اس برگزیدہ کو مان تو لیتے ہیں پر جس محبت اور تعظیم کو رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے لئے خاص کرانے کے لئے وہ مبعوث ہوا تھا برعکس اس کی تعلیم کے بلکہ اس کی تعلیم کے لب لباب کے خلاف ان دونوں میں اسی کو خدا یا خدا کا شریک اور ہم پلہ قرار دے کر ضال اور گمراہ بن جاتے ہیں لہٰذا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کو بڑھا دیا۔

الغرض کہ خدائے علیم وحکیم نے اس مختصر سی دعا میں علاوہ اور معارف وحقائق کے نفس دعا ہونے کے لحاظ سے پہلے سوال والتماس کے چھوٹے بڑے سب لوازم ومناسبات کو بوجہ احسن بیان فرما کر پھر بندے کے حقیقی عجز اور ہر ایک امر میں ہر ایک پہلو سے ایک مہربان علیم وحکیم اور مقتدر مولیٰ کی طرف محتاج ہونے اور اس حقیقی مولیٰ کی عظمت اور جبروت اور قاضی الحاجات ہونے کا واقعی اور صحیح صحیح پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے جو کہ جوش استدعا اور رحم وکرم اور استجابت دعا کے لئے ازبس محرک اور جاذب ہے۔

پھر اس کے بعد ایسی دعا بیان فرمائی جو کہ سب مطالب کو شامل ہے بلکہ سب مطالب کے اسہل اور انسب ترین اسباب واقعیہ کے استدعا پر بھی مشتمل ہے اور حرمان وناکامی کی سب راہوں سے اس میں امن مانگا گیا ہے پھر یہی نہیں کہ خود غرضوں کی مانند یہ فلاح ونجاح محض اپنی ذات کے لئے طلب کرنا بتایا ہو بلکہ ان سب باتوں میں سب دوست ودشمن قوم کو شریک کر دیا ہے یہ تو عام مطالب کے لحاظ سے ہے اور جو امر اور مطلب کہ قومی سب سعادتوں کی جڑھ اور سب کامیابیوں کا سرچشمہ ہے اور جس کی نسبت ثابت ہے کہ جب سے انسانی نسل چلی ہے تب سے ایک وہی امر ہے کہ جس کے ساتھ کسی قوم کو سعادت دارین نصیب ہوئی ہے اور اس کے سواء اور کوئی ایسا امر نہیں ثابت ہوا اور وہ انبیاء کی بعثت ہے۔ تو اس کے لئے بالخصوص یہاں پر دعا بتائی ہے اور جس طرح ان کی بعثت اور اس سے متمتع ہونے کے لئے دعا فرمائی ہے اسی طرح ان کی مخالفت اور عناد اور محبت اور تعریف ومدح میں غلو واطراء کے وبال سے محفوظ رہنے کے لئے دعا بتائی ہے۔ پس یہ ہے قرآنی دعا کہ جس کی نظیر نہ کسی قوم کے پاس ہے اور نہ کسی کتاب میں وہ مکتوب ہے۔

اب ہم متن قرآن مجید ہونے کے لحاظ سے مختصر بلکہ بہت مختصر طور پر کچھ بیان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآن مجید نہایت جامع اور کامل کتاب ہے نوع انسان کی سعادت دارین کے لئے جن علوم اور قواعد واصول کی ضرورت تھی یا متصور ہو سکتی ہے وہ سب اس میں درج ہیں اور عظمت الٰہی اور شفقت عَلٰی خَلْقِ اللہ کے سب اصول مسائل پر مشتمل ہے اور سعادت دارین کے اصول اور تعظیم الٰہی اور شفقت علی خلق اللہ کے اصول کہنے کو تو چند کلمات ہیں لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ یہ کثیر التعداد بڑے بڑے علوم پر مشتمل ہیں۔ مثل علم کلام، فقہ، عبادات، تصوف، علم معاشرت، علم تمدن، علوم سیاست وغیرہ کے اور پھر ان علوم میں سے ہر ایک علم بہت بہت شاخیں رکھتا ہے اور ہر یک شاخ پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں اور پھر وہ جامع ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں تو اگر یہاں پر ان سب علوم پر مفصل بحث شروع کی جائے جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں اور متن قرآن ہونے کے لحاظ سے ضروری ہے کہ فاتحہ بھی ان پر مشتمل ہو تو پھر کئی نمبر اسی بحث پر شائع ہونے چاہئے۔ پس اس سے یہی بہتر ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں ان علوم کا ذکر ہے وہاں پر ہی مفصل بحث کی جائے۔ ہاں یہاں پر جن مسائل کا ذکر ضروری ہے ان کا اجمالی طور پر ذکر دیتا ہوں اور وہ مسائل یہ ہیں۔

ایمان بالغیب:

مسئلہ اوّل: ایمان بالغیب ہے جس کا ذکر بِسْمِ اللہِ میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے نمبر میں بتایا ہے کہ یہاں پر معرفت اسمی کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ محض معرفت اسمی کے وقت استعانت مانگنے کی بناء محض ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر قریباً کیا بلکہ یقیناً سب دنیا کا عمل در آمد ہے اور تجربہ اس کے مفید اور ضروری ہونے کی شہادت دیتا ہے لیکن پھر بھی بعض نادان تعصب سے جلے ہوئے اس پر اعتراض کر دیتے ہیں۔ کیا دنیا اس بات کو نہیں جانتی کہ ہر ایک کمال کی بنیاد پہلے ایمان بالغیب ہی سے شروع ہوتی ہے۔ جب کسی استاذ کے پاس تلمیذ جاتا ہے تو اس کے پاس اس امر کے قطعاً دلائل نہیں ہوتے کہ جس نقش کو استاذ الف بتاتا ہے وہ الف ہی ہے یا جس لفظ کے یہ معنے بتائے

ہیں فی الحقیقت اس کے یہی معنے ہیں یا فلاں کام اور صنعت کا جو طریق بتاتا ہے وہ واقعہ میں صحیح طریق ہے یا اس کام پر جو غرض اور فائدہ بتاتا ہے ٹھیک ٹھیک وہ اس پر ضرور مرتب ہو گا۔ بلکہ جو علوم سب سے بڑھ کر یقینی یقین کئے جاتے ہیں اور ان کے دلائل بڑے مضبوط اور قوی تر خیال کئے جاتے ہیں ان کی اور ان کے دلائل کی بنیاد ایمان بالغیب سے بھی اتر کر محض خیالی اور فرضی امور پر ہوتی ہے مثلاً اقلیدس کے مسائل اور دلائل اعلیٰ درجہ کے یقینی مانے گئے ہیں لیکن سطحہ مستوی اور خط مستقیم وغیرہ جن امور پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ محض فرضی اور خیالی ہیں لیکن سب دنیا جانتی ہے کہ باوجود اس کے ان علوم پر بڑے بڑے مفید اور واقعی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی سب لوگ دیکھتے ہیں کہ جن علوم وفنون کو محض ایمان بالغیب کے طور پر مانتے تھے بعد میں وہ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیق کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت مدلل اور مبرہن یا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور ان پر یقین حاصل کرنے کے واسطے اعلیٰ سے اعلیٰ جو طریق متصور ہو سکتے ہیں وہ سب طریق ان کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ پر پہلے دن ہی اگر وہ استاذ اور معلم کی ہر ایک بات پر اس سے دلائل طلب کرنے لگیں تو کبھی بھی وہ کوئی علم یا فن حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ایمان بالغیب کے لئے بھی کسی قدر قرائن کی ضرورت ہوتی ہے اور نیز اس امر کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ایمان بالغیب آخر کسی وقت ایمان شہودی سے بھی مبدل ہوتا ہو۔

اور سچے اور جھوٹے مذہب میں یہی ایک عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ ورنہ ابتداءً جیسا جھوٹی بات کو ماننے والا محض ایمان بالغیب رکھتا ہے اسی طرح سچے مذہب کا پیرو بھی پہلے پہل بہت سے امور پر ایمان بالغیب رکھتا ہے۔ پس جو جھوٹے مذہب پر ایمان بالغیب لاتا ہے اس کے پاس اس ایمان بالغیب کے لئے نہ ابتداء میں کچھ قرائن ہوتے ہیں اور نہ آگے چل کر اس کا یہ ایمان بالغیب کبھی ایمان شہودی سے مبدل ہوتا ہے۔ پر سچے مذہب والے کے پاس ایمان بالغیب کے وقت میں ایمان بالغیب لانے کے لئے صحیح اور قوی ترین قرائن ہوتے ہیں مثلاً وہ دیکھتا ہے کہ سچے مذہب کا اثر بالاتفاق یہ ہے کہ اس پر کاربند ہونے سے خدا علیم وحکیم اور قادر ومالک کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو جائے اور ایسے رَبُّ الْعٰلَمِیْن کا اس کے

ساتھ خصوصیت کے ساتھ تعلق ہو جائے اور ان دونوں تعلقوں کے آثار میں سے بیّن ترین یہ ہیں کہ وہ بندہ اپنے ہر ایک رنج وراحت اور عسر ویسر میں اپنے مولیٰ کریم سے وفادار رہے اور اپنے ہر ایک محبوب اور ہر ایک خواہش پر اس کو اور اس کی اتباع کو مقدم رکھے حتّٰی کہ اپنی جان عزیز بھی نثار کرنے کے لئے ہاتھ پر رکھی ہوئی ہو اور کوئی چیز اس کے قدم کو اپنے حقیقی مولیٰ کی طرف اٹھانے سے نہ روک سکے۔ اور وہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اس کو اپنے دربار میں شرف حضور بخشے اور خاص غیبوں پر اس کو اطلاع بخشے جو کہ اوروں کو ہر گز ہر گز نصیب نہیں ہو سکتی اور پھر اس کی وہ تائید کرے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو۔ پس جب کوئی شخص ان خاص آثار کو مشاہدہ کرے گا تو ضرور ان سے تعلق خاص کا ایمان پیدا ہو گا اور تعلق خاص سے اس مذہب کی صداقت کا ایمان پیدا ہو گا وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اور پھر جب ایمان بالغیب رکھ کر سچے مذہب کی سچی اتباع اختیار کرے گا تو اس کا خدا سے اور خدا کا اس سے تعلق پیدا ہوتا جائے گا اور جیسا یہ تعلق قوی ہوتا جائے گا ویسا ہی اس کے آثار کا مشاہدہ ہوتا جائے گا اور جس قدر آثار تعلق خداوندی کا مشاہدہ ہوتا جائے گا اسی قدر ایمان بالغیب میں کمی اور ایمان شہودی میں ترقی ہوتی جائے گی یہاں تک کہ سب غیبوں کا سرچشمہ اور وراء الوراء ہستی یعنی مہربان خدا اَنَا الْمَوْجُوْدُ[1] اور اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ[2] (القصص:31) اور اَنَا رَبُّکَ[3] (طٰہٰ:13) اور اَنْتَ عَبْدِیْ[4] فرما کر ایمان بالغیب کو ایمان شہودی کر دے گا۔ اسی طرح اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (حم السجدۃ:31)

(بے شک جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ یعنی ذات منزہ من النقائص اور مستجمع جمیع صفات کمال ہے۔ اور پھر اس کے موافق استقامت رکھتے ہیں تو ان پر یہ کہتے ہوئے فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ خوف رکھو گے اور نہ حزن اور خوشخبری ہو اس جنت کی کہ جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا) کے مقام پر پہنچ کر فرشتوں کی نسبت ایمان بالغیب ایمان شہودی سے مبدل ہو جائے گا۔

---

[1] ۔ میں موجود ہوں۔ (از مرتب)
[2] ۔ میں اللہ ہوں۔ (تفسیر صغیر)
[3] ۔ میں تیرا رب ہوں۔ (تفسیر صغیر)
[4] ۔ تو میرا بندہ ہے۔ (از مرتب)

الغرض کہ ایمان بالغیب اگرچہ سچے اور جھوٹے دونوں مذہبوں میں ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ سچے میں قرائن ہوتے ہیں اور جھوٹے میں ندارد۔ اور سچے میں ایمان بالغیب ایمان شہودی سے بدل جائے گا اور جھوٹے میں بالغیب ہی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کی اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات:

دوسرا مسئلہ: اللہ کے اسماء حسنیٰ اور صفات کا مسئلہ ہے کیونکہ سب اسماء حسنیٰ کا منبع اللہ ہے اور سب صفات کاملہ کے سرچشمے وہ چار صفات ہیں جو کہ یہاں پر مذکور ہوئے ہیں اور یہ مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ دنیا میں جس قدر باطل اور جھوٹے مذاہب ہیں وہ اسماء وصفات الٰہیہ میں غلطی لگنے یا اختیار کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر صفات الٰہیہ پر پوری پوری اطلاع ہوتی تو عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبہ:30) (عزیر اللہ کا بیٹا ہے) اور نصاریٰ مسیح ابن اللہ نہ کہتے۔ اور نہ آریہ تناسخ کے چکر اور مادہ اور روحوں کی قدامت کے قائل ہوتے بلکہ جس قدر برے اقوال اور یا بد اعمال ہوتے ہیں وہ بھی صفات کی بے علمی یا بے اعتقادی سے سرزد ہوتے ہیں۔ سچ ہے کہ اگر بنی اسرائیل کو صفات کمال کا علم اور یقین نصیب ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:139) ترجمہ۔ بنا ہمارے لئے ایک معبود جیسے کہ ان کے لئے بہت سے معبود ہیں۔ اور نہ یہ کہ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء:154) ترجمہ۔ بتا دے ہم کو اللہ سامنے۔ اور نہ یہ کہ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدۃ:65) ترجمہ۔ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ اور نہ گوسالہ کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے کہ یہ ہمارا اور موسیٰ کا وہ خدا ہے جو ہمیں مصریوں سے چھوڑالایا ہے اور نہ اس کو اپنا معبود بولتے اور نہ اس کی پرستش کرتے۔ بلکہ چور کو اگر خدا کی رزاقیت اور علیم وبصیر اور منتقم ہونے کا علم اور یقین ہوتا تو کبھی وہ چوری نہ کرتا۔ اسی طرح ڈاکو فریبی اور زانی وغیرہ۔

پس صفات کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے کہ عملی زندگی کا سارادار و مدار اسی پر ہے۔ سب بدیوں سے سچے طور پر روکنے والا صفات الٰہیہ کا اعتقاد ہے اور سب نیکیوں کا اخلاص کے ساتھ کرانے والا بھی یہی اعتقاد ہے۔ کیا یہ سچی بات نہیں کہ جب انسان کو اس پر سچا اور پختہ یقین کامل ہو کہ خدا سمیع وبصیر اور قدیر ہے اور اپنی نافرمانی اور بدکرداری پر سزا دینے والا ہے

اور فرماں برداری پر انعام اور اکرام کرنے والا ہے تو وہ انسان ضرور ہی نافرمانی سے بچے گا۔ اور سچا فرمانبردار بنے گا۔ غرض کہ یہ مسئلہ بہت ضروری اور اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب سے پہلے اسی کی تعلیم دیتے رہے ہیں اور سب سے زیادہ زور اسی پر دیتے رہے ہیں۔

توکل علی اللہ:

تیسرا مسئلہ: توکل علی اللہ کا ہے اور یہ بِسْمِ اللّٰہِ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور اِھْدِنَا سے ثابت ہے اور یہ مسئلہ بھی نہایت ضروری اور سب کامیابیوں اور استقامت اور بلند حوصلہ ہونے کی جڑھ ہے۔ اس لئے کہ جب انسان کے دل میں اس بات کا یقین کامل ہوتا ہے کہ ہر ایک کامیابی اور ہر ایک بہتری کا حاصل کرنا اللہ قدیر کے ہی ارادہ سے ہوتا ہے اور ہر ایک ناکامی اور شر سے محفوظ رہنا بھی اسی کی مشیت سے وابستہ ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میرا خدا قادر مطلق ہے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کے آگے ان ہونی ہو مگر وہی جو اس کے صفات کاملہ اور وعدہ کے خلاف ہو۔ تو پھر اس کی نظر میں سواء ایسی چیز کے اور کوئی امر انہونا نہیں رہتا جو کہ اس کے ارادہ کو تذبذب میں ڈال کر اس کی استقامت کے شہتیر کو کمزور کرے جس پر کہ کامیابی کا سارا سہارا ہے۔ اور نہ اس کی نظر میں کوئی ایسا دشمن یا ایسا مانع نظر آتا ہے جو کہ اس کے قادر مطلق رب کے ارادہ کو روک سکے تاکہ اس وجہ سے اس کی بلند حوصلگی میں کچھ فرق آئے۔

غرض کہ توکل علی اللہ ایک وہ چیز ہے کہ ایک عاجز انسان کو پہاڑ سے بھی مضبوط کر دیتا ہے یہاں تک کہ سخت سے سخت دشمن بھی اس کی نظر توکل میں ایک مردہ کیڑا ہوتا ہے اور پہاڑوں کو پیس دینے والے مصائب اس کے قدم توکل کے آگے پر کاہ سے بھی بے حیثیت ہوتے ہیں اور مومن بلکہ انبیاء کی بہادری اور استقلال کا یہی گُر ہے۔

دعا:

چوتھا مسئلہ: دعا ہے جیسا کہ الرَّحِیْمِ اور اِھْدِنَا سے ثابت ہے۔ توکل کی مانند دعا بھی سب کامیابیوں کی جڑھ اور استقامت کا ستون ہے۔ جس انسان کو دعا پر یقین ہوتا ہے مایوسی

اور تذبذب اس کے نزدیک نہیں آسکتے۔ یہ دعا وہ چیز ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تباہی اور ہلاکت کا جب زبردست دشمن مصمم ارادہ کرتے رہے ہیں اور ان کو سنا کر دھمکی دیتے رہے ہیں تو اسی کی طاقت سے نہ وہ ان کی دھمکیوں کی کچھ پرواہ کرتے رہے ہیں اور ان کے شر سے بھی محفوظ رہتے رہے ہیں چنانچہ قرآن مجید اللہ کریم کے ایک راستباز بندے کا ان کی دھمکیوں کا جواب نقل فرماتا ہے کہ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ (الدخان:21) ترجمہ۔ تمہارے پتھراؤ سے میں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ بلکہ مومن کے ہر ایک میدان جنگ کا ہتھیار اور ہر ایک آڑے وقت کی مشکل کشا دعا ہی ہوتی ہے۔ بدر کے میدان میں جب دشمن لوہے میں ڈوبا ہوا کئی گنا زائد طاقت کے ساتھ آمادۂ پرخاش ہوا تو حضرت سید الرسل خاتم الانبیاء ﷺ نے اسی ہتھیار کو استعمال کیا۔ اس سے اس امر کا پورا پورا پتہ لگتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو (جو کہ دعا کے تجربہ کار ہوتے ہیں) دعا کے سب سے زیادہ کار آمد اور موثر ہتھیار ہونے کا نہایت اعلیٰ اور پختہ یقین ہوتا ہے ورنہ اس تنگ اور آڑے وقت میں وہ اور اسباب سے رخ پھیر کر ایک دعا ہی سے تمسک نہ کرتے۔ بلکہ جیسا ایک بڑے مقتدر شہنشاہ کا بیٹا اپنے باپ کی رعیت میں سے کسی سے خوف نہیں رکھتا اور نہ اس کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ فلاں ضرورت کے پورا کرنے کے لئے میں خرچ کہاں سے لاؤں گا یا کس سے مدد لوں گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا سرپرست قادر مقتدر اور مہربان ہے لہٰذا میں اس سے جو استدعا کروں گا وہ ضرور پورا کردے گا۔

اسی طرح دعا پر اعتقاد رکھنے والا بھی ہمیشہ مطمئن اور خوشحال رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام باوجود ایسی سخت ابتلاء کے جو کہ کسی اور فرد بشر پر ہرگز نہیں آتا پھر بھی ہمیشہ مطمئن اور خوشحال رہتے ہیں جن مقاموں پر دنیا کے لوگ یاس اور ناامیدی کے مقابلہ سے عاجز آکر خودکشی تک کر گزرتے ہیں دعا پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک وہاں پر بھی یاس نہیں آسکتا اور امید ورجاء سے سرشار رہتے ہیں اور آخر خداوند کریم ان کو کامیاب کر ہی دیتا ہے۔ کون ہے جو خوشحالی اور کامیابی کو نہیں چاہتا۔ اور ان دونوں کا سرچشمہ دعا ہے جس کا سبق فاتحہ شریف نے دیا ہے۔

سعی اور محنت:

پانچواں مسئلہ: سعی اور محنت کا ہے جیسا کہ الرَّحِیۡمِ اور الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ میں بتایا ہے جس طرح قرآن مجید نے توکل اور دعا اور پھر سعی اور محنت میں دونوں پہلوؤں پر کاربند ہونا سکھلایا ہے یہ نہایت ہی اعلیٰ اور اصفیٰ طریق ہے اور باقی مذاہب نے یا تو توکل پر زور دے کر سلسلۂ اسباب کو لغو اور محنت و سعی کو عبث قرار دے کر خدا کی بے ادبی اور اباحت اور تعطل کی گندی راہ پر چلانا چاہا ہے۔ یا سلسلۂ اسباب اور محنت پر زور دے کر دہریت کی تخم ریزی کی ہے اور کسی نے حفظ مراتب کو مد نظر نہیں رکھا پر قربان جائیں بے مثل خدا کی اس بے مثل کتاب پر جو کہ بے مثل رسول پر نازل ہوئی ہے کہ جس نے اس بے مثل شاہراہ کو پیش کیا ہے اور حفظ مراتب کو ہر ایک مقام پر ملحوظ رکھا ہے۔ اور سعی و محنت کا مسئلہ وہ ہے کہ جس کے فوائد سے دنیا کے اکثر اور معتبر اور معتد بہ حصہ کو انکار نہیں ہے ہاں اس میں اگر کوئی نقص ہے تو وہ یہ ہے کہ عام طور پر اسباب اور سعی کو مستقل خیال کیا جاتا ہے جو کہ دہریت کی جڑھ ہے لیکن قرآن مجید نے جو سعی بتائی ہے وہ اس نقص سے منزہ ہے۔

عبادت:

چھٹا مسئلہ: عبادت کا ہے۔ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے کیونکہ عبادت ہی وہ چیز ہے کہ جس سے انسان ایک مہذب اور پاک اور بے شر اور نافع انسان بن سکتا ہے اور اسی سے انسان اپنے حقیقی رب اور مولیٰ کو راضی کر سکتا ہے کہ جس کے ہاتھ میں دونوں جہانوں کی سب خیر و شر ہے اور جو سعادت دارین اور سب کامیابیوں اور سب خوشحالیوں کا سرچشمہ ہے۔ عبادت کا بھی مسئلہ وہ ہے کہ جس پر دنیا کے اکثر حصہ کا اتفاق ہے لیکن نقص یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس میں خدا کے سواء اور اشیاء کو بھی رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ کے ساتھ شریک کر دیا ہوا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ۔ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ ذُو الۡجَلَالِ وَالۡاِکۡرَامِ۔ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ[1] کی بے قدری اور بے عزتی کر رہے ہیں کیونکہ

[1]۔ فیصلہ کرنے والوں میں سے بہترین، تمام جہانوں کا ربّ، صاحب جلال واکرام، اس جیسا زمین اور آسمان میں کوئی نہیں ہے۔ (از مرتب)

عبادت اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو کہتے ہیں۔ پس جب ماسوا اللہ کی بھی وہی تعظیم کی گئی جو کہ اللہ کے لئے کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس کی عظمت اور قدر و منزلت اللہ کے برابر ہو تو ضرور اس شخص نے اللہ عزیز کو اپنی قدر سے نیچے اتار کر ایک ادنیٰ چیز سے برابر کر دیا اور یہ اعلیٰ درجہ کی بے قدری ہے۔

اسی وجہ سے قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (الزمر:65)(کہہ دے اے جاہلو کیا تم مجھے کہتے ہو کہ اللہ کے سواء کسی اور کی عبادت کروں) کے بعد فرمایا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ[1](الانعام:92)یعنی غیر اللہ کو عبادت میں اللہ کا شریک بنانے سے اللہ عظیم کی سخت بے قدری ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے اس نقص کے رفع کرنے میں بہت زور دیا ہے اسی وجہ سے فاتحہ میں بھی اِيَّاكَ نَعْبُدُ فرمایا۔

توحید:

ساتواں مسئلہ: توحید کا ہے جیسا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں توحید ذاتی اور توحید صفاتی کو بیان فرمایا ہے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں توحید فی العبادت کا بیان ہے۔

ہمدردی خلائق:

آٹھواں مسئلہ: ہمدردی خلائق ہے جیسا کہ اِهْدِنَا میں مذکور ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جب قوم کی قوم ہی صراط مستقیم پر ثابت قدم ہو جائے اور ہر ایک فرد بشر میں یہ ہمدردی ہو جائے کہ وہ اپنی قوم کے صراط مستقیم پر لانے کا اس قدر کوشاں ہو جائے کہ خدا سے گڑ گڑا کر قوم کا صراط مستقیم پر ثابت قدم ہونا سچے جوش سے چاہے نہ عادت سے تو پھر یقیناً اس قوم کو سعادت دارین حاصل ہو کر ہی رہے گی اس کے ثبوت کے لئے صحابہ کا نمونہ کافی ہے۔ یہی تعلیم تھی کہ جس نے اہل اسلام کو دینی اور دنیوی معراج کرایا تھا۔ اور اب اگر آدمؑ کے ہبوط کی مانند ان کا ہبوط اور تنزل ہے تو اسی تعلیم کو پس پشت ڈالنے سے اور آئندہ بھی اگر ان کا عروج ہو گا اور ضرور ہی ہو گا تو اسی تعلیم پر کاربند ہونے سے ہو گا۔ اس سے بڑھ کر اور کونسی ہمدردی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص روزمرہ پنجگانہ ہر ایک رکعت میں بلکہ سحری کے وقت جبکہ ہر ایک انسان اپنی ضرورتوں اور سخت سے سخت حاجتوں کو

[1] ۔ تو ان لوگوں نے اللہ (کی صفات) کا اندازہ اس طرح نہیں کیا تھا جس طرح کرنا چاہیے۔ (تفسیر صغیر)

فراموش کر کے میٹھی نیند سو رہا ہو اور ایک شخص رو رو کر خدا سے دعا مانگتا ہو کہ میری قوم کو صراط مستقیم پر لا اور یہی ہمدردی سارے تمدن کی جڑھ ہے۔

صحیح اور سچے تجارب کا حصول:

نواں مسئلہ: صحیح اور سچے تجارب کا حاصل کرنا اور ان سے فائدہ اور عبرت حاصل کرنا ہے جیسا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ سے ثابت ہے کیونکہ اس میں بتایا ہے کہ پہلے تجربہ سے معلوم کرو کہ کون لوگ منعم علیہم ہوئے ہیں اور کون مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اور کون ضَآلِّیْن ٹھہرے ہیں۔ اور پھر اس تجربہ سے یوں فائدہ اٹھاؤ کہ تم بھی دعا کرو کہ ہم کو مُنْعَمْ عَلَیْهِمْ کی راہ پر چلا اور مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اور ضَآلِّیْنَ کی راہ سے بچا۔ اور یہ مسئلہ بھی سعادت کی جڑھ ہے اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں مُنْعَمْ عَلَیْهِمْ اور مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اور ضَآلِّیْنَ کی بہت مثالیں بیان فرمائی ہیں تاکہ یہ اسوۂ حسنہ اور عبرت کا باعث ہوں اور جس قوم نے ترقی کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو اس کا پہلا محرک یہی تجارب ہوئے ہیں۔

صادقوں کی معیت اور بدوں سے اجتناب:

دسواں مسئلہ: صادقوں کی معیت اور بدوں سے اجتناب ہے جیسا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ سے ثابت ہے اور یہ مسئلہ بھی سب سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ جب دنیا کی لائف پر نظر کی جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہی لوگ کامیاب اور سعادت مند ہوئے ہیں کہ جنہوں نے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ(التوبۃ:119) (صادقوں کے ساتھ ہو جاؤ) کی تعمیل کی اور جنہوں نے شریروں کا ساتھ اختیار کیا ہے آخر بجز خسارہ اور حسرت کے ان کے ہاتھ میں اور کچھ نہیں آیا۔

ایسے اور بہت سے مسائل ہیں جو فاتحہ شریف میں بتائے گئے ہیں اور ہماری غرض یہاں پر نمونہ بتانا ہے لہٰذا ہم انہی چند مسائل پر بس کرتے ہیں اور اسی پر فاتحہ کی تفسیر کو ختم کرتے ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ[1]۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 2 ماہ اگست 1906ء صفحہ 41 تا 82)

[1]۔ ہم اس (بات) پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ (از مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرۃ

آیت 2: الٓمّٓ۔

(م) یہ اور اس کے ساتھ کے اور مفرد حروف جو کہ بہت سی سورتوں کے ابتداء میں آئے ہیں ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں ان کے معانی کی نسبت بہت سا نزاع ہوا ہے بعض کا قول ہے کہ ان کے معانی کچھ نہیں ہیں اور محض اس غرض کے لئے لائے گئے ہیں کہ جس کتاب کی ایک سورۃ کی مثل تم سے طلب کی گئی ہے وہ ان ہی حروف سے مرکب ہے کہ جن سے تمہارا کلام مرکب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کے معانی ہیں لیکن چونکہ یہ حروف آیات متشابہات میں سے ہیں لہٰذا ان کی مراد کو سوائے اللہ کریم کے اور کوئی نہیں جانتا بعض کہتے ہیں کہ ان کے معانی ہیں لیکن ان پر اطلاع بجز آنحضرتؐ یا خواص امت کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔ بعض کہتے ہیں کہ اوروں کو بھی ہو سکتی ہے بلکہ ہے پھر اس میں نزاع ہوا ہے کہ وہ کون سے معنی ہیں۔

چونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ[1] (الشعراء:196) اور مہمل الفاظ مبین تو کیا لسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔ اور علاوہ اس کے پھر ان پر کوئی فائدہ بھی مرتب نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن مجید کے ہر ایک لفظ سے یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب انہیں حروف سے مرکب ہے کہ جن سے مخالف اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں اور خداوند کریم کا ہر ایک قول و فعل لغو ہونے سے منزہ ہے۔ رہا یہ مذہب کہ یہ آیات متشابہات سے ہیں اور ان کے معانی اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس مذہب کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا الخ۔ (آل عمران:8)

[1]۔ (اس کو جبریل نے خدا کے حکم سے) کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں اتارا ہے۔ (تفسیر صغیر)

ترجمہ۔ اس کتاب سے کچھ آیات محکمات ہیں جو کتاب کے اصول ہیں اور کچھ متشابہات ہیں پس جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں فتنہ اور تاویل کی خواہش سے اور نہیں جانتا اس کی تاویل مگر اللہ اور علم میں پختہ لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور سوائے عقلمندوں کے اور کوئی نصیحت نہیں پکڑتا۔ اے ہمارے رب ہدایت کرنے کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ بنا اور اپنے پاس سے رحمت دے بیشک تو بہت دینے والا ہے۔ اور اِلَّا اللّٰہُ پر وقف ہے جس سے صاف ثابت ہے کہ اللہ کے سواء متشابہات کی تاویل کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں وہ اِلَّا اللّٰہُ پر وقف نہیں رکھتے بلکہ اَلرَّاسِخُوْنَ کو اللہ پر عطف کر کے یہ معنی کرتے ہیں کہ ان کی تاویل بجز اللہ اور راسخین فی العلم کے اور کوئی نہیں جانتا۔

متشابہات کے معنی کسی کو معلوم ہو سکتے ہیں یا نہ:

لیکن میرے خیال میں خواہ اِلَّا اللّٰہُ پر وقف ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ متشابہات کے معنی اللہ کے سواء اور کسی کو کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں تاویل آیا ہے معنی نہیں آیا یعنی یہ تو آیا کہ اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا نہ یہ کہ اس کے معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور تاویل کے معنی قرآن مجید میں مآل اور انجام کے آئے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اعراف میں آیا ہے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (الاعراف:54) ترجمہ۔ اس کے مآل ہی کا انتظار کرتے ہیں اور جس دن اس کا مآل اور انجام آجائے گا تو جو لوگ اس کو پہلے بھولے بیٹھے تھے وہ کہیں گے کہ بیشک ہمارے رب کے رسول حق لائے تھے علیٰ ہٰذا القیاس۔ اور مقاموں میں بھی یہی معنی آئے ہیں اور اس کے معنی معنے کے ہرگز نہیں آئے۔

پس تاویل کے نہ جاننے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معنی بھی کوئی نہیں جانتا۔ پھر اس مذہب پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ جب متشابہات کے معنی ہی کسی کو نہیں معلوم ہو سکتے تو پھر ان کا اتارنا ہی لغو ہوا جو کہ خدائے حکیم کی شان سے بعید بلکہ اَبْعَدْ ہے۔ تو انہوں نے

اس کا یہ جواب دیا کہ اہل علم کے لئے کسی علمی بات اور خصوصاً مشکل بات میں خوض و فکر کرنے سے بچنا عظیم الشان مجاہدہ ہے پس جس طرح ظاہری افعال میں انسان کو مکلف کیا گیا ہے اسی طرح علماء کو علمی رنگ میں بھی مکلف کیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ بھی صحیح نہیں بلکہ محض بناوٹی بات معلوم ہوتی ہے اس واسطے کہ خداوند کریم کا اگر یہ منشا ہوتا تو بجائے یہ فرمانے کے کہ اس کی تاویل اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ فرماتا کہ ان میں کوئی خوض و فکر نہ کرے یا یہ کہ جو ان میں خوض و فکر کرے گا اس کو سزا دی جائے گی لیکن ظاہر ہے کہ سارے قرآن مجید میں ایسا نہیں آیا اور اتباع متشابہات کی مذمت کی ہے تو وہ بھی اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ کے ساتھ (فتنہ کے ارادہ سے) مقیّد ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس ارادہ سے نہ ہو تو مذموم نہیں اور هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ بھی صاف بتاتا ہے کہ ایسے معنی مذموم نہیں کہ جن کا مرجع آیات محکمات ہوں یعنی وہ معنی محکمات کے مطابق ہوں۔ نیز اگر ان کے اتارنے سے یہ غرض ہوتی کہ لوگ ان میں خوض و فکر نہ کریں تو ضروری تھا کہ پہلے خداوند کریم ان کی فہرست دیتا کہ فلاں فلاں آیت متشابہ ہے یا کم از کم آنحضرت ﷺ ہی وہ فہرست بیان فرما دیتے حالانکہ نہ قرآن مجید نے یہ فہرست بیان کی ہے اور نہ آنحضرتؐ نے بتائی ہے بلکہ اب تک علماء کا متشابہات میں نزاع ہے۔ اگر ایک ایک آیت کو متشابہ قرار دیتا ہے تو دوسرا اس کو محکم کہتا ہے بلکہ اگر ایک متشابہ کے ایک معنی کرتا ہے تو دوسرا اس کے بالمقابل اور معنی بتاتا ہے۔

پس کیا جس کتاب کا دعویٰ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[1] (الانعام:155) ہے (یعنی جن اشیاء کی تفصیل کی ضرورت تھی ان کی تفصیل مناسب حال کتاب اللہ بلکہ جامع کتاب اللہ اس کتاب میں موجود ہے) اور جس نبی نے حجۃ الوداع کے مجمع جیسے مجمع میں اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ[2] کی ندا بلند کی ہے اور سب مجمع سے قَدْ بَلَّغْتَ[3] کا جواب سن کر رفیق اعلیٰ کی طرف رخ کیا ایک نہایت ضروری فہرست کو نہ بیان کرتے اور نہ اس کے متعلق کچھ نشان اور پتہ بیان کرتے۔

---

[1] ۔ ہر اک امر کی وضاحت کرنے کے لئے۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ غور سے سنو! کیا میں نے پہنچا دیا۔ (از مرتب)

[3] ۔ یقیناً آپؐ نے پہنچا دیا۔ (از مرتب)

متشابہ بھی محکم ہو جاتی ہے:

نیز آیت میں اس قدر آیا ہے کہ اس کی تاویل بجز اللہ کے کوئی نہیں جانتا تو اگر بالفرض تاویل سے معنی مراد لئے جاویں تو بھی اس سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی بذات خود نہیں جانتا نہ یہ کہ خدا دوسرے کسی کو بتاتا بھی نہیں۔ جیسا کہ علم غیب میں آیا ہے لَا یَعْلَمُ ..... الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ[1] (النمل:66) اور پھر دوسرے مقام میں آیا ہے لَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ[2] (الجنّ:27،28) نیز جس طرح ایک شے ایک وقت غیب کا حکم رکھتی ہے تو اس وقت بجز اللہ عالم الغیب کے اور کوئی اس کو نہیں جانتا اور نہ مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ کے سوا اور کسی کو اس پر اطلاع بخشتا ہے اور پھر دوسرے وقت خداوند کریم اسی شے کو معرض ظہور اور عالم شہود میں لے آتا ہے تو ہر ایک انسان کو اس کا علم حاصل ہو سکتا ہے مثلاً ایک بچہ جب تک رحم میں ہوتا ہے تو اس کے بہت سے احوال وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ (لقمان:35) (اور وہی جانتا ہے جو رحم میں ہے) کے مطابق غیب میں داخل ہوتے ہیں جن کو بجز خدائے علیم کے دوسرا کوئی نہیں جانتا اور جب وہ بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے وہ احوال غیب معرض ظہور میں آچکتے ہیں تو پھر ہر کہ ومہ ان کو جان لیتا ہے یا جیسا کہ ایک انسان جب تک زندہ ہوتا ہے تو نہ وہ خود جانتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو بجز اللہ عالم الغیب کے اس کا علم ہوتا ہے کہ کس زمین میں یہ مرے گا جیسا کہ فرمایا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان:35) (کوئی جی نہیں جانتا کہ کہاں پر مرے گا) لیکن جب وہی انسان کہیں مر جاتا ہے تو اس کو اور اور انسانوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور اس وقت یہ غیب نہیں اور نہ غیب کے احکام اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ غرض کہ جس طرح غیب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ غیب ہی رہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو ایک وقت میں غیب ہو جائے تو پھر جب وہ غیب نہ رہے تو بھی اللہ کے سوا اس کا علم اور کسی کو حاصل نہ ہو۔

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ جو آیت یا عبارت ایک وقت متشابہ ہو جائے تو

---

[1] ۔... خدا کے سوا (ان میں سے کوئی) غیب کو نہیں جانتی۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا۔ سوائے ایسے رسول کے جس کو وہ اس کام کے لئے پسند کر لیتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

پھر وہ ہمیشہ متشابہ ہی رہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جب وہ متشابہ نہ رہے تو بھی اس کی تاویل یا معنے بجز اللہ کے اور کوئی نہ جان سکے یا نہ جانے بلکہ جس طرح غیب ایک وقت میں غیب ہوتا ہے اور اس وقت اللہ کے سوا دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا اور پھر بعض اوقات وہی غیب جب معرض ظہور اور شہود میں آجاتا ہے تو اس کو ہر ایک جان سکتا اور جان لیتا ہے۔ اسی طرح متشابہ کا حال بھی ہے کہ ایک وقت وہ متشابہ ہوتی ہے یعنی علاوہ ان معنوں کے جو کہ متکلم کی مراد ہیں سامع کے نزدیک اور معانی کا بھی احتمال رکھتی ہے اور سامع کو نہ متکلم نے خود بتایا ہوا ہوتا ہے کہ ان معانی متحملہ میں سے فلاں معنی میری مراد ہیں اور نہ اس کو کوئی قرائن ملتے ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ خود ہی ان معنوں کی تعیین کرے جو کہ متکلم کی مراد ہیں اور اس وقت میں بجز اللہ علیم اور متکلم کے دوسرا کوئی ان مراد معنوں کو نہیں جان سکتا اور جب دوسرے وقت میں خداوند کریم خود ان معنوں کو بتا دیتا ہے یا انسان کے پاس وہ قرائن موجود ہو جاتے ہیں یا اس کو اس وقت معلوم ہو جاتے ہیں کہ جن کے ساتھ وہ مقصودہ معنوں کی تعیین کر سکتا ہے تو اس وقت نہ وہ متشابہ متشابہ رہتی ہے اور نہ اس پر یہ حکم مرتب ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی دوسرا کوئی نہ جانے۔

متشابہ کے محکم ہونے کی مثال:

اس کی نظیر یا مثال یوں خیال کرنی چاہئے کہ ایک رؤیا ہوتا ہے جو بہت سی تعبیروں کا محتمل ہوتا ہے۔ پس اس وقت وہ متشابہ یا متشابہ کے حکم میں ہوتا ہے پھر جب خداوند کریم خود اس کی تعبیر بتا دیتا ہے یا اس کا مصداق معرض ظہور میں آجاتا ہے تو پھر اس میں کوئی اشتباہ اور تردّد ہرگز نہیں رہتا ہے اور نہ وہ اس وقت متشابہ یا متشابہ کے حکم میں رہتا ہے اسی طرح جو پیشگوئی کہ استعارہ کے رنگ میں ہوتی ہے اور وہ بہت معانی کے محتمل ہونے کے باعث متشابہ ہوتی ہے اور جب خدائے علیم و حکیم خود اپنی مراد کی تعیین کر دیتا ہے یا تعیین کے قرائن موجود ہو جاتے ہیں یا اس کا مصداق ظاہر ہو جاتا ہے تو اس کی مراد میں کوئی تردّد نہیں رہتا اور نہ وہ متشابہ رہتی ہے مثلاً اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ

النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ[1] (النمل:83) (ہم نکالیں گے ان کے لئے دابہ الخ) ایک متشابہ آیت تھی۔ دابہ کا لفظ بہت سے معنوں کا محتمل تھا لہٰذا کسی نے اس سے کوئی شے مراد لی اور کسی نے کوئی۔ تو جب خداوند کریم نے اس پیشگوئی کا مصداق اس آخری زمانہ میں ظاہر فرمایا جو کہ ہمارا زمانہ ہے اور علاوہ اس کے خداوند کریم نے اس وقت اپنے برگزیدہ رسول مہدی موعود اور مسیح کو بتا بھی دیا کہ دابہ سے مراد طاعون کے کیڑے ہیں جو زمین سے نکلتے ہیں اور لوگوں کو اس لئے کاٹتے ہیں کہ وہ اللہ کی آیتوں اور نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تو اب باقی سب احتمال رفع ہو کر اصل معنے مراد معین ہو گئے اور یہ آیت کریمہ اب متشابہات سے نکل کر محکمات میں داخل ہو گئی۔ اسی طرح اَطْوَلُكُنَّ يَدًا[2] (صحیح البخاری کتاب الزکاۃ حدیث 1420) کی پیشگوئی بہت سے معانی کے محتمل ہونے کے باعث متشابہات میں سے تھی۔

لیکن جب آنحضرتؐ کے بعد لمبے ہاتھ والی بی بی فوت نہ ہوئی بلکہ وہ جو کہ فراخ دست اور سخی تھی تو اسی وقت اس کے مقصودہ معنی سب پر کھل گئے اور کسی کو ان میں تردّد نہ رہا اور یہ اس وقت سے متشابہات کے شمار سے نکل کر محکمات کی قطار میں داخل ہو گئی۔

پس اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ متشابہات ایسی چیز نہیں کہ ابد الاباد کے لئے وہ متشابہ ہی رہیں اور اللہ کے سواء اور کسی کو ان کا علم کبھی بھی حاصل نہ ہو بلکہ بعض اوقات ان کے معنوں کی تعیین ہو کر متشابہ ہونے سے نکل جاتی ہیں اور اس وقت اس کا علم اوروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

کبھی ایک شخص کی نسبت متشابہ ہوتی ہے اور دوسروں کی نسبت محکم:

نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شے ایک کے لئے غیب ہوتی ہے اور دوسروں کے لئے نہیں ہوتی مثلاً ایک انسان کے دل میں جو بات ہو وہ دوسروں کے لئے تو غیب ہے لیکن اس شخص کے لئے غیب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک بات ایک شخص کی

[1]۔ ہم ان کے لئے زمین سے ایک کیڑا نکالیں گے جو ان کو کاٹے گا۔ اس وجہ سے کہ لوگ ہمارے نشانات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ تم میں سب سے لمبے ہاتھ والی۔ (از مرتب)

نسبت متشابہ ہوتی ہے اور اس کے نزدیک اس کے مقصودہ معنوں کی تعیین نہیں ہوتی اور ایک دوسرا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک مراد معین ہوتی ہے اور اشتباہ رفع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی نسبت وہ متشابہ نہیں رہتی جیسا کہ عزیز مصر کی خواب ہے جو کہ سورۂ یوسف میں مذکور ہوئی ہے کہ اوروں کے نزدیک وہ متشابہات میں سے تھی اور کوئی بھی مراد معنوں کی تعیین نہ کر سکا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے نزدیک وہ متشابہ نہ تھی اور معانی مقصودہ آپ کے نزدیک معین تھے۔

پس اس لحاظ سے بھی جائز ہے کہ ان حروف کی مراد بعض کے نزدیک معین نہ ہوئی ہو اور بعض کے نزدیک اللہ کے فضل سے معین ہو جیسا کہ پہلی تحقیقات کی رو سے جائز تھا کہ پہلے یہ حروف متشابہ ہوں اور اب ان کے معنی معلوم ہو کر محکم ہو جائیں اور یہ دونوں امر محض ممکن ہی نہیں بلکہ خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا ہے۔ چونکہ مسیح موعود کے زمانہ کی نسبت پہلے سے قرآن مجید واحادیث صحیحہ نے بتا دیا تھا کہ وہ زمانہ زمینی اور آسمانی برکات کا زمانہ ہو گا لہٰذا اس کے مطابق خداوند کریم نے اس زمانہ میں دونوں قسم کے برکات اس زمانہ کو عطا فرمائے ہیں۔ اور چونکہ زمینی برکات تو مشاہد ہیں تو ان سے آسمانی برکات کا ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اور منجملہ آسمانی برکات کے ایک قرآن مجید کے مطالب اور معارف وحقائق ہیں یہاں تک کہ دنیا پر روشن ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے معارف وحقائق خدا نے اپنے مسیح اور اس کے بعض خدام پر ظاہر فرمائے ہیں جو کہ لوگوں پر مخفی تھے اور منجملہ ان معارف کے ایک ان ہی حروف مقطعات کے معنی ہیں کہ جن میں لوگوں کو اشتباہ تھا لیکن خداوند کریم نے اپنے فضل وکرم سے حضرت مسیح موعود کے سچے خادم اور قرآن مجید کے عاشق حضرت مولانا مولوی نور الدین صاحب پر ایسے کھول دیئے ہیں کہ علاوہ ان کے ثلج قلب کے اور بھی جو شخص بنظر تحقیق ان پر غور وفکر کرے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ یقین کر لے گا کہ ان سے یہی مراد ہے اور وہ یہ ہے۔

حروف مقطعات کے معنے:

(**حضرت حکیم الامت سَلَّمَهُ اللهُ تَعَالٰی**) یہ حروف اسماء الٰہی کے ٹکڑے ہیں اور ان کے

ساتھ ان اسماء الٰہی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ جن کی یہ جزو ہوتے ہیں اور یہ دعویٰ ہم ازخود نہیں کرتے بلکہ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ اور بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور خیر التابعین فی التفسیر مجاہد اور سعید بن جبیر اور قتادہ اور عکرمہ اور حسن اور ربیع بن انس اور سدی اور شعبی اور اخفش اور تابعین کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہے کہ ان حروف کے ساتھ اسماء الٰہیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ ان اسماء الٰہی کے ابعاض اور اجزاء ہیں اور ضحاک نے اس پر یہ استدلال کیا ہے کہ کلمہ کے بعض کو ذکر کرکے پورا کلمہ مراد لینا یہ عربوں کی عادت میں داخل ہے اور اس کی تائید کے لئے اس نے کچھ اشعار پیش کئے ہیں۔

بلکہ جو قرآن مجید کہ ہدایت اور شفا ہے اس میں بھی تم دیکھتے ہو کہ وقفوں کے رموز کے لئے حروف لکھے ہوئے ہیں مثلاً مطلق کا نشان ط ہے اور جائز کا نشان ج ہے اور رکوع کا نشان حاشیہ پر ع ہے۔ اسی طرح کتب احادیث میں نا۔ انا۔ نبا۔ ح رموز ہیں اور علم کلام میں ھٰذا خلف کے عوض ھف ہوتا ہے اور کتب فقہ میں بحط وغیرہ رموز موجود ہیں اور کتب لغت میں ل۔ س۔ ن۔ ض۔ ك۔ ف۔ ح بابوں کے رموز ہیں اور ت۔ ع۔ ج۔ بلدہ اور معروف اور جمع کے رموز ہیں۔ اور کتب طب میں مکد مِنْ كُلِّ وَاحِد کی رمز ہے۔

پس یہ سب رموز اس بات کے شاہد ناطق ہیں کہ یہ طریقہ اختصار عربوں میں دائر اور سائر ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث میں بھی موجود ہے اور اس زمانہ میں تو قریباً ہر ایک قوم میں اس کی اس قدر کثرت ہے کہ جس کے ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پس جبکہ یہ طریق اختصار زبان عرب بلکہ خود قرآن میں موجود ہے اور بہت سے جلیل القدر صحابہ اور اہل علم تابعین اور ائمہ سے مروی ہے تو اب اس سے بے وجہ عدول کرنا اور محض احتمالات بے وجہ سے ان کے معنوں میں اشتباہ پیدا کرکے ان کو متشابہات میں داخل کرنا درست نہیں ہے اور بعض لوگ بعض روایات کو بزعم خود ان معنوں کے مخالف تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ انہی معنوں کی مؤید اور مثبت ہیں نہ مخالف۔ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ اور شعبی سے مروی ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی ہیں تو اگرچہ بعض نے غلطی

سے اس روایت کو پہلی روایت کے خلاف خیال کیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ اس کی مؤید ہے کیونکہ دونوں روایتوں کا مطلب یہ ہے کہ ان حروف سے مراد اسماء الٰہی ہے۔ اگرچہ اس قدر فرق ہے کہ پہلی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی پر اس لئے دلالت کرتے ہیں کہ یہ ان کی جزو ہیں اور دوسری روایت میں یہ نہیں بیان کیا گیا بلکہ جزو کا کل پر بلکہ بدل کا مبدل منہ پر اطلاق کر کے انہی حروف کو اسماء بول دیا ہے اور یہ استعمال عام اور شائع ہے۔ اور ان دونوں روایتوں کے متحد المطلب ہونے پر یہ بڑا قرینہ ہے کہ قائل دونوں کے ایک ہی ہیں اور دوسری کی عبارت ان معنوں کی محتمل ہے جو کہ پہلی کے معنی ہیں۔

اسی طرح بعض سے مروی ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی ہیں تو یہ بھی مخالف نہیں بلکہ پہلی روایت کے مؤید ہے کیونکہ پہلی روایت کے مطابق ان سے مراد اسماء الٰہی ہیں اور ظاہر ہے کہ اسماء الٰہی عموماً خدا کی صفت اور ثناء ہوتے ہیں مثل رَبُّ الْعَالَمِیْنَ، اَلرَّحْمٰنُ، اَلرَّحِیْمُ، اَلرَّزَّاقُ، ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنِ[1] وغیرہ کے۔ پس یہ روایت بھی مؤید ہے نہ مخالف۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہ سے مروی ہے کہ یہ حروف قسم ہیں کہ جن کے ساتھ قسم کھائی گئی ہے تو یہ بھی مخالف نہیں۔ بلکہ مؤید ہے کیونکہ قسم بھی اسماء الٰہی کے ساتھ کھانے کا حکم ہے۔

پھر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ الٓمّٓ نام ہے سورت کا اور یہ وہ بات ہے کہ جس پر اکثر مفسرین کا اتفاق ہے اور اکثر محققین نے اسی کو پسند کیا ہے اور خلیل اور سیبویہ جیسے جلیل القدر امام بھی اسی طرف گئے ہیں اور اس پر ان احادیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ جن میں کسی سورت کو ان حروف کے ساتھ نامزد کر کے ذکر کیا گیا ہے جیسا صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ جمعہ کی صبح کی نماز میں الم سجدۃ اور ھَلْ اَتٰی پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری کتاب الجمعۃ باب مایقرا فی صلاۃ الفجر یوم الجمعۃ حدیث نمبر 891)

(صحیح مسلم کتاب الجمعۃ باب مایقرا فی یوم الجمعۃ حدیث نمبر 2031)

[1] ۔ تمام جہانوں کا رب، بے حد کرم کرنے والا، بار بار رحم کرنے والا، سب کو کھانا کھلانے والا، بڑی زبردست طاقت والا۔ (از مرتب)

اور ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یٰس قرآن مجید کا دل ہے۔
(سنن ترمذی ابواب فضائل القرآن باب ماجاء فی فضل یٰس حدیث نمبر 2887)

اور ایک دوسری میں آیا کہ آنحضرتؐ نے ص میں سجدہ کیا۔
(صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ ص حدیث نمبر 4807)

مجاہد نے کہا ہے کہ یہ سورتوں کے اوّل کے حکم میں ہیں یعنی جس طرح سورتوں کے اوّل سے ان سورتوں کو نامزد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہا جاتا ہے سورۃ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ یا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ وَغَیْرُھُمَا۔ اسی طرح ان حرفوں سے بھی ان سورتوں کو نامزد کیا جاتا ہے۔ اور یہی قول ہے مجاہد اور حسن اور زید بن اسلم کا۔ تو یہ قول بھی مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے کیونکہ جب یہ مسلّم بات ہے کہ سورتوں کا نام ان کے ابتداء کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔

اور ان کے اوائل کے فی الحقیقت کچھ معنے بھی ضرور ہی ہوتے ہیں۔ تو پھر یہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں ہیں اگر باوجود اسماء الٰہی کی طرف مشیر ہونے کے۔ ان سورتوں کے نام بھی ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔

پھر مجاہد سے مروی ہے کہ یہ قرآن مجید کے نام ہیں اور یہ بھی مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے کیونکہ ہر ایک سورۃ قرآن ہے تو جب یہ سورتوں کے نام ہوئے تو بالضرور قرآن مجید کے بھی نام ہوئے اور جس طرح کہ سورتوں کے اسماء اور اسماء الٰہی کے اجزا ہونے میں کسی قسم کی منافات نہیں بلکہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اسماء قرآن مجید اور اسماء الٰہی کے اجزاء ہونے میں کوئی مخالفت نہیں اور نہ اسماء قرآن مجید اور اسماء الٰہی ہونے میں کچھ نقص عائد ہو سکتا ہے۔

پھر مجاہد سے مروی ہے کہ حروف سورتوں کے مفاتیح ہیں اور چونکہ سورتیں بھی قرآن مجید ہیں لہٰذا وہ مفاتیح القرآن بھی ہیں اور یہ بھی مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے۔ اس لئے کہ سورتوں کا افتتاح بھی تسبیح و تحمید اور اسماء حسنیٰ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پس اگر باوجود ان کے اسماء الٰہی کی طرف مشیر ہونے کے مفاتیح القرآن بھی ہوں تو کچھ حرج کی بات نہیں ہے اور پھر بعض کا قول ہے کہ یہ اسماء الٰہی اور افعال سے ہیں اور یہ حضرت ابن عباس سے مروی

ہے تو یہ بھی مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے۔ اس لئے کہ اسماء الٰہی میں سے وہ بھی ہیں جو کہ افعال الٰہی پر دال ہیں۔

پھر بعض نے کہا ہے کہ یہ معنے کے لئے یا بہت معانی کے لئے موضوع ہیں تو یہ بھی مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے اور پہلا مجاہد ہی کا قول ہے اور مؤید اس وجہ سے ہے کہ مجاہدؒ وغیرہ نے جو معنے بیان کئے ہیں وہ وہی ہیں جو پہلے ہم بیان کر آئے ہیں اور ان کا مؤید ہونا ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اور وضع یہاں پر مجاز کو بھی شامل ہے کہ جس کو وضع نوعی کہتے ہیں اور اصل معنوں کی تائید اس دلیل عقلی سے بھی ہوتی ہے جو کہ اس دور کے امام حضرت مسیح موعود اور مہدی مسعود علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک واقعی شئے کے لئے چار علتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک علت مادی کہ جس میں وہ شئے بننے کی استعداد اور قابلیت ہوتی ہے۔ دوم علت صوری کہ جس کے ساتھ وہ چیز موجود ہو جاتی ہے۔ سوم علت غائی۔ اور یہ وہ غرض اور فائدہ ہے کہ جو اس شئے پر مرتب ہوتا ہے اور اسی کے لئے وہ شئے بنائی جاتی ہے۔ اور چہارم علت فاعلی اور یہ وہ ہے جو کہ اس شئے کو بنانے والی ہوتی ہے۔

تو یہاں پر علت مادی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ[1] (البقرۃ:3) ہے یعنی جو کہ اللہ کے علم میں ہے اور علت صوری لَا رَيْبَ فِيْهِ[2] (البقرۃ:3) ہے اور علت غائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[3] (البقرۃ:3) ہے۔ اب باقی رہی علت فاعلی تو یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ اس کا بیان الٓمّٓ میں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ الف لام میم میں اشارہ ہے۔ اللہ، لطیف، معلم اور مرسل اور مُنْزِل کِتَاب کی طرف یا اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ کی طرف یعنی میں ہوں بہت جاننے والا اللہ۔ پس اس دلیل عقلی سے بھی یہی ثابت ہے کہ ان حروف سے مراد اسماء الٰہی ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ یہ اللہ علیم کے ان پروانوں پر اپنے خاص دستخط ہیں۔

---

[1] ۔ یہی کامل کتاب ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ اس (امر) میں کوئی شک نہیں۔ (تفسیر صغیر)

[3] ۔ متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے۔ (تفسیر صغیر)

(محمد سرور) جب بہت سے صحابہ بلکہ جلیل القدر صحابہ اور تابعین اور ائمہ زبان سے صحیح سند کے ساتھ یہ معنے مروی ہیں اور باقی جس قدر روایات ہم نے بیان کی ہیں وہ سب ہی ان معنوں کی مؤید ہیں۔ تو اب ناظرین غور فرماسکتے ہیں کہ ان معنوں میں اب کون سا اشتباہ باقی رہ سکتا ہے یا ان کے یقین میں کون سی کسر رہ جاتی ہے تا کہ ان کو متشابہات سے قرار دیا جائے۔

اب رہا یہ کہ اس طریق کو کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ ایسا سوال ہے کہ اگر پہلے زمانہ کے لوگ پیش کرتے تو شاید ان کو اس کا حق بھی پہنچتا لیکن اس زمانہ کے لوگوں کو ہر گز نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ آج کل یہ طریق ایسا رائج ہوا ہے کہ ہر ایک قسم کی چیز پر اور ہر ایک طبقہ کے لوگوں میں یہ رائج ہے۔ برتنوں، لکھنے کے پروں، ہر ایک کارخانہ کی ہر چیز پر اس طریق کے مطابق کچھ ضرور ہی لکھا ہوا ہوتا ہے۔ سب حکام بلکہ شاہانِ وقت بھی اپنے دستخطوں میں اس طریق کو استعمال کرتے ہیں۔

پس جب دنیا کے ہر ایک طبقہ میں یہ طریق رائج ہے تو کیا کوئی عقلمند یہ خیال کر سکتا ہے کہ سب نے بے وجہ ہی اس کو اختیار کیا ہوا ہے۔ یا جب کہ اس کو استعمال کرتے ہیں اور سائل اور کسی پر سوال نہیں کرتا بلکہ خاص قرآن مجید ہی پر سوال کرتا ہے۔ تو کیا اس کا یہ سوال نیک نیتی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ پس جن وجوہات سے ساری دنیا نے اس کو اختیار کیا ہوا ہے انہی وجوہات سے قرآن مجید نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور قرآن مجید کے لئے یہ ایک امتیازی نشان ہے کہ جو جو خوبیں کہ بڑے زمانہ کے بعد دنیا کو معلوم ہوئی ہیں اور بالآخر سب عقلمندوں نے ان پر اتفاق کیا ہے ان سب کے اصول قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

پس جس طرح آج کل کے حکام کے دستخط طریق اختصار کے ساتھ ہوتے ہیں اسی طرح خدائے قدیر نے بہت سے شاہی احکام کی پیشانی پر ان حروف کے ساتھ دستخط کیا ہے۔ علاوہ اس کے حضرت حکیم الامت نے اس طریق کے اختیار کرنے کا سر تدبر بتایا ہے۔ اور مبرد اور بہت سے محققین کا قول ہے کہ ان کے ساتھ منکرین کا منہ بند کیا گیا ہے اور اتمام تحدی کے لئے ان کو مکرر لایا گیا ہے۔ جیسا کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ[1] (البقرۃ:24) مکرر

[1]۔ اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔ (تفسیر صغیر)

لایا گیا ہے اور یہی فراء سے اور قطرب سے مروی ہے جو امام سیبویہ کا شاگرد ہے اور حضرت شیخ الاسلام امام ہمام علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

قاضی بیضاوی نے خاص چند حروف کے لانے اور خاص سورتوں میں لانے کے بہت لطیف وجوہات بیان کی ہیں۔ جن سے خدائے حکیم مطلق کی حکمت کی عظمت معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ بہت سے اصطلاحی مسائل پر مبنی ہونے کی وجہ سے عام مذاق اور فہم سے بالاتر ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کو یہاں پر درج کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نیز وہ نکات بعد از وقوع کی قسم سے ہیں نہ استدلالی رنگ کی۔ نیز ان حروف سے شیعہ اور سنیوں نے عجیب نہیں بلکہ نہایت افسوس ناک طور پر اپنے اپنے مذہب کی صداقت پر استدلال کیا ہے۔

شیعہ نے تو کہا ہے کہ ان حروف میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ طَرِیْقُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمْسِکُہٗ (علی کا طریق حق ہے۔ ہم اس سے تمسک کرتے ہیں) اور ان کے بالمقابل اہل سنت والجماعت نے کہا کہ ان میں صَحِّ طَرِیْقَکَ مَعَ السُّنَّۃِ[1] کی طرف اشارہ ہے اور نہ تفسیر بالرأی کے سخت ترین وعید کا کچھ خیال کیا اور نہ اس بات کا کچھ خیال کیا کہ اس طریق استدلال کا کچھ ثبوت بھی ہے یا محض ایجاد بندہ ہے۔

اور پھر یہ بھی خیال نہیں کیا کہ جس بناوٹ سے ہم نے استدلال کیا ہے فریق ثانی بھی ایسی بناوٹ کر سکتا ہے۔ ہمارے ایک مکرم معظم دوست کا قول ہے کہ اللہ یہاں پر آدمؑ، بنی اسرائیل، ابراہیمؑ کے قصوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ اس سورت میں مذکور ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بجز لفظی مناسبت کے اس دعویٰ کے اثبات کے لئے اور کوئی دلیل نہیں ہے حالانکہ یہ دعویٰ بڑا خطرناک ہے کہ خدا کی مراد ان سے فلاں ہے کیونکہ اس کا ثبوت دو ہی طریق سے ہو سکتا ہے یا تو خداوند کریم خود بتا دے یا آنحضرتؐ یا آپ کے شاگردوں سے کچھ مروی ہو۔

پس اصل ثبوت یہی دو ہیں۔ باقی قرائن اور مناسبات موید ہو سکتے ہیں نہ مثبت۔ اور پھر اس میں یہ مشکل بھی پیش آتی ہے کہ اوّل سورۃ بقرہ میں اور بھی بہت سے قصے مذکور ہیں پھر ان کی

[1]۔ تو اپنا طریق سنت کے مطابق درست کر۔ (از مرتب)

تخصیص کیوں کی۔ زیادہ مقصود ہونے کا خیال بھی درست نہیں ہو سکتا کیونکہ اوروں کی نسبت بھی یہ دعویٰ ہو سکتا ہے چنانچہ بقرۃ کا قصہ بھی ایسا مقصود ہے کہ اس سورہ کا نام ہی بقرۃ رکھ دیا گیا ہے۔

دوم اور بہت سے قصے ہیں اور امور ہیں کہ جن میں یہ لفظی مناسبت پائی جاتی ہے اور بعض کا قول ہے کہ الٓمّٓ میں اشارہ ہے کہ اَللّٰہُ اَنْزَلَ بِوَاسِطَۃِ جِبْرَائِیْلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ یعنی اس کتاب کو اللہ نے بذریعۂ جبرائیل علیہ السلام محمد علیہ السلام پر اتارا ہے اور یہ قول بھی بعینہٖ اس سے پہلے کی مانند ہے۔ غرض کہ اصل بات یہی ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی کے اجزاء اور ابعاض ہیں اور ان سے غرض شاہانہ پروانوں پر دستخط ہے کیونکہ قرآن مجید کی ہر ایک سورۃ میں جو جو احکام ہیں کچھ تو رازق ہونے کی حیثیت سے صادر ہوئے ہیں، کچھ رب ہونے اور کچھ الٰہ اور خالق، مالک، ملک، بر، رؤف، رحیم وغیرہ ہونے کی وجہ سے، تو جس جس صفت کے لحاظ سے وہ احکام صادر ہوئے ہیں ضروری ہے کہ انہی صفات اور مناصب کو دستخطوں میں بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیتوں کے اخیر میں کچھ اسماء الٰہی ہوتے ہیں وہ اپنے ما قبل کے ساتھ ضرور ہی مناسبت اور تعلق کامل رکھتے ہیں۔ اور یہ معنے خود بھی صحیح طور پر بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ سے مروی ہیں اور اور اقوال بھی جو کہ کسی مستند سند سے مروی اور معتد بہا ہیں وہ ان کے موید ہیں گویا ان روایات میں بھی یہی معنے مروی ہیں نہ اور۔

ہاں بعض ایسے اقوال بھی ہم نے ذکر کئے ہیں جو کہ ان معنوں کے موید نہیں لیکن نہ ان کی کوئی سند ہے اور نہ وہ چنداں قابل اعتبار ہیں۔ حروف مقطعات کی بحث چونکہ معرکۃ الآراء بنی ہوئی تھی اور ان میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ اور بعض نادان دوست ایسی راہ پر چلے تھے کہ جس کی وجہ سے دشمنوں کو قرآن مجید پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کا موقع مل گیا ہے جس سے انہوں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر اعتراض کئے ہیں اور پھر بہت سی سورتوں میں ان کا ذکر ہے لہٰذا ہم نے اس بحث کو طول دیا ہے۔

اسم اشارہ کی بحث:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ۔ ذَا اسم اشارہ ہے اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے واحد مذکر کی طرف جس کے معنے ہیں یہ۔ اور لام دوری یا تاکید کے لئے ہے اور کاف حرف خطاب ہے۔ اکیلے

ذَا کے معنے تھے یہ۔ اور لام کے لگنے سے اس کے معنے ہوئے وہ، لیکن اکیلا لام کاف کے سوا نہیں ملایا جاتا یعنی ذال کبھی نہیں آتا لیکن کاف لام دونوں لگ کر پھر بھی اس کا ترجمہ وہ کیا جاتا ہے جس میں ذا اور لام کا ترجمہ ہو جاتا ہے اور کاف کا نہیں ہوتا بلکہ اس کا ترجمہ اردو میں ہو سکتا ہی نہیں۔ کیونکہ اس کا صحیح ترجمہ ہوتا ہے وہ تو اور یہ اردو کا محاورہ نہیں۔ ہاں وہ دیکھ اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو اس میں وہ اور خطاب (جو کاف کا مفہوم ہے) ادا تو ہو جاتا ہے پر دیکھنا اپنے طرف سے ایزاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ھٰذَا کا ترجمہ بھی اردو میں ٹھیک ٹھیک ادا نہیں ہوتا کیونکہ آگاہ کرنے کے لئے ہے اور اردو میں اس کے لئے کوئی ایسا لفظ نہیں کہ جس میں اصل معنوں پر ایزاد نہ ہو۔

پس ھٰذَا کا ترجمہ بقدر امکان ہے خبردار یہ اور ذٰلِكَ کا ہے وہ دیکھ اور کبھی کبھی ذٰلِكَ ھٰذَا کے معنوں میں آتا ہے تب یہ لام تاکید کے لئے ہو گا نہ تبعید یعنی دوری کے لئے۔ یہ تو ذٰلِكَ کی عام بحث اور تحقیق ہے۔ اب رہا یہ کہ یہاں پر اسکے معنے وہ ہیں یا یہ۔

(حضرت مولانا حکیم الامت) ابن عباس، مجاہد، سعید، اخفش، ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں پر اس کے معنے ھٰذَا کے ہیں یعنی اس کا لام دوری کے لئے نہیں بلکہ تاکید کے لئے ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ (آل عمران:59) (ترجمہ) یہ وہ ہے جو کہ ہم تیرے پر پڑھتے ہیں۔ اور پھر فرمایا اِنَّ ھٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (آل عمران:63) (بے شک یہ حق بیان ہے) تو پہلے قرآن مجید یا ایک سورۃ یا ایک واقعہ کے لئے ذٰلك لانا اور پھر اسی کے لئے وہاں پر ہی ھٰذا لانا صاف دکھاتا ہے کہ ان دونوں کے ایک ہی معنے ہیں ورنہ ایک چیز ایک ہی وقت میں بعید اور قریب کس طرح ہو سکتی اور ایک دوسری آیت کریمہ میں قرآن مجید کے لئے ھٰذا بھی آیا ہے جیسا فرمایا ھٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (الانعام:93) (یہ (قرآن) ایک (عظیم الشان) کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے (اور وہ) برکات کی جامع ہے۔)[1] تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذٰلِكَ ھٰذَا کے معنوں میں ہے اور فراء نے کہا

[1] نوٹ: رسالہ تعلیم الاسلام میں "ھذا کتاب انزلناہ الیك یہ کامل کتاب ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے" لکھا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق آیت اور ترجمہ تفسیر صغیر کے مطابق اوپر لکھ دیا گیا ہے۔ (از مرتب)

ہے کہ ذٰلِكَ دوری کے لئے ہے لیکن دوری اکثر تو مکانی ہوتی ہے اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے ہوتی ہے اور یہاں پر بھی مرتبہ کے لحاظ سے ہے یعنی وہ عظیم الشان کتاب جو کہ اپنی عظمت اور رفعت کے لحاظ سے نوع انسان سے بہت دور اور ارفع ہے جیسا کہ حضرت یوسف کی نسبت عزیز مصر کی بی بی کا قول نقل ہے فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (یوسف:33) (یہ وہ عظیم الشان شخص ہے کہ جس کی نسبت تم مجھے ملامت کرتی ہو۔)

(م) میرے خیال میں ان دونوں باتوں میں اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ جو کہتے ہیں کہ یہاں پر ذٰلِكَ دوری کے لئے نہیں ان کا مطلب اس سے مکانی دوری ہے اور جو کہتے ہیں کہ دوری کے لئے ہے ان کا مقصد دوری سے مکانی دوری نہیں بلکہ عظمت کی دوری ہے تو جس طرح پہلے مذہب والوں کے نزدیک مکانی دوری کے لئے نہیں اسی طرح دوسرے مذہب والوں کے نزدیک بھی مکانی دوری کے لئے نہیں اور جس طرح دوسرے مذہب والوں کے نزدیک عظمت کے لئے ہے اوّل مذہب والوں کے نزدیک بھی عظمت کے لئے ہے اس لئے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ذٰلِكَ هٰذَا کے مقام پر ہے جب وہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ ہٰذا کے مقام پر ذٰلِكَ کیوں اختیار کیا گیا تو کہتے ہیں کہ عظمت کے لئے۔

پس اس سے صاف ثابت ہے کہ اگرچہ بظاہر ان دونوں قولوں میں اختلاف پایا جاتا ہے پر حقیقت میں دونوں کا منشاء یہی ہے کہ مکانی دوری کے لئے نہیں بلکہ عظمت اور رفعت کی دوری کے لئے ہے اور یہاں پر بُعد زمانی بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کتاب کی طرف اشارہ کیا جائے جو کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں تھی یا یوں کہو کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس پیشگوئی میں تھی جو کہ آپ نے آنحضرتؐ کے متعلق کی تھی جس کو قرآن مجید نے بدیں الفاظ ذکر فرمایا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرۃ:130) اے ہمارے رب اور بھیج دے ان میں ایک عظیم الشان رسول جو کہ ان میں سے ہو جو سنائے ان کو تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کامل کتاب اور کامل حکمت اور پاک صاف بنائے ان کو۔

ال کے معنے ہیں وہ یا یہ کیونکہ جو ال اشارہ کے بعد آتا ہے وہ عہد خارجی کے لئے ہوتا

ہے یعنی اس سے ایک معین فرد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور یا اس کے معنے ہیں کامل کے جیسا کہ اَنْتَ الرَّجُلُ میں ہے یعنی تجھے اور مردوں پر ایسی فوقیت حاصل ہے کہ وہ تیرے مقابلہ میں مرد ہی نہیں بلکہ ایک تو ہی حقیقت میں مرد ہے۔ پس یہ ال جس شئے پر داخل ہوتا ہے اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اس کو کسی ایک فرد کے ساتھ خاص کر کے اس کے کمال کو ظاہر کرتا ہے اسی وجہ سے اس ال کو حقیقت کا ال بولتے ہیں۔

کتاب کے معنے:

کِتَابٌ: اصل میں ضم یعنی جمع کو کہتے ہیں اور اسی وجہ سے لشکر کو کَتِیْبَۃٌ کہتے ہیں اور کتاب بمعنے مکتوب بھی آتی ہے جیسا قرآن مجید میں آیا ہے اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ۔ (النمل:30) بے شک میرے پاس ایک معزز مکتوب (خط) ڈالا گیا ہے بمعنی حجت بھی آئی ہے جیسا آیا ہے فَاْتُوْا بِکِتٰبِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (الصٰفٰت:158) (پس لاؤ اپنی حجت اگر تم سچے ہو۔)

اور کتاب بمعنی اجل اور تاریخ کے بھی آتی ہے جیسا آیا ہے مَآ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ۔ (الحجر:5) (ہم نے جس بستی کو ہلاک کیا ہے ضرور ہی اس کے لئے کوئی معین تاریخ ہوئی ہے) اور بمعنی مکاتبت بھی آئی ہے یعنی غلام کو یہ لکھ دینا کہ اگر وہ فلاں مقدار کا مال ادا کر دے تو وہ آزاد ہے جیسا قرآن مجید میں آیا ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ (النور:34) (اور جو غلام مکاتبت چاہتے ہوں) اور تاریخ اور مکاتبت کو بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ ان دونوں کے لکھنے کا کثرت سے رواج ہے۔

پس یہ دونوں گویا مکتوب کے افراد ہیں اور یہاں پر مکتوب مراد ہے اور باقی دو معنے بھی اس میں موجود ہیں اس لئے کہ یہ کتاب شبہات اور شیطانی افواج کے مقابلہ پر بڑا قوی اور بہادر لشکر ہے۔ اور قرآن مجید بذات خود حجت ہے اور اپنے سب دعاوی کو حجت سے مضبوط کرتا ہے۔

رَیْبٌ کے معنے:

لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ لَا کے معنی ہیں نہیں اور رَیْبٌ کہتے ہیں شک کو۔ اور کبھی قلق کے معنوں میں آتا ہے۔ اور جو بمعنے قلق ہے، گاہے ان اشیاء پر بولا جاتا ہے جو کہ قلق اور اضطراب کا

باعث اور سبب ہوتی ہیں یعنی شدائد اور مصائب۔ جیسا قرآن مجید میں آیا ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۔ (الطور:31) یعنی ہم ان پر حوادث اور مصائب کے اترنے کا انتظار کرتے ہیں۔

پس اگر شک لیا تو لَا رَيْبَ فِيْهِ کے یہ معنے ہوئے کہ اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ اور اگر بمعنے قلق لیا تو اس کے معنے ہوں گے کہ اس میں کوئی قلق اور حیرانی نہیں ہے۔ اور اگر بمعنے شدائد اور مصائب کے لیا جائے تو پھر اس کے معنے ہوں گے کہ اس میں شدائد اور مصائب ہرگز نہیں ہیں۔ اور یہ تین ہی معنے صحیح اور بالکل صحیح ہیں۔

الٓمّٓ کے معنے:

اب الٓمّٓ کو اگر سورۃ کا نام قرار دیا جیسا کہ اکثر مفسرین کا قول ہے تو پھر اس ساری عبارت کے معنے یہ ہوں گے۔ الٓمّٓ وہ (یا یہ) کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک (یا حیرانی یا شدت اور مصیبت) نہیں ہے۔ اور اگر الٓمّٓ کو اسماء الٰہی کے اجزاء قرار دیا جیسا کہ حق ہے اور بالکل ثابت شدہ صداقت ہے تو اس سارے کے معنے ہوں گے اللہ لَطِيْفٌ، مُنْعِمٌ، مُنْتَقِمٌ، مُنْزِلُ كِتَابٍ[1] ہے۔ اس کتاب (یا اس کامل کتاب) میں ذرہ بھر شک (یا قلق یا شدت و مصیبت) نہیں ہے۔ یعنی چونکہ اللہ لَطِيْفٌ بِالْعِبَادِ[2] ہے اور فرمانبردار بندوں پر مُنْعِمٌ ہے اور نافرمانوں سے مُنْتَقِمٌ ہے۔

پھر یہ نہیں کہ برہموؤں کے خدا کی مانند خاموش ہو اور اپنا پتہ لگانے والوں کے عظیم الشان احسان کا ممنون و مرہون ہو اور کسی کے عذاب دینے میں محض ظالم اور خلاف عقل اور بیجا دکھ دینے والا ہو بلکہ متکلم اور مُنْزِلُ الْكِتَابِ[3] ہے کہ کلام اور کتاب کے ذریعہ سے اپنا اور اپنے صفات کاملہ اور اپنی رضا کی راہوں کا پورا پورا پتہ دیتا ہے۔ تاکہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (الانفال:43) (تاکہ جو ہلاک ہو کھلی بات سے ہو اور جو زندہ ہو وہ بھی کھلی بات سے۔)

---

[1] مہربانی کا سلوک کرنے والا، انعام کرنے والا، انتقام لینے والا، کتاب نازل کرنے والا۔ (از مرتب)

[2] اپنے بندوں سے مہربانی کا سلوک کرنے والا۔ (از مرتب)

[3] کتاب کو نازل کرنے والا۔ (از مرتب)

پس چونکہ وہ لَطِیْفٌ اور مُنْعِمٌ ومُنْتَقِمٌ اور متکلم اور مُنْزِلُ الْکِتَاب ہے۔ اسی وجہ سے اس کامل کتاب میں ذرہ بھر نہ شک ہے نہ حیرت و قلق اور نہ رنج و مصیبت ہے۔

قرآن مجید کی جن جن سورتوں کے ابتداء میں الٓمّٓ یاالٓرٰ یاالٓمّٓرٰ آیا ہے۔ اگر ان پر یکجائی نظر کی جاوے تو دیکھنے والا ضرور اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ ان حروف کا یایوں کہو کہ ان حروف کے معانی کا کتاب اور کتاب کے اتارنے اور لطف وانعام اور سزا وانتقام سے ضرور ہی تعلق بلکہ بہت شدید تعلق ہے۔ یہاں تک کہ جس سورۃ میں یہ آئے ہیں وہاں پر ضرور ہی ان امور کا بیان ہے۔

چنانچہ الٓمّٓرٰ سورہ رعد ہی میں آیا ہے اور سورہ رعد یوں شروع ہوتی ہے الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الرّعد:2) یہ کامل کتاب کی آیتیں ہیں اور جو تیری طرف اتارا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے ضرور حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اور الٓرٰ پانچ سورتوں کے افتتاح میں آیا ہے۔ یونس، ھود، یوسف، ابراھیم، حجر۔ یونس میں ہے الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (یونس:2) (یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔)

اور ھود میں ہے الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود:2) (اس عظیم الشان کتاب کی آیتیں محکم کی گئی ہیں پھر ان کی تفصیل کی گئی حکیم وخبیر کی طرف سے۔)

اور یوسف میں ہے الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف:2 تا 3) یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ ہم نے اس کو عربی (یعنی بیان کرنے والا) قرآن اُتارا ہے تاکہ تم سمجھو (یار کو۔)

اور ابراھیم میں ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (ابراھیم:2) (ہم نے کامل کتاب تیری طرف اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف نکالے۔)

اور حجر میں ہے الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (حجر:2) (یہ کامل کتاب یعنی کھول کر بیان کرنے والے قرآن کی آیتیں ہیں۔)

اور الٓمّٓ چھ سورتوں کے ابتداء میں آیا ہے۔ سورہ بقرہ، آل عمران، عنکبوت، روم، لقمان، الٓمّٓ سجدۃ۔ اوّل میں ہے الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ (البقرۃ:2تا3)

اور آخر میں ہے الٓمّٓ۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (السجدۃ:2تا3)

(اس کامل کتاب کے رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کی طرف سے نازل ہونے میں کچھ بھی شک نہیں ہے۔)

یہ تو ان سورتوں کے فواتح ہیں اور اگر ان سورتوں کو اوّل سے آخر تک غور سے پڑھا جائے تو ہمارے مذکورہ بالا بیان کی ضرور مصدق پائی جائیں گی۔

اب رہا یہ کہ اس کتاب میں کس امر کی نسبت شک نہیں تو یہ بھی ان سورتوں سے خوب پتہ لگ جاتا ہے کہ جن میں یہ حروف آئے ہیں مثلاً سورہ رعد میں آیا ہے وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ۔[1] (الرّعد:2) اور سورہ سجدہ میں اس سے بھی واضح طور پر آیا ہے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (السجدۃ:3) یعنی اس کتاب کے نازل من اللہ ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔

اس کتاب کے نَازِلٌ مِنَ اللّٰہِ ہونے میں کیوں شک نہیں:

اب رہا یہ کہ اس کے نازل من اللہ ہونے میں کیوں شک نہیں اس کی وجہ خداوند کریم نے دو طور پر بیان فرمائی ہے۔ ایک تفصیلی طور پر اور ایک اشارہ کنایۃ یا یوں کہو کہ اجمالی رنگ میں تفصیلی کی تفصیل تو یہ ہے کہ اس سورت میں جس کو خداوند کریم نے اصل دعویٰ قرار دیا ہے وہ یہی لَا رَيْبَ فِيْهِ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی چیز میں کوئی فائدہ معلوم نہ ہو تو اس کی نسبت کسی قسم کی مشقت برداشت نہیں ہو سکتی نہ اور اس کے یا اس کے ثبوت واثبات کی طرف کوئی چنداں توجہ کر سکتا ہے لہٰذا قبل اس کے کہ اس کی دلیل بیان ہو خداوند کریم نے پہلے اس کا فائدہ بیان فرمادیا کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔

یعنی متقیوں کو ہر ایک مقصد کی نسبت عموماً اور رضاء الٰہی کے حاصل کرنے میں خصوصاً سب سے اسلم اور اقصر اور مستقیم تر راہ بتانے والی ہے جس پر چل کر انسان فلاح پاتا ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ بہت لوگ اپنے زعم میں کسی کو متقی خیال کر کے اس کی ہدایت کے

[1]۔ جو کلام تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ بالکل حق ہے۔ (تفسیر صغیر)

امید وار ہو سکتے ہیں۔ یا یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب اس کا دعویٰ ہے کہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور ہم متقی ہیں تو پھر ہم کو کیوں ہدایت نہیں کرتی۔ لیکن خداوند کریم نے بتادیا کہ متقیوں کی فلاں فلاں علامت ہے اور جن میں یہ نشان نہیں ہیں خواہ وہ ہزار دعویٰ کریں پر وہ ہر گز متقی نہیں اور نہ اس کتاب سے ان کو ہدایت ہو گی اور نہ مومنوں کو ان کی ہدایت کا امید وار ہونا چاہئے بلکہ ان کی نسبت یہ قطعی فیصلہ ہے کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ (ایمان نہ لائیں گے) اور صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (البقرۃ:19) (بہرے، گنگے، اندھے ہیں لہٰذا وہ رجوع نہ کریں گے۔) اور یہ کہ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ (البقرۃ:76) (کیا تم طمع رکھتے ہو کہ تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے۔)

اور اس اثناء میں یہ تقسیم بھی ہو گئی کہ مخاطب دو قسم تھے ایک اہل کتاب کہ جن کی نسبت ان کی مسلمہ کتاب سے حجت پیش ہو سکتی ہے اور دوم مشرک اُمّی جو لَا یَعْلَمُوْنَ[1] ہیں کہ جن کے لئے کسی کتاب کا حوالہ کافی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خداوند کریم نے اس کے بعد اس دعویٰ پر دو دلیلیں پیش کیں ایک مشرکوں امیوں کے حال کے مطابق اور دوم اہل کتاب کے مذاق پر۔

اس کتاب کے لَا رَیْبَ فِیْهِ ہونے کی پہلی دلیل:

چنانچہ مشرکوں کے مقابلہ پر فرمایا وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الخ۔ (البقرۃ:24) (پس اگر تم اس کتاب کی نسبت شک میں ہو جو کہ ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو لے آؤ اس جیسی کتاب سے ایک سورۃ الخ۔)

پس چونکہ یہ دلیل دعویٰ سے کسی قدر فاصلہ پر مذکور ہوئی تھی لہٰذا اس کے دلیل ہونے پر متنبہ کرنے کے لئے یہاں پر وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ فرمایا جیسا کہ دعویٰ میں لَا رَیْبَ فِیْهِ فرما کر ریب کی نفی کی تھی۔ اسی طرح وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ الخ فرما کر ریب کی نفی کو ثابت کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ لیکن باوجود اس کے اگر تم پھر بھی شک میں غرق ہو تو اس کی کسی سورۃ کی مثل

[1]۔ وہ علم نہیں رکھتے۔ (از مرتب)

کوئی سورۃ تو لاؤ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو لیکن یاد رکھو کہ کبھی تم ایسا نہ کر سکو گے چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق وہ ایسا کرنے سے عاجز آ گئے اور اپنے عجز کے ہاتھ سے اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے پر مہر کر گئے۔

اس کتاب کے لَا رَیْبَ فِیْہِ ہونے پر دوسری دلیل:

اور اہل کتاب کے مذاق پر پ 1 ع 15 میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی پیشگوئی دعا کے رنگ میں نقل فرماتے ہوئے بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مکہ اور مکہ والوں کی نسبت کیا دعا کی ہے۔ اور یہ کہ مکہ کے اندر مکہ والے بنی اسماعیل میں سے ایک نبی مبعوث فرما کر اور اس کو کامل کتاب دے کر لوگوں کا معلم بنا چنانچہ رسول کی نسبت فرماتا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ۔ (البقرۃ:130) (اے ہمارے رب اور ان میں ان سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کامل کتاب اور حکمت پڑھائے اور ان کو پاک کرے)

اور اجمالی رنگ میں الٓمّٓ میں اشارہ فرمایا ہے اور وہ یوں ہے کہ پہلے اپنے دستخط میں بتایا ہے کہ یہ پروانہ لَطِیْفٌ، مُنْعِمٌ، مُنْتَقِمٌ کا ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ کتاب ایسے الطاف وانعام اور انتقام پر مشتمل ہے جو کہ خدا کے سوا کسی اور مخلوق کی طاقت میں نہ ہو سکیں یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے پڑھنے سے صاف صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسے الطاف وانعام اور انتقام پر مشتمل تو ضرور ہی ہے کیونکہ اس میں صاف بیان کیا ہوا ہے۔ کہ ہمارے فلاں فلاں رسول کی فلاں فلاں قوم نے فرمانبرداری کی اور ہم نے ان پر فلاں فلاں الطاف وانعام کئے اور فلاں نے نافرمانی کی تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔

اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کتاب اور اس رسول کی جو اطاعت کریں گے ہم ان پر بہت کچھ الطاف وانعام کریں گے۔ یہاں تک کہ دنیا اور آخرت کے جنت ان کو دیں گے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کریں گے ان سے ضرور ہی انتقام لیں گے۔ یہاں تک کہ ان کو دنیا اور آخرت کے جہنم کا مزہ چکھائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں امر انسانی طاقت سے بالاتر ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب دنیوی اور اخروی انعام وانتقام کا وعدہ ہے تو اگر ان دونوں

سے ایک کا مشاہدہ ہو جائے گا تو دوسرے کا ہو جانا ضرور ماننا پڑے گا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ خداوند کریم نے صحابہؓ پر ضرور دنیوی انعام کیا ہے اور ان کو سچے معنوں میں کامیاب کیا ہے۔ اور جو ملک کہ دنیا کا جنت مسلم تھا وہ ضرور صحابہؓ کو دیا ہے اور کفار سے ضرور انتقام لیا ہے اور ان کو ناکام ہلاک کیا ہے۔

پس اس سے صاف ثابت ہے کہ قیامت کو بھی ضرور پورا ہو گا تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ جیسا اس کتاب میں انعام وانتقام کا وعدہ دیا گیا تھا اس کے مطابق کیا بھی ہے اور وہ انعام وانتقام اللہ کے سوا اور کسی کی طاقت میں ہو سکتا بھی نہیں تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بے شک یہ کتاب لَطِیْفٌ اور مُنْعِمٌ اور مُنْتَقِمٌ خدا کی ہے۔ پس تفصیلی اور اجمالی دلیلوں سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک نہیں۔

ان دلائل سے ایک زائد فائدہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگرچہ رَیْب کے معنے قلق و اضطراب اور مصائب وشدائد بھی ہیں اور قرآن مجید سے یہ منفی بھی ہیں۔ یعنی چونکہ قرآن مجید فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اس وجہ سے اس میں یا اس کے کسی حکم میں قلق اور حیرت نہیں پیدا ہوتے۔ اور چونکہ اس کے اتباع سے خداوند کریم راضی ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں سب مصائب وشدائد کا رفع کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آقا جب کسی غلام پر راضی ہوتا ہے تو کبھی اس کے دکھی اور مصیبت زدہ ہونے کو پسند نہیں کرتا۔

لہٰذا اس میں نہ کوئی شدت ہے اور نہ مصیبت لیکن یہ کہ یہاں پر ریب سے شک مراد ہے یا قلق یا شدت ومصیبت تو ان دلائل سے اور سورۂ الم سجدہ کی اس آیت کریمہ سے (کہ جس کے ساتھ ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب کس امر میں لَا رَیْبَ فِیْہِ ہے۔ اور وہ ہے لَا رَیْبَ فِیْہِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ[1] (السجدۃ:3) یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پر بجز شک کے اور کوئی معنے مراد نہیں۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ نہ یہ جملہ کہ اس کے منجانب اللہ ہونے

[1] ۔ رب العالمین کی طرف سے... ایک یقینی بات ہے، جس میں کوئی شبہ نہیں۔ (تفسیر صغیر)

میں کوئی ریب نہیں کسی اور معنے کا محتمل ہے اور نہ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔[1](البقرۃ:24)اور نہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ[2] الخ(البقرۃ:130) کسی اور معنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اس آیت کے ذیل میں بہت سی تفسیروں میں یہ سوال مذکور ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہزارہا ایسے لوگ ہیں کہ جن کو اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں ریب وشک ہے اور ضرور ہے تو پھر خداوند کریم کیوں لَا رَيْبَ فِيْهِ فرما کر ریب کی کُلی نفی فرماتا ہے۔ پھر ان مفسروں نے خود ہی اس سوال کا جواب دیا ہے کہ چونکہ یہ کتاب اپنے منجانب اللہ ہونے پر اپنے اندر ہی بہت سے ایسے دلائل اور نشان اور قرائن رکھتی ہے کہ اگر شک کرنے والا بنظر تامل اس کو دیکھے گا تو ضرور اس کے شکوک رفع دفع ہو جائیں گے لہٰذا خداوند علیم نے ان کے شکوک بے محل کو کالعدم قرار دے کر کُلی نفی فرمادی ہے۔

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس قدر دور جانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ معترض نے یہ تو ثابت کیا ہی نہیں کہ قرآن مجید فی الحقیقت محل ریب ہے اور نہ یہ اس کا منشاء ہے بلکہ اس کا منشاء تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس میں شک کرتے ہیں لہٰذا اس میں ریب ہے اور قرآن کی اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ اس میں کسی کو شک وریب نہیں بلکہ یہ ہیں کہ اس میں ریب نہیں۔ پس جو ریب معترض نے ثابت کیا ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں ہے اور جس کی نفی کُلی کی ہے وہ نہ معترض نے ثابت کیا ہے اور نہ فی الحقیقت وہ ثابت ہے اور نہ کوئی اس کو ثابت کر سکتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ریب نہ ہونا دو طرح ہے۔ اوّل یہ کہ یہ کتاب ایسی ہو کہ اس کا منجانب اللہ ہونا نہایت اعلیٰ اور اقویٰ اور دبدبہ اور واضح اور روشن تر دلائل سے ثابت ہونے کے باعث وہ محل ریب اور مورد شک وشبہ نہ ہو۔ اگرچہ بعض نادانوں اور ناقص العقلوں اور ناسمجھوں کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں ریب وشک بھی پڑتا ہو۔ اور اس کی

[1]۔ اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔(تفسیر صغیر)
[2]۔ انہیں کتاب... سکھائے۔(تفسیر صغیر)

نظیر یہ ہے کہ طبیبوں نے لکھا ہے کہ بعض امراض سے حس ذائقہ خراب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میٹھی سے میٹھی چیز بھی اس کو بدمزہ معلوم ہوتی ہے۔ تو اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ چیز میٹھی اور لذیذ ہے۔ اور بدمزگی اور کڑواپن کی وہ محل نہیں۔ اگرچہ بعض مریضوں کو وہ بدمزہ یا کڑوی محسوس ہوتی ہے۔

اور دوم یہ کہ اس کے منجانب اللہ ہونے میں کسی فرد بشر کو شک نہ ہو۔ پس اگر لَا رَیْبَ فِیْهِ کے یہ معنے ہوتے کہ کسی فرد بشر کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک وشبہ نہیں تو ضرور اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا۔ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے۔ اور پھر باوجود اس کے خداوند کریم کس طرح مشاہدہ کے خلاف فرماتا ہے کہ کسی فرد بشر کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک وشبہ نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ اسی قدر معنے ہیں کہ اس میں ریب نہیں ہے۔ نہ یہ کہ کسی بشر کو اس میں ریب نہیں کیونکہ اگر یہ معنے مراد ہوتے تو پھر عبارت یوں ہوتی کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ لِاَحَدٍ[1] پر ظاہر ہے کہ یہ عبارت قرآن مجید میں نہیں آئی۔ اور جب اس کے یہ معنے ہوئے کہ یہ فی الحقیقت محل ریب نہیں ہے تو پھر اگر کسی نادان کو اس میں ریب واقع ہو تو وہ اس کلی نفی کے مخالف ہرگز نہیں ہے۔

پس خلاصہ جواب یہ ہوا کہ معترض کا یہ اعتراض سرے سے متوجہ ہی نہیں ہوتا تا کسی جواب کی ضرورت پڑتی کیونکہ جو امر وہ مشاہدہ سے ثابت کرتا ہے نہ اس کی نفی ہے اور نہ وہ اس نفی کے خلاف ہے۔ اور جس امر کی نفی ہے نہ وہ ثابت ہے اور نہ وہ ثابت ہو سکتا ہے۔ پس اعتراض بالکل وارد ہی نہ ہوا۔

قرآن مجید کی پہلی سورۃ کا پہلا دعویٰ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ کیوں لکھا ہے:

اب رہی یہ بات کہ خدائے علیم نے قرآن عظیم کی پہلی سورۃ کا پہلا دعویٰ یہ کیوں رکھا ہے کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

تو واضح ہو کہ اس دعویٰ کا قرآن عظیم کی پہلی سورۃ کا پہلا دعویٰ قرار دینا ہی ایسی اعلیٰ

[1]۔ اس میں کسی کے لئے کوئی شک نہیں ہے۔ (از مرتب)

حکمت پر مبنی ہے کہ اکیلی وہی حکمت اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کے لئے کافی ہے۔ بلکہ وہ حکمت اس امر کو نہایت اعلیٰ اور روشن ترین طور پر ثابت کرتی ہے کہ یہ کتاب دنیا کی سب کتابوں سے اشرف اور اعلیٰ اور سب سے زیادہ پُر حکمت ہے۔ بلکہ صاف ثابت کرتی ہے کہ دنیا میں جس قدر کتابیں منجانب اللہ تسلیم کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہی کتاب ہے جو کہ خدائے بے مثل کی طرح بے مثل ہے۔ اور وہ حکمت یہ کہ یہ مسئلہ سب مسائل کی جڑھ اور ماں ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر جس قدر مسائل اس کتاب میں بیان ہوں گے وہ سب کے سب سوا کسی شک وشبہ کے اسی ایک دعویٰ کے ساتھ ثابت ہو جائیں گے۔

کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کتاب منجانب اللہ ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے میں ذرہ بھی شک نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا جو مسئلہ ہو گا اس کتاب کی طرح اس کے منجانب اللہ ہونے میں بھی ذرہ بھر شک نہ ہو گا۔ اور جس مسئلہ کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہ ہو اس کے تسلیم میں ہر گز کلام نہیں لہٰذا اس کتاب کے ہر ایک مسئلہ کی تسلیم میں ذرہ بھر کلام نہیں ہو گا۔ ایسے اُمُّ الْمَسَائِل[1] مسئلہ کو سب سے پہلے بیان کرنا اور پھر اس کو اعلیٰ اور اقویٰ اور واضح ترین دلائل سے ثابت کرنا یہ قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے۔ جو کہ دنیا کی کسی کتاب میں ہر گز ہر گز نہیں پائی جاتی۔

کیا کوئی آریہ وید میں یہ کمال دکھا سکتا ہے یا کوئی یہودی یا عیسائی توریت وانجیل وغیرہ میں اس کا دعویٰ کر سکتا ہے ہر گز نہیں اور بالکل نہیں۔ باوجود یہ کہ قرآن مجید نے اپنے ہر ایک دعویٰ کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ اور کوئی مسئلہ بے دلیل نہیں چھوڑا اور پھر بھی اپنی پہلی سورۃ میں پہلے وہ دعویٰ ثابت کیا ہے جو کہ سب مسائل کے لئے ہزار ہا دلائل جیسا ہے۔ اور اور کتابوں نے باوجود یہ کہ اپنے دعاوی کو بے دلیل چھوڑا ہوا ہے اور اس بارہ میں اپنے ماننے والوں کی دست نگر اور ممنون احسان ہیں۔ اور پھر بھی ابتداء میں نہ کوئی ایسا اُمُّ الْمَسَائِل مسئلہ ثابت کیا ہے اور نہ خالی ذکر ہی کیا ہے۔

اور پھر فقط یہی نہیں کہ اس دعوے کے ساتھ قرآنی سب مسائل اور دعاوی کا اثبات

[1]۔ مسائل کی جڑ۔ (از مرتب)

اعلیٰ درجہ کا ہو جاتا ہے بلکہ کتاب کے اتارنے سے جو اصل غرض ہے وہ بھی اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ پر حاصل ہوتی ہے اور وہ غرض اتباع اور عمل ہے۔ اور اس دعوے کے ثبوت سے اتباع اور عمل میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ جب انسان کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک نہیں ہے تو پھر جب وہ کوئی حکم اس میں پائے گا تو چونکہ اس پر اس کا پختہ یقین ہو جائے گا کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو اس یقین کامل کے بعد ممکن نہیں کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرے۔ یا اس کی بجا آوری میں کچھ پس وپیش کرے یا سستی اور کاہلی اختیار کرے۔

پس جس طرح کہ مصنّفین لوگ جب کوئی علمی کتاب لکھتے ہیں تو اس کے ابتداء میں چند امور لکھ دیتے ہیں جو کہ مضامین کتاب کے ثابت کرنے اور سمجھنے سمجھانے میں مددگار ہوتے ہیں اور علمی اصطلاح میں ان امور کو مقدمہ کہتے ہیں۔ اسی طرح خداوند حکیم نے فاتحہ شریف اور قرآن عظیم میں بطور مقدمہ دو چیزوں کو بیان فرمایا ہے۔

فاتحہ میں سب سے پہلے معرفت اسمی کو رکھا ہے کیونکہ سب معرفتوں کی جڑھ وہی ہے جیسا کہ عام طور پر سب اشیاء میں یہی طریق ہے کہ پہلے محض اسمی شناخت ہوتی ہے اور بعد اس کے اور شناختیں ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ نہیں کہ خداوند حکیم نے یہاں پر ہی معرفت اسمی سے شروع کیا ہے بلکہ جہاں کہیں اپنی معرفت کی تعلیم شروع کی ہے تو اس کا شروع معرفت اسمی ہی سے کیا ہے۔

خداوند کریم اپنی معرفت کی تعلیم کس سے شروع کرتا ہے:

چنانچہ جب خداوند کریم نے قرآن مجید کے اتارنے سے اپنی معرفت کاملہ کی تعلیم شروع کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلی آیت کریمہ جو کہ اشرف المخلوقات سیّد ولد آدم حضرت خاتم النبیینؐ پر نازل فرمائی وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (العلق:2) ہے (پڑھ اپنے اس رب کے نام سے کہ جس نے پیدا کیا ہے۔) جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور جس طرح بسم اللہ میں معرفت اسمی بتائی گئی ہے۔ یا کہ جس طرح فاتحہ شریف بلکہ ہر ایک سورۃ کی ابتدا میں سوائے سورہ برأت کے معرفت اسمی بتائی گئی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کے نزول کے شروع میں بھی معرفت اسمی ہی بتائی گئی ہے اور قرآن مجید کی پہلی سورۃ کی ابتداء میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کو رکھا ہے کیونکہ یہ مسئلہ قرآنی سب مسائل کی جڑھ ہے کیونکہ اس ایک ہی مسئلہ سے قرآنی سب مسائل بوجہ احسن ثابت ہو جاتے ہیں۔ اور نیز اس ایک ہی مسئلہ کے اثبات سے ان سب مسائل پر عملدرآمد کرنے کا سچا جوش پیدا ہو جائے گا جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اور یہ دونوں مقصود جو کہ اس سے حاصل ہوتے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں جن سے اس مسئلہ کی اور اس کے یہاں پر ذکر کرنے کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔

بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے یہ ایک ایسی عظمت اور کمال ہے جو کہ ایسی کامل اور بے مثل کتاب سے مختص ہے اور کسی اور کتاب میں ہرگز نہیں ہے۔ جہاں تک کتابیں دنیا میں موجود ہیں ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ اس کے سرورق پر ایک ایسا مسئلہ بیان ہو جس سے اس کتاب کے سب مسائل اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر ثابت ہو جائیں۔ مگر ایک قرآن مجید ہی ہے کہ جس نے اپنے سرورق پر ایک ایسا دعویٰ ثابت کیا ہے کہ جس سے اس کے سارے کے سارے مسائل اعلیٰ درجہ پر ثابت ہو جاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں قرآن مجید کی ایسی خصوصیات پر بہت غور و توجہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس سے ایمان کامل ہو کر کتاب اللہ کی سچی اطاعت کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نکتہ میں نے نہ کسی تفسیر میں دیکھا ہے اور نہ کسی سے سنا ہے بلکہ محض خدا کے فضل سے مجھے معلوم ہوا ہے تو جب یہ نکتہ مجھے معلوم ہوا تو قرآن مجید کی عظمت اس قدر میرے دل پر طاری ہوئی کہ بڑی دیر تک آنحضرتؐ (فِدَاهُ اَبِیْ وَ اُمِّیْ وَ رُوْحِیْ[1]) پر درود بھیجتا رہا اور قرآن مجید کی محبت سے اس قدر دل میں جوش آیا کہ بار بار قرآن کو چوما۔ پس چونکہ میرا تجربہ ہے کہ ایسے امور میں خوض و فکر ایمان کے لئے آب پاشی کا کام دیتا ہے۔ لہٰذا میں ناظرین کو توجہ دلاتا ہوں کہ ایسے امور پر نظر غور سے توجہ فرمایا کریں۔

[1]۔ اس پر میرے ماں باپ اور میری جان قربان ہو۔ (از مرتب)

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی تفسیر:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ: (م) ہدایت کے معنے فاتحہ شریف کی تفسیر میں مفصل عرض کر دیئے گئے ہیں البتہ یہاں پر اس قدر بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ هُدًى کبھی لازم ہوتا ہے اور کبھی متعدی یعنی کبھی ہدایت کے معنوں میں ہوتا ہے اور کبھی اِهْتِدَاء کے معنوں میں آتا ہے۔ اور یہاں پر ہدایت کے معنوں میں ہے۔ رہا یہ کہ ہدایت کے معنوں میں سے یہاں پر کون سے معنے مراد ہیں تو اس کی تفصیل ابھی ایک اعتراض کے جواب میں آتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تقویٰ کے معنے:

متقی تقویٰ سے ہے اور تقویٰ کے معنے ہیں کسی شئے سے ڈر کر اس سے بچنا یا بچنے کی کوشش کرنا۔ اور شریعت میں بھی اس کے یہی معنے ہیں فقط یہاں پر اس قدر تخصیص ہے کہ اللہ سے ڈر کر اس کی نافرمانی کے امور سے بچنا یا بچنے کی کوشش کرنا۔ پس اس کے معنے یہ ہوئے۔ ہدایت (یا ہدایت دینے والی) ہے ان کو جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

(ح) ترجمہ۔ نور ہے متقیوں کے لئے۔ یہی مروی ہے ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ اور اور بہت سے صحابہؓ سے اور قرآن مجید میں آیا ہے وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ (الاعراف:158) اس نور کی اتباع کرو جو کہ (اس کے ساتھ اتارا گیا ہے) اور فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ (المائدۃ:16) (ضرور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور یعنی بیان کرنے والی کتاب آئی ہے)

تقویٰ کے مراتب جو کہ بعض نے بیان کئے ہیں:

(م) بعض علماء نے یہاں پر یہ تفصیل کی ہے کہ تقویٰ کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ محض شرک اور کفر سے اجتناب ہو نہ اور گناہوں سے۔ دوم یہ کہ شرک و کفر اور باقی کبائر سے اجتناب ہو نہ صغائر سے۔ اور سوم یہ کہ شرک و کفر اور کبائر و صغائر سب سے اجتناب ہو۔ اور اس میں اچھے کاموں کا کرنا بھی داخل ہے کہ جن کے کرنے کا حکم ہے کیونکہ ایسے اچھے کام کا ترک ضرور کبیرہ یا صغیرہ گناہ ہوتا ہے۔

یہ مراتب صحیح نہیں ہیں:

یہ تو بعض علماء کا قول ہے لیکن قرآن مجید اور احادیث سے ہر گز ثابت نہیں ہوا کہ جو شخص شرک وکفر سے اجتناب کرتا ہو اور باقی سب کبائر وصغائر میں مبتلا ہو اس کو بھی متقی کہا جاسکتا ہے۔ پس یہ اصطلاح محض ان کا اپنا خیال ہے جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔ بلکہ قرآن وحدیث سے صریح مخالف ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں بدی سے اجتناب تقویٰ کے لئے ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں اگرچہ یہ نہیں بیان کیا گیا کہ تقویٰ یا متقی کے لفظوں کے لفظی معنے فلاں ہیں یا ان کا مفہوم یا حقیقت فلاں فلاں ہے۔ ہاں اس قدر ضرور بیان کیا ہے کہ متقیوں کے کیا اوصاف ہیں اور کیا کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ اور نیز یہ بھی بیان کیا ہے کہ تقویٰ کے کیا کیا آثار وثمرات ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا صاحب نے ان دونوں امروں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

(ح)۔ کہ خداوند کریم نے متقی کی اپنی کتاب میں یہ تفسیر فرمائی ہے۔

متقی کے صفات:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ[1] وَ فِي الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ[2] وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرۃ:178)

(لیکن نیکی اس کی ہے جو کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور باوجود مال کی محبت کے پھر بھی مال دے قرابت والوں اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں کو اور گردنوں میں۔ اور جب عہد کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں اور سختی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت صبر کرنے والے ہوتے ہیں انہیں

[1]۔ اور سوالیوں کو۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اور نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کو ادا کیا۔ (تفسیر صغیر)

لوگوں نے صدق دکھایا اور تقویٰ اختیار کیا ہے) اور دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر:34)(اور جو سچائی لایا اور اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں۔)

اور فرمایا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران:134تا136)(جو تیار کیا گیا ہے ان متقیوں کے لئے جو خرچ کرتے ہیں خوشی اور تکلیف میں اور غصہ کو کھاتے اور لوگوں سے معاف کرتے ہیں۔ اور اللہ مخلصوں سے محبت کرتا ہے۔ اور جو کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر کوئی ظلم کرتے ہیں تو معاً اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اس سے مغفرت مانگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور اللہ کے سوا اور کون ہے گناہوں کی مغفرت کرنے والا اور کئے ہوئے پر جان کر اصرار نہیں کرتے۔)

اور ایک اور مقام پر لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا[1] کے بعد فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ۔ (آل عمران:16تا18)(جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہیں پس ہمارے گناہ معاف کر اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور عبادت بجالانے والے اور خرچ کرنے والے اور سحریوں کے وقت استغفار کرنے والے۔)

پھر ایک اور محل پر ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ[2] کے بعد فرمایا اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ۔ (الانبیاء:49تا50)(جو غیب میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس گھڑی سے خوف کرنے والے ہیں۔)

---

[1] جو لوگ تقویٰ اختیار کریں۔ (تفسیر صغیر)

[2] متقیوں کے لئے ایک یاددہانی کی تعلیم۔ (تفسیر صغیر)

پھر ایک جگہ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ[1] (الحجر:46) الخ کے بعد فرمایا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ۔ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔ وَفِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات:16 تا 20) (بیشک وہ اس سے پہلے مخلص تھے۔ رات سے بہت تھوڑا آنکھ لگاتے تھے۔ اور سحریوں کے اوقات مغفرت مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حصہ تھا۔)

تقویٰ کے آثار و ثمرات:

اور تقویٰ کے آثار جو قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

تقویٰ سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ (التوبۃ:4) (بیشک اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔)

اللہ متقی کا ولی ہوتا ہے۔ فرمایا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (الجاثیۃ:20) (اور اللہ متقیوں کا سرپرست ہوتا ہے۔)

اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ فرمایا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ۔ (البقرۃ:195) (بیشک اللہ متقیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔)

متقی کی اللہ قبول کرتا ہے۔ فرمایا اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ (المائدۃ:28) (اللہ تو متقیوں ہی سے قبول کیا کرتا ہے۔)

عاقبت اور آخرت اور اچھا انجام متقی کے لئے ہوتا ہے۔ فرمایا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (الاعراف:129) (بے شک انجام یا نیک نامی متقیوں کے لئے ہے۔)

وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ (الزخرف:36) (اور آخرت اللہ کے نزدیک متقیوں کے لئے ہے۔)

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ (ص:50) (بیشک متقیوں کے لئے اچھا انجام ہے۔)

متقی کو اللہ ہر ایک تنگی سے کوئی نہ کوئی مخلص دے دیتا ہے۔ فرمایا وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ (الطلاق:3) (جو اللہ سے ڈر کر اس کی نافرمانی سے بچتا ہے تو خدا اس کے لئے خلاصی کی راہ نکال دیتا ہے۔)

---

[1] متقی (لوگ) یقیناً باغوں اور چشموں (والے مقام) میں (داخل) ہوں گے۔ (تفسیر صغیر)

متقی کو اللہ ایسی راہوں سے رزق دیتا ہے کہ اس کو خیال تک نہیں ہوتا) متقی کو اللہ ایسا امتیازی نشان دیتا ہے کہ اہل دنیا سے اس کو ممتاز کر دیتا ہے۔ فرمایا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا۔ (الانفال:30) (اگر تم تقویٰ کرو گے تو اللہ تمہارے لئے مابہ الامتیاز بنادے گا۔)

اللہ عَلِیۡمٌ متقی کا معلّم ہوتا ہے۔ فرمایا وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ یُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ۔ (البقرۃ:283) (اللہ سے تقویٰ کرو اور اللہ تم کو تعلیم دے گا۔)

متقی کو جنت ملتی ہے اور جو چاہے گا وہی اس کو دیا جائے گا۔ فرمایا وَ لَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ۔ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ کَذٰلِکَ یَجۡزِی اللّٰہُ الۡمُتَّقِیۡنَ (النحل 31 تا 32) (متقیوں کا گھر کیا ہی عمدہ ہے اور وہ عدن کے جنت ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں بہتیں ہوں گی۔ ان کے لئے ان میں وہ سب کچھ مہیا ہو گا جو کہ وہ چاہیں گے۔ اللہ اسی طرح متقیوں کو جزا دے گا۔)

(م) ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ[1] کے آگے الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ۔ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ[2] (البقرۃ:4 تا 5) تک تو متقی کے صفات مذکور ہیں اور اس کے بعد اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ[3] (البقرۃ:6) میں تقویٰ کے آثار کا بیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ متقی جو کام کرتا ہے اس میں اس کو تذبذب اور تردّد نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر ایک امر میں خدا کی ہدایت پر ہوتا ہے جو کہ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ[4] (البقرۃ:30) ہے۔

جیسا فرمایا اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ (یہ لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہوتے ہیں)

1۔ متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے (تفسیر صغیر)

2۔ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو (کچھ) ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے یا جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا تھا اس پر ایمان لاتے ہیں اور آئندہ ہونے والی (موعود باتوں) پر (بھی) یقین رکھتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

3۔ یہ لوگ (یقیناً) اس ہدایت پر (قائم) ہیں جو ان کے رب کی طرف سے (آئی) ہے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

4۔ ہر ایک بات (کی حقیقت) کو خوب جانتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

اور نقصان سے محفوظ اور کامیاب ہوتے ہیں۔ جیسا فرمایا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (وہی نقصان سے محفوظ اور کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں۔)

بہر حال متقی کے صفات اور آثار بہت سے قرآن مجید میں مذکور ہیں جن سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ ایک فاسق بدکار کو قرآن مجید کی زبان میں متقی نہیں کہتے۔ پس جو لوگ فاسق بدکار کو متقی کا عظیم الشان خطاب دیتے ہیں وہ خدا کی مہیمن کتاب کے خلاف کرتے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر ایک اعتراض:

یہاں پر بعض نے اعتراض کیا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید خاص متقیوں ہی کے لئے ہدایت ہے نہ اوروں کے لئے۔ اور اس میں دو نقص ہیں اوّل یہ کہ اس کی دعوت عام نہ رہے گی حالانکہ اہل اسلام عموم کے مدعی ہیں اور دوم یہ کہ اس میں تحصیل حاصل لازم آتی ہے اس لئے کہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جو لوگ پہلے سے متقی ہو چکے ہیں ان کے لئے ہی یہ کتاب ہدایت ہے۔ اور ہدایت بھی اس نے انہی امور کی کرنی ہوئی جو کہ تقویٰ میں داخل ہیں۔ مثل ایمان اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کے جو کہ متقی کو پہلے سے حاصل ہیں۔ پس اس کتاب کا یہ کام ہوا کہ جو کام متقیوں کو حاصل ہیں ان کی ہدایت کرے اور یہی تحصیل حاصل ہے۔ یعنی جو شئے پہلے سے حاصل ہے وہ پھر دوبارہ حاصل کی جائے۔

اس اعتراض کے جواب میں مفسرین نے دو راہیں اختیار کی ہیں ایک یہ کہ متقی کے معنوں میں تغیر کیا جائے اور دوم یہ کہ تخصیص کو اڑا کر عموم بھی قائم رکھا جائے اور جو تخصیص بظاہر معلوم ہوتی ہے اس کی بنا کسی اور وجہ پر رکھی جائے۔

اوّل کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ متقی کے دو معنے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ متقی بن چکا ہو یعنی متقی کی صفات اس میں موجود ہو چکی ہوں اور اس نے شرک و کفر اور ہر ایک قسم کی بدی سے اجتناب اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ پر استقامت کر لی ہو۔

دوم یہ کہ وہ خوف خدا رکھتا ہے اور بمعنے مذکور متقی بننا چاہتا ہے پر ابھی راستہ نہ ملنے اور علم نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے بنا نہیں۔ پس یہ بھی ایک معنوں میں متقی ہوتا ہے۔ جیسا کہ جو شخص سفر میں چلا جاتا ہے وہ تو ضرور مسافر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے لیکن جو شخص سفر کا

مصمم ارادہ رکھتا ہے عرف میں اس کو بھی مسافر کہہ دیتے ہیں۔ اور اس کو علمی اصطلاح میں مجاز باعتبار مَایَؤُلُ کہتے ہیں۔ یعنی جس لحاظ سے اس پر وہ لفظ بولا گیا ہے وہ ابھی تو اس میں موجود نہیں ہے لیکن آئندہ ہونے والا ہے۔ جیسا مثلاً حدیث میں آتا ہے مَنْ قَتَلَ قَتِیْلًا فَلَہٗ سَلَبُہٗ۔ (جو کسی مقتول کو قتل کرے تو اس کے لئے اس کا سب اسباب ہے۔)

(سنن الترمذی ابواب السیر باب ماجاء فی من قتل قتیلاً فلہ سلبہ حدیث نمبر 1562)

پس اس میں قَتِیْلٌ آئندہ کے لحاظ سے بولا گیا ہے ورنہ قَتِیْلٌ یعنی مقتول کے قتل کے کیا معنے۔ تو جب متقی کے یہ معنے ہوئے تو اب اعتراض رفع ہو گیا۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو باوجود اس قدر تکلف کے اس جواب میں دو نقص تا حال باقی ہیں۔ اوّل یہ کہ متقی کے جو معنے اس جواب میں لئے گئے ہیں وہ اس تفسیر کے بالکل خلاف ہیں جو کہ یہاں پر خداوند کریم نے متقی کی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ کیونکہ جواب میں متقی کے جو معنے لئے گئے ہیں ان میں ایمان بالغیب اقامت صلوٰۃ انفاق وغیرہ کی نفی ہے۔ اور خدا کی بیان کردہ اس تفسیر میں ان امور کا اثبات ہے اور ایک شے کی نفی اور اثبات دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

پس خدا کی بیان کردہ تفسیر ان معنوں کی تردید کرتی ہے جو کہ جواب میں لئے گئے ہیں اور دوم یہ کہ اگرچہ یہ معنے لینے سے تحصیل حاصل کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے کیونکہ ان معنوں کے لحاظ سے متقی میں وہ امور حاصل نہیں ہیں کہ جن کی ہدایت یہ کتاب کرتی ہے لیکن دعوت کی تخصیص کا سوال اب تک باقی ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ ان معنوں کے لحاظ سے متقی نہیں ان کے لئے یہ کتاب ہدایت نہ ہو گی اور یہی تخصیص ہے اور پہلے معنوں پر بھی ایک اعتراض یہی تھا۔ پس یہ جواب باوجود پُر تکلف ہونے کے نہ صحیح ہے اور نہ فی الحقیقت کافی ہے۔

دوسرا جواب:

اور دوسرے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس بارہ میں بہت مقاموں پر ذکر آیا ہے چنانچہ سورہ لقمان میں آیا ہے هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (لقمان:4) (ہدایت اور رحمت ہے مخلصوں کے لئے۔)

اور سورۂ نحل میں ہے هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل:65)(قرآن مجید مومن لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔) اور سورۂ بقر کے ایک دوسرے مقام پر ہے هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى (البقرۃ:186)(قرآن مجید سب انسانوں کے لئے ہدایت اور کھلی کھلی ہدایت ہے۔)

پس اگر بعض مقام پر نظر کرنے سے تخصیص کا وہم گذر سکتا ہے تو هُدًى لِّلنَّاسِ سے صاف صاف تعمیم ثابت ہے پھر خاص کر جبکہ ایسے آیات کریمہ پر بھی نظر کی جائے جو کہ آنحضرتؐ کی دعوت اور بعثت کے عموم پر قطعی دلیل ہیں جیسے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:159)(اے لوگو بیشک میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔) تو اب عموم کے قائل ہونے سے چارہ نہیں اور جب عموم ہے تو پھر کوئی اعتراض نہیں۔

ہاں اب یہ بات قابل غور ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور لِلْمُحْسِنِيْنَ اور لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ میں بظاہر تخصیص تو ضرور ہے تو جب هُدًى لِّلنَّاسِ میں تعمیم ہے اور وہی مراد ہے تو ان آیات کریمہ میں تخصیص کیوں کی ہے جو کہ عموم کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تعمیم تو نفس دعوت کے لحاظ سے ہے اور تخصیص محض فائدہ کے رو سے ہے۔ یعنی قرآن مجید سب کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا گیا ہے۔ لیکن رہا یہ کہ اس سے فائدہ کون اٹھائیں گے اور کون لوگ اس کی ہدایت پر چلیں گے تو خداوند علیم نے ان آیات میں یہ بتا دیا کہ دعوت اگرچہ عام ہے پر اس سے فائدہ خاص متقیوں، محسنوں، مومنوں کو ہی ہو گا۔

اور یہاں پر اس امر کا قرینہ بھی موجود ہے کہ تخصیص دعوت کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ فائدہ کے رو سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ متقیوں کے بیان کے آگے خداوند کریم نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (البقرۃ:7تا8)(بیشک جو ایسے کافر ہیں کہ ان کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ نہ ایمان لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔)

پس اگر دعوت عام نہ ہوتی تو غیر متقیوں کے لئے عذاب عظیم کا کیوں وعید ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ تو مکلف ہی نہیں ٹھہرتے تو جب مکلف ہی نہ ہوئے تو نہ ماننے سے عذاب عظیم کیسا۔ پس اس سے صاف ثابت ہوا کہ دعوت یہاں پر بھی عام ہی ہے اور چونکہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا الخ میں ان کا بیان ہے کہ جن کو اس کتاب کی ہدایت سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ جیسا فرمایا لَا یُؤۡمِنُوۡنَ اور اس کے بعد منافقوں کا حال بیان کرتے ہوئے بھی فرمایا کہ صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ (البقرۃ:19)(بہرے، گنگے، اندھے ہیں لہٰذا یہ ایمان نہ لائیں گے۔)

جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منافقوں کو بھی اس کتاب کی ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا لہٰذا ثابت ہوا کہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ میں (جو کہ ان دونوں کے مقابل پر ہے) ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس کتاب کی ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ تو جب یہ ثابت ہوا کہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ میں ان کا ذکر ہے۔ جو کہ اس کتاب کی ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے تو پھر یہ تخصیص محض فائدہ اٹھانے کے لحاظ سے ہے نہ نفس دعوت کے لحاظ سے۔

دوسرے جواب کا نقص:

یہ جواب اگرچہ پہلے کی نسبت بہت سے تکلف پر مشتمل نہیں اور فی نفسہٖ صحیح اور کافی ہے۔ لیکن اس میں اس قدر نقص ضرور ہے کہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ اور ھُدًی لِّلنَّاسِ ایک ہی طرز کے دو جملے ہیں۔ اور اس جواب میں ان دونوں میں یہ فرق رکھا ہے کہ اوّل کے معنے یہ کئے ہیں کہ ہدایت ہے جس کا فائدہ خاص متقیوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور دوسرے کے یہ کئے ہیں کہ ہدایت ہے یعنی راستہ بتانے والی ہے سب انسانوں کو خواہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔ پس باوجود دونوں فقروں کے یکساں ہونے کے ان دونوں میں فرق کرنا اطمینان خاطر کے خلاف ہے۔ اور جو جواب اس فرق پر مبنی ہے وہ بھی تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ان دونوں جوابوں کی حالت یہ تھی جو ناظرین کی خدمت میں عرض کر دی ہے۔ لہٰذا میرے دل میں بہت شوق تھا کہ اصل اعتراض کا کوئی عمدہ جواب ہاتھ آئے۔

چنانچہ مَیں نے بہت سے اہل علم سے دریافت بھی کیا اور بہت سی تفسیروں کو بھی

دیکھا مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ لیکن دسمبر 1905ء کو دار الاماں میں سالانہ جلسہ ہوا تو ایک دن حضرت اقدس مہدی معہود اور مسیح موعود علیہ السلام (فِدَاہُ اَبِیْ وَ اُمِّیْ وَ رُوْحِیْ وَمَالِیْ وَعِرْضِیْ[1]) نے سورۂ بقرہ کے اسی پہلے رکوع کا وعظ فرمایا اور ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ پر ایسی تقریر فرمائی کہ جس سے علاوہ سوال مذکور کے پورے طور پر حل ہونے کے علوم حقہ اور معرفت صحیحہ کا دروازہ کھل گیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ ﷺ وَ اٰلِہٖ وَ خُلَفَائِہِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ[2]۔

اور وہ تقریر بہت طویل ہے لہٰذا پوری تقریر یہاں پر درج نہیں ہو سکتی ہاں اس کے جس حصہ کو اعتراض کے جواب میں دخل ہے اس کا خلاصہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 3 بابت ستمبر 1906ء صفحہ 89 تا 124)

تیسرا جواب جو کہ حضرت مسیح موعودؑ کی تقریر سے ماخوذ ہے اور یہی اصل جواب ہے:

کہ قرآن مجید کی ہدایت اسی پر بند نہیں ہے کہ چند معدودہ امور پر ایمان بالغیب لانے کا حکم لاوے اور نماز، زکوٰۃ، حج، صوم وغیرہ چند امور کے کرنے کا حکم دے دے اور چند معدودہ امور سے منع کر دے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ہدایت کو یہاں تک ہی محدود خیال کرتا ہے تو وہ یقیناً قرآن مجید سے ناآشنا ہے اور وہ قرآن مجید کی سخت بے قدری اور ہتک کر رہا ہے اور قرآن مجید کو بے مثل کتاب ہونے کے اعلیٰ مقام سے اتار کر وید اور توریت وانجیل کے مرتبہ پر اتار کر قرآن مجید کی عظمت کو خاک میں ملاتا ہے۔ نیز اگر اس کا یہ خیال ہے تو پھر اس کو ماننا پڑے گا کہ خواص امت اور خصوصاً آنحضرتؐ کے لئے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا عبث تھی کیونکہ جب قرآن مجید کی ہدایت کا خلاصہ یہ ہوا کہ چند امور پر اعتقاد رکھا جائے اور چند احکام معلوم ہو جائیں تو جب کسی شخص کو یہ حاصل ہوا تو پھر اس کے لئے اِھْدِنَا کی دعا محض عبث ہوئی لیکن ظاہر ہے کہ ایسا خیال تو بالکل غلط اور سخت غلط ہے۔

---

[1]۔ اس پر میرے ماں باپ اور میری جان اور میرا مال ومتاع قربان ہو۔ (از مرتب)

[2]۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو بلند مرتبہ، صاحب عظمت (اور) تمام جہانوں کا رب ہے اور رسولوں کے سردار (اور) خاتم النبیینؐ اور ان کی آل اور ان کے خلفائے راشدین ومہدیین پر درود وسلام ہو۔ (از مرتب)

پس ثابت ہوا کہ قرآن مجید کی ہدایت کو مذکورہ بالا امور پر محصور سمجھنا بالکل غلط ہے بلکہ قرآن مجید کی ہدایت کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔ اس قدر ہدایت تو دنیا کے سب مذاہب میں موجود ہے۔ مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے بعد جو متقی کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ وہ اسی قدر ہے کہ ایمان بالغیب ہو تو ہر ایک مذہب میں بعض غیب امور پر ایمان رکھنا پڑتا ہے۔ پھر اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ اقامت صلوٰۃ ہو تو ہر ایک مذہب والے کچھ نہ کچھ پوجا کیا کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ہے کہ ہمارے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کریں اور دنیا جانتی ہے کہ ہر ایک مذہب میں کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ وَغَيْرُ ذَالِكَ۔

پس اگر قرآن مجید کی ہدایت اسی قدر ہے تو قرآن مجید اور اور کتابوں میں کچھ فرق نہیں ہے، مگر اس قدر کہ کوئی کہہ دے کہ قرآن مجید نے ان کا اچھا طریق بیان کیا اور اوروں نے ناقص۔ لیکن جیسا ایک مسلمان کا یہ دعویٰ ہے ویسا ہی ایک آریہ وید کی نسبت دعویٰ کرتا ہے اور یہودی توریت کی نسبت۔ پس اس صورت میں قرآن مجید اور باقی کتابوں میں کچھ معتدبہ اور بیّن فرق نہیں رہتا۔ پس اس ساری تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت مذکورہ بالا امور میں ہرگز محصور نہیں ہے بلکہ ان سے وسیع ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایسا خدا پیش کیا ہے جو کہ قادر مطلق ہے اور اس کے انعام کے خزانے غیر متناہی ہیں جو کہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اور نہ انسان کی ترقی طلب فطرت ترقی کے کسی زینہ پر ٹھہر سکتی ہے اگر کوئی یہ خیال کرے کہ خدا کے انعام کسی حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے آگے خدا میں دینے کی طاقت یا گنجائش نہیں ہوتی تو اس نے اسلام کے خدا بلکہ یوں کہو کہ حقیقی خدا کو ہرگز نہیں پہچانا اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ترقی کی فلاں حد تک پہنچ کر آگے انسان میں ترقی کی قابلیت نہیں رہتی یا خواہش نہیں رہتی تو وہ انسانی فطرت سے ناآشنا ہے اور وہ نسل انسانی کے ہم عمر تجربہ اور صحیح مشاہدات کا خلاف کرتا ہے اور ایک مسلمان کے لئے اس امر کے ثابت کرنے میں اسی قدر کافی ہے کہ حضرت سید المرسلین خاتم النبیینؐ اپنی ساری عمر میں اِهْدِنَا کی دعا مانگتے رہے اور آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اِهْدِنَا کی دعا ترک کر دیں۔

اور ظاہر ہے کہ جب خاتم الانبیاء باوجود اس رفعت شان کے اِھْدِنَا کی دعا مانگتے ہیں جو کہ صاف بتاتی ہے کہ ابھی کمالات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی کچھ مدارج کمالات ایسے بھی ہیں کہ جن کی تحصیل کی راہیں مانگی جارہی ہیں۔ تو اور دوسرا کون ہوا یا ہے یا ہوگا کہ جس نے ان مدارج کو ختم کیا تھا یا کیا ہے یا کرے گا۔

اور قرآن مجید چونکہ اکمل کتاب ہے اور سب صداقتوں کی جامع اور مہیمن ہے لہٰذا وہ ہر ایک مرتبۂ کمال کے بعد دوسرے درجہ کی طرف کامل ہدایت کرتا ہے اور کوئی درجۂ کمال ایسا نہیں کہ جس کی طرف یہ راہنمائی نہ کرتا ہو اور ان بے شمار مدارج میں سے جو کوئی کچھ حاصل کرتا ہے تو اس سے آگے کے لئے وہ قرآن مجید کی ہدایت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ نہیں کہ پیراں نمے پرند مریداں مے پرانند[1] کے مطابق ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ قرآن مجید خود یہ دعویٰ کرتا ہے چنانچہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں بھی یہی دعویٰ ہے کہ متقیوں کے لئے ہر ایک مرتبہ کمال کی طرف راہنمائی کرنے والی یہ کتاب ہے۔ اور پھر محض دعویٰ ہی دعویٰ نہیں بلکہ ہزارہا لوگوں کو اعلیٰ مدارج پر پہنچا کر اپنے لئے عملی شہادت قائم کی ہے اور پھر یہ نہیں کہ پہلے ایسا کیا تھا۔ اور اب عملی شہادت قائم کرنے سے قاصر ہے اب بھی ویسی ہی عملی شہادت تیار کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ پس اس تحقیق کے مطابق ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا یہ مطلب ہے کہ خداوند کریم فرماتا ہے کہ یہ کتاب یہی نہیں کہ اور کتابوں کی طرح اس معنے سے متقی بناتی ہو کہ غیب پر ایمان لے آئیں اور نماز کو قائم کریں اور اللہ کے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کریں بلکہ یہ ایسے لوگوں کو بھی ہدایت کر کے آگے لے جانا چاہتی ہے چنانچہ ایمان بالغیب سے مشاہدہ تک پہنچاتی ہے۔

مثلاً پہلے خدا پر ان کا ایمان بالغیب تھا تو یہ قرآن ایسی راہ بتاتا ہے کہ جس سے خدائے ذوالجلال خود اس کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اپنے مشاہدہ کے انوار سے اس کو رنگین کر دیتا ہے۔ اسی طرح پہلے فرشتوں پر اگر ایمان بالغیب تھا تو یہ وہ طریق بتاتا ہے کہ جس پر چل کر انسان اس مقام پر پہنچتا ہے کہ فرشتے اس پر نازل ہو کر بشارتیں دیتے ہیں جیسا کہ

[1]۔ پیر خود نہیں اڑتے ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں۔ (از مرتب)

فرمایا اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ۔ (حٰمٓ السجدۃ:31تا32)(بیشک جو کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے یعنی جو کہ سب نقائص سے پاک اور سب کمالات کا جامع ہے۔ پھر استقامت دکھاتے ہیں یعنی جیسا خدا مانا ہے اس کے مناسب وہ عمل درآمد رکھتے ہیں تو ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور ان کو کہتے ہیں کہ مت ڈرو اور مت غم کرو اور تمہیں بشارت ہو اس جنت کی کہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ یعنی پہلے جنت کا تمہارے ساتھ وعدہ تھا اب وہ لے لو۔ ہم تمہارے دوست اور حامی اور سرپرست ہو گئے ہیں اس نزدیک زندگی میں اور پیچھے آنے والی زندگی میں۔)

اور اسی طرح جنت پر اگر ایمان بالغیب تھا تو قرآن اس راستہ پر چلانا چاہتا ہے کہ جس پر قدم مارنے سے اسی دنیا میں جنت پا لیتے ہیں جیسا مذکورہ بالا آیت میں آیا ہے یا وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن:47) میں آیا ہے (اور جو اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرتے ہیں ان کے لئے دو جنت ہیں۔)

یعنی ایسے لوگوں کو ایک جنت اسی عالم دنیا میں ملتا ہے اور دوسرا آخرت میں غرض کہ جن امور پر انسان ایمان بالغیب رکھتا ہے قرآن مجید اس کو ایسی راہ بتاتا ہے کہ اس پر قدم مارنے سے وہ اس کے مشاہدہ میں آجاتے ہیں اور جو لوگ اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں ان کو ایسی راہ بتاتا ہے کہ جس سے ان کی نماز قائم ہو جاتی ہے یعنی جن لوگوں کی نماز ابھی پہرہ پر قائم ہونے کے قابل نہیں اور نماز کے سپاہی کی ڈیوٹی جو کہ قرآن مجید نے تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (العنکبوت:46) (نماز بے حیائیوں اور ناجائز امور سے روکتی ہے) میں بتائی ہے ابھی وہ نہیں بجا لا سکتی اور نمازی بار بار اس کو کھڑا کرتا ہے اور وہ بار بار گر جاتی ہے۔ تو قرآن مجید ان کو ایسے راستہ کی ہدایت کرتا ہے کہ جس سے ان کی نماز قائم ہو کر پہرہ دینے کے قابل ہو جاتی ہے اور انسان کو فحشاء اور منکر سے بالکل روک دیتی ہے اور اس وقت نماز دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ لذیذ اور دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کی غذا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جو لوگ پہلے اللہ کے دیئے ہوئے سے بڑی مشکل کے ساتھ کچھ خرچ کرتے ہیں تو قرآن مجید ان کو ایسی ہدایت کرتا ہے کہ جس سے وہ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۔[1] (النساء:59) کے موافق خدا کا سب کچھ دیا ہوا اس کے راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور جو جو چیزیں اور طاقتیں کہ خداوند کریم نے ان کو امانت دی ہوئی ہیں وہ خداوند تعالیٰ کو واپس دے دیتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ بڑے شوق اور اخلاص سے کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی پیاری جان بھی بڑی خوشی سے دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ غرض کہ معترض نے چونکہ قرآن مجید کی ہدایت کو اسی قدر میں محصور یقین کیا ہوا تھا جو کہ متقی کی تفسیر میں یہاں پر بیان ہوا ہے لہٰذا اس نے اعتراض کر دیا کہ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ میں تحصیل حاصل ہے کیونکہ قرآن مجید نے اسی چیز کی ہدایت کرنی ہے جو کہ متقی کو پہلے سے حاصل ہے۔

خلاصہ جواب ثالث:

اور خلاصہ جواب یہ ہے کہ معترض کا یہ خیال محض غلط ہے کہ قرآن مجید نے انہی امور کی ہدایت کرنی ہے جو کہ متقی کو پہلے حاصل ہیں بلکہ جو امور کہ متقی کو حاصل ہیں ان سے آگے اور کمالات کے حاصل کرنے کا طریق قرآن مجید بتاتا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ یہ وہ کمال ہے جو کہ قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے اور دنیا کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔

هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے اور اسلام کے فطرتی مذہب ہونے کی دلیل ہے:

اور یہ ایک ہی کمال ایسا ہے کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کے لئے کافی برہان اور حجت ہے اور نیز اس امر کے لئے بھی کافی ثبوت ہے کہ جو دین یہ کتاب لائی ہے وہ فطرتی مذہب ہے۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ تصنیف مصنف کی ایک عکسی تصویر ہوتی ہے۔ پس اگر کوئی مصنف کو نہ جانتا ہو تو تصنیف سے اس کے حال کو بخوبی جان لیتا ہے اور اگر مصنف کو جانتا ہو تو اس سے تصنیف کے حال کو بخوبی دریافت کر لیتا ہے۔ پس چونکہ ہم خدا کو جانتے ہیں کہ

[1] ۔ کہ تم امانتیں ان کے مستحقوں کے سپرد کرو۔ (تفسیر صغیر)

وہ ذات میں، صفات میں، قدرت میں اور سب کمالات میں غیر محدود ہے تو اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایسے غیر محدود قادر مطلق خدا کی تصنیف اور کتاب کی ہدایت بھی ضروری ہے کہ غیر محدود ہو۔ اور اگر محدود ہو تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیر محدود خدا کی تصنیف نہیں بلکہ محدود مخلوق کی تصنیف ہے جو غلطی سے خدا کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

پس چونکہ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں کہ قرآن مجید ہی ایک وہ کتاب ہے کہ جس کی ہدایت غیر محدود ہے لہٰذا یہ کسی محدود مخلوق کی کتاب نہیں بلکہ یقیناً یقیناً غیر محدود خدا کی کتاب ہے۔ اور دوم اس وجہ سے کہ سب دنیا جانتی ہے کہ انسان کی طبیعت ایسی ترقی طلب ہے کہ ترقی کے معراج میں کسی خاص زینہ اور پایہ پر ہرگز نہیں ٹھہر سکتی بلکہ آگے ہی آگے چلی جاتی ہے جیسا کہ تمدنی وغیرہ ترقیات اس کی شاہد ناطق ہیں۔ پس جب انسان کی فطرت غیر محدود ترقی کی قابل اور طالب ہے تو اس کے لئے فطرتی مذہب وہی ہو سکتا ہے جو کہ غیر محدود ترقی کی ہدایتوں کا جامع ہو نہ وہ جو کہ ایک محدود ترقی پر پہنچ کر انسانی فطرت کی غیر محدود قابلیت اور غیر متناہی طلب کا خون کر دینے والا ہو۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں ترتیب کا بیان:

یہاں سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں تعلق ہے کہ جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے بعد متصل ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کی دلیل ہے جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے اور نیز میں نے پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ علت غائی ہے اور لَا رَيْبَ فِيْهِ علت صوری اور ذٰلِكَ الْكِتٰبُ علت مادی اور الٓمّٓ علت فاعلی ہے اور ظاہر ہے کہ جس طرح علت فاعلی کے بعد علت مادی کا ہونا ضروری ہے اور مادی کے بعد صوری کا ہونا ضروری ہے اسی طرح صوری کے بعد غائی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پس یہ دوسری وجہ ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے لَا رَيْبَ فِيْهِ کے بعد متصل لانے کی۔

آیت4: اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ۔

اَلَّذِیۡنَ کے معنے ہیں جو لوگ۔ یُؤۡمِنُوۡنَ۔ ایمان سے بنایا ہوا ہے۔

ایمان کے معنے:

اور ایمان کہتے ہیں یقین و تسلیم کو۔ پس اگر یقین نہ ہو اور تسلیم ہو تو اس کو نفاق کہتے ہیں۔ اور اگر تسلیم نہ ہو اور یقین ہو تو اس کو تَکۡذِیۡبٌ اور جُحُوۡدٌ کہتے ہیں جیسا فرعونیوں کے بارہ میں آیا ہے۔ وَجَحَدُوۡا بِہَا وَاسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (النمل:15) (اور انہوں نے ان کا انکار کیا حالانکہ یقین کیا ان کا ان کی جانوں نے (تو یہ سب کچھ) ظلم و تکبر سے کیا ہے۔)

ایمان پر بڑی بڑی بحثیں علماء کے درمیان واقع ہوئی ہیں۔ منجملہ ان بحثوں کے ایک بحث یہ ہے کہ ایمان کم و بیش ہوتا ہے یا نہیں۔ اہل حدیث اور شوافع اس طرف گئے ہیں کہ کم و بیش ہوتا ہے۔ اور احناف اس طرف گئے ہیں کہ کم و بیش نہیں ہوتا۔ اور فی الحقیقت اس بحث کی بنا اس امر پر ہے کہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ایمان میں داخل اور اس کی جزو ہیں یا خارج ہیں۔ جنہوں نے ان کو جزو قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایمان کم و بیش ہو گا کیونکہ جس قدر اعمال و اخلاق میں کمی ہو گی اسی قدر ایمان کے اجزا کی کمی ہو گی اور جس قدر اجزاء میں کمی ہو گی اسی قدر ایمان ناقص اور کم ہو گا۔ اور جس قدر اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ زائد ہوں گے تو ایمان کے اجزاء زائد ہوں گے اور جس قدر ایمان کے اجزاء زائد ہوں گے اسی قدر ایمان بھی زائد ہو گا۔ تو اب ساری بحث کا دار و مدار اس پر آ گیا کہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ایمان میں داخل ہیں یا نہیں۔ اس پر فریقین نے بڑا بڑا زور دیا ہے۔

نزاع لفظی اور نزاع حقیقی میں فرق:

مَیں جب فلسفہ پڑھتا تھا اور اس میں بار بار یہ فقرہ پڑھتا تھا کہ محققین کے درمیان

نزاع لفظی[1] نہیں ہوتا بلکہ حقیقی ہوتا ہے تو یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کیونکہ جب لفظی نزاع محققین میں اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ تحقیق کے بعد نزاع لفظی والی صورت میں نزاع نہیں رہ سکتا اور محقق وہی ہوتے ہیں جو ہر ایک امر کی تحقیق کر لیتے ہیں یا کر لیا کریں تو پھر حقیقی نزاع کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ محقق تو وہ ہوا جو تحقیق کر کے حق و حقیقت تک پہنچ جائے اور ظاہر ہے کہ حق ایک ہی ہوتا ہے نہ دو۔ پس جب حقیقی نزاع میں دو متخالف امور ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ دو میں سے ایک حق ہو اور ایک ناحق اور جو ناحق کا قائل ہو وہ کہاں کا محقق ہوا۔

پس اگر محققین میں نزاع لفظی اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ یہ ان کے محقق ہونے کے خلاف ہے تو پھر نزاع حقیقی بطریق اولیٰ ان میں نہیں ہو سکتا جو کہ یقیناً ایک کو غیر محقق قرار دیتا ہے۔ یہ خیال میں ہمیشہ اپنے استاذوں پر ظاہر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ میرے ایک نئے استاذ نے شیخ ابن عربی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ محققین میں نزاع حقیقی کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب ان میں نزاع ہوتا ہے تو ضرور لفظی ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اولویت اور غیر اولویت میں ہوتا ہے۔ تو اس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی پھر اس کی تائید مَیں نے اس سے بھی پائی ہے کہ بڑے بڑے فاضلوں نے محققین کے نزاعوں میں جمع اور اتفاق کی بڑی بڑی کوششیں کی ہیں اور آخر ان نزاعوں کو نزاع لفظی ہی بنایا ہے۔

چنانچہ حضرت مجدد شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں

---

[1] نزاع لفظی اس کو کہتے ہیں کہ حقیقت میں ہر ایک فریق دوسرے کی بات کا منکر نہ ہو لیکن بظاہر ہر ایک کی بات دوسرے کے خلاف ہو اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک اس لفظ کے اور معنے یا مقصود لے کر بات کرتا ہے اور دوسرا اس کے اور معنے یا مقصد لے کر اور بات کہتا ہے۔ پس چونکہ لفظ ایک ہوتا ہے اور باتیں دو متخالف اس وجہ سے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک اور معنوں کے لحاظ سے بات کرتا ہے اور دوسرا دوسرے معنوں کے رو سے لہٰذا حقیقت میں ان میں کچھ خلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شہر کے دونوں طرف دو نہریں ہوں ایک شہر سے میل کے فاصلہ پر ہو اور ایک دو میل پر تو زید کہے کہ نہر میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور عمرو کہے کہ دو میل پر ہے تو یہ دونوں قول اگرچہ بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن حقیقت میں کوئی خلاف نہیں کیونکہ زید نے اور نہر کے خیال سے کہا ہے اور عمرو نے اور نہر کے لحاظ سے۔ پس اگر زید سے دوسری نہر کی نسبت دریافت ہو تو وہ بھی وہی کہے گا جو کہ عمرو نے کہا تھا اور اسی طرح عمرو سے دوسری کی نسبت سوال ہو تو وہ بھی وہی کہے گا جو کہ زید نے کہا تھا۔ پس ایسے نزاع کو نزاع لفظی کہتے ہیں یعنی اگرچہ بظاہر لفظوں میں خلاف ہے لیکن حقیقت میں کوئی خلاف نہیں۔ (حاشیہ از رسالہ تعلیم الاسلام)

اس نزاع کو بھی نزاع لفظی قرار دے کر دونوں مذہبوں میں جمع کر دیا ہے۔ اور نزاع لفظی قرار دینے کے لئے انہوں نے بیان کیا ہے کہ ایمان چار قسم ہے یا یوں کہو کہ ایمان دو قسم ہے ایک دنیوی اور ایک اخروی اور جو اخروی ایمان ہے وہ تین معنے رکھتا ہے۔ پھر انہوں نے بتایا ہے کہ احادیث ذیل یا ان کی مثلوں میں دنیوی ایمان کا ذکر ہے۔

اور وہ حدیثیں یہ ہیں:

نمبر 1: آنحضرتؐ نے فرمایا ثَلَاثٌ مِّنْ اَصْلِ الْاِیْمَانِ مَنْ[1] قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَا تُکَفِّرْہُ بِذَنْبٍ وَّلَا تُخْرِجْہُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ[2] الخ۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح جلد 1 صفحہ 130 کتاب الایمان باب الکبائر وعلامات النفاق دار الفکر بیروت)

فرمایا ایمان کے تین اصول ہیں۔ جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے کسی گناہ کے ساتھ اس کو کافر نہ کہہ اور نہ کسی عمل کے ساتھ اس کو اسلام سے خارج کر الخ۔

نمبر 2: اور فرمایا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَ حِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ۔

(صحیح البخاری کتاب الایمان باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ... حدیث نمبر 25)

فرمایا مجھے اجازت ملی ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کروں۔ ہاں اگر وہ شہادت دے دیں کہ اللہ ہی معبود ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو پھر انہوں نے اپنے مال وجان مجھ سے بچالئے، سواء اس کے جو اسلام نے ان پر لازم کیا ہے اور باقی حساب ان کا اللہ خود کرے گا۔

نمبر 3: اور فرمایا مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا وَ اسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَ اَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذَالِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَہٗ ذِمَّۃُ اللّٰہِ وَ ذِمَّۃُ رَسُوْلِہٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰہَ فِیْ ذِمَّتِہٖ۔

(صحیح البخاری کتاب الصلاۃ باب فضل استقبال القبلۃ حدیث نمبر 391)

---

[1] نوٹ: رسالہ تعلیم الاسلام میں مَنْ لکھا ہے جبکہ حدیث کے الفاظ اَلْکَفُّ عَمَّنْ کے ہیں۔ (از مرتب)

[2] ۔ تین باتیں ایمان کی جڑ، بنیاد میں سے ہیں جو لا الہ الا اللہ کہے اس سے (لڑائی) کرنے سے رکنا اور اس کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ بنانا، کہنا اور نہ اسے کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج کرنا۔ (از مرتب)

فرمایا جو ہماری نماز جیسی نماز پڑھے۔ اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ پھیرے اور ہماری ذبح کی ہوئی شئے کھائے۔ پس یہ وہ مسلمان ہے جس کے اللہ اور رسول اللہؐ ذمہ وار ہیں۔ لہٰذا تم اللہ کی ذمہ واری میں رخنہ مت ڈالو۔

اور ایمان اخروی کے تین معنے یہ بیان کئے ہیں:

نمبر 1: وہ ایمان ہے جو کہ کفر والے خُلُودِفِی النَّارِ [1] سے بچاتا ہے۔ یعنی ایک وہ ایمان ہے کہ جب وہ حاصل ہو جائے تو پھر اس کو اس قدر لمبا عذاب نہ دیا جائے گا جس قدر کہ کافر کو دیا جائے گا۔ اور اس ایمان میں فقط عقائد حقہ ہیں اعمال صالحہ یا اخلاق فاضلہ اس میں داخل نہیں اور یہ کم و بیش اس طور پر نہیں ہوتا کہ کبھی اس کے اجزاء زیادہ ہو جائیں اور کبھی کم۔

نمبر 2: وہ ایمان ہے کہ دُخُوْلِ فِی النَّارِ [2] سے بالکل بچا دے۔ یعنی دوسرا وہ ایمان ہے کہ جب وہ حاصل ہو جاوے تو پھر انسان بالکل دوزخ میں داخل ہی نہ ہو بلکہ اس کو خُلُودِفِی الْجَنَّتِ [3] مل جائے۔ پس یہ وہ ایمان ہے کہ جس میں علاوہ عقائد حقہ کے اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ بھی داخل ہیں اور یہ کم و بیش بھی بمعنے مذکور ہوتا ہے۔

نمبر 3: وہ ایمان ہے جو بمعنی سکینت اور نور ایمان کے ہے۔ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں بیان کیا کہ رات کے وقت میں نماز پڑھ رہا تھا تو ایک روشنی اوپر سے ظاہر ہوئی جس سے قریب تھا کہ میرا گھوڑا بھاگ جاتا تو آپؐ نے فرمایا یہ سکینت ہے۔

(صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا باب نزول السکینۃ لقرآۃ القرآن حدیث 1856، 1859)

پھر اور حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لَا یَزْنِی الزَّانِی حِیْنَ یَزْنِی وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ۔

(صحیح البخاری کتاب المظالم باب النھبی بغیر اذن صاحبہ حدیث نمبر 2475)

---

[1] ۔ آگ میں لمبا عرصہ رہنا۔ (از مرتب)

[2] ۔ آگ میں داخل ہونا (از مرتب)

[3] ۔ جنت میں دوام۔ (از مرتب)

یعنی زانی جب زنا کرتا ہے تو اس وقت وہ مومن نہیں رہتا۔

اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایمان اس کا نکل کر اس کے سر پر سایہ بان کی مانند ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی ابواب الایمان باب ماجاء لایزنی الزانی وھو مؤمن حدیث نمبر 2625)

یعنی اس میں نور ایمان نہیں رہتا بلکہ نکل جاتا ہے۔

غرض کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر دونوں مذہبوں میں اس طرح رفع نزاع کیا ہے کہ بتادیا کہ جو کہتے ہیں کہ ایمان کم و بیش ہوتا ہے انہوں نے ایمان اخروی کے دوسرے معنے لئے ہوئے ہیں۔ اور جن معنوں کے لحاظ سے پہلے مذہب والے کم و بیش ہونے کا انکار کرتے ہیں دوسرے مذہب والے بھی ان کے لحاظ سے کم و بیش ہونے کے قائل نہیں۔ اور جن کے رو سے دوسرے مذہب والے کم و بیش ہونے کے قائل ہیں ان کے لحاظ سے پہلے بھی ان کے منکر نہیں۔

(حضرت سیدی و مولائی حکیم الامت) ایمان کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحجرات:16) مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں مال و جان سے کوشش کی۔ بے شک وہی سچے ہیں۔

اور فرمایا فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (النساء:66) تیرے رب کی قسم ہے کبھی مومن نہ ہوں گے جب تک کہ تجھے حَکَم نہ بنائیں ان امور میں کہ جن میں ان کے مابین نزاع ہو۔ اور پھر تیرے فیصلہ میں کسی قسم کی اپنے جی میں تنگی نہ پائیں۔ اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔

اور فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ۔ (النور:63) مومن تو وہی ہیں جو کہ اللہ اور اس کے رسول پر

ایمان لاتے ہیں اور جب کسی ایسے اہم امر پر اس کے ساتھ ہوں جو لوگوں کو جمع کرتا ہے تو اذن لینے کے سوا نہیں جاتے۔

اور فرمایا اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ (السجدۃ:16 تا17) ہماری آیتوں پر تو وہی ایمان لائے ہیں کہ جب ان کو ان کے ساتھ نصیحت (یا یاد دہانی) کی جاتی ہے تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے تسبیح کہتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں اور خوف و امید سے اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں۔

اور فرمایا وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ۔ (الاحزاب:37) کسی مومن اور مومن عورت کو اختیار نہیں جبکہ اللہ اور رسول کسی امر میں فیصلہ کر دیں۔

اور فرمایا اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (النور:52) مومن لوگ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف فیصلہ کے لئے بلائے جاتے ہیں تو ان کا یہی قول ہوتا ہے کہ ہم نے سنا، قبول کیا اور اطاعت کی۔

اور فرمایا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ (النساء:137) اللہ اور اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو کہ اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور اس کتاب پر جو کہ اس سے پہلے اتاری ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء:60) اے ایمان والو اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور اپنے میں سے حکومت والوں کی اور اگر کسی شے میں تمہارا تنازع ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیرو۔ اگر تم اللہ اور آخر آنے والے دن (یا وقت) پر ایمان رکھتے ہو۔

اور فرمایا لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ۔(المجادلۃ:23)تم کوئی لوگ نہ پاؤ گے جو کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہوں اور پھر ان سے محبت اور دوستی رکھتے ہوں جو کہ اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہوں۔

اور فرمایا وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ۔(المائدۃ:82)اور اگر یہ اللہ اور آخری دن پر اور اس پر جو اللہ نے اتارا ہے ایمان رکھتے تو پھر ان سے کبھی دوستی نہ لگاتے۔

اور فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔(الانفال:74)اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں انہوں نے مجاہدہ کیا اور جگہ دی اور مدد کی وہی پکے مومن ہیں۔

اور فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔(الحجرات:11)مومن تو بھائی ہی ہیں نہ اور کچھ۔

اور فرمایا وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔(البقرۃ:279)اور چھوڑ دو جو سود باقی رہا ہے اگر تم مومن ہو۔

اور فرمایا وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔(آل عمران:140) اور نہ سست ہو اور نہ غمناک ہو اور تم ہی ٹھیک غالب آنے والے ہو اگر تم مومن ہو۔

اور فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔(البقرۃ:166)اور جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ سے سخت محبت رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اور فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔(النساء:77)اور جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی راہ پر جنگ کرتے ہیں۔

اور فرمایا فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (الاعراف:86) اور پیمانہ اور ترازو کو پورا کرو (پورا ماپو اور پورا تولو) اور لوگوں کی چیزوں میں نقصان مت ڈالو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد مت ڈالو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم مومن ہو۔

اور فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (الانفال:2تا4) پس اللہ سے ڈرو اور اپنے درمیانی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور ان کو اس کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان کو بڑھاتی ہیں اور وہ اپنے رب پر ہی سہارا رکھتے ہیں۔ اور جو نمازیں قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔

اور فرمایا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ (البقرۃ:27) لیکن جو ایمان لاتے ہیں۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

احادیث کے لحاظ سے ایمان کی تعریف:

اور حدیثوں کے لحاظ سے ایمان کی تعریف یہ ہے:

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ ایمان کیا ہے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کی ملاقات اور اس کے رسولوں اور آخری دن پر ایمان لائے۔

(صحیح البخاری کتاب الایمان باب سوال جبریل النبی ﷺ... حدیث نمبر 50)

اور ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ آخرت میں اٹھائے جانے پر اور اس پر ایمان لاؤ کہ اچھائی اور برائی کا انذار اللہ کی طرف سے ہے۔ تو جبرائیلؑ نے کہا صَدَقْتَ (آپ نے سچ فرمایا) یہ حدیث بخاری، مسلم، ابن ماجہ میں ہے۔

(صحیح البخاری کتاب التفسیر باب قولہ ان اللہ عندہ علم الساعۃ حدیث نمبر 4777)

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب الاسلام ماھو؟ وبیان خصالہ حدیث 99)

(سنن ابن ماجہ افتتاح الکتاب باب فی الایمان حدیث نمبر 63)

اور فرمایا ہے تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اپنے والد

اور اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہوں۔ یہ حدیث بخاری میں ہے۔

(صحیح البخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ﷺ من الایمان حدیث نمبر 14)

اور ابن خزیمہ [1] میں اس پر زیادہ یہ بھی ہے کہ اپنے اہل و عیال اور مال سے۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد 1 صفحہ 240 کتاب الایمان حدیث 15 دار احیاء التراث العربی 2003ء)

اور بخاری میں ایک اور حدیث میں فرمایا ہے۔ تم سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ پسند نہ کرے جو کہ وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الایمان باب من الایمان أن یحب لنفسہ حدیث نمبر 13)

اور شعب الایمان میں ایک حدیث میں فرمایا ہے۔ اس شخص کا ایمان نہیں جس کے لئے امانت نہیں۔

(الجامع لشعب الایمان جزء 6 صفحہ 196-197 حدیث 4045 مکتبۃ الرشد الریاض 2004ء)

اور حضرت عبد اللہ بن عباس نے عبد القیس کے قافلہ کے قصہ میں روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ایمان اس امر کی شہادت ہے کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور صلوٰۃ کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا دینا اور رمضان کے روزے رکھنے اور مسجد حرام کا حج کرنا ہے۔ امام احمدؒ اور ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 1 صفحہ 902 مسند عبد اللہ بن عباس حدیث نمبر 3406 عالم الکتب بیروت 1998ء)

(مستخرج أبی عوانۃ جزء 5 صفحہ 127 کتاب الحدود باب بیان الاوعیۃ... حدیث نمبر 8090 بحوالہ المکتبۃ الشاملۃ)

اور نسائی میں مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جس کو لوگ اپنے مال و جان پر امین سمجھیں۔

(سنن النسائی کتاب الایمان و شرائعہ باب صفۃ المؤمن حدیث نمبر 4995)

اور امام احمدؒ اور عبد الرزاق نے روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ زانی جب زنا کرتا ہے تو زنا کرنے وقت ہرگز مومن نہیں ہوتا اور نہ چور چوری کرنے کے وقت مومن ہوتا ہے اور نہ شرابی شراب پینے کے وقت مومن ہوتا ہے اور نہ کوئی اُچکّا کسی ذی قدر شے

[1] ابن خزیمہ میں یہ الفاظ نہیں ملے۔ البتہ عمدۃ القاری میں یہ الفاظ ابن خزیمہ کے حوالے سے ملے ہیں۔ (از مرتب)

کے اُچک کر لے جانے کے وقت مومن ہوتا ہے۔ جب لوگ نظریں اٹھا کر اس کو دیکھتے ہوتے ہیں اور وہ پھر بھی اچک لے جاتا ہے اور نہ خائن خیانت کے وقت مومن ہوتا ہے۔ تم اس سے بچو۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 8 صفحہ 253 مسند عائشہ 25601 عالم الکتب بیروت 1998ء)

(مصنف عبد الرزاق جزء 7 صفحہ 416 کتاب الطلاق حدیث نمبر 13684 المکتب الاسلامی گجرات انڈیا 1983ء)

اور ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ ان سے ایمان نکل کر سایہ بان کی طرح ان کے اوپر ہوتا ہے تو جب وہ اس عمل کو قطع کر دیتا ہے تو اللہ اس کی طرف ایمان کو لوٹا دیتا ہے۔

(سنن الترمذی کتاب الایمان باب ماجاء لایزنی الزانی وھو مؤمن حدیث نمبر 2625)

اور صحیح مسلم میں مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں سب سے ادنیٰ راستہ سے موذی چیز کا دور کرنا ہے اور حیا ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان عدد شعب الایمان... حدیث نمبر 153)

اور جب آنحضرتؐ سے یہ سوال ہوا ہے کہ کونسا ایمان افضل ہے تو آپ نے یہ جواب دیا ہے کہ اخلاق حسنہ۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 572 مسند عمرو بن عبسۃ حدیث نمبر 19655 عالم الکتب بیروت 1998ء)

اور امام احمد کی ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ تُو محبت بھی اللہ ہی کے لئے کرے اور عداوت بھی محض اللہ ہی کے لئے کرے اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں لگائے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 7 صفحہ 385 تا 386 مسند معاذ بن جبل 22483 عالم الکتب بیروت 1998ء)

اور فرمایا ہے کہ جو شخص محض اللہ ہی کے لئے دیتا ہے اور اللہ ہی کے لئے روکتا ہے تو اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا ہوتا ہے۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

(ابو داؤد کتاب السنۃ باب الدلیل علیٰ زیادۃ الایمان... حدیث 4681)

اور بخاری میں ہے کہ ایمان کا نشان انصار کی محبت ہے۔

(صحیح البخاری کتاب الایمان باب علامۃ الایمان حب الانصار حدیث 17)

اور مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے مومن ہی پیار کرے گا نہ اور۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی اَن حب الانصار... حدیث 240)

اور ابو سلیمان دارانی سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے قافلہ کو فرمایا تھا کہ تمہارے ایمان کا کیا نشان ہے۔ تو انہوں نے عرض کی کہ آپ کے بھیجے ہوؤں نے ہم کو پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ ہم شہادت دیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور صلوٰۃ کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور رمضان کے روزے رکھیں اور خانہ کعبہ کا حج کریں اور ان پر عمل کریں۔

اور پانچ اشیاء کا حکم دیا ہے انہوں نے کہ ہم ان پر ایمان لائیں۔ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور بعد الموت اٹھائے جانے پر۔ اور پانچ چیزوں کو ہم نے جاہلیت اور اسلام میں اپنا خلق بنایا ہے اور وہ یہ ہیں کہ مصیبت کے وقت صبر کرنا اور آرام وآسائش کے وقت شکر کرنا اور قضاوقدر کی رفتار پر راضی رہنا اور دشمنوں کی ملاقات کے مقاموں پر صدق دکھانا اور دشمنوں پر شماتت نہ کرنا۔ اور اس سے زیادہ آنحضرتؐ نے ان کو یہ فرمایا کہ وہ جمع نہ کرو جو تم نہ کھاؤ اور نہ وہ بناؤ کہ جن میں نہ رہو اور نہ ان اشیاء کی رغبت یا ان میں ترقی کرو کہ جن کو تم چھوڑ جانے والے ہو اور اس اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ جس کے طرف تمہارا رجوع ہو گا اور جس پر تم پیش کئے جاؤ گے اور اس کی خواہش کرو کہ جس کی طرف تم جانے والے ہو اور جس میں تم رہو گے اور یہ ایمان کبیر میں مذکور ہے۔

(الایمان لابن تیمیہ جزء اوّل صفحہ 211، المکتب الاسلامی عمان، المکتبۃ الشاملۃ)

ایمان کے چار معنے:

(م) میں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا قول نقل کر کے ناظرین کو بتا دیا ہے کہ ایمان کے چار معنے ہیں۔ تو اب ناظرین پر کوئی اشکال باقی نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ وہ خود ہر ایک حدیث میں وہ ایمان لے سکتے ہیں جس کا حال اس حدیث میں مذکور ہو گا۔ مثلاً جس حدیث میں آیا ہے کہ فلاں فلاں کام کرنے کے وقت انسان مومن نہیں رہتا بلکہ ایمان اس سے نکل کر سایہ بان کی مانند اس کے اوپر ہوتا ہے اور اس کے چھوڑنے پر پھر لوٹ آتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس میں وہ ایمان مراد ہے جو کہ بمعنے سکینت اور نور ایمان کے ہے۔

اسی طرح جس حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں تو ظاہر ہے کہ

اس میں وہ ایمان مراد ہے کہ جس میں اعمال واخلاق داخل ہیں۔ ورنہ موذی چیز کے راستہ سے دور کرنے کے عمل اور حیا کے خلق کی شاخیں بننے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں۔ پس یہ بالکل سچی بات ہے کہ ان احادیث میں ایمان کے ایک ہی معنے نہیں لئے گئے بلکہ ایک میں ایک لئے گئے ہیں اور دوسرے میں دوسرے۔ ناظرین پر یہ بھی مخفی نہ رہے کہ علماء میں یہ بھی اختلاف ہوا کہ ایمان اور اسلام ایک ہی ہیں یا جدا جدا ہیں اور دونوں فریق نے اپنے اپنے دعوے کے اثبات میں بہت زور دیا ہے۔

لیکن چونکہ فریقین محققین سے ہیں جیسے حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ اور ائمہ حدیثؒ لہٰذا میرے خیال میں یہاں پر بھی نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی ہے۔ یعنی ایمان اور اسلام کے معانی میں سے بعض نے کچھ معنے لے کر کہہ دیا کہ دونوں ایک ہی ہیں اور بعض نے اور معانی لے کر کہہ دیا کہ ایک نہیں بلکہ جدا جدا ہیں اور جن معانی کے لحاظ سے بعض نے دونوں کو ایک قرار دیا ہے۔ دوسرے بھی ان کے لحاظ سے تغائر کے قائل نہیں ہیں اور جن کے لحاظ سے بعض نے ان میں تغائر کا قول کیا ہے ان کے لحاظ سے دوسرے اتحاد کے قائل نہیں۔

پس فریقین میں فی الحقیقت کوئی نزاع نہیں ہے ہاں بظاہر نزاع کی صورت نظر آتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایمان اصل میں یقین اور تسلیم کے مجموعہ کو کہتے ہیں اور یہ کہ شریعت میں اس کے چار معنے آئے ہیں اور ایک معنوں کے لحاظ سے اس میں عقائد حقہ اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ داخل ہیں۔ اور اب یہ جاننا چاہئے کہ اسلام حقیقت میں ایسے قول و فعل کو کہتے ہیں جو کہ تسلیم پر آگاہی دیتے ہوں آگے عام ہے کہ خواہ حقیقت میں بھی اس کے دل میں ایسی سچی اور حقیقی تسلیم ہو کہ جس کے جوش سے یہ قول و فعل صادر ہوتے ہوں جیسا کہ اس کے قول و فعل سے ظاہر ہوتا ہے یا کہ حقیقت میں ایسی تسلیم نہ ہو محض ظاہری نظر اور عرف پر اس کے قول و فعل سے تسلیم ظاہر ہوتی ہو۔

اسلام کا صحیح مفہوم:

پس اگر اسلام اور عرف کا لحاظ کیا جائے تب تو حقیقی تسلیم اس میں داخل نہیں جو کہ

ایمان کے لئے ضروری ہے اور اگر اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ معتبر اور مفید اور حقیقی اور واقعی اسلام وہی ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ حقیقی تسلیم بھی ہو تو تب ایسے اسلام میں حقیقی تسلیم ضرور ہی داخل ہے۔ پس جنہوں نے اسلام کے نفس مفہوم کا لحاظ کیا جس میں تسلیم حقیقی داخل نہیں انہوں نے تو کہہ دیا کہ ایمان اور چیز ہے کہ جس میں اعتقاد، عمل، خلق داخل ہیں۔ اور اسلام اور چیز ہے جس میں فقط قول اور بعض اعمال داخل ہیں جو کہ تسلیم پر دلالت کرتے ہوں اور حقیقی تسلیم اس کی جزو نہیں ہے اور جنہوں نے اس طور پر خیال کیا کہ اگرچہ اسلام کا مفہوم عام ہے اور ایسی تسلیم کا ہونا نہ ہونا دونوں اس میں مساوی ہیں لیکن چونکہ مفید اور معتبر وہی اسلام ہے جس میں حقیقی تسلیم یعنی سچا اعتقاد بھی ہو۔ لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ ایمان اور اسلام ایک ہی شے ہیں کیونکہ جس طرح ایمان میں اعتقاد اور اعمال واخلاق داخل ہیں اسی طرح اسلام میں بھی یہ تینوں داخل ہیں۔ اور ان دونوں مذہبوں میں جمع کا جو طریق ہم نے بیان کیا ہے یہ از خود تراشیدہ نہیں ہے بلکہ یہ قرآن مجید واحادیث صحیحہ سے نکالا ہوا ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ جو شخص ان آیات واحادیث پر غور وتدبر کی نگاہ کرے گا ضرور اس کو یقین ہو جائے گا کہ یہ طریق بالکل حق اور واقعی ہے۔ اسی جمع کے طریق کو حضرت مولانا سَلَّمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ایمان اور اسلام میں ارتباط:

(حضرت حکیم الامت) ایمان اور اسلام دونوں جمع بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں میں ارتباط ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الذاریات:36تا37)(پس ہم نے وہ سب مومن نکالے جو کہ اس میں تھے تو نہ پایا ہم نے اس میں مسلمانوں کا کوئی گھر بجز ایک کے) اور دونوں جدا بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ مطلق اور مقید ہونے کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف نوع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (الاحزاب:36) بیشک مومن مرد اور عورتیں اور مسلمان مرد اور عورتیں۔ اور فرمایا قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ (الحجرات:15) گواروں نے کہا ہم ایمان لائے کہہ دے تم ایمان نہیں لائے لیکن کہو ہم اسلام لائے۔

پس یہ بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے بچوں کو مردوں اور عورتوں میں داخل کیا ہے۔ جیسا فرمایا وَاِنۡ كَانُوۡۤا اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ (النساء:177) پس اگر بھائی بہنیں ہوں مرد اور عورتیں تو مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کی مانند ہو۔ اور پھر ان کو مردوں اور عورتوں سے نکالا بھی ہے۔ جیسا فرمایا اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ (النساء:99) سواء ضعیف مرد و عورت اور بچوں کے یا جیسا کہ قرآن مجید نے منافقوں کو بعض مقاموں پر مومنوں میں داخل کیا ہے جیسا فرمایا قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الۡمُعَوِّقِيۡنَ مِنۡكُمۡ۔ (الاحزاب:19) اللہ جانتا ہے تم سے روکنے والوں کو۔ اور ظاہر ہے کہ جہاد پر جانے سے روکنے والے منافق ہیں نہ مومن لیکن یہاں پر خدائے حکیم ان کو مِنۡكُمۡ (تم میں سے) فرماتا ہے۔ اور دوسرے مقام میں ان کو خارج کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ (التوبۃ:56) حالانکہ وہ تم سے نہیں ہیں۔

کیا ایمان اور اسلام ایک ہی چیز ہیں؟

(م) قرآن مجید کے علاوہ احادیث میں بھی ایسا ہی آیا ہے کہ بعض حدیثوں میں ایمان اور اسلام کو بالمقابل ذکر کیا ہے اور پھر دونوں کی جدا جدا تعریفیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً حضرت جبرائیل والی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت جبرائیل نے پہلے یہ سوال کیا کہ مَا الۡاِيۡمَانُ تو آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ اَنۡ تُؤۡمِنَ بِاللّٰهِ الخ جیسا کہ ہم نے پہلا لکھا ہے۔ اور پھر دوسرا سوال کیا کہ اَلۡاِسۡلَام تو حضور علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔ اَنۡ تَشۡهَدَ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَ تُقِيۡمَ الصَّلٰوةَ وَ تُؤۡتِيَ الزَّكٰوةَ وَ تَصُوۡمَ رَمَضَانَ وَ تَحُجَّ الۡبَيۡتَ اِنِ اسۡتَطَعۡتَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا۔ پس اس حدیث میں ایمان کی تعریف میں چند امور پر اعتقاد لانا اور ان کو دل سے تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

اور اسلام کی تعریف میں بتایا ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کی زبان سے شہادت دے اور نماز ادا کرے، زکوٰۃ دے، روزہ رکھے، حج کرے۔ تو ایمان اور اسلام کے لئے جدا جدا سوال کرنا اور پھر جدا جدا جواب دینا صاف بتاتا ہے کہ یہ دونوں جدا جدا امر ہیں اور وفد (قافلہ) عبد القیس کی حدیث جو کہ ابھی عنقریب بیان ہوئی ہے۔ اس میں آیا

ہے کہ اَلْاِیْمَانُ شَھَادَۃُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ تُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ تُؤْتُوا الزَّکَاۃَ وَ تَصُوْمُوْا رَمَضَانَ وَ تَحُجُّوا الْبَیْتَ الْحَرَامَ۔ تو اس میں ایمان کی وہ تعریف کی گئی ہے جو کہ جبرائیل والی حدیث میں اسلام کی کی گئی تھی۔ پس اس حدیث میں صاف ثابت ہوتا ہے کہ ایمان واسلام ایک ہی چیز ہیں۔

حقیقی اور غیر حقیقی اسلام:

پس خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جہاں پر اسلام سے حقیقی اسلام لیا گیا ہے تو چونکہ حقیقی اسلام میں تسلیم کے علاوہ اعتقاد بھی ضروری ہے۔ اور اس وجہ سے اسلام اور ایمان دونوں ایک ہی ہو جاتے ہیں لہٰذا وہاں پر ان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اور جہاں پر حقیقی مراد نہیں تو چونکہ غیر حقیقی کی حقیقت محض تسلیم ہے جس میں اعتقاد کی ضرورت نہیں لہٰذا وہاں پر ان دونوں کو جدا جدا کر دیا ہے۔ اور جہاں پر جمع ہے وہاں پر جیسا اسلام سے حقیقی اسلام مراد ہے اسی طرح ایمان سے بھی وہ ایمان مراد ہے کہ جس میں اعمال واخلاق داخل ہیں۔ مثلاً جو آیۃ کریمہ جمع کی مثال میں ہم نے ذکر کی ہے ظاہر ہے کہ اس میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہے کہ جس کے ساتھ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ داخل ہیں۔

اور اسلام سے بھی وہی اسلام مراد ہے جو کہ محض ظاہری نہیں بلکہ اس میں ظاہری تسلیم کے علاوہ سچا اعتقاد بھی ہے۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے جو بیت المسلمین یا اَخْرَجْنَا مَنْ کَانَ فِیْھَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ[1] (الذاریات:36) میں جو مومن اور مسلم ذکر کئے ہیں وہ حضرت لوطؑ اور ان کے سچے متبع ہیں جن میں اعتقاد اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ سب جمع تھے۔ اور نجات کا قرینہ بھی اس کا موید ہے اور جہاں پر تفریق کی گئی ہے وہاں پر ایمان سے خواہ نفس اعتقاد لو یا اعتقاد واعمال واخلاق کا مجموعہ لو۔ لیکن اسلام سے وہ ظاہری اور لغوی اسلام مراد ہے کہ اعتقاد جس کی جزو نہیں ہے بلکہ محض ظاہری تسلیم ہے جیسا کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا[2]۔ (الحجرات:15) میں

---

[1]۔ ہم نے اس بستی میں جتنے مومن تھے ان کو نکال لیا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اَعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے تو ان سے کہدے کہ تم حقیقۃً ایمان نہیں لائے لیکن تم یہ کہا کرو کہ ہم نے ظاہری طور پر فرمانبرداری قبول کر لی ہے۔ (تفسیر صغیر)

صاف ظاہر ہے اور اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ[1] (الاحزاب:36) اور حدیث جبرائیل میں ایمان سے نفس اعتقاد مراد ہے اور اسلام سے نفس وہ اقوال وافعال اور اخلاق مراد ہیں جو کہ سچی تسلیم اور اعتقاد پر دالّ ہوں۔

ایک اور بحث بھی یہاں پر ہوئی ہے کہ ایمان میں اقرار زبانی بھی ضروری ہے یا نہ۔ تو بعض نے کہا ہے کہ ضروری ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ضروری نہیں۔ اور بعض نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اللہ علیم کے نزدیک معتبر ہونے کے لئے تو اقرار شرط نہیں ہے۔ اور بلحاظ خلق اللہ کے اقرار ضروری ہے۔ یعنی ایمان اخروی میں تو زبان سے اقرار کرنا کوئی ضروری امر نہیں ہے اور ایمان دنیوی میں اقرار ضروری ہے۔

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ فیصلہ صحیح نہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ جس طرح دنیوی ایمان میں اقرار ضروری ہے اسی طرح اس اخروی ایمان میں بھی ضروری ہے کہ جس میں اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ داخل ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا الخ (البقرۃ:137) کہو ہم اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا ہے ایمان لائے ہیں۔ اور جیسا کہ وفد عبد القیس کی حدیث میں آیا کہ اَلْاِیْمَانُ شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ الخ۔ پس قول اور شہادت کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ اس ایمان میں اقرار ضروری ہے۔ ہاں اس اخروی ایمان میں بے شک داخل نہیں جو بمعنے اعتقاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبرائیلؑ کی حدیث میں جہاں یہ ایمان اخروی بیان ہوا ہے وہاں پر نہ قول ہے نہ شہادت ہے بلکہ اَنْ تُؤْمِنَ کا لفظ ہے جو کہ دل کا فعل ہے نہ زبان کا۔

بِالْغَیْبِ۔ غیب کا لفظ دو طور پر آتا ہے ایک مصدر بمعنی غائب اور پوشیدہ ہونے کے۔ دوم صفت مشبہ جس کے معنے ہیں لوگوں سے پوشیدہ چیز جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اَلْغَیْبُ مَا غَابَ عَنِ النَّاسِ۔ غیب وہ ہے جو لوگوں سے پوشیدہ ہو۔ اور یہاں پر دونوں معنے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی تشریح حضرت مولانا سلمہ اللہ نے یوں فرمائی ہے۔

[1]۔ یقیناً کامل مرد اور کامل عورتیں اور کامل مومن اور کامل مومن عورتیں۔ (تفسیر صغیر)

(حضرت حکیم الامت رَقَّاہُ اللّٰہُ اِلٰی مَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی[1]) ایمان لاتے ہیں اس حالت میں کہ وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں جیسا فرمایا ہے مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (ق:34) جو ڈرا الرحمان سے غائب ہونے کی حالت میں اور فرمایا یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ (الرعد:22) بالغیب ڈرتے ہیں اپنے رب سے پوشیدہ ہونے کی حالت میں۔ پس اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں منقول ہے کہ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ (یوسف:53) تا کہ وہ جان لے کہ غائبانہ حالت میں مَیں نے اس کی خیانت نہیں کی۔ تو ان معنوں کے رو سے مطلب یہ ہو گا کہ متقی لوگ ان لوگوں کی مانند نہیں ہوتے کہ جن کے حق میں آیا ہے۔ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ (البقرۃ:15) جب مومنوں کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کو اکیلے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں بلکہ جیسے وہ لوگوں کے سامنے ایمان لاتے ہیں۔ ان اشیاء (اللہ اور ثبوت رسالت، کتاب اللہ کے منجانب اللہ ہونے اور قیامت وغیرہا) پر جو کہ لوگوں سے غائب ہیں۔

پس بالغیب یہاں پر ایسا ہے جیسا کہ بِاللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ میں ہے۔ اور دلائل بیہقی میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اَلَا اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا قَوْمٌ یَکُوْنُوْنَ بَعْدَکُمْ یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْھَا کُتُبٌ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْہِ[2]۔ (دلائل النبوۃ از بیہقی جلد 6 صفحہ 538 دار الکتب العلمیہ بیروت)

ہاں سب مخلوق سے مجھے زیادہ پسند ان لوگوں کا ایمان ہے جو کہ تم سے پیچھے آئیں گے تو کچھ صحیفے پائیں گے کہ جس میں کتابیں ہوں گی اور وہ ان پر ایمان لائیں گے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنی پر ہونے والا ایک اعتراض اور اس کا جواب:

(م) یہ دونوں معنے زبان اور واقعہ کے لحاظ سے صحیح اور درست ہیں لیکن خدائے ذوالجلال کے برگزیدہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دسمبر 1906ء کے جلسہ کی تقریر میں یہی اخیری معنے کئے تھے۔ اور اور اوقات میں بھی یہی معنے حضور کی زبان

[1] ۔ اللہ اسے بلند کرے اس طرف جس کو وہ پسند کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے۔ (از مرتب)

[2] ۔ نوٹ: دلائل النبوۃ و دیگر کتب سے یہ الفاظ ملے ہیں اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَقَوْمٌ یَکُوْنُوْنَ بَعْدَکُمْ یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْھَا کِتَابٌ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا۔ (از مرتب)

سے سنے گئے ہیں اور مقام سے زیادہ تر یہی مناسبت رکھتے ہیں۔ ہاں ان معنوں پر بعض دشمنان حق نے ایک اعتراض ضرور کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے پہلے ہی سے ایمان بالغیب کی پٹی پڑھا کر لوگوں کی نظر کو تحقیق حق سے پھیرنا چاہا ہے تاکہ لوگ اس دھوکے میں آکر (کہ متقی وہی ہوتا ہے جو کہ بے سوچے بے سمجھے ہر ایک بات کو مان لے) قرآن مجید کی بے دلیل باتوں کو مان سکیں۔ گویا قرآن مجید کے نزدیک قابل تعریف وہی لوگ ہوئے جو نہ کسی بات کی دلیل دریافت کریں نہ تحقیق کریں نہ بات کو سوچیں اور ایسے ہی مان لیویں۔ اور اگر کوئی تحقیق کرنی چاہے تو نہ متقی رہتا ہے نہ قابل تعریف رہتا ہے بلکہ فوراً اس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ یہ ہے خلاصہ سوال جو کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے دوسرے معنوں پر وارد کیا گیا ہے۔

لیکن یہ سوال محض عناد اور جہالت پر مبنی ہے ورنہ قرآن مجید میں عموماً اور ان الفاظ میں (کہ جن پر اعتراض کیا گیا ہے) خصوصاً ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو کہ اس اعتراض کو اپنے نزدیک تک نہیں آنے دیتے۔ لیکن جس کی آنکھوں میں عناد اور تعصب کی سرخ مرچوں کی کافی مقدار پڑی ہوئی ہو وہ ایسے دلائل کو کہاں دیکھ سکتا ہے۔ بلکہ وہ خود اس بات کا مصداق ہوتا ہے جو کہ اس نے سوال مذکور میں پیش کی ہے اور وہ دلائل کہ جن پر نظر کرنے کے بعد اس اعتراض کے پیش کرنے کی ہرگز گنجائش نہیں رہتی وہ یہ ہیں:

دلیل اوّل:

نمبر 1: قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے کہ جس نے اصول دین کے ہر ایک مسئلہ کو خود رنگا رنگ کے براہین قاطعہ کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ اور اور جس قدر کتابیں خدا کے نام پر پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں کہ جس نے اپنے دعاوی کو خود ثابت کیا ہو بلکہ وہ اپنے ضروری سے ضروری مسائل کے اثبات میں بھی اپنے تابعین کی تائید کی محتاج اور ان کی دست نگر اور ممنون احسان ہیں۔ پس یہ کس قدر ظلم اور صریح ظلم ہے کہ کسی ایسی کتاب کا نام لیوا قرآن مجید جیسی کتاب پر مذکورہ بالا بہتان لگائے جو کہ اپنے ہر ایک دعوے کا اثبات رنگارنگ اور قوی ترین براہین کے ساتھ خود دیتی ہے۔

دلیل دوم:

نمبر2: پھر قرآن مجید میں بار بار بیان کیا گیا ہے اور مختلف پیرایوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔(النمل:53)لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ(النحل:68) لِقَوْمٍ یَّتَدَبَّرُوْنَ۔[1] بیشک مذکورہ بالا امور میں واضح ترین نشان و دلائل ہیں جاننے والوں، عقلمندوں، سوچنے سمجھنے والوں کے لئے۔ پس انسان بشرطیکہ عناد و تعصب سے مسلوب العقل نہ ہو۔ خیال کر سکتا ہے کہ جس کتاب کا یہ دعویٰ ہو کہ عقلمند اور سوچ سمجھ والوں کے لئے میں نے دلائل بیان کئے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ میرے مسائل پر وہی ایمان لا سکتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عقلمند اور سمجھدار اور سوچنے والے ہوں۔ تو پھر اس پر ایسا بہتان کیونکر لگ سکتا ہے جو کہ مذکورہ بالا صریح دعویٰ کے صریح طور پر متضاد اور مخالف ہو۔

دلیل سوم:

نمبر3: قرآن مجید کی خصوصیات میں سے بلکہ اس کے منجانب اللہ ہونے کے واضح اور قوی ترین دلائل میں سے ایک یہ امر بھی ہے کہ قرآن مجید کے جن الفاظ پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے تو انہی الفاظ یا ان کے متصل ما قبل یا ما بعد میں اس اعتراض کا جواب بھی ضرور ہی مذکور ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل سچا اور پختہ قاعدہ ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے ناظرین اس دعوے کی تصدیق کے لئے ہمیشہ ہمارے رسالہ میں اس کے نظائر مشاہدہ فرماتے رہیں گے۔ یہاں پر اعتراض مذکور کا جواب یُؤْمِنُوْن کے لفظ میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ایمان جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے محض تسلیم کو نہیں کہتے بلکہ یقین اور تسلیم کے مجموعہ کو عربی زبان میں ایمان کہتے ہیں۔ اور عقلمند کیا ایک جاہل سے جاہل بھی بخوبی جانتا ہے کہ یقین ایسی شے نہیں ہے کہ بن دیکھے اور بے دلیل اور بے سوچے سمجھے محض کسی کے کہنے سننے سے حاصل ہو جائے بلکہ یقین مشاہدہ اور دلیل صحیح اور قوی اور قرائن صحیحہ قویہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور بس۔ تو جب ایمان کا لفظ یقین پر دالّ ہے اور یقین بجز مشاہدہ اور دلائل اور قرائن کے حاصل ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر کس طرح

[1]۔ قرآن مجید میں لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ(النحل:70) کے الفاظ آئے ہیں۔(از مرتب)

کوئی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے یہ خیال کر سکتا ہے یا قرآن مجید پر یہ بہتان لگا سکتا ہے کہ اس میں بے وجہ اور بے سوچے سمجھے مان لینے یا ایمان لانے کی ترغیب ہے۔

پس ناظرین غور تو کریں کہ اس اعتراض کا کیا دندان شکن جواب اسی فقرہ میں رکھا ہوا ہے۔ آپ اگر غور کریں گے تو ہر ایک اعتراض کا جواب اسی طرح اسی عبارت میں یا اس کے ما قبل یا مابعد میں پائیں گے جس سے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بیشک یہ کتاب اس عالم الغیب خدا کی ہے جو کہ قبل از اعتراض و معترض جانتا تھا کہ فلاں وقت، فلاں عَنِیْد، فلاں اعتراض اس مقام پر کرے گا۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی سے اس کا صحیح اور دندان شکن جواب اس میں یا اس کے ما قبل و مابعد میں رکھ دیا ہے۔ اور کسی مخلوق کی کتاب میں یہ کمال ہر گز متصور نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم:

ہم نے تفسیر فاتحہ میں بتایا ہے کہ سب لوگ ایمان بالغیب سے کام لیتے ہیں یہاں تک کہ سب علوم یقینیہ کی بنا بھی ایمان بالغیب ہی پر ہوتی ہے۔ مثلاً اقلیدس کے دعاوی اور دلائل سب سے زیادہ یقینی بیان کئے جاتے ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ ان کی بِسْمِ اللّٰہ ایمان بالغیب ہی سے شروع ہوتی ہے۔ دنیا میں جس قدر بڑے فاضل اور فنون و ہنر کے ماہر ہوئے ہیں یا ہیں ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی اسی ایمان بالغیب سے شروع ہوا ہے۔

معترض صاحب نے بھی جب اپنے استاذ سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کیا ہو گا تو ضرور پہلا سبق ایمان بالغیب سے ہی شروع کیا ہو گا اور ممکن نہیں کہ حروف ہجاء کے اشکال اور اسامی اور تلفظ الفاظ اور ان کے معانی میں ایمان بالغیب سے استاذ و شاگرد نے کام نہ لیا ہو۔ اور ابتداءً ان کے دلائل کا سوال پیش کیا ہو بلکہ دنیا میں نہ کوئی ایسا استاذ ہوا ہے اور نہ ہے جو کہ اپنے مبتدی شاگرد کی تعلیم کو دلائل سے شروع کرتا ہو اور بفرض محال اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو ممکن نہیں کہ کبھی وہ کامیابی کا مسرت بخش چہرہ دیکھ سکے۔

ایمان بالغیب کا مسئلہ عالم گیر مسئلہ ہے:

پس یہ ایمان بالغیب کا مسئلہ ایسا عالم گیر مسئلہ ہے کہ کوئی فرد بشر ایسا نہیں کہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو اور نہ کوئی ایسا پیشہ اور حرفہ یا فن ہے کہ جس کی تعلیم و تعلم کی بنا اس پر نہ ہو۔

اور اسی سے اس کا ضروری اور مفید ہونا بھی ثابت ہے۔ پیغام رسانی کے اس نئے طریقہ کا موجد (کہ جس میں تار وغیرہ کا واسطہ نہیں) لکھتا ہے کہ میری توجہ کو اس طرف پھیرنے والا ایک بنگالی بابو کا یہ قول ہے کہ اس فضا میں ہوا سے لطیف تر ایک جوہر ہے جس میں ہوا کی طرح موج پیدا ہوتی ہے۔

پس یہ قول اس وقت عظیم الشان موجد کے پاس بالکل بے دلیل تھا اور ایمان بالغیب کے طور پر اس کے ذہن میں تھا لیکن اس پر چل کر آخر وہ ایک صحیح نتیجہ تک پہنچ گیا۔ پس جب یہ مسئلہ اس قدر عالمگیر اور ضروری اور مفید ہے تو پھر اس پر اعتراض کرنا حماقت کا نشان نہیں تو اور کیا ہے۔

نیز جب سب دنیا اس پر اپنے روز مرہ کے کاموں میں عملدرآمد کر رہی ہے یہاں تک کہ خود معترض صاحب بھی اس پر عمل درآمد کرنے والے ہیں۔ تو پھر یہ کس قدر تعصب ہے کہ جب اس مسئلہ کو ایک بے مثل کتاب میں دیکھا جائے تو فوراً اس پر یہ الزام لگایا جائے کہ یہ کتاب بے دلیل باتوں کے منوانے کی ترغیب دیتی ہے۔

دلیل پنجم:

نمبر 5: ہم نے سورہ فاتحہ میں بتایا ہے کہ غیب کو ماننا دو قسم کا ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک غیب شے کو کہ نہ وہ خود مشاہد اور محسوس ہے اور نہ اس سے کچھ آثار محسوس و مشاہد ہیں اور نہ اس کے تسلیم کرنے کے کچھ قرائن ہیں لیکن پھر بھی اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور دوم یہ کہ اس غیب چیز کو تسلیم کرنے کے لئے صحیح اور قوی ترین قرائن موجود ہوں اور ان قرائن صحیحہ کے باعث اس کو تسلیم کیا جائے۔ پس اوّل طریق تو بے شک ناپسند ہے لیکن دوم کے پسند ہونے اور رائج اور دائر سائر ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔ اور یہاں پر قسم دوم ہے نہ اوّل جیسا کہ ایمان کے لفظ سے ثابت ہے اور واقعات اس کے شاہد ناطق ہیں۔

دلیل ششم:

نمبر 6: ہم نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایمان بالغیب جیسا جھوٹے مذہب میں ہوتا ہے اسی طرح سچے مذہب میں بھی اس سے چارہ نہیں لیکن ان میں دو فرق ہوتے ہیں

اوّل یہ کہ سچے مذہب میں ایمان بالغیب کے قرائن قویہ اور صحیحہ موجود ہوتے ہیں اور ضرور ہوتے ہیں اور جھوٹے میں نہیں ہوتے اور یقیناً نہیں ہوتے۔ دوم یہ کہ سچے مذہب میں رفتہ رفتہ ایمان بالغیب سے مشاہدہ تک نوبت پہنچتی ہے بخلاف جھوٹے کے کہ اس میں غیب ہمیشہ غیب بلکہ بے دلیل اور بے قرینہ غیب رہتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تعلیم ترقی پذیر ہے۔ پس جن امور کو پہلے ایمان بالغیب کے طور پر تسلیم کرایا جاتا ہے رفتہ رفتہ وہی امور پھر ایمان کے مرتبہ سے نکل کر مشاہد اور محسوس و مبصر ہو جاتے ہیں۔

اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تقریر کا یہی منشاء ہے جو کہ دسمبر 1905ء کو حضور نے مجمع عام اور کثیر میں کی تھی اور جو کہ ہم نے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ:3) کے ذیل میں درج کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے پہلے ہی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرما کر یہ بتایا ہے کہ یہ کتاب اور کتابوں کی طرح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کے کمال کا معراج یہ ہو کہ معمولی متعارف متقی بننے کی راہ بتاتی ہو یعنی اس پر چلنے والا کچھ تو چند امور غیب پر ایمان لے آئے اور کچھ نماز بھی پڑھے لیکن ایسی کہ ہمیشہ اس کو اس کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی رہے۔ اور ان دو باتوں کے علاوہ خدا کے بہت کچھ دیئے ہوئے سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرتا ہو یعنی وہ ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہنچا کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ الخ (الاحزاب:73) (بے شک ہم نے امانت آسمان وزمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور وہ ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا) کے مطابق جو کچھ قویٰ اور عزت وجاہ اور مال واولاد اور گھر بار اور دوست ویار بطور امانت ملے ہوں تو اس نے ان سب کو مطابق اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء:59) (بیشک اللہ کریم) تم کو حکم دیتا ہے کہ سب امانتوں کو ان کے حق داروں کی طرف واپس کر دو) اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:112) (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لئے ہیں اس کے عوض کہ ان کے لئے جنت ہے) کے اللہ تعالیٰ کی طرف واپس کر دیا ہو جو کہ مذکورہ بالا امانتوں کا حق دار

ہے اور یقیناً ہے۔ بلکہ ان سب سے بعض کا کچھ حصہ دیا ہو۔ بلکہ یہ وہ کتاب ہے جو کہ ایمان بالغیب سے مشہود تک پہنچاتی ہے۔

اور یہ اپنے متبع کو اس حد تک لے جاتی ہے کہ اس کی نماز ایسی قائم ہو جاتی ہے کہ کبھی وہ گرتی ہی نہیں تاکہ اس کو اس کے قائم کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے حتی کہ اس کو اس کی حفاظت کی مطلق ضرورت نہیں رہتی بلکہ پھر اس کی نماز اس کو فحشاء اور منکر سے محفوظ رکھنے والی ہو جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت:46)(بے شک وہ نماز بے حیائی اور ناپسند امور سے محفوظ رکھتی ہے)اور امانت الٰہیہ کو پوری احتیاط اور خوشی سے اللہ کریم کے حکم کے مطابق حوالہ بخدا کر دیتا ہے۔ اب ناظرین غور کریں کہ یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایک ایسی کتاب کا متبع جو کہ ایمان بالغیب سے ایک قدم بھی آگے نہیں لے جاسکتی۔ اس کتاب پر اعتراض کرے جو کہ ایمان بالغیب سے نکال کر شہود تک پہنچاتی ہو۔

دلیل ہفتم:

نمبر7: جس طرح یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے الفاظ میں اس کا جواب موجود ہے۔ اسی طرح ان الفاظ کے ماقبل پر نظر کرنے سے بھی ثابت ہے کہ یہ اعتراض یہاں پر وارد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ[1] (البقرۃ:3تا4) کے کسی طرح یہ معنے نہیں کہ ایمان بالغیب لاؤ اور نہ یہ کہ ایمان بالغیب کوئی بڑا بھاری کمال ہے۔ بلکہ لغت اور عرف کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ یہ کتاب ایمان بالغیب والوں کو ہدایت کرتی ہے۔ یعنی اور مذاہب کے لوگ زیادہ سے زیادہ ایمان بالغیب ہی کی حد تک پہنچتے ہیں تو جس مذہب کا کوئی انسان اسلام میں داخل ہو گا تو اس وقت تک زیادہ سے زیادہ اس نے ایمان بالغیب حاصل کیا ہو گا لیکن جب داخل ہو جائے گا تو یہ کتاب اس ایمان بالغیب والے کو آگے (مشہود) کی ہدایت کرے گی۔ غرض کہ اس عبارت کے یہ معنے نہیں کہ یہ کتاب ایمان بالغیب کی ہدایت کرتی ہے تاکہ اعتراض پڑتا کہ یہ ایمان بالغیب

[1] ۔ متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے...ہیں۔ (تفسیر صغیر)

کی ترغیب دیتی ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ یہ کتاب ایمان بالغیب والوں کو کسی اور چیز کی ہدایت کرتی ہے۔

پس جب ایمان بالغیب کی ہدایت کا ذکر تک یہاں پر نہیں تو پھر اس اعتراض کے وارد کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ رہا تعصب تو اس کا علاج اس خدا کے پاس ہے جو کہ اپنے اسلام کی تائید میں فرعون وابو جہل اور لیکھرام وآتھم جیسوں کو ہلاک اور تباہ اور نامراد کرتا رہا ہے۔

متقیوں کے لئے ترقی کی ہدایت:

بموجب تفسیر مذکور کے ترجمہ یہ ہوا کہ جو ایمان لاتے ہیں غیب پر۔ یعنی قرآن مجید ان متقیوں کے لئے آگے کی ترقی کی ہدایت کرتا ہے کہ جن کی قوت نظریہ (عقل) ایسی کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہے کہ جو چیزیں سب کے نزدیک غیب ہیں اور قرائن اور دلائل سے لوگوں کو اس کا علم نہیں حاصل ہوتا تو وہ اپنی کامل عقل کے ذریعہ سے ان اشیاء کو ان کے قرائن سے یقینی طور پر معلوم کر لیتے ہیں۔ اور پھر قوتِ فیصلہ اور شجاعت ایسی کامل رکھتے ہیں کہ خواہ اس اعتقاد میں ساری دنیا ان کے مخالف ہو اور ہزارہا خطرات کا ان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہو یا ہزارہا شکوک وشبہات کی فوجیں ان پر لائی جائیں لیکن وہ ضرور ہی عقل کی راہ نمائی سے ان امور کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور نہ شکوک سے تذبذب میں پڑتے ہیں اور نہ مخالفت کسی سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کے اعتقاد و تسلیم پر خوب مستحکم ہو جاتے ہیں۔

اور آگے بتایا کہ ان کی قوت عملیہ ایسی کامل اور اعلیٰ اور ارفع اور اقویٰ ہوتی ہے کہ جب عقل کسی امر کے حق اور مفید ہونے پر فتوی لگا دے تو وہ اس کو کر ہی گذرتے ہیں۔ بلکہ اس کے کرنے پر مداومت کرتے رہتے ہیں اگرچہ اس کے کرنے میں جانی یا مالی تکلیف بھی بہت کچھ برداشت کرنی پڑتی ہو۔ مثلاً جب ان کی عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ[1] خدا کے آگے عرض معروض کرنے اور اس کی سچی تعظیم بجالانے کے لئے نماز پڑھنی چاہئے تو خواہ اس میں بدنی تکلیف ہوتی ہے اور خصوصاً صبح اور رات کے وقت کمال سردیوں اور چھوٹی سی چھوٹی راتوں میں تو بہت ہی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن پھر

[1]۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ (از مرتب)

بھی وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ نماز کو قائم کرتے رہتے ہیں اور جب عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ خدا کے حکم کے مطابق اس کے دیئے ہوئے سے کچھ اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہئے تو باوجود مالی نقص اور بدنی تکلیف کے پھر بھی وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ہمارے دیئے ہوئے سے (یا جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس سے کچھ) وہ خرچ کرتے ہیں۔

انسان میں دو طاقتیں:

اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان میں دو طاقتیں ہیں جو کہ سب انسانی طاقتوں کی جڑھ ہیں اور وہ یہ ہیں:

نمبر 1 قوت نظریہ (عقلیہ) نمبر 2 اور قوت عملیہ اور سب انسانی کمالات کا مدار ان دو قوتوں کے کمال پر ہے۔ اور قوت نظریہ کا کمال تو یہ ہے کہ جو اشیاء اوروں کو نہ معلوم ہو سکیں اور نہایت پوشیدہ اور غیب ہوں ان کو بھی یقینی طور پر معلوم کر لے۔ اور قوت عملیہ کا کمال یہ ہے کہ جب قوت نظریہ کسی امر کے حسن اور مفید اور واجب العمل ہونے کا فتویٰ دے دے تو وہ اس کے کرنے میں پہلو تہی نہ کرے اور فوراً بجالائے خواہ اس میں بہت کچھ تکالیف کا سامنا ہو۔

پس چونکہ انسانی کمال ان دو طاقتوں کے کمال پر مبنی ہے۔ اور ان دو طاقتوں کا کمال یہ ہے جو کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے تو پھر هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ کا یہ خلاصہ مضمون ہوا کہ یہ کتاب کامل انسانوں کے لئے ہدایت ہے کہ جن کی قوت نظریہ اور قوت عملیہ دونوں اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔ اقامت کے لفظی معنے ہیں کھڑا کرنا اور صلوٰۃ کے بہت سے معنے ہیں۔ دعا ان میں سے زیادہ مشہور ہے اور درود کو بھی اسی وجہ سے صلوٰۃ کہتے ہیں کہ وہ بھی رحمت اور فضل کی دعا ہے۔ لیکن جہاں يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وغیرہ ان کی مانند آتا ہے وہاں پر بتفسیر نبی کریمؐ اور باتفاق امت محمدیہ یہی عبادت مخصوصہ مراد ہے کہ جس کو ہمارے ملک کے اہل اسلام اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ رسولؐ کے مقرر کردہ نام کو ترک کر کے اہل فارس یا یوں کہو کہ آتش پرستوں کی اتباع سے نماز کہا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی

سر سری بات نہ تھی۔ حضرت نبی کریمؐ کی غیرت نے تو اس قدر بھی اجازت نہ دی تھی کہ صلوٰۃ عشاء کو عَتَمَہ کہا جاوے چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے اپنے صحابہ کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ اعراب لوگ عشاء کو عَتَمَہ کہا کرتے ہیں پس ایسا نہ ہو کہ وہ اس نام میں تم پر غالب آجائیں اور پھر تم بھی اس کو عَتَمَہ کہنے لگو بلکہ اس کو عشاء ہی کہا کرو۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 2 صفحہ 262 مسند عبداللہ بن عمر بن خطاب حدیث 4688 عالم الکتب بیروت 1998ء)

لیکن افسوس کہ ہمارے ملک کے اہل اسلام نے وقت تو درکنار اصل عبادتوں کے نام بھی آتش پرستوں وغیرہ سے لے کر اصل نام ترک کر دیئے ہیں۔ چنانچہ صلوٰۃ کو نماز اور صوم کو روزہ کہتے ہیں اور تو جانے دیجئے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کو بھی ترک کر کے بجائے ان کے خدا کہتے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں صریح حکم تھا کہ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا[1] (الاعراف:181) اور اس قدر ان جدید ناموں کا استعمال کثیر ہوا ہے کہ جو لوگ ان کے عوض اصل اسماء بولنا چاہتے ہیں وہ بھی افہام و تفہیم کی مجبوریوں سے ان کے استعمال کو ترک نہیں کر سکتے۔ ایک نام کیا آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پیشگوئی کے مطابق اس وقت اہل اسلام میں بجز اسلام کے اسم و رسم کے اور کچھ بھی باقی نہیں ناموں کی اصلاح تو دور دراز کی بات ہے یہاں تو اصول و فروع سب کے سب ایں خانہ ہمہ آفتاب است[2] کے مصداق بنے ہوئے ہیں اور پھر بد قسمتی کی یہ حد کہ خدا کے بھیجے ہوئے کا ماننا تو درکنار ابھی مصلح کی ضرورت سے بھی انکار ہے۔ اللہ ہی رحم کرے۔

صلوٰۃ ایک خاص عبادت:

الغرض کہ صلوٰۃ اس خاص عبادت کو کہتے ہیں کہ جس کو ہمارے ملک کے لوگ نماز کہتے ہیں قرآن مجید کے پڑھنے سے ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاں کہیں قرآن مجید میں نماز پڑھنے کا ذکر آتا ہے تو صَلُّوْا یا یُصَلُّوْنَ وغیرہ نہیں آتا بلکہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (الانعام:73) اور یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (البقرۃ:4) وغیرہ الفاظ سے آتا ہے کہ جن میں

[1] ۔ اور اللہ کی بہت سی اچھی صفات ہیں پس تم ان کے ذریعہ سے اس سے دعائیں کیا کرو۔ (تفسیر صغیر)

[2] ۔ اس گھر کا ہر فرد آفتاب ہے۔ (از مرتب)

اقامت کا مادہ ضرور ہوتا ہے پھر ایک دو نہیں سینکڑوں مقاموں پر اس کا ذکر آتا ہے اور اسی طور پر آتا ہے۔ اس سے کم از کم اس طرف تو ضرور ذہن جاتا ہے کہ اس میں کوئی خاص حکمت ہے کہ جس کی وجہ سے اس طریق کو اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ اصل عبارت تو اس کے لئے صَلُّوْا اور یُصَلُّوْن وغیرہ ہونی چاہئے۔

ناظرین اس سوال کو ملحوظ خاطر رکھیں انشاء اللہ آگے ہم اس کی وجہ (یعنی جواب) مفصل بیان کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے مراد کیا ہے۔ حضرت مولانا صاحب نے اس کی مراد بیان فرماتے ہوئے یوں تقریر بیان فرمائی ہے۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 4 بابت اکتوبر 1906ء صفحہ 129 تا 160)

صلوٰۃ کی اقامت سے مراد:

(حکیم الامت) صلوٰۃ کی اقامت سے یہ مراد ہے کہ سجود، رکوع، تلاوت کو پورا کیا جائے اور خشوع اور حضور کے ساتھ پڑھی جائے اور خوب توجہ رکھی جائے۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے یہی معنے بیان فرمائے ہیں۔ اقامت چیز کے ادا کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ پس ان معنوں کے لحاظ سے یہ مقصد ہو گا کہ صلوٰۃ کا حق ادا کرتے یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کو کَمَا حَقُّهَا ادا کرتے ہیں۔ اور امام راغب نے لکھا ہے کہ یہ لکڑی کی اقامت سے ہے جو کہ سیدھا کرنے کے معنوں میں ہے یا بمعنے مداومت یا بمعنی محافظت ہے۔

پس معنے یہ ہوں گے کہ صلوٰۃ کو سیدھا کرتے ہیں یا اس پر مداومت کرتے ہیں یا اس کی محافظت کرتے ہیں جیسا قرآن مجید میں آیا ہے هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ (المعارج:24) وہ اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ (المعارج:35) وہ اپنی نمازوں پر حفاظت کرتے ہیں۔

(محمد سرور) پہلے معنے بہت ہی جامع اور موزون ہیں اور ایک اعلیٰ درجہ کے صحابی سے مروی ہیں۔ اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے بھی جلسہ دسمبر 1905ء میں یہی

معنے بیان فرمائے تھے۔ پس جب مراد کی تعیین ہو گئی تو اب ہم اس طریق کے اختیار کرنے کی وجہ بتاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک چیز خواہ وہ جسم اور جسمانی شے مثل جمادات ونباتات وحیوانات کے نہ ہو۔ لیکن چونکہ ضرور اس کا ایک ظاہر ہوتا ہے جو جسم سے مشابہ ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے جو کہ روح سے مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا کسی مناسب محل پر استعارہ یا تشبیہ کے طور پر اس ظاہر کو جسم اور باطن کو روح کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ کے ظاہری افعال کو اس کا جسم اور تعظیم الٰہی اور خشوع وحضور اور دلی تذلل اور انکسار کو اس کی روح قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ اس کے بعض افعال کو بعض روایتوں میں اس کا سر اور بعض کو دل وغیرہ کہا گیا ہے۔

صلوٰۃ پہرہ دار ہے:

علاوہ بریں قرآن مجید نے صلوٰۃ کو پہرہ دار قرار دیا ہے جیسا فرمایا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (العنکبوت:46) وہ صلوٰۃ بے حیائی اور ناپسندیدہ امور سے یقیناً بچاتی ہے۔ اور کوئی انسان پہرے کے قابل تبھی ہوتا ہے کہ اس کا جسم اپنے پورے اعضاء رکھتا ہو اور اس میں روح بھی ہو مُردہ نہ ہو اور نہ سو کر میت کی مانند ہو۔ اور پھر پہرہ کے لئے عموماً کھڑا کرنا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ پس صلوٰۃ کے پہرہ دار ہونے کے لحاظ سے بنیاد ایسے قواعد پر تھی جو کہ انسانی تجویز سے خالی نہ تھی اور پھر ان قواعد سے کام لینا بھی انسانی فعل تھا جو کہ خطا اور صواب کا محتمل ہوتا ہے۔

لیکن پھر بھی اس پر ایسا اعتبار کیا جو کہ خداوند کریم کی بتائی ہوئی بات پر کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسروں کی تکفیر اور ان کی بات کی تقبیح کرنے لگے اور پھر انسانی دخل کے باعث وہ امور اس قابل بھی نہیں رہتے کہ ان پر یہ اعتبار کیا جائے کہ ضرور یہ نجات کا ذریعہ اور منظور الٰہی ہیں۔ لیکن جب خداوند کریم نے اپنے برگزیدہ بندہ کو مبعوث فرمادیا اور رنگارنگ قوی ترین براہین اور روشن ترین آیات ونشانات سے اس کا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا۔ اور اپنے اس پاک کلام میں اس کا برگزیدۂ الٰہی اور محبوب ومنظور خداوندی ہونا ظاہر کر دیا کہ جس کا قرآن مجید کی طرح کلام الٰہی ہونا ان ہی دلائل وشواہد سے مبرہن کر دیا ہے

کہ جن کے ساتھ قرآن مجید کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا تھا۔ تو اس سے یہ امر بھی قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جو کچھ خدا کا یہ برگزیدہ کرتا ہے وہ سب خداوند کریم کو پسند اور اس کی مرضی کے مطابق ہے۔ کیونکہ اگر خداوند کریم کو اس کا کوئی فعل ناپسند ہوتا تو پھر خداوند کریم اس کی تذلیل کرتا نہ وہ تائید جو کہ انبیاء کی کرتا رہا ہے اور اس پر اظہار غضب کرتا نہ اظہار رضا، اور اس کی دعاؤں کو رد کرتا نہ قبول، اور مفتریوں کی مانند اس کو ناکام ونامراد کرتا نہ کہ انبیاء کی طرح کامیاب وبامراد اور مظفر ومنصور۔

پس خدائے علیم کا اس کے ساتھ ایسا معاملہ رکھنا اس کے اعمال وعبادات کے لئے الٰہی سارٹیفکٹ ہے۔ اور یہ الٰہی سارٹیفکٹ ہی وہ اعلیٰ درجہ کی زبردست چیز ہے جو کہ عقلمندوں کے دلوں کو کامل تسلی بخش کر سب نزاعوں کا فیصلہ اور سب اعتراضوں کا قلع وقمع کر دیتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہی وہ اعمال اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ہر ایک عقلمند اپنی نجات کی صحیح صحیح امید کی بنا ان پر رکھے۔ اور اس کے سوا اور سب انسانی بناوٹیں ہوتی ہیں لہٰذا وہ ہمیشہ اس مرتبہ سے گری رہتی ہیں۔

پس ناظرین اس امر کو بخوبی یاد رکھیں کہ عبادت وہ چیز ہے کہ جس پر انسان کی نجات کی ساری بنا کھڑی ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے ساتھ خدا کی رضامندی کا بیّن ثبوت ہو اور جو خدا کی رضامندی کا امتیازی نشان اپنے ساتھ نہ رکھتی ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ انسان اپنی نجات کی امید کا سہارا اس پر رکھے خواہ انسانی حجت بازیوں اور لسانیوں کا بہت کچھ اس کو رنگ چڑھایا ہوا ہو۔

صلوٰۃ کی کیفیت:

مَیں نے یہ معیار اعمال وعبادات اس لئے یہاں پر بیان کیا ہے کہ مَیں یہاں پر صلوٰۃ کی کیفیت بیان کرنی چاہتا ہوں۔ اور جو کچھ مَیں بیان کروں گا وہ اکثر سنت مطہرہ اور احادیث صحیحہ کے مطابق ہو گا۔ لیکن اثبات اور دفع نزاع احادیث اور ان کی ترجیح کے قواعد سے نہ کروں گا کیونکہ یہ طریق انسانی دست اندازی سے خالی نہ ہونے کی وجہ سے نہ کافی اثبات کر سکتا ہے اور نہ مادۂ نزاع کو کاٹ سکتا ہے۔ بلکہ یہاں پر مَیں اسی قدر بیان کروں گا کہ خدا کا

برگزیدہ اس عبادت کو اس طریق پر ادا کرتا ہے تاکہ یہ طریق عقلمندوں کے نزدیک اثبات کے لئے کافی اور رفع نزاع کے لئے وافی ہو۔ اور بجائے اس کے کہ مَیں ہر ایک مسئلہ کے ساتھ یہ لکھوں کہ حضرت اقدسؑ کا یہی معمول رہا ہے۔ ابتداء ہی میں مَیں یہ بتا دیتا ہوں کہ صلوٰۃ کی جو کیفیت مَیں یہاں پر لکھوں گا وہ حضرت اقدسؑ کے عمل کے مطابق ہو گی۔

حضرت مسیح موعودؑ کا طریق نماز:

اور وہ یہ ہے کہ جب صلوٰۃ پڑھتے ہیں تو کعبہ کی طرف رخ کر کے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ انگلیاں دونوں کانوں کے برابر ہو جاتی ہیں اور پھر دونوں کو نیچے لا کر سینہ یعنی دونوں پستانوں کے اوپر یا ان کے متصل نیچے اس طور پر باندھ دیتے ہیں کہ بایاں ہاتھ نیچے اور دایاں اوپر ہوتا ہے۔ اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ دہنے ہاتھ کی تینوں درمیانی انگلیوں کے سرے بائیں کہنی تک یا اس سے کچھ پیچھے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں اور انگوٹھے اور کنارے کی انگلی سے پکڑا ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے خلاف اوپر یا نیچے یا آگے بڑھا کر یا پیچھے ہٹا کر یا ساری انگلیوں سے کوئی پکڑ کر ہاتھ باندھتا ہے تو کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ ہاتھ باندھ کر سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَ تَبَارَكَ اسْمُكَ وَ تَعَالٰى جَدُّكَ وَ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ (اے اللہ مَیں تجھے پاک ہونے کے علاوہ بڑی تعریفوں والا یقین کرتا ہوں اور تیرا نام بڑا بابرکت ہے اور تیری ذات بڑی بلند ہے اور تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے) یا اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ۔[1]

نماز میں اپنی زبان میں دعا کرنا:

اور اگر بعض دعا کرتے بھی ہیں تو طوطے کی مانند عربی الفاظ دوہرا دیتے ہیں۔ رہے معنے اور مطلب تو اوّل تو کوئی ان کو جانتا ہی نہیں۔ اور اگر کوئی شاذ و نادر جانتا ہے تو ان کی

[1]۔ الٰہی میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اتنی دوری ڈال دے جتنی دوری تو نے مشرق اور مغرب میں ڈالی ہے۔ الٰہی مجھے خطاؤں سے ایسا پاک وصاف کر دے جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے پاک وصاف کر دیا جاتا ہے۔ (بخاری مترجم جلد 2 صفحہ 144-145 روایت نمبر 744 از نظارت اشاعت ربوہ)

طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو غیر زبان ہونے کے باعث وہ جوش پیدا نہیں ہوتا جو کہ قبولیت دعا یا حضور پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے حضرت امام ہمام علیہ السلام اس امر کی سخت تاکید فرماتے ہیں کہ نماز میں اپنی زبان میں بہت کثرت کے ساتھ کرنی چاہیئے۔

ظاہری اعمال پر توجہ کا نتیجہ اور اس کا حل:

چونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کسی مذہب میں روحانیت معدوم یا کالعدم ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کے پیرو ظاہری اعمال کی بہت کچھ چھان بین کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا جب اہل اسلام پر بھی یہ زمانہ آیا تو انہوں نے بھی ظاہری اعمال پر بہت کچھ توجہ کی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی باتوں پر وہ جھگڑے ہوئے جو کہ تکفیر اور مقدمات اور جنگ وجدال تک ممتد ہوئے۔ چنانچہ آج کل کا ہر ایک چھوٹا بڑا عالم وجاہل عورت ومرد اس سے ناواقف نہیں کہ رفع یدین اور اونچی آمین اور فاتحہ خلف الامام اور مسئلہ اشارہ وغیرہ پر اہل حدیث اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے متبعین میں کیا کیا جھگڑے اور کیسے کیسے مقدمے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اور مذاہب کی نزاعوں کو بھی ملا کر نظر ڈالو تو انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ اور ممکن نہ تھا کہ یہ نزاع بجز اس امر کے رفع ہوتا جو کہ خداوند حکیم نے ہمیشہ سے ایسے اختلافات کے مٹانے کے لئے مقرر فرمایا ہوا ہے اور جس کو قرآن مجید میں لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ۔ (البقرۃ:214) (تاکہ لوگوں میں فیصلہ کرے) کے عنوان کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا خداوند حکیم نے اس عظیم الشان اختلاف کے مٹانے کے لئے ایک عظیم الشان امام کو مبعوث فرمایا ہے جو کہ سب انبیاءؑ کا موعود تھا۔ چنانچہ اب ہزارہا حنفی اور وہابی اور سنی اور شیعہ وغیرھم ایک مسجد میں ایک امام کے پیچھے ایک صف میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور کوئی بھی ایک دوسرے پر نہ اعتراض کرتا ہے اور نہ کسی ایسے جزوی اختلاف میں دوسرے کے فعل کی تقبیح وتحقیر کرتا ہے۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ بجز اس کے کبھی اختلاف مٹ سکتا ہی نہ تھا۔

صلوٰۃ کے بارہ میں بعض کا اپنی رائے پر انحصار:

کیونکہ قرآن مجید میں سب اعمال وعبادات کی جزوی بحث تو تفصیل وار تھی نہیں اور نہ یہ اس کی شان کے موزون تھی۔ ان کی تفصیل کا پتہ سنت وحدیث سے ملتا تھا۔ اور بعض امور کی نسبت ان میں بھی اختلاف تھا تو بعض نے سنت وحدیث کو جواب دے کر محض اپنی رائے اور بناوٹ سے کچھ تجویز کر دیا اور دل بہلانے یا لوگوں کو قابو کرنے کے خیال سے یہ کہہ دیا کہ لوگ تو قرآن مجید کو ترک کر کے سنت وحدیث کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور ہم وہ کرتے ہیں جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ حالانکہ یہ محض خیال ہے قرآن مجید نے وہ تفصیل ہر گز نہیں دی۔ مثلاً اس فرقہ نے جو اپنی نماز شائع کی ہے اس میں سجدہ رکوع وغیرہ افعال اور کچھ آیات قرآنی کا پڑھنا ہے حالانکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ صلوٰۃ وہ ہے کہ جس میں یہ اشیاء ہوں۔ اور نہ لغت عرب میں لفظ صلوٰۃ کے مفہوم میں یہ اشیاء داخل ہیں۔ ہاں اگر داخل ہیں تو ان لوگوں کی عرف میں کہ جن کو وہ گمراہ یقین کرتے ہیں اور ان کی عرف میں بھی تب داخل ہوئی ہیں کہ انہوں نے سنت واحادیث سے صلوٰۃ کی حقیقت پہلے یہ قرار دی اور پھر اس مجموعہ کو صلوٰۃ کے نام سے ذکر کرنا شروع کیا۔ اور نہ قرآن مجید میں یہ مذکور ہے کہ جس صلوٰۃ کا تم کو حکم دیا جاتا ہے اس میں یہ افعال کرو۔ ہاں ان اشیاء کا حکم ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ صلوٰۃ میں ہو۔

مثلاً وَاسْجُدْ کا حکم ہے اور وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ[1] (الاعراف:200) کا بھی حکم ہے۔ پس اگر وَاسْجُدْ کے یہ معنے ہیں کہ صلوٰۃ میں سجدہ کرو تو پھر کیا وجہ ہے کہ وَأْمُرْ کے یہ معنے نہ ہوں کہ صلوٰۃ میں امر بالمعروف کیا کرو۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ انہوں نے صلوٰۃ یا اور اعمال کی تفصیل قرآن مجید سے نکالی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ حدیث وسنت سے متاثر ہو کر اپنی رائے کو دخل دے کر از خود ایک نئی صورت تجویز کی ہے۔ اور لوگوں کو پھنسانے کے لئے یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن مجید اس کی یہ صورت بیان کرتا ہے جو کہ لوگوں نے ترک کر دی تھی۔

---

[1]۔ اور مطابق فطرت باتوں کا حکم دیتا رہ۔ (تفسیر صغیر)

ترجیح کی پیروی کا نتیجہ:

اور بعض نے سنت وحدیث کو اعتبار تو کیا لیکن جہاں پر کچھ اختلاف پایا خواہ دونوں صورتیں جمع بھی ہو سکتی تھیں تو بھی انہوں نے ایک کو ترجیح دے کر اس پر کاربند ہونا چاہا۔ اور پھر ترجیح کے قواعد قرار دے کر ان کے مطابق ایک کو دوسرے پر ترجیح دی یا ایک کو ثابت اور دوسری کو غیر ثابت قرار دے دیا۔

قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ کا کثرت سے ذکر:

اور باوجود یکہ اس ترجیح وغیرہ کی اس کے لئے اقامت (کھڑا کرنا) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کے سننے اور پڑھنے سے ہر ایک عقلمند سمجھ لے کہ مجھے وہ صلوٰۃ ادا کرنی چاہئے جو کہ پہرہ پر کھڑا کرنے کے قابل ہو۔ نہ اس کا کوئی ہاتھ پاؤں لنگڑا یا ناقص اور بے کار ہو، نہ گونگی اور بہری ہو، نہ اندھی، نہ مُردہ یا مُردہ کی مانند ہو۔ پس یہ وجہ اور یہ مقصد ہے کہ جس کے واسطے جہاں کہیں صلوٰۃ کے ادا کرنے کا ذکر آتا ہے تو مُقِیْمُوْنَ اور اَقِیْمُوْا وغیرھما کے ساتھ اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔ چونکہ اللہ عَلِیْمٌ، عَالِمُ الْغَیْب[1] (الانعام:74) ہے وہ پہلے سے جانتا تھا کہ اہل اسلام کسی وقت صلوٰۃ کی اقامت کے خلاف کریں گے۔ یعنی وہ ایسی صلوٰۃ نہیں پڑھیں گے جو کہ فحشاء اور منکر سے روک سکے۔ لہٰذا اللہ جل شانہ نے قرآن مجید میں بہت کثرت کے ساتھ اقامت صلوٰۃ کا ذکر فرمایا ہے۔

اقامت صلوٰۃ ایک مجرب نسخہ:

ناظرین! اللہ تعالیٰ کا کلام بالکل سچا ہے اس میں ایک ذرہ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ پس جب تک آپ صاحبان اپنی صلوٰۃ کو ارشاد الٰہی کے مطابق تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ۔ (العنکبوت:46) نہ پاؤ تب تک نفس کے دھوکہ میں آکر یہ خیال مت کرو کہ ہم اقامت صلوٰۃ کے مؤکد حکم سے عہدہ برآ ہو گئے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن جب اس کے پاس ایسی طاقت بھی موجود ہوتی ہے کہ جس کو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ان کمزوریوں سے بچانے والی فرماتا ہے تو ضرور وہ گرنے سے بچ جاتا ہے لیکن جب

[1] ۔ پوشیدہ۔۔۔ (باتوں) کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

خود بھی کمزور ہو اور بچانے والی طاقت بھی اس کے ہاتھ میں بالکل ندارد ہو تو پھر وہ ضرور ہی گرتا ہے۔ ناظرین میں سے اگر کوئی چاہتا ہے کہ مَیں انسانی کمزوریوں سے بچوں تو وہ صاحب اس مجرب نسخہ یعنی اقامت صلوٰۃ کو ضرور ہی استعمال کریں اور جب تک یہ نسخہ ہاتھ نہ آئے تب تک ہر گز آرام نہ کریں۔

حضرت اقدس علیہ السلام نے اقامت صلوٰۃ ہی کے متعلق ایک مقام پر بیان فرمایا ہے کہ جب کسی شرابی کو ایک گلاس سے وہ نشہ حاصل نہیں ہوتا جو کہ اس کا مطلوب ہوتا ہے تو وہ ایک اور گلاس پیتا ہے اور اس حد تک پیتا جاتا ہے کہ اس کا مطلوب نشہ اور سرور حاصل ہو جاتا ہے۔ پس جب شراب جیسی گندی چیز کے تکرار سے مطلوب سرور حاصل ہو جاتا ہے تو کیا اگر نماز جیسی اعلیٰ چیز کو مطلوب سرور حاصل کرنے کے لئے مکرر کیا جائے تو اس سے مقصود نہ حاصل ہو گا؟ ضرور ہو گا، ضرور ہو گا لیکن کوئی اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے تکرار کرنے والا بھی تو بنے۔ اور حضور علیہ السلام کے خدام میں سے بہت لوگ ہیں جنہوں نے اس نسخہ کو تجربہ میں لا کر دیکھا ہے اور یقیناً اکسیر پایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الخ۔ (البقرۃ:46) اور (اصلی اور مفید اور پہرہ دینے کے قابل اور لذت بخش) صلوٰۃ یقیناً گراں ہوتی ہے لیکن خدا سے ڈرنے اور عاجزی کرنے والوں پر گراں نہیں ہوتی۔

نماز مومن کا معراج ہے:

بلکہ جیسا صحیح حدیث میں آیا ہے ان کے لئے قُرَّةُ الْعَيْنِ (آنکھوں کی ٹھنڈک) ہوتی ہے۔

(سنن النسائی کتاب عشرۃ النساء باب حب النساء حدیث نمبر 3939)

اور اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز ان کی نظر میں لذیذ نہیں ہوتی۔ پھر صلوٰۃ کے بارہ میں آیا ہے کہ یہ مومن کا معراج ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح جلد 2 صفحہ 536 کتاب الصلاۃ حدیث 856 دار الکتب العلمیۃ بیروت 2001ء)

اور یہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ معراج عروج سے ہے یعنی عروج کا ذریعہ تو اس میں شک نہیں کہ صلوٰۃ عظیم الشان عروج کا ذریعہ ہے۔ اور نیز معراج وہ چیز ہے کہ جس میں حضور

سرورِ کائنات علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں اپنے معروضات و مقاصد کو پیش کیا تھا۔ اور چونکہ صلوٰۃ میں مومن بھی اپنے مقاصد کو بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہے لہٰذا اس کو معراج فرمایا ہے۔

اہل اسلام کا نماز کی جان حضور کو چھوڑنا:

لیکن افسوس کہ جس طرح اہل اسلام نے صلوٰۃ کی جان یعنی حضور کو جواب دیا تھا۔ حتیٰ کہ فقہ کی کتابوں میں جہاں صلوٰۃ کے مستحب بھی بیان کئے گئے ہیں وہاں پر حضور جیسی ضروری چیز کا نام تک نہیں لیا گیا۔ اور اگر کسی نے ذکر بھی کیا ہے تو صاف لکھ دیا کہ اسی قدر حضور ضروری ہے کہ اگر مصلی سے سوال ہو کہ کون سی نماز پڑھتے ہو تو وہ صحیح جواب دے سکے حالانکہ یہ وہ حضور نہیں جو کہ صلوٰۃ کی روح ہے۔ تو اسی طرح دعا کو بھی جواب دے دیا ہے جو کہ صلوٰۃ بلکہ سب عبادات کا مغز تھی اور جو کہ حضور کے پیدا کرنے کا بڑا بھاری ذریعہ تھی اور چونکہ موجودہ اہل اسلام کی نماز مغز اور جان سے خالی محض ہے۔ لہٰذا وہ اپنی مقررہ ڈیوٹی کے ادا کرنے (یعنی پہرہ دینے اور فحشاء اور منکر سے روکنے) سے قاصر ہے۔ خداوند تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ صلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ادائے صلوٰۃ کر کے مسجد سے قدم باہر رکھتے ہی منکر و فحشاء میں مبتلا ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ حضور دعا کے وقت پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں نے یا تو دعا کو بالکل جواب دے دیا ہوا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَ الثَّلْجِ وَ الْبَرَدِ (اے اللہ میرے اور میری خطاؤں میں مشرق مغرب کی دوری کر دے۔ اے اللہ مجھے خطاؤں سے ایسا صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ میری خطاؤں کو پانی اور برف اور اولوں سے دھو دے) وغیرہ مسنون دعا پڑھتے ہیں۔

تعوذ، تسمیہ اور سورۃ فاتحہ:

اس کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (مَیں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں دھتکارے ہوئے شیطان سے) اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (مَیں اللہ کے نام کے ساتھ پڑھتا ہوں

جو بن مانگے اور بے کئے دینے والا اور مانگنے اور کرنے پر عمدہ دینے والا ہے) اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ اٰمِیْنَ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہیں جو سب جہانوں کا پیدا کر کے پالنے والا اور بن مانگے اور بے کئے دینے والا اور مانگنے اور کرنے پر بہت عمدہ دینے والا اور دین کے دن (یا یوں کہو کہ جزا کے دن) کا مالک ہے۔ ہم تو تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھی راہ بتا (اور اس پر چلا) جو کہ تجھ سے انعام پانے والوں کی راہ ہے (یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں، صالحوں کی) نہ غضب شدہ لوگوں کی اور نہ گمراہوں کی (یعنی نہ یہود کی اور نہ عیسائیوں کی)

اور اس کے بعد کوئی سورۃ یا قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھتے ہیں۔ اور فاتحہ میں جو اِهْدِنَا الخ کی دعا ہے اس کو بہت توجہ سے اور بعض دفعہ بار بار پڑھتے ہیں اور فاتحہ کے اوّل یا بعد سورۃ کے پہلے یا پیچھے غرض کھڑے ہوتے ہوئے اپنی زبان میں یا عربی زبان میں علاوہ فاتحہ کے اور اور دعائیں بڑی عاجزی وزاری اور توجہ سے مانگتے ہیں۔ اور پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہیں۔

رکوع اور قیام:

اور دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں گھٹنوں کو انگلیاں پھیلا کر پکڑتے ہیں اور دونوں بازوؤں کو سیدھا رکھتے ہیں اور پیٹھ اور سر کو برابر رکھتے ہیں اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ (مَیں اپنے رب کو سب نقصوں سے پاک یقین کرتا ہوں جو کہ بہت بڑا ہے) یا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ (اے ہمارے رب ہم تجھے سب نقصوں سے پاک جاننے کے علاوہ سب تعریفوں والا یقین کرتے ہیں۔ اے اللہ تُو مجھے میری کمزوریوں کے بد نتائج سے اور آئندہ کمزوریوں سے بچا) تین یا تین سے زیادہ دفعہ پڑھتے ہیں۔ اور رکوع کی حالت میں اپنی زبان میں یا عربی زبان میں جو دعا کرنا چاہیں کرتے ہیں۔

اس کے بعد سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ (اللہ سنتا ہے اس کی جو اس کی حمد کرتا ہے) کہتے

ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کھڑے کھڑے رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اے ہمارے رب تیرے ہی لئے سب تعریف ہے) یا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اے اللہ اے ہمارے رب تیرے ہی لئے سب تعریف ہے) یا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى۔ (اے اللہ اے ہمارے رب تیرے ہی لئے سب تعریف ہے اور مَیں تیری بہت تعریف کرنی چاہتا ہوں جس میں برکت ہو جیسا کہ ہمارا رب پسند اور خوش رکھے) یا اس کے سوا اور کوئی ماثور کلمات کہتے ہیں اور اس کے بعد جو دعا کرنی چاہتے ہیں اپنی زبان میں یا عربی زبان میں کرتے ہیں۔

پہلا سجدہ:

اور پھر اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہتے ہوئے نیچے جاتے ہیں اور پہلے گھٹنے اور پھر ہاتھ اور پھر ناک اور پیشانی یا پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے اور پھر ناک اور پیشانی زمین پر رکھ کر سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى (مَیں اپنے رب کو پاک یقین کرتا ہوں جو بہت بلند ہے) یا سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِيْ (اے اللہ اے ہمارے رب تجھے سب نقصوں سے پاک جاننے کے علاوہ بڑی تعریف والا یقین کرتے ہیں اے اللہ میری کمزوریوں کے بد نتائج سے اور آئندہ کمزوریوں سے مجھے بچادے) کم سے کم تین دفعہ یا اس سے زیادہ طاق پڑھتے ہیں۔

اور چونکہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ سجدہ میں بندہ اپنے رب سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ سجدہ میں دعا بہت قبول ہوتی ہے۔

(صحیح مسلم کتاب الصلاۃ باب مایقال فی الرکوع والسجود حدیث نمبر 1083)

لہٰذا سجدہ میں اپنی زبان یا عربی زبان میں بہت دعائیں کرتے ہیں۔ اور سجدہ کی حالت میں اپنے دونوں پاؤں کو کھڑا رکھتے ہیں اور ان کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف متوجہ رکھتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کے درمیان سر رکھتے ہیں اور دونوں بازوؤں کو اپنے دونوں پہلوؤں سے جدا کر کے اور دونوں کہنیوں کو زمین سے اٹھا کر رکھتے ہیں۔ ہاں جب لمبا سجدہ کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو اپنی دونوں کہنیوں کو دونوں گھٹنوں پر رکھ کر سہارا لے لیتے ہیں۔

دو سجدوں کے درمیان قعدہ:

اس کے بعد اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے سر اٹھا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے ہیں اس طور پر کہ داہناں پاؤں کھڑا رکھتے ہیں اور بایاں پاؤں بچھا کر اس کے اوپر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ لیتے ہیں اور بیٹھ کر اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ وَ اھْدِنِیْ وَ ارْفَعْنِیْ وَ اجْبُرْنِیْ وَ ارْزُقْنِیْ۔ (اے اللہ میری کمزوریوں کے بد نتائج سے اور آئندہ کمزوریوں سے بچا اور مجھ پر رحم کر اور مجھے ہر ایک امر کی سیدھی راہ بتا اور مجھے رفعت اور عزت دے اور میرے نقصوں کا تدارک کر دے اور مجھے رزق دے) یا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ تین دفعہ پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی زبان میں یا عربی زبان میں جو دعا چاہتے ہیں وہ مانگتے ہیں۔

دوسرا سجدہ:

اور پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے پہلے سجدہ کی مانند سجدہ کرتے ہیں اور پہلے سجدہ کی مانند اس میں بھی وہی کچھ پڑھتے ہیں جو کہ پہلے سجدہ میں پڑھا تھا اور دوسرے سجدہ میں بھی دعائیں مانگتے ہیں۔

دوسری رکعت:

اور پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سوائے پہلی تکبیر اور سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ اور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے بعینہٖ پہلی رکعت کی مانند دوسری رکعت پڑھتے ہیں۔ اور دونوں سجدوں کے بعد اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جیسا کہ دو سجدوں کے درمیان بیٹھا کرتے ہیں۔ ہاں اس قدر فرق ہوتا ہے کہ پہلے سجدہ کے بعد جب بیٹھتے ہیں تو دونوں ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں پر اس طور پر رکھتے ہیں کہ دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور دونوں کی انگلیاں قبلہ کی طرف سیدھی ہوتی ہیں۔ اور دوسری رکعت کے دونوں سجدوں کے بعد جب بیٹھتے ہیں تو اپنے بائیں ہاتھ کو تو ویسا ہی رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کو ہتھیلی سے ملا لیتے ہیں۔ اور درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ باندھ لیتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان کی انگلی کو سیدھا رکھتے ہیں اور پھر اَلتَّحِیَّاتُ پڑھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَ الصَّلَوَاتُ وَ الطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ

الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (اور یہ کہتے ہوئے اس انگلی کو اٹھا کر اشارہ کرتے ہیں اور پھر ویسی ہی رکھ دیتے ہیں جیسی کہ پہلے رکھی ہوئی تھی) وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ (سب تحفے اور نمازیں اور پاکیزہ اعمال اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اے نبی تجھ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر سلام ہو۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور مَیں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔)

پس اگر تین چار رکعتیں پڑھنی ہوتی ہیں تو اس کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر باقی رکعتوں کو ویسا ہی پڑھتے ہیں جیسا کہ دوسری رکعت کو پڑھا تھا اور پھر ان کو ختم کر کے اخیر میں پھر اسی طریق سے یا دہنے پاؤں کو کھڑا کر کے اور بائیں پاؤں کو دہنے طرف باہر نکال کر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور یہی التحیات پڑھتے ہیں۔

نماز کا اختتام:

اور اگر دو ہی رکعت والی نماز ہوئی تو یہی آخری بیٹھنا ہوتا ہے۔ اور آخری بیٹھنے میں اَلتَّحِیَّاتُ مذکورہ کے بعد پڑھتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (اے اللہ تُو اپنی بڑی رحمت نازل فرما حضرت محمد علیہ السلام پر اور ان کی آل پر جیسی کہ تُو نے رحمت نازل فرمائی ہے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر بے شک توصفت کیا گیا۔ اور بزرگ ہے۔ اے اللہ تُو برکت نازل فرما محمد علیہ السلام پر اور ان کی آل پر جیسی کہ تُو نے نازل فرمائی ہے حضرت ابراہیمؑ اور آپ کی آل پر بے شک تُو صفت کیا گیا اور بزرگ ہے۔)

اس کے بعد پھر کوئی دعا مقرر نہیں بلکہ جو چاہتے ہیں وہ دعا مانگتے ہیں اور ضرور مانگتے ہیں اس کے بعد دہنے طرف منہ پھیر کر کہتے ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ (تم پر اللہ کی رحمت اور سلام ہو) اور پھر بائیں طرف بھی اسی طرح منہ پھیر کر کہتے ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ۔ پس اَللّٰہُ اَکْبَرُ سے نماز شروع ہوتی ہے اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ

اللہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نماز ہے جو کہ حضرت مسیح موعودؑ اور ان کے اہل علم اور مخلص مہاجر اور رات دن ساتھ رہنے والے اصحاب پڑھتے ہیں۔

رفع یدین:

جیسا مَیں نے بیان کیا ہے کہ ہاتھ باندھنے میں اختلاف ہے۔ اور حضرت مسیح موعودؑ اور ان کے مذکورہ بالا خدام فلاں طرز پر باندھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی جاننا چاہئے کہ رفع یدین میں بھی اختلاف ہے (یعنی رکوع کو جاتے ہوئے اور اٹھنے کے بعد نیچے جاتے ہوئے) اور دوسری رکعت کے بعد بیٹھ کر پھر اٹھتے ہوئے تکبیر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھوں کو اس طرح اٹھانا جیسا کہ پہلی تکبیر کے وقت اٹھاتے ہیں) اور اختلاف یہ ہے کہ۔ بعض ان مقاموں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور بعض نہیں اٹھاتے۔ اور حضرت مسیح موعودؑ اور ان کے مذکورہ بالا خدام ان مقاموں پر رفع یدین نہیں کرتے ہاں اگر کوئی ان کے سامنے کرے تو اس پر اعتراض بھی نہیں کرتے۔

باجماعت نماز کی سخت تاکید ہے:

جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی سخت تاکید ہے جہاں تک ہو سکے جماعت کو ترک نہ کیا جائے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مَیں چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کو امام بنا کر نماز پڑھوں اور جو لوگ جماعت میں نہ آئیں خود جا کر ان کو گھروں کے اندر بند کر کے ان کے گھروں کو جلا دوں۔

(سنن الترمذی ابواب الصلاۃ باب ماجاء فیمن سمع النداء... حدیث نمبر 217)

پھر ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک نابینا صحابی نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ مَیں نابینا شخص ہوں۔ اور کوئی میرا ہاتھ پکڑنے والا بھی نہیں اور راستہ بھی دشوار گذار ہے۔ تو کیا مجھے اجازت ہے کہ مَیں گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کروں۔ تو پہلے حضور علیہ السلام نے اجازت دے دی اور جب وہ واپس چلا تو حضورؐ نے پھر اس کو واپس بلا کر دریافت فرمایا کہ کیا تُو آذان کی آواز سنا کرتا ہے۔ اس نے کہا ہاں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا جب آذان سنتا ہے تو پھر تجھے ضرور آنا چاہئے اگرچہ ہاتھ پاؤں کے بل چوپایہ ہو کر ہو۔

(صحیح مسلم کتاب المساجد والمواضع الصلاۃ باب یجب اتیان المسجد علی من سمع النداء حدیث 1486)

اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن سے جماعت کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرنے کی تاکید ثابت ہوتی ہے۔ صحابہ کرام اسی تاکید کو بیان فرماتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں ایسے بیمار بھی باجماعت صلوٰۃ ادا کرتے تھے جن کو دو شخص ان کی بغلوں کے نیچے اپنا کاندھا رکھ کر لاتے تھے اور وہ ان دونوں کے درمیان جھولتے ہوئے آتے تھے۔

(سنن النسائی کتاب الامامۃ باب المحافظۃ علی الصلوات حیث ینادی بھن حدیث 849)

جماعت میں سستی علامات نفاق میں سے قرار دی گئی ہے۔ پس ہر ایک مومن کو اس کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

باجماعت اور انفرادی نماز میں چنداں فرق نہیں ہوتا:

جماعت کے ساتھ جب صلوٰۃ ادا کرتے ہیں تو اس میں اور اکیلے ادا کرنے میں کچھ چنداں فرق نہیں ہوتا۔ فقط اسی قدر فرق ہے کہ باجماعت نماز میں فاتحہ شریف کے بعد فقط امام ہی کوئی سورۃ یا قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھتا ہے اور مقتدی نہیں پڑھتے بلکہ وہ فاتحہ شریف ختم کر کے پھر خاموش ہو کر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اس کے سوا یہ بھی فرق ہے کہ امام سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتا ہے اور مقتدی فقط رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ وغیرہ کہتا ہے۔ اور اس کے سوا اور جو کچھ امام کرتا ہے تو مقتدی بھی کرتا ہے اور جو وہ پڑھتا ہے تو وہ بھی پڑھتا ہے۔ ہاں امام کے بعد فاتحہ پڑھنے میں اختلاف ہے بعض پڑھتے ہیں اور بعض نہیں پڑھتے۔ لیکن حضرت مسیح موعودؑ کا یہی عمل اور یہی حکم ہے کہ امام کے پیچھے اَلْحَمْدُ پڑھی جاوے۔ بلکہ آپ کا حکم ہے کہ جس رکعت میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ہوتی ہی نہیں اِلَّا اس صورت میں کہ مقتدی اسی وقت میں امام سے مل سکا ہے کہ امام رکوع کو چلا گیا ہے یا جانے والا ہے اور وہ اب فاتحہ ختم نہیں کر سکتا تو اس صورت میں مقتدی کی یہ رکعت ہو جاوے گی حالانکہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اور اس کے سوا جس طرح امام کی نماز فاتحہ کے سوا نہیں ہوتی اسی طور پر مقتدی کی بھی بجز فاتحہ کے نہیں ہوتی۔

مقتدی پر امام کی اتباع ضروری ہے:

مقتدی پر امام کی اتباع ضروری ہے پس ہر ایک فعل میں اس کو اس کی پیروی کرنی

چاہئے اور امام سے پیش دستی نہ کرے۔ آنحضرتؐ نے اس امر کی سخت ممانعت فرمائی ہے کہ مقتدی امام سے پہلے سجدہ کو جائے یا اٹھے۔

(صحیح مسلم کتاب الصلاۃ باب النھی سبق الامام برکوع او السجود نحوھما حدیث 961)

فوت شدہ رکعتوں کو کیسے پورا کیا جائے:

یہ صورت اکثر پیش آتی ہے کہ بعض وقت مقتدی اس وقت امام سے ملتا ہے کہ وہ ایک یا دو رکعت پڑھ چکا ہوتا ہے۔ تو چونکہ حکم یہ ہے کہ فرضوں کی پہلی دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے بعد سورہ پڑھی جاتی ہے اور ان کے بعد کی رکعت اور رکعتوں میں فاتحہ کے بعد کوئی سورۃ نہیں پڑھی جاتی۔ لہٰذا ناواقف انسان کو اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اب کیا کیا جائے تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ صحیح حدیث میں آنحضرتؐ سے اس بارہ میں یہ فتویٰ آیا ہے کہ مَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا۔ (جو رکعت تم سے فوت ہو جائے تو اس کو پورا کرو۔)

(صحیح البخاری کتاب الاذان باب قول الرجل فاتتنا الصلاۃ حدیث نمبر 635)

اور ظاہر ہے کہ فوت تو اس کی پہلی رکعت یا رکعتیں ہوئی ہیں۔ پس بموجب ارشاد آنحضرت ﷺ انہی فوت شدہ رکعتوں کو پورا کرے گا اور چونکہ فوت شدہ پہلی رکعتیں ہیں کہ جن میں فاتحہ کے بعد سورۃ بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا مقتدی (کہ جس کو عربی زبان میں اور فقہاء کی اصطلاح میں بجائے مقتدی کے مَسْبُوْقٌ بولتے ہیں) جو رکعتیں امام کے بعد علیحدہ پڑھے گا تو ان میں سورۃ بھی پڑھے گا۔ اور اگر پہلے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ الخ نہ پڑھی ہو جو کہ فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی ہے تو اب وہ بھی پڑھے گا۔ غرض کہ یہ ان رکعتوں کو اسی طرح پڑھے گا کہ جس طرح ایک شخص فرضوں کی پہلی دو رکعتوں کو اکیلا ہونے کی حالت میں پڑھتا ہے۔)

لطیفہ:

لکھا ہے کہ مذکورہ بالا مسئلہ میں فریقین یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے اسی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اَتِمُّوْا کے لفظ سے استدلال کیا کہ اِتْمَامْ کہتے ہیں کہ کچھ حصہ بنا ہوا ہے اور کچھ ناتمام ہے اور اب اس کو بنایا گیا ہے۔ لہٰذا اس سے

ثابت ہوا کہ یہ رکعتیں جو اب پڑھے گا یہ آخری رکعتیں ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے مَا فَاتَكُمْ سے استدلال کر کے فرمایا کہ اِتْمَامُ مَا فَاتَ کا حکم ہے اور چونکہ فوت شدہ پہلی رکعتیں ہیں لہٰذا انہیں کا پورا کرنا ہو گا تو اس سے ثابت ہوا کہ جو رکعتیں اب پڑھے گا وہ پہلی ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔[1]

بلند آواز سے آمین کہنا:

امام کے ساتھ نماز پڑھنے کی حالت میں ایک اور مسئلہ میں بھی بہت کچھ نزاع ہے اور وہ ہے بلند آواز سے آمین کہنے کا۔ لیکن حضرت مسیح موعودؑ کا عمل درآمد (جو کہ ترجیح اور ثبوت کے لئے حجت قاطعہ ہے اور حجت قاطعہ بھی ایسی کہ جس پر ہر ایک عقلمند مومن حلف کھا سکتا ہے کہ خدائے علیم کو یہ پسند ہے) یہی ہے کہ آپ بلند آواز سے آمین نہیں کہتے اور نہ کسی کہنے والے پر کوئی اعتراض کرتا ہے۔

امام کو باجماعت نماز میں رعایت کرنی چاہئے:

جیسا کہ مقتدی پر لازم ہے کہ امام کی اطاعت کرے اور اس پر سجدہ وغیرہ میں سبقت نہ کرے اسی طرح امام کو بھی بعض امور کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس قدر صلوٰۃ یعنی نماز لمبی نہ کرے جو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے اور باجماعت صلوٰۃ ادا کرنے سے ان کو متنفر کر دے۔ پس امام ہونے کی حالت میں نہ تو ان چھ مواضع میں لمبی دعا کرے کہ جن میں صلوٰۃ کے اندر دعا کی جاتی ہے۔ یعنی قیام (کھڑا ہونا)، رکوع، قومہ (رکوع سے اٹھنا)، دو سجدے اور جلسہ (دو سجدوں میں بیٹھنا) اور قعدتین (التحیات کے لئے دو دفعہ بیٹھنا) میں اور نہ سُبْحَانَكَ اللّٰهُ وغیرہ کے عوض جو لمبی لمبی دعائیں ہیں وہ اختصار کے موقع پر شروع کرے۔ اور نہ رکوع سجود میں کثیر التعداد تسبیح پڑھے۔ اور نہ بہت لمبی قرأت پڑھے۔ لیکن جہاں تک اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے تو اکثر امام مسنون قرأت سے بہت کم پڑھتے ہیں۔ اور پھر بھی مقتدی چیخ اٹھتے ہیں کہ فلاں امام بہت لمبی قرأت پڑھتا ہے اور اگر ان مقتدیوں میں سے کوئی خواندہ آدمی ہو تو جھٹ وہ حدیثیں سنانی شروع کر دیتا ہے۔ جو کہ

[1]۔ اور حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ (از مرتب)

قرأت کے لمبا کرنے کی ممانعت میں آئی ہوئی ہیں جیسی یہ حدیث کہ آنحضرتؐ نے حضرت معاذ کو فرمایا تھا کہ یَامُعَاذُ أَفَتَّانٌ[1] (اے معاذ کیا تُو فتنہ ڈالنے والا ہے۔)

(صحیح البخاری کتاب الادب باب من لم یر اکفار من قال ذلک... حدیث نمبر 6106)

پس یاد رکھنا چاہئے کہ مسنون قرأت سے انسان فَتَّان نہیں بنتا جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی اور سنتوں پر عملدرآمد کرنے سے انسان فَتَّان اور گمراہ ہرگز نہیں ہوتا۔ پس مقتدیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے پیارے نبیؐ کی سنت پر عمل درآمد کرنے سے اس قدر نہ گھبرایا کریں۔ اور نہ اس کے کرنے والے پر جلدی سے فَتَّان وغیرہ کا فتویٰ لگایا کریں۔ اور یہ عذر کہ ہم کام کاج والے لوگ ہیں قابل سماعت نہیں ہے۔ آخر آنحضرت ﷺ کے کثیر التعداد مقتدی بھی سب کے سب نہ بیکار اور نکمے تھے اور نہ سب کے سب تندرست ہی ہوتے تھے۔

نمازوں میں رسول کریم ﷺ کون سی سورتیں پڑھا کرتے تھے:

اور نہ یہ بات ہے کہ آنحضرتؐ اوروں کو حکم دیتے ہوں اور آپ نہ کرتے ہوں۔ آج کل تو امام لوگ خود بہت کم قرأت پڑھتے ہیں ہاں ایک صورت میں ان کی قرأت بے شک قابل اعتراض ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت تھی کہ صبح کی نماز میں سب سے زیادہ طویل قرأت پڑھتے تھے مثلاً جمعہ کے دن پہلی رکعت میں سورۂ الم سجدہ اور دوسری میں هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ۔

(صحیح البخاری کتاب الجمعۃ باب مایقرأ فی صلاۃ الفجر یوم الجمعۃ حدیث نمبر 891)

اور اور دنوں میں سورۃ ق اور سورۃ طور۔ اور ان کی مانند طوال[2] مفصل سے اور جو کہ ساٹھ سے سو آیت تک ہوتی ہیں۔

(سنن الترمذی ابواب الصلاۃ باب ماجاء فی القراءۃ فی الصبح حدیث نمبر 306)

---

[1] نوٹ: کتب احادیث میں یَامُعَاذُ أَفَتَّانٌ أَنْتَ کے الفاظ ملتے ہیں۔ (از مرتب)

[2] نوٹ: سورۂ ق سے آخر تک جو سورتیں ہیں ان کو مفصل کہتے ہیں۔ پس ق سے بروج تک کو طوال مفصل کہتے ہیں اور بروج سے والضحیٰ تک اور بعض کے نزدیک لَمْ یَکُنْ تک اوساط مفصل کہتے ہیں اور والضحیٰ سے آخر تک قصار مفصل بولتے ہیں۔ منہ۔ (نوٹ از رسالہ تعلیم الاسلام)

اور اس سے اتر کر ظہر کی نماز میں لمبی کرتے تھے چنانچہ جمعہ کے دن سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھتے تھے۔

(صحیح مسلم کتاب الجمعۃ باب مایقرأ فی صلاۃ الجمعۃ حدیث نمبر 2027)

اور عموماً چالیس آیت سے آیت تک پڑھا کرتے تھے اور عصر اور عشاء میں اس سے کم پڑھتے تھے مثل وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور وَاللَّيْلِ وغیرہ کے جو کہ اوساط مفصل سے ہیں۔

(الدر المنثور جزء 8 صفحہ 483 سورۃ الشمس، جزء 8 صفحہ 488 سورۃ اللیل دار احیاء التراث العربی 2001ء)

اور مغرب کے وقت سب سے کم پڑھتے تھے مثل قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے قصار مفصل سے۔

(سنن ابن ماجہ کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا باب القراءۃ فی صلاۃ المغرب حدیث نمبر 833)

لیکن آج کل امام لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ سب نمازوں میں یکساں پڑھتے ہیں جس سے یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ صبح وغیرہ کی قرأت میں جو مقدار سنت ہے اس میں کمی آجاتی ہے۔ اور مغرب بلکہ عشاء میں بھی مسنون مقدار پر زیادتی بلکہ بعض اوقات بہت زیادتی لازم آتی ہے۔ جس سے علاوہ خلاف سنت کرنے کے مقتدیوں کے اعتراض کے نیچے آجاتے ہیں۔ پس نقص یہی ہے کہ شام اور عشاء میں تو قرأت زیادہ پڑھتے ہیں اور صبح اور ظہر میں مسنون سے کم پڑھتے ہیں۔ اور امام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خاص اپنی ذات ہی کے لئے دعائیں نہ مانگے بلکہ مقتدیوں کو بھی ان دعاؤں میں شریک کرے۔

نماز باجماعت میں امام بنانے کی اصل غرض:

کیونکہ اصل غرض امام بنانے اور باجماعت صلوٰۃ ادا کرنے سے یہ ہے کہ شخصی اغراض پر اس قدر حکام توجہ نہیں کرتے جس قدر قومی مطالب پر توجہ کرتے ہیں۔ اور قومی مطالب کے پیش کرنے کا احسن ترین طریق یہی ہے کہ کسی ایسے شخص کو وہ اپنا وکیل بنادیں جو کہ اس دربار میں قبولیت رکھتا ہو یا کم از کم ان میں سے چیدہ اور منتخب انسان ہو۔ اور نیز اس قوم کا اس کی نسبت یہ خیال ہو کہ سب سے بڑھ کر یہ قومی فوائد اور قومی سعادت کے حصول کا خواہش مند ہے۔

احمدی غیر احمدی امام کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟:

اور علاوہ اور وجوہات کے ایک یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی

جماعت کو سخت تاکید فرماتے ہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے صلوٰۃ ادا نہ کریں۔ کیونکہ غیر احمدی ہونے کے باعث نہ تو احمدی اس کو اپنے مطالب دینی اور دنیوی کے پیش کرنے میں اس کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو دربار الٰہی میں اس سے بڑھ کر کیا، بالکل قبولیت حاصل ہی نہیں ہے اور نہ وہ اس کے فائدہ اور اس کی سعادت دارین کا خواہاں اسے یقین کر سکتا ہے۔ اور نہ حقیقت میں غیر احمدی احمدی کے مقاصد کے حصول کے لئے دعا کر سکتا ہے۔ اسلئے کہ احمدی کے مقاصد تو یہ ہیں کہ احمدی سلسلہ ساری دنیا میں پھیل جائے اور سب مخالف ناکام و نامراد رہ جائیں۔ اور حضرت مسیح موعودؑ پر خداوند کریم اپنی بڑی بڑی اور خاص رحمتیں نازل فرمائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک غیر احمدی خصوصاً وہ جو مخالف ہو کبھی یہ نہیں کر سکتا اور نہ اس دعا کا کبھی اس کو جوش پیدا ہو سکتا ہے جو کہ قبولیت دعا کے لئے از بس ضروری ہے۔ بلکہ وہ تو یہ دعا کرے گا کہ (نعوذ باللہ) خدا اس سلسلہ کو تباہ کرے اور بڑے بڑے مصائب سے ان کو ہلاک کرے۔ وَغَيْرُ ذَالِكَ۔

تو اب احمدی ایسے کو کس طرح اپنا وکیل بنا سکتا ہے کیا وہ مخالف کی مذکورہ بالا دعا پر مقتدی بن کر آمین کہے۔ دنیا کے ادنیٰ ادنیٰ کاموں میں تو کوئی ایسے انسانوں کو وکیل نہیں بناتا کہ جس کی نسبت یہ خیال ہو کہ دربار میں اس کی کچھ عزت نہیں ہے۔ بلکہ حکام اس پر سخت ناراض ہیں یا جس شخص کی نسبت یہ خیال ہو کہ یہ میرا خیر خواہ نہیں بلکہ سخت بدخواہ ہونے کے علاوہ اس کے مقاصد میرے مقاصد کے اضداد ہیں۔ تو کیا دین و دنیا کے سب کے سب مقاصد میں احمدی لوگ ایسے لوگوں کو اپنا وکیل بنالیں؟ ان لوگوں کی عقل پر نہایت افسوس آتا ہے جو کہ باوجود ایسے واضح ترین امور کے پھر بھی کہتے ہیں کہ احمدی غیر احمدیوں کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ اور پھر خود تو حضرت ابو بکرؓ یا کسی اور خلیفہ اور امام کے منکر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور احمدیوں کو کہتے ہیں کہ اس امام اعظم کے منکر کے پیچھے نماز پڑھو کہ جس کی نسبت آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے سب صحابہؓ کو خصوصاً اور باقی امت کو عموماً خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ (وہ مسیح موعود تم میں سے ہی تمہارا امام ہو گا۔)

(صحیح البخاری کتاب احادیث الانبیاء باب نزول عیسی ابن مریم علیہم السلام حدیث نمبر 3449)

تو جس کو آنحضرتؐ نے سب صحابہؓ اور ساری امت کا امام قرار دیا ہے اس کے منکر کے پیچھے کیوں منع نہیں کرتے۔

نماز کے متفرق مسائل:

نماز کے مسائل تو بہت سے ہیں۔ لیکن مَیں نے ان کا ذکر یہاں پر مناسب خیال کیا ہے کہ جو اکثر لوگ دریافت کیا کرتے ہیں یا ان میں عموماً تساہل کیا جاتا ہے یا ان میں اختلاف ہے۔ چنانچہ آگے بھی کچھ متفرق طور پر ایسے مسائل کا ذکر کرتا ہوں۔ نماز میں بعض اوقات انسان کو یاد نہیں رہتا کہ کس قدر رکعتیں میں نے پڑھی ہیں۔ تو ایسی صورت میں اوّل سوچنا چاہئے اگر کسی طرف زیادہ گمان ہو گیا تو وہ کرلے ورنہ کم رکعتیں قرار دے کر باقی اور پڑھ لے۔ اور آخر میں سجدہ سہو کرلے۔ اسی طرح نماز میں جب کوئی بھول ہو جائے مثلاً دو رکعتوں کے بعد بیٹھنا بھول جائے تو اس صورت میں نماز ختم کر کے سجدہ سہو کرلے اور اگر سجدہ بھول جائے تو پھر حکم ہے کہ نماز ختم کر کے یہ سجدہ بھی کرلے اور اس کے بعد سجدہ سہو بھی کرلے۔

سجدہ سہو:

سجدہ سہو یوں ہوتا ہے کہ آخری اَلتَّحِیَّاتُ ختم کر کے سلام پھیر کر یا سلام سے پہلے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر نماز کے دو سجدوں کی مانند دو سجدے کرے اور پھر سلام پھیر دے۔ عام طور پر حنفی لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں امام سے کوئی بھول ہو گئی، اور نماز ختم کر کے کوئی بات ہو گئی، تو پھر نئے سرے نماز پڑھتے ہیں۔ اور باتوں کے بعد سجدہ سہو کافی نہیں سمجھتے خواہ وہ اس سہو ہی کے متعلق ہوں۔

لیکن یہاں پر حدیث کے موافق سہو کے متعلق بات چیت ہو کر بھی نماز کو دہراتے نہیں بلکہ سجدہ سہو کر لیتے ہیں۔ سفر میں سوا مغرب کی نماز کے اور سب نمازیں دو رکعت پڑھتے ہیں۔ اور سنتیں نہیں پڑھتے ہاں وتر پڑھتے ہیں۔ اور سفر میں اکثر اوقات ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔ یعنی ایک ہی وقت میں پہلے ایک اور پھر دوسری نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اور جب جمع کرتے ہیں تو اذان ایک ہی ہوتی ہے اور اقامت دو

دفعہ۔ اور کبھی سخت بارش یا بیماری کی وجہ سے بھی جمع کرتے ہیں۔ جیسی سفر میں جمع کرتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

سفری نماز اور حد سفر:

سفر میں بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ بہت دن ایک مقام پر رہے ہیں اور حضرت سے دریافت کرتے رہے ہیں کہ سفری نماز پڑھیں یا پوری۔ تو حضورؑ نے فرمایا ہے کہ چونکہ ہمارا خود رہنے کا مصمم ارادہ نہیں تو ایسے تردّد کی حالت میں خواہ بہت دن رہیں تو بھی قصر یعنی سفری نماز پڑھنی چاہئے۔ حد سفر کی نسبت بہت دفعہ سوال ہوا ہے تو حضورؑ نے یہی فرمایا ہے کہ شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں جس کو عرف عام میں سفر کہا جاتا ہے اس میں قصر کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضور کا معمول یہی دیکھا ہے کہ گورداسپور، بٹالہ کو جب تشریف لے جاتے ہیں تو سفری نماز پڑھتے ہیں۔

وتروں کی ادائیگی کا طریق:

وتروں کی نسبت بہت سوال ہوتا رہتا ہے کہ ایک پڑھا جائے یا تین۔ اور یہ بھی کہ اگر تین ہوں تو پھر کس طرح پڑھے جائیں۔ تو ان میں حضور کا یہ حکم ہے کہ ایک رکعت تو منع ہے اور تین اس طور پر پڑھتے ہیں کہ دو رکعتوں کے بعد اَلتَّحِیَّاتُ پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں۔ اور پھر اٹھ کر ایک رکعت پڑھتے ہیں اور کبھی دو کے بعد اَلتَّحِیَّاتُ پڑھتے ہیں اور سلام پھیرنے سے پہلے اٹھ کر تیسری رکعت پڑھتے ہیں۔

نماز کے بعد پڑھے جانے والے مسنون کلمات:

صلوٰۃ کے ختم کے بعد مسنون طریق ہے کہ یہ کلمات پڑھے جائیں۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ اَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ۔ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا رَآدَّ لِمَا قَضَیْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْکَ السَّلَامُ وَ اِلَیْکَ یَرْجِعُ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ۔ (اے میرے رب پہلے قصوروں کے بد نتائج سے اور آئندہ قصور سے بچا اور رحم کر اور تُو سب رحم کرنے

والوں سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ مَیں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ مَیں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ مَیں اس اللہ عظیم سے مغفرت چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اے اللہ اس شے کو کوئی روکنے والا نہیں جو کہ تُو دے اور نہ اس کو کوئی دینے والا ہے جس کو تو روک دے اور نہ اس کو کوئی رد کر سکتا ہے جو کہ تُو حکم دے اور نہ کوشش والے کی کوشش اس کو تجھ سے بچا سکتی ہے۔ اے اللہ تُو سلام ہے اور سلامتی تیری طرف سے ملتی ہے اور سلامتی کا مرجع تُو ہی ہے تُو بڑی برکت والا ہے اے جلال اور عزت والے۔)

اور 33 دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہِ (اللہ پاک ہے) اور 33 دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے) اور 33 دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ (اللہ بہت بڑا ہے) اور ایک دفعہ کہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اور اس کا شریک کوئی نہیں ہے اس ہی کے لئے سب تعریفیں ہیں اور وہ ہر ایک چاہی ہوئی بات پر قادر ہے) یہاں پر ہم اسی قدر پر بس کرتے ہیں۔ اور وضو اور اوقات صلوٰۃ پر مناسب موقعوں پر انشاء اللہ بیان ہو گا۔

آیت نمبر 4: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

(حضرت مولانا حکیم الامت) مِنْ کے معنے یہاں پر ہیں بعض اور کچھ کے۔ اور مَا کے ہیں جو یا شے کے یا اس کے۔ اور رَزَقْنَا رزق سے بنایا ہوا لفظ ہے۔ اور رزق کہتے ہیں اس چیز کو جس سے نفع اٹھا سکتے ہوں اور کبھی بمعنے نصیب اور حصہ کے آتا ہے اور کبھی بمعنے مَرْزُوْق یعنی جو چیز رزق کے طور پر دی جاتی ہے اور گاہے اس کے معنے شکر اور ملک کے ہوتے ہیں۔ دوم اور سوم معنوں کی مثال قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔

جیسا کہ فرمایا ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ (الواقعۃ:83) (اور اپنا نصیبہ اور حصہ یہ بناتے ہو کہ تکذیب کرتے ہو) اور فرمایا اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا۔ (یونس:60) (تم بتاؤ تو سہی کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لئے

اتارا ہے پس تم نے خود ہی اس میں سے کچھ تو حلال بنا دیا اور کچھ حرام قرار دیا) اور فرمایا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔ (ھود:7) (اور جو کوئی زمین پر چلنے والی چیز ہے ان سب کا رزق اللہ ہی پر ہے) هُمْ کے معنے ہیں ان کو۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں مذکور قابل ذکر باتیں:

(محمد سرور) اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوا کہ اور جو خرچ کرتے ہیں کچھ اس میں سے جو ہم نے ان کو دیا ہے یا نصیب کیا ہے۔ یہاں پر تین باتیں قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ جو ہم نے دیا ہے اس سے کوئی شے مراد ہے یا عام ہے۔ دوم یہ کہ اس کے خرچ کرنے سے کیا مراد ہے۔ سوم یہ کہ مِنْ کے لفظ کے بڑھانے یا بالفاظ دیگر یہ کہو کہ کچھ کہنے سے کیا مقصد ہے۔ پس واضح ہو کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس انفاق یعنی خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ کا دینا ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد بی بی کو نفقہ دینا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زکوٰۃ اور بی بی کا نفقہ مال سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں سے جیسا یہ ثابت ہوتا ہے کہ انفاق سے مراد زکوٰۃ یا بی بی کو نفقہ دینا ہے۔ ایسا ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مَا سے یعنی جو ہم نے دیا ہے اس سے مال مراد ہے۔ پس اس کے مطابق خداوند کریم نے متقیوں کی تعریف میں یہاں تک تین چیزیں بیان فرمائی ہیں۔

نمبر 1: یہ کہ عقل سے کام لینا جیسا کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ میں ہے۔ نمبر 2: یہ کہ بدنی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ جیسا فرمایا يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۔ نمبر 3: یہ کہ مال جیسی محبوب اور مرغوب چیز کو اللہ جلّشانہٗ کی رضامندی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں چونکہ یہاں پر لفظ مَا مذکور ہے جو کہ عام ہے اور رَزَقْنَا کے معنے نصیب کے ہیں۔ تو پھر الفاظ قرآن مجید سے نہ زکوٰۃ کی تخصیص نکلتی ہے اور نہ بی بی کے نفقہ کی اور نہ مال کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے الفاظ سے کھلا کھلا عموم ثابت ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کہ ہم نے ان کو دیا ہے خواہ وہ بدن انسانی ہو یا قوائے روحانی یا قوائے جسمانی ہوں یا علم و ہنر ہو یا جاہ و حشم ہو یا مال و دولت ہو یا کوئی اور چیز ہو تو وہ ایسی ہر ایک چیز سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں۔

پس اس لحاظ سے نہ انفاق سے مراد کوئی خاص زکوٰۃ یا نفقۂ عورت یا کوئی خاص اور چیز ہے اور نہ مَا (یعنی جو ہم نے دیا ہے) سے خاص مال مراد ہے۔ بلکہ یہ دونوں عام ہیں مَا سے تو وہ ہر ایک شے مراد ہے جو کہ اللہ کریم نے اپنے بندوں کو دی ہے۔ اور انفاق سے ایسی ہر ایک چیز کا اللہ جلّشانہ کی رضامندی کے لئے خرچ کرنا مراد ہے۔

متقی کون ہوتے ہیں:

تو اس صورت میں متقیوں کی تفسیر میں یہاں تک جو بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے خصوصیت کے ساتھ عقل اور پھر عموماً جسم اور جسمانی قویٰ اور پھر اللہ جلشانہٗ کی سب دی ہوئی چیزوں کے فی سبیل اللہ صَرف کرنے کا بیان ہے۔ یعنی متقی وہ ہوتے ہیں جو پہلے خصوصاً عقل کو پھر سارے جسم کو پھر سب اپنی چیزوں کو اللہ کی راہ میں صَرف کرتے اور لگاتے ہیں۔ اور جو حضرت عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ اس صورت میں تمثیل کی قسم سے ہو گا نہ از قسم تفسیر۔ اور حضرت سیدی و مولائی حکیم الامت نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ انفاق کی مثالیں ہیں نہ کہ اس کی تعیین اور تفسیر۔ اور دونوں روایتوں کا مختلف ہونا بھی تمثیل کا مؤید ہے۔

اللہ کی راہ میں قربانی کرنا ہی اصل مقصد ہے:

اب رہا یہ کہ مِنْ کا لفظ کیوں بڑھایا ہے تو واضح ہو کہ مفسروں نے تو لکھا ہے کہ یہ اسراف کی ممانعت کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ یعنی خداوند کریم نے یہ بتایا ہے کہ مال سے یا عام طور پر ہمارے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کرنا چاہئے اور اگر زیادہ یا سارا خرچ کرو گے تو یہ اسراف میں داخل ہو گا۔ اور دوسرے مقام پر خداوند کریم نے بتایا ہے کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں ہے بعض اہل علم کا یہ ارشاد ہے کہ لَا خَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ وَ لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ (یعنی اسراف میں خیر نہیں ہے اور جو امر خیر ہو اس میں اسراف نہیں ہوتا) اور یہ بات بالکل سچ ہے اللہ کی راہ میں مال و جان سب کچھ دینا ہی تو اصل مقصد ہے۔ کون ہے کہ اس کو اسراف میں داخل کرے۔

حضرت ابو بکرؓ کی بے مثال مالی قربانی:

اگر یہ اسراف ہوتا تو جب حضرت ابو بکرؓ نے سب مال ومتاع حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور حضور علیہ السلام کے یہ دریافت فرمانے پر کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے حضرت ابو بکرؓ نے یہ جواب دیا تھا کہ اَللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (یعنی گھر والوں کے لئے بجز اللہ اور رسول کے اور کچھ نہیں چھوڑا۔)

(سنن الترمذی کتاب المناقب باب منہ حدیث نمبر 3675)

تو بجائے اس کے کہ حضرت ابو بکرؓ کو حضور علیہ السلام یہ فرمائیں کہ آپ نے بہت بُرا کیا ہے۔ کیونکہ آپ نے بہت بڑا اسراف کیا ہے اور اسراف کرنے سے قرآن مجید نے سخت ممانعت فرمائی ہوئی ہے۔ یہ فرمایا کہ اَلْفَرْقُ بَیْنَکُمَا کَمَا بَیْنَ کَلِمَتَیْکُمَا۔[1]

(تفسیر روح البیان جلد اوّل سورۃ البقرہ آیت 220 صفحہ 346 مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ بیروت 2003ء)

(یعنی اے ابو بکر و عمر تم دونوں میں اسی قدر فرق ہے جو کہ تم دونوں کی ان دو باتوں میں ہے کہ عمر کہتا ہے کہ گھر کے لئے نصف مال چھوڑا ہے اور ابو بکر کہتا ہے کہ گھر والوں کے لئے اللہ اور رسول کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا) پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ اسراف نہیں اور نہ اس کی ممانعت کے لئے مِنْ لایا گیا ہے۔

قرآن مجید راہنمائی کا ذریعہ:

بلکہ اصل بات وہی ہے جو کہ مَیں نے پہلے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر میں بیان کی ہے اور اس کے بیان کے لئے حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی وہ تقریر نقل کی ہے جو کہ آپ نے ایام جلسہ میں فرمائی تھی اور وہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ الخ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اور کتابوں اور مذہبوں کی غایت تو یہی ہے کہ اپنے پیروؤں کو ایسے متقی بنا دیں کہ بعض امور غیب پر ایمان لے آئیں اور صلوٰۃ کو قائم کرتے رہیں اور کچھ تھوڑا بہتا دیتے رہیں۔ لیکن قرآن مجید ہی ایک وہ کتاب ہے جو کہ ایسے متقیوں کو آگے اور کمالات کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایمان بالغیب سے شہود تک اور اقامت صلوٰۃ سے

[1] نوٹ: تفسیر روح البیان میں الفاظ یہ ہیں مَابَیْنَکُمَا مَابَیْنَ کَلَامَیْکُمَا۔ (از مرتب)

گذر کر اس حد تک پہنچتے ہیں کہ ان کی صلوٰۃ خود قائم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی گرتی ہی نہیں کہ وہ اس کو قائم کریں۔ اور اللہ جَلَّشَانُہٗ کے دیئے ہوئے سے کچھ تھوڑا بہت دینے سے بڑھ کر اس حد تک پہنچتے ہیں کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ الخ(الاحزاب:73)(یعنی ہم نے آسمان وزمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تھی اور انہوں نے نہ اٹھائی اور ڈر گئے لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا) کے مطابق جو مال ودولت اور جاہ وحشم اور عزت وآبرو اور جسم اور جسمانی قویٰ وغیرہ اشیاء جو کہ خداوند کریم نے اس کے پاس امانت رکھی تھیں۔ وہ ان کو اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۔(النساء:59)(بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ تم سب امانتیں امانت رکھنے والوں کو واپس دے دو) کے مطابق پورا پورا واپس اللہ جَلَّشَانُہٗ کو دے دیتا ہے اور کچھ بھی ان سے اپنے پاس نہیں رکھتا تا کہ امانت میں خیانت نہ ہو۔

تو جب ان آیات کریمہ کا یہ مطلب ہوا جو کہ مَیں نے بیان کیا ہے اور مَیں نے پہلے بتایا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی جلسہ کے موقع پر ان آیات کی یہی تفسیر فرمائی تھی۔ تو پھر ظاہر ہے کہ مِنْ اس لئے نہیں لایا گیا کہ سب دینا اسراف ہونے کے باعث منع ہے بلکہ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہاں پر جو متقی کی تفسیر کی گئی ہے اس میں اللہ کریم کے دیئے ہوئے سے کچھ ہی خرچ کرنا داخل ہے نہ سب کا سب خرچ کر دینا۔

آیت 5: وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ۔

(م)وَاو کے معنے ہیں اور، اَلَّذِیۡنَ کے ہیں جو، یُؤۡمِنُوۡنَ ایمان لاتے ہیں یالائیں گے اور ایمان کی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔

بَاء کے معنے ہیں ساتھ اور پر، مَا کے معنے ہیں جو۔

اُنۡزِلَ اتارا گیا، اِلٰی طرف، كَ تیرے، مِنۡ سے، قَبۡل پہلے، كَ تجھ، اٰخِرَةِ پیچھے آنے والی، هُمۡ وہ، یُوۡقِنُوۡنَ یقین کرتے ہیں یا کریں گے۔

ترجمہ:

اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا تیری طرف۔ اور اس پر جو اتارا گیا تجھ سے پہلے اور پیچھے آنے والی پر وہ یقین کرتے ہیں۔ اور یقین کہتے ہیں علم کو اور شک کے دور ہونے کو اور خبر پر نفس کے ثابت اور مطمئن ہونے کو اور باقی مذکورہ بالا الفاظ میں سے کوئی لفظ زیادہ قابل تشریح نہیں ہے اور جو تھا اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔

یہاں پر اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ اور مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ سے کیا مراد ہے۔ اور پیچھے آنے والی کیا چیز ہے کہ جس پر یقین کرنا ضروری ہے۔

مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ اور مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ سے کیا مراد ہے:

(**حضرت حکیم الامت** سَلَامُ اللّٰہِ وَرَحۡمَتُہٗ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیۡہِ) مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ سے وہ سب وحی مراد ہے جو کہ خداوند کریم نے حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم پر نازل فرمائی ہے خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ اور مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وہ کل وحی الٰہی ہے جو کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم سے پہلے انبیاء پر نازل کی گئی۔ اور کل اس لئے لیا ہے کہ مَا کا لفظ جبکہ یہ موصولہ یعنی بمعنے جو ہو تو عام اور سب کو شامل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ سب انبیاءؑ کا ہم کو علم نہیں جیسا کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡكَ۔ (المؤمن:79) (اور بعض انبیاء سے وہ ہیں جو کہ ہم نے تیرے آگے بیان نہیں کئے) تو پھر جو کچھ ان پر اتارا گیا ہے اس کا ہمیں

کب علم ہو سکتا ہے۔ پس لفظ مَا کو موصولہ یعنی بمعنے جو قرار نہیں دینا چاہئے۔ اس کو مصدریہ قرار دیا جائے یعنی جو کہ مابعد کے فعل کو مصدر بنا دیتا ہے جس سے فعل اور باقی اسماء بنائے جاتے ہیں تاکہ ترجمہ یہ ہو جائے۔ اور جو ایمان لاتے ہیں تیری طرف اتارے جانے پر اور تجھ سے پہلے اتارے جانے پر اور پیچھے آنے والی پر یقین کرتے ہیں۔ اور اس صورت میں ان کا ردّ ہو گا جو کہ نبوت کے اور وحی کے منکر ہیں جیسے کہ برہمو لوگ ہیں کہ نبوت کے صریح منکر ہیں۔

اس آیت میں کون سے مومن مراد ہیں:

اور عبد اللہ بن عباسؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ اور بہت سے اور صحابہؓ نے فرمایا ہے کہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ سے مراد وہ مومن ہیں جو کہ عربوں میں سے ہوئے ہیں اور وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ الخ سے مراد اہل کتاب کے مومن ہیں۔ اور مجاہد تابعیؒ نے کہا ہے کہ ان دونوں سے عام مومن مراد ہیں۔ اور تفسیر ابن کثیر میں اسی کو پسند کیا گیا ہے۔ اور الَّذِيْنَ کا مکرر لانا اور پہلے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور دوسرے میں عَلٰى هُدًى کہنا اور پھر دوبارہ اُولٰٓئِكَ لانا اور نئی خبر کا لانا صحابہؓ کے قول کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ ان سب باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دو متغائر عبارتوں سے متغائر لوگ مراد ہیں۔ لیکن سورۂ بقرہ کے آخر میں جو یہ آیا ہے کہ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ الخ[1] (البقرۃ:286) تو یہ مجاہد کے قول کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سب کا مومن بہ یکساں ہے۔

اَلْاٰخِرَةِ سے مراد:

اور اٰخِرَة چونکہ قرآن مجید میں بعض مقام پر دار یا یوم ملا کر لایا گیا ہے جیسا کہ آتا ہے وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ۔ (یوسف:110) (اور ضرور پیچھے آنے والی حیاتی کی حویلی بہتر ہے) اور اَلْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (البقرۃ:9) (پیچھے آنے والا دن) اور دار آخرۃ اور یوم آخر سے مراد حشر کا وقت ہے۔ لہٰذا مفسروں نے یہاں پر اکیلے اَلْاٰخِرَةِ سے بھی حشر کا وقت اور قیامت ہی مراد رکھا ہے۔ لیکن مَا قَبْلَ پر یعنی مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ پر نظر کرنے سے

[1] ۔ یہ سب (کے سب) اللہ اور اس کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

حضرت خاتم النبیینؐ کی دوسری بعثت ثابت ہوتی ہے جس کا کہ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ..... وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ۔(الجمعۃ:3تا4)(اللہ وہ ہے کہ جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا ہے جو کہ ان سے ہے کہ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے کھلی کھلی گمراہی میں تھے اور ان آخرین میں بھی اس رسول کو بھیجے گا جو اب تک ان پہلوں کے ساتھ نہیں ملے) میں ذکر آیا ہے۔ کیونکہ یہاں سے صاف صاف ثابت ہے کہ آنحضرتؐ ایک دفعہ تو اُمّی لوگوں میں مبعوث ہوئے یعنی بھیجے گئے اور ایک دفعہ ان پیچھے آنے والوں میں بھی مبعوث ہوں گے جو کہ ان پہلوں کے ساتھ نہیں ملے۔ پس ما قبل پر نظر کرنے سے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ لوگ پیچھے آنے والی بعثت نبی کریمؐ پر یقین کرتے ہیں۔

یہ تو اس صورت میں ہوں گے جب ما قبل میں یعنی مَا اُنْزِلَ میں مَا مصدر یہ لیا جائے یعنی دوسرے ترجمہ کے لحاظ سے یہاں پر بھی بعثت مراد ہو گی جیسی کہ مَا اُنْزِلَ سے بعثت مراد ہے۔ اور اگر مَا موصولہ بمعنے جو بنایا جاوے یعنی پہلا ترجمہ لیا جائے تو اس سے وحی مراد ہے جو کہ پیچھے آنے والی ہے جیسے کہ مَا اُنْزِلَ سے وحی مراد ہے۔ پس پہلے ترجمہ کے لحاظ سے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ کے معنے یہ ہوں گے اور وہ لوگ پیچھے آنے والی وحی پر یقین لاتے ہیں۔

صحابہ رسول ﷺ کا علم اور خیالات وسیع تھے:

(محمد سرور) ناظرین یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر کسی کے معلومات کا دائرہ تنگ ہوتا ہے تو اسی قدر اس کے خیال کا جولان گاہ بھی تنگ ہوتا ہے۔ صحابہ کرام کا چونکہ علم بہت وسیع تھا اس لئے ان کے خیالات بھی بڑی وسعت رکھتے تھے۔ دو مختلف مسئلوں پر عملدرآمد رکھنے والے صحابہؓ نہ ایک دوسرے کے مسئلہ کی تردید کرتے تھے اور نہ ایک دوسرے کو بُرا یا گمراہ کہتے تھے بلکہ وہ ان سب مسائل کو حق اور سب صحابہ کو حق پر چلنے والے یقین کرتے تھے۔

صحابہؓ میں سے بعض رفع یدین کرتے اور بعض نہ کرتے تھے عَلٰی ھٰذَا الْقِیَاسِ بعض اونچی آمین کہتے اور بعض آہستہ۔ بعض بآواز بلند بِسْمِ اللّٰہِ پڑھتے اور بعض خفیہ۔ لیکن کبھی نہ ایسا ہوا اور نہ سنا یا پڑھا گیا ہے کہ ایک نے دوسرے کے مسئلہ کی تردید کی ہو یا ایک نے دوسرے کو گمراہ قرار دیا ہو۔ حالانکہ شرعی مسائل کی وہ بہت قدر کرنے والے تھے۔ اسی طرح ایک صحابی ایک آیت کے ایک معنے کرتا تھا اور دوسرا دوسرے اور تیسرا تیسرے اور بہت بہت اقوال جمع ہو جاتے تھے لیکن نہ کبھی ان میں نزاع ہوا ہے اور نہ ایک نے دوسرے کے معنوں کی تردید کی ہے۔ اور نہ اپنے معنوں کی ترجیح ثابت کی ہے اور نہ دوسروں کو گمراہ اور غلط کار قرار دیا ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ سے قبل زمانہ کی حالت:

لیکن جب قرآن مجید کی پیشگوئی کے مطابق وہ زمانہ آ گیا کہ دین اور قرآن مجید کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ تو پھر لوگوں میں پہلے علم کم ہوا اور پھر وسعت خیال نے جواب دیا اور ایک ایک مسئلہ پر اڑنے لگے۔ اگر دونوں طرف رسول اکرمؐ کی حدیث بھی موجود ہو تو بھی جب تک ایک کو ترجیح دے کر دوسرے کو رد نہ کر لیں تب تک تو آرام ہی حرام ہونے لگا۔ پھر تو یا رفع یدین ہو یا نہ ہو دونوں کا جمع تو محال معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح جہاں کہیں کسی آیت میں ایک سے زیادہ معنے مروی ہوں تو جب تک ایک کو ترجیح نہ دے لیں اور دوسرے کو رد نہ کر لیں تب تک چین نہیں۔ ہاں چونکہ حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ زمانہ نبوت ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی صاحبؒ اپنے مکتوبات میں اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دوسرے ہزار کا مجدد ہونے کی وجہ سے مَیں پہلے بزرگوں سے افضل ہوں۔ کیونکہ صدی کے مجدد سے ہزار کا مجدد ایسا ہی افضل ہوتا ہے جیسا کہ اولوالعزم رسول اور انبیاء سے افضل ہوتے ہیں۔ حالانکہ جیسے ان کے مقامات سلوک واحوال تصوف ہوتے تھے ایسے آپ کے اور آپ کے مریدوں کے ہرگز نہیں تو اس سوال کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک راہ ولایت ہے اور ایک راہ نبوت ان دونوں میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ اور مقامات سلوک اور احوال کی تفصیل راہ ولایت میں ہوتی ہے اور راہ نبوت میں مطلقاً نہیں ہوتی اور چونکہ ہم سے پہلوں کا زمانہ آنحضرتؐ کے زمانہ سے

بھی دور تھا اور مسیح موعودؑ کے زمانہ سے بھی دور تھا لہٰذا ان کے مقامات واحوال سلوک میں تفصیل ہوتی تھی۔ اور ہمارا زمانہ چونکہ زمانۂ مہدی کے بہت قریب ہو گیا ہے اس لئے ہمارے زمانہ کے سلوک میں وہ تفاصیل باقی نہیں رہیں بلکہ راہ نبوت کی طرح اجمال آ گیا ہے۔ اور پھر آنحضرتؐ بھی حضرت مسیح موعودؑ کو نبی اللہ کا خطاب دیا ہے۔

(صحیح مسلم کتاب الفتن واشرط الساعۃ باب ذکر الدجال وصفتہ ومامعہ حدیث 7373)

آنحضرت ﷺ کی بعثت ثانیہ:

اس سے بھی ثابت ہے کہ آپ کا زمانہ زمانۂ نبوت ہے اور قرآن مجید سے بھی ثابت ہے کہ مسیح موعودؑ کی بعثت آنحضرتؐ کی بعثت ثانی ہے جیسا کہ مَیں نے ابھی مختصراً سورۂ جمعہ کی ابتدائی آیات سے ثابت کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت ثانیہ ہو گی۔ رہا یہ کہ وہ کب ہو گی تو چونکہ اس کے بعد آتا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ (الجمعۃ:6) (ان لوگوں کی مثال کہ جن پر تورات لادی گئی تھی) جس میں یہود کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ امت محمدیہ میں یہودی تب ہی ہوں گے کہ مسیح موعود بھی ہو لہٰذا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت ثانیہ مسیح موعود کے ذریعہ سے پوری ہو گی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اور اور بہت سے صحابہؓ نے آپ کی وفات پر یہ خیال کیا تھا کہ آپ کو یہ عارضی موت آئی ہے اور پھر دوبارہ مبعوث ہو کر فلاں فلاں کام کریں گے اس کی جڑھ بھی یہی تھی کہ قرآن مجید سے ان کو یقین تھا کہ آنحضرتؐ کی بعثت ثانیہ ضرور ہی ہو گی لیکن اس کی کیفیت نہ جانتے تھے۔ لہٰذا اس کے اس طور پر پورا ہونے کا خیال کر لیا۔

حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ زمانۂ نبوت ہے:

غرض چونکہ یقیناً یہ زمانہ زمانۂ نبوت بلکہ آنحضرتؐ کا زمانہ ہے لہٰذا حضرت مسیح موعودؑ کی برکت سے پھر بار ثانی حضور مسیح موعود علیہ السلام کے خدام میں پہلے کی مانند وسعت خیال دکھائی دینے لگی ہے۔ یہاں تک کہ وہی رفع یدین اور آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کہ جن پر فریقین میں سخت نزاع تھا اور مقدمات اور قتل ومقاتلہ تک نوبتیں

پہنچ چکی تھیں۔ ایک مسجد میں ایک امام کے پیچھے دو مقتدی دو متخالف عمل کرتے ہیں اور کوئی ایک دوسرے پر اعتراض تک نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک آیت کے اگر بیسیوں معانی ان کی نظر کے سامنے آجائیں تو وہ حدیث کے مطابق ان کو ظہر اور بطن سمجھ کر جمع کر لیں گے اور کوئی تضاد نہ خیال کریں گے۔ مثلاً جہاں کہیں قرآن مجید میں قیامت کے احوال مذکور ہوتے ہیں وہاں پر بطور پیشگوئی کسی نہ کسی زمانہ کے متعلق کچھ دنیوی حالات بھی ضرور ہی بیان ہوتے ہیں۔ تاکہ جب اس زمانہ میں وہ احوال دنیوی معرض ظہور میں آکر اس پیشگوئی کو صادق کر دیں تو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے یہ قیامت کا بیّن ثبوت ہو۔ کیونکہ جب دو عظیم الشان آئندہ کے واقعوں کی خبر ایک ہی کلام میں دی گئی۔ اور دونوں میں سے ایک تو معرض ظہور میں آچکا جس کو لوگوں نے بچشم خود مشاہدہ کر لیا تو اس سے یقین کرنا پڑے گا کہ وہ دوسرا واقعہ بھی ضرور ہی ہونے والا ہے جو کہ اس مخبر نے اس عبارت میں بیان کیا تھا۔

مثلاً صحابہ کے زمانہ کے متعلق یہ پیشگوئی قیامت کے ساتھ شامل کی تھی کہ ان کو باغ اور نہریں اور وسیع ملک اور عجیب وغریب محل اور غلام اور لونڈیاں ملیں گیں اور وہ تختوں پر مسند نشیں ہوں گے۔ تو جب یہ سب واقعات چشم دید ہو گئے تو اس سے یقین کرنا پڑا کہ قیامت بھی ضرور ہے۔ تو ایسی آیات سے قیامت اور دنیا دونوں کے واقعات لئے جاتے ہیں اور عوام کی طرح اعتراض نہیں کیا جاتا۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 5 بابت ماہ نومبر 1906ء صفحہ 169 تا 196)

تفسیر کا اصول:

پس ناظرین اس کو خوب یاد رکھیں کہ جہاں پر ہم صحابہ کرام کے مختلف اقوال لکھیں یا بہت سے معانی لکھیں اور کسی ایک کی تردید نہ کریں وہاں پر وسعت خیال سے کام لیا کریں۔ بعض مقام ایسے بھی ہوں گے کہ ہم لکھیں گے کہ حضرت اقدس نے یہ معنی بیان فرمائے ہیں اور مولوی صاحب نے فلاں معنی بیان کئے ہیں۔ اور ہم یہ کرتے ہیں تو نعوذ باللہ منہ اس کا یہ مطلب نہ ہو گا کہ حضرت اقدس کی تفسیر کا حضرت مولانا خلاف کر رہے ہیں اور نہ یہ کہ ہم مولانا صاحب کی تفسیر کے خلاف بیان کر رہے ہیں بلکہ ان کو ظہر اور بطن

یقین کرنا چاہئے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے لیلۃ القدر سے ضرورت امام کا زمانہ لیا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتادیا ہے کہ اس سے لیلۃ القدر کی نفی نہ سمجھ لینا جو کہ اہل اسلام میں مشہور ہے۔ بلکہ ایک کو ظہر اور دوسرے کو بطن سمجھنا چاہئے اور کثرت معانی سے عظیم الشان فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کے دو معنی:

قرآن مجید ہر ایک زمانہ کے لئے ہدایت اور ہتھیار ہے اور کثیر المعانی ہونے کے باعث دو رُخی تلوار کا کام دیتا ہے۔ مثلاً یہ ایک آیت کریمہ ہے وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ (المائدۃ:68) اور عربیت اور قواعد کے لحاظ سے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تجھے معصوم رکھے گا یعنی بچائے گا لوگوں سے یعنی تیرے مخالف لوگ خواہ کچھ ہی تدبیر کریں خواہ اپنا سارا زور لگائیں پر تجھے نہ قتل کر سکیں گے اور نہ ناکام کر سکیں گے۔ اور ہم خود ان کے شر سے تجھے بچائیں گے۔

اور دوم یہ کہ اللہ تجھے معصوم رکھے گا لوگوں میں سے یعنی تیرے مخالف بڑے بڑے زور لگائیں گے کہ تجھے قصور وار قرار دیں۔ لیکن دنیا کے سب لوگوں میں سے ایک تجھ کو حقیقی اور سچا معصوم ثابت کر دکھائیں گے اور پھر ممکن نہیں کہ کوئی تجھے قصور وار ٹھہرا سکے۔ اب یہ دو معنی ہیں اور دونوں سے جدا جدا دو مقصد ثابت ہوتے ہیں۔ اوّل سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ بیشک سچے نبی ہیں کہ جس طرح آپ نے قبل از وقت ان جوشیلے اور خونخوار ہزاروں وہزار دشمنوں کے سامنے آگ لگا دینے اور پرخاش پر آمادہ کر دینے والی خبر سنائی تھی۔ بعینہٖ ویسی ہی پوری ہوئی اور وہ ہزاروں ہزار مکذب ہرگز ہرگز اس کو جھٹلا نہ سکے۔ اگرچہ انہوں نے ناخنوں تک بھی زور لگایا اور بہت کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور ظاہری اسباب اور قرائن بھی ان کے معین اور مؤید تھے۔ لیکن سب نے منہ کی کھائی اور کچھ بھی نہ بن پڑا۔ اور آخر وہ سلامتی کا شہزادہ اور عصمت کا تاجدار کامیابی کے تخت پر بیٹھا اور وہ موذی دشمن ہلاک وتباہ اور سرنگوں ہوئے۔ جس سے بیّن طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ بیشک آنحضرتؐ خدا کے برگزیدہ اور اس کے فرستادہ ہیں۔ اور یہ

پیشگوئی عَالِمُ الْغَیْب[1] (الانعام:74) اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ[2] کی ہے جو کہ اس کے ان افعال کے مطابق ہے کہ جن سے شان ایزدی کا جلال نمایاں ہے۔

اور دوسرے معنوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خاتم النبیینؐ سب انسانوں سے جیسے کمالات میں ممتاز ہیں ایسے ہی معصوم ہونے میں بھی ممتاز اور یگانہ ہیں۔ پس پہلے معنوں سے جیسی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور رسالت کا اعلیٰ درجہ کا بیّن اور قوی تر ثبوت پایا جاتا ہے ایسے ہی دوسرے معنوں سے عیسائیوں کے ایک عظیم الشان دجل کی پردہ دری اور ان کے عظیم الشان اعتراض کی جڑ کاٹی ہے۔

عیسائیوں کا ایک دجل:

اور وہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے دھوکا دینے کے لئے جیسی کہ ان کی عادت ہے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام معصوم نبی ہے۔ اس میں یہ بیان ہے کہ قرآن مجید نے سب نبیوں کے گناہ ذکر کئے ہیں یہاں تک کہ خود حضرت محمد صاحب کو بھی گنہگار بتلایا ہے۔ ہاں بیگناہ اور بے قصور اگر بتایا ہے تو ایک حضرت مسیح کو بتایا ہے۔ اور چونکہ نبی کی ضرورت محض شفاعت یعنی سپارش کے لئے ہے کیونکہ سب انسان فطرتی طور پر گناہ گار ہیں اور شفاعت اور سفارش وہی کر سکتا ہے یا اسی کی قبول ہو سکتی ہے جو کہ بے گناہ ہو۔ پس چونکہ بموجب تعلیم قرآن سب انبیاء (نعوذ باللہ منہ) گناہ گار ہیں اور ایک مسیح ہی بے گناہ اور معصوم ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق اور کسی نبی کے ماننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک خاص مسیح ہی کو ماننا چاہئے۔ یہ ہے پادری صاحبوں کا دجل اور افتراء لیکن چونکہ قرآن مجید عَالِمُ الْغَیْبِ خدا کا کلام ہے اور خداوند اس کی حفاظت ظاہری اور باطنی کا خود ذمہ وار بنا ہے اور قیامت تک اس نے محفوظ رہنا ہے۔ لہٰذا اس علیم و حکیم خدا نے ان سب حملوں کے دفاع اس میں رکھے ہوئے ہیں۔ جو ہر ایک زمانہ کے مخالف اس پاک کتاب پر کریں گے۔ چنانچہ خداوند کریم نے وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ فرما کر اس دجل کو بھی پاش پاش کر دیا۔

---

[1]۔ پوشیدہ... (باتوں) کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ جو چاہتا ہے اسے کر کے رہتا ہے۔ (تفسیر صغیر)

فقط ایک معصوم حضرت محمد ﷺ:

کیونکہ اور کوئی ایسا نہیں کہ جس کو قرآن مجید نے یا اور کسی آسمانی کتاب نے معصوم کہا ہو فقط ایک حضرت محمد رسول اللہؐ ہی ہیں کہ جن کو خداوند کریم صریح الفاظ میں معصوم فرماتا ہے۔ اور نیز فرماتا ہے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں تیری معصومیت کو میں خود ثابت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ جب لاہور میں ایک بڑے پادری نے اس دجل سے اہل اسلام پر مجمع عام میں حملہ کیا اور اہل اسلام اس حملہ سے بہت تنگ آ گئے۔ اور قریب تھا کہ پادری لوگ اپنی فتح کا نقارہ بجاتے کہ حضرت مسیح موعود کے ایک صادق خادم مفتی محمد صادق صاحب (سَلَّمَهُ اللّٰهُ وَرَقَّاهُ اِلٰی مَا یُحِبُّ وَیَرْضٰهُ[1]) نے اس آیت مذکورہ کو ہاتھ میں لے کر اس پادری پر حملہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دجل کا پردہ سب پر کھل گیا۔ اور وہ خود اس قدر شرمندہ ہوا کہ برسر اجلاس کہنے لگا کہ مسلمانوں نے مجھے دھوکا دیا ہے کہ قرآن مجید میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں صاف لکھا ہوا ہے کہ حضرت محمد صاحب معصوم ہیں۔

معانی کثیرہ کے فوائد:

پس معانی کثیرہ کے ایسے ایسے فائدے ہوتے ہیں۔ مَیں نے یہ طول طویل تقریر محض اس غرض کے لئے کی ہے تا کہ ناظرین میں سے کسی کو یہ ابتلاء نہ ہو کہ فلاں صاحب تو یہ معنی کرتے ہیں پس فلاں کون ہوتا ہے کہ ان کے خلاف معنی کرتا ہے۔ پس ناظرین خوب یاد رکھیں کہ اسکو خلاف نہیں کہتے بلکہ اس کو ظہر اور بطن کہتے ہیں۔ اور یہ قرآن مجید کے کمالات سے ہے۔ جب یہ تمہید ناظرین نے سن لی تو اب کسی پر یہ گراں نہ گذرے کہ حضرت حکیم الامت نے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (البقرۃ:5) کے یہ معنی کیوں کئے ہیں اور آنحضرت کی دوسری بعثت پر (یا) پیچھے آنے والی وحی پر یقین کرتے ہیں۔ حالانکہ فلاں فلاں صاحب اس کے معنی قیامت کے کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت مولانا صاحب نعوذ باللہ منہ نہ قیامت کے منکر ہیں۔ اور نہ ان کا یہ ارشاد ہے کہ یہاں پر قیامت کے معنی کرنے نہ

[1]۔ اللہ اسے سلامت رکھے اور اسے بلند کرے اس طرف جس کو وہ پسند کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے۔ (از مرتب)

چاہئیں۔ بلکہ ان کا یہ منشاء ہے کہ قیامت کے معنی تو ہیں لیکن ما قبل کی مناسبت سے یہاں پر یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

غرض کہ اس اصل کو یاد رکھنے سے بہت سے اعتراض رفع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اب میں ناظرین کو ایک اور بات بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مُتَّقِیْنَ کی تفسیر میں اگر اجمالی ایمان کافی ہے تو پھر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کافی تھا اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ الخ (البقرۃ:5) کا ذکر بے ضرورت اور بے فائدہ ہے اور اگر تفصیلی ایمان کی ضرورت ہے تو پھر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کا ذکر کرنا بے وجہ ہے جو کہ اجمالی ایمان پر دالّ ہے۔ اور یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ الخ ناکافی ہے کیونکہ یہ ایمان باللہ اور ایمان بالملائکہ کو بظاہر شامل نہیں ہے۔ اگر کسی حیلہ سے شامل بنایا جائے تو پھر ایمان بالغیب کا ذکر زائد از حاجت ہے۔ الغرض کہ ایمان اجمالی کی صورت میں ایمان بالغیب کا ذکر کافی ہے۔ اور ایمان بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وغیرہ کے ذکر کا بے جا ہونا لازم آتا ہے۔ ایمان تفصیلی کی صورت میں ایمان بِمَآ اُنْزِلَ وغیرہ جو مذکور ہے وہ ناکافی ہے۔ اور ایمان بالغیب کے ذکر کا بے محل اور بے ضرورت ہونا لازم آتا ہے۔

پس بعض مفسرین نے تو اس سوال کو عُقْدَہ لَا یَنْحَلّ[1] خیال کر کے اس کو چھیڑا تک نہیں ہے اور بعض کے کلام سے اس کا حل یوں پایا جاتا ہے کہ۔ متقی دو قسم کے تھے ایک اہل عرب کے اور دوم اہل کتاب کے پس یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے ساتھ قسم اوّل کو بیان کیا ہے اور یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ الخ کے ساتھ قسم دوم کو بیان کیا ہے اور یہاں پر نہ اجمال مد نظر ہے اور نہ تفصیل ملحوظ ہے تا کہ یہ اعتراض وارد ہو بلکہ دونوں قسم کا بیان اور امتیاز ملحوظ تھا اور وہ اس قدر سے حاصل ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ نہیں کہ اوّل سے قسم اوّل اور دوم سے قسم دوم مراد ہو بلکہ دونوں سے عام متقی مراد ہیں۔ ہاں دو طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جب کسی امر کو پہلے مجمل طور پر بیان کر کے بعد

[1]۔ ایسی پیچیدہ بات جس کا کوئی حل نہ ہو۔ (از مرتب)

میں مفصل بیان کیا جائے تو یہ بیان بہ نسبت اس کے بہت عمدہ ہوتا ہے کہ ابتداءً ہی مفصل بیان کیا جائے۔ لہٰذا یہاں پر پہلے عام متقیوں کو مجمل بیان کیا اور پھر ان کی پہلی تفسیر کی کسی قدر تفصیل کر دی۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے کون سے متقی مراد ہیں:

لیکن حضرت اقدس کی اس تقریر سے (جو کہ آپ نے جلسہ دسمبر پر ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے متعلق فرمائی تھی) صاف ثابت ہوتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے وہ متقی مراد ہیں جو کہ باتفاق سب غیر مذاہب متقی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک مذہب میں چند امور غیب پر ایمان لانا ہوتا ہے اور کچھ پوجا ہوتی ہے اور کچھ خرچ کرنا ہوتا ہے اور ان امور کا کاربند بنانا اور ان کی علت غائی ہوتا ہے۔ اور جس کو یہ امور حاصل ہوں وہ ان کی اصطلاح میں متقی ہوتا ہے اگرچہ جس طرح ہر ایک مذہب میں خرچ کرنے کا جدا طریق مقرر ہے اور پوجا کی اور اور صورت ہے۔ اسی طرح وہ امور غیب بھی جدا جدا ہیں کہ جن پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے لیکن یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ ایسے جامع کلمات ہیں جو کہ سب کو جدا شامل ہیں۔ اور اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ الخ سے وہ متقی مراد ہیں کہ جن میں خاص وہ ایمان ہوتا ہے جو کہ غیر اہل کتاب کیا، اہل کتاب کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ اہل اسلام سے مخصوص ہے۔

بجز اہل اسلام کے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہے:

کیونکہ مشرکین عرب نہ تو آخرت پر یقین رکھتے تھے اور نہ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ پر اور نہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ پر۔ اور اہل کتاب میں سے اکثر یہود اگرچہ آخرت پر یقین کا دعویٰ رکھتے تھے لیکن مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی انجیل پر اور مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ یعنی قرآن مجید پر ایمان نہ لاتے تھے۔ اور نصاریٰ اگر آخرت کے یقین کے علاوہ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی انجیل پر ایمان کا دعویٰ رکھتے تھے پر مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ یعنی قرآن پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ پس مشرکین عرب میں یہ تینوں امر مفقود تھے اور اکثر یہود میں اخیر تھا اور پہلے دو نہ تھے۔ اور نصارے میں اخیر دو تھے اور پہلا نہ تھا۔ بلکہ ان تینوں کا جامع بجز اہل اسلام کے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہے۔

رہا یہ کہ ان دو قسم کے متقیوں کو یہاں پر کیوں ذکر کیا ہے تو حضور علیہ السلام کی تقریر مذکور سے واضح ہوتا ہے کہ اس بات کے لئے ان کو ذکر کیا ہے کہ غیر متقی تو کیا عام مذاہب کے متقی بھی قرآن مجید کی ہدایت کے محتاج ہیں بلکہ جو اہل اسلام کی اصطلاح میں ہیں وہ بھی قرآن مجید کی ہدایت کے محتاج ہیں۔ اور قرآن مجید ان سب کے لئے ہدایت ہے اور یہ احتیاج دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

قرآن مجید سب کے لئے ہدایت ہے:

اوّل تو اس وجہ سے کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے مسلّم مذہب کے لحاظ سے اپنے آپ کو غیر متقی یقین کرتے ہیں۔ وہ تو عموماً اپنے آپ کو کسی مُزَکّی اور ھَادِیْ کے محتاج یقین کرتے ہیں۔ اور جو اپنے مسلم مذہب کے لحاظ سے اپنے آپ کو متقی یقین کر بیٹھتے ہیں۔ تو پھر وہ اپنے آپ کو کسی مزکی اور ھادی کا محتاج خیال نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو بالکل نجات یافتہ اور حاوی کمالات انسانی یقین کر کے بالکل مستغنی ہو بیٹھتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں یہود و نصارے کے ایسے اقوال واعتقاد بیان فرمائے گئے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

تھوڑے دن کی بات ہے کہ میں اپنے مہربان دوست جناب ماسٹر عبد الرحیم صاحب کی شادی پر شہر بریلی میں گیا تھا تو وہاں پر ایک مولوی صاحب کے ساتھ حضرت مسیح موعود اور مہدی مسعود علیہ السلام کے بارہ میں بات چیت ہوئی اور اثنائے گفتگو میں ہمارے کسی ساتھی نے یہ کہا کہ مولانا اگر علماء کی سب باتیں بالکل صحیح ہیں جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو پھر یہ دعوے تو سب فرقے کرتے ہیں تب تو چاہیے کہ مسیح اور مہدی نہ آئے کیونکہ اس صورت میں اس کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو وہ مولوی صاحب زور سے بولے کہ ہمیں تو بیشک کسی مسیح اور مہدی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور میں حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہدایت میں ہمیں مہدی اور مسیح کی کوئی ضرورت نہیں۔

اوّل تو ہم خود اللہ کے فضل سے حق کو جانتے اور اس پر چلتے ہیں اور اگر شاذ و نادر کسی مسئلہ میں تحقیق درکار ہو تو حرمین شریفین کا فتویٰ کافی اور بس ہے اور مسیح اور مہدی

کے ذرہ بھر بھی ضرورت نہیں۔ بھلا مہدی اور مسیح کون ہے کہ جس کی اہل سنت و الجماعت کو ضرورت ہو۔

ہر فرد قرآن کریم کی ہدایت کا محتاج ہے:

پس چونکہ اِتَّقَا کے مدعی ہی ایسا خیال کرتے ہیں لہٰذا اللہ کریم نے بتا دیا کہ سب مذاہب کے متقی کہلانے والے یہاں تک کہ جو لوگ اہل اسلام کی اصطلاح کے مطابق متقی ہیں وہ بھی قرآن مجید کی ہدایت کے محتاج ہیں۔ اور انسانی کمالات کے خواہ کسی مرتبہ پر انسان پہنچ جائے پھر بھی وہ قرآن مجید کی ہدایت کا محتاج ہے اور قرآن مجید اس کو آگے کے اور کمالات غیر متناہیہ کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔ پس اگر وہ ایمان بالغیب تک پہنچا ہے تو قرآن مجید شہود کی ہدایت کرتا ہے اور اگر وہ اقامت صلوٰۃ تک پہنچا ہے تو قرآن مجید اس کو صلوٰۃ قائمہ کی ہدایت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ کریم کے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کرتا ہے تو یہ اس کو سب امانت اللہ کی طرف واپس کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور اگر وہ آگے پیچھے کی سب وحیوں اور سب کلام الٰہی پر ایمان لا چکا ہے تو قرآن مجید اس کو اس بات کی ہدایت کرتا ہے۔ کہ اس پر بھی کلام الٰہی نازل ہو اور خدا اس سے بھی بولے اور کلام کرے۔ غرض کہ کوئی مرتبہ نہیں کہ جس کے آگے کی ہدایت قرآن مجید میں نہ ہو۔

اور **دوم** اس وجہ سے تاکہ اور سب کتابوں سے قرآن مجید کی عظمت ظاہر کرے کیونکہ اور سب کتابیں اسی قدر کمال رکھتی ہیں اور ان کی علت غائی یہی ہے کہ اپنے متبع کو اس معنے سے متقی بنائیں کہ وہ چند امور غیب پر ایمان لائے اور صلوٰۃ کو قائم کرتا رہے اور اللہ کریم کے دیئے ہوئے سے کچھ کچھ صرف کرے اور بس۔ اور اس سے آگے کی ان میں کوئی ہدایت نہیں ہے۔ بخلاف قرآن مجید کے کہ ایسے متقیوں بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ کے متقیوں کو آگے کی ہدایت کرتا ہے لہٰذا آگے فرمایا ہے۔

آیت 6: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(محمد سرور) اُولٰٓئِكَ جمع کا اسم اشارہ ہے جس کے معنی ہیں وہ۔ علیٰ کے معنے ہیں پر۔ اور هُدًى بمعنی ہدایت ہے اور ہدایت کے معنی تفسیر فاتحہ میں مفصل بیان ہو چکے ہیں۔ اور عربی کا قاعدہ ہے کہ لفظ پر ال نہ لانے اور تنوین پڑھنے سے کمال اور عظمت کے معنے بعض محل پر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہاں هُدًى پر بھی تنوین (اخیر پر جو نون پڑھا جاتا ہے اور لکھا ہوا نہیں) تعظیم کے لئے ہے یعنی بڑی ہدایت۔ مِنْ کے معنی سے کے ہیں۔

ربّ سے مراد:

اور رَبّ اس کو کہتے ہیں جو پیدا کر کے کمال کو پہنچانے والا اور پرورش کرنے والا ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید نے خود فرمایا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (البقرۃ:22تا23) (اے لوگو تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو جو تم سے پہلے ہوئے ہیں۔ تاکہ تم بچو (اور) جس نے تمہارے فائدہ کے لئے زمین کو فرش بنایا ہے اور آسمان کو بنا اور بلندی سے پانی اتارا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تمہارے رزق کے لئے کچھ پھل نکالے ہیں۔)

پس اس تفسیر الٰہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ربّ وہ ہے جو پیدا کرے اور اس کے بعد ضروریات بقاء عطا کرے اور زبان اردو میں چونکہ ان معنوں کو ادا کرنے والے مختصر الفاظ نہیں ملے لہٰذا عام طور پر ربّ کا ترجمہ پالنے والا کرتے ہیں۔ اور یہ مشکل بہت سے اسماء الٰہیہ میں پیش آئی ہے جس سے یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ عموماً اسماء حسنیٰ کے معنی پورے بیان نہیں ہوتے۔

هُمْ۔ جمع مذکر کی ضمیر ہے جس کے معنی ہیں ان کے۔ لیکن اردو کے محاورہ کے مطابق اس کے معنے اپنے کے کئے جاتے ہیں۔ واو کے معنے ہیں اور، اُولٰٓئِكَ اور هُمْ دونوں کے ملنے سے ان کے معنے ہوتے ہیں وُہی، ال کے معنے یہاں پر کامل کے ہیں۔

اور مُفْلِحُوْنَ مُفْلِحٌ کی جمع ہے اور مُفْلِحٌ فلاح سے بنا ہوا ہے اور فلاح اور ھُدًی کی نسبت حضرت مولانا صاحب نے بیان فرمایا ہے۔

(حکیم الامۃ) فلاح کہتے ہیں مقصود کے پانے سے ظفریاب اور فائز ہونے کو اور اس کی تفصیل سورہ لقمان کی ابتداء میں بقاء و غنی اور عزت کے ساتھ فرمائی ہے اور حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ھُدًی کی تفسیر نور اور استقامت کے ساتھ فرمائی ہے۔

(م) پس ساری آیت کا ترجمہ یہ ہوا۔ یہ عالیشان لوگ عظیم الشان ہدایت (یا نور واستقامت) پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی کامل طور پر کامیاب (مظفر و منصور) ہونے والے ہیں۔

قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظھر اور بطن ہوتا ہے:

ناظرین جیسا کہ میں نے اس سے پہلے آیات کی تفسیر میں بتایا تھا کہ قرآن مجید کے لئے ظھر اور بطن ہوتا ہے اسی طرح اس آیت کریمہ کے لئے بھی ظھر اور بطن ہے اور دونوں کے لحاظ سے بڑے اعلیٰ درجہ کے مقاصد پر یہ آیت کریمہ مشتمل ہے۔ اگر اہل اسلام اسی ایک آیت کریمہ کے ظھر یا بطن کو مد نظر رکھتے تو یہ چند امور ان کو حاصل ہوتے۔

اوّل: یہ کہ ان کو سچے مذہب کی شناخت کا ایسا گُر ملتا کہ جس کے ذریعہ ایک اور ایک دو کی مانند سچے مذہب کی صداقت پر یقین حاصل ہوتا جو کہ سب خوبیوں کی جڑھ اور سب کمالات کا مرکز ہے اور کہ جس کے کھونے کے باعث آج کل سب رذائل کے مستجمع بنے ہوئے ہیں۔

دوم: وہ کسی فرشتہ صورت اور ابلیس سیرت کے پھندے میں پھنس کر اپنے دین کو تباہ نہ کرتے جیسا کہ آج کل کوئی کسی کے پیچھے لگا ہوا ہے اور کوئی کسی کی امت بنا ہوا ہے۔

سوم: یہ کہ جس طرح کہ شیطان بعض کو دھوکا دے کر ان کے قابل نفرت اور باعث نفرین عقائد اور اعمال واخلاق کو ان کی نظر میں مزیّن کر دکھاتا ہے۔

پس اس سے ان کو کبھی دھوکا نہ دے سکتا اور پھر کبھی ایسا نہ ہوتا کہ وہ قبر پرستی اور پیر پرستی وغیرہ گندے سے گندے شرک وبدعت کو حصول نجات اور وصول کمالات اسلامیہ کا ذریعہ قرار دیتے۔ اور اس کی ترغیب دیتے اور تعلیم و تلقین کرتے اور نہ کبھی ایسا ہوتا کہ

نیکی کے ادنیٰ ترین مقام پر پہنچ کر اپنے آپ کو اعلیٰ مقام پر یقین کر کے خود پسندی کے شدید دھکے سے پھر مادی ظلمات کے گڑھے میں واپس آ پڑتے۔ سو چونکہ یہ سب بہت ضروری اور اعلیٰ درجہ کے مفید مقاصد ہیں کہ جن سے اس زمانہ کے عام اہل اسلام ناواقف اور محروم ہیں۔ لہٰذا میں آپ صاحبان کو ان مقاصد عالیہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

پس آپ غور اور توجہ سے سنیں انشاء اللہ میں پہلے اس آیت کریمہ کے ظہر اور بطن کو بیان کروں گا اور پھر بتاؤں گا کہ یہ مقاصد اس ظہر اور بطن سے کس طرح حاصل ہوتے ہیں۔ ظہر اس کا تو یہ ہے کہ جو لوگ متقی ہوتے ہیں (یعنی ایمان بالغیب بلکہ مَآ اُنْزِلَ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ [1] اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِہٖ پر ایمان رکھتے اور صلوٰۃ کو قائم کرتے اور اللہ کے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ کرتے ہیں) چونکہ خدائے علیم و حکیم کی اس جامع کتاب پر ان کا ایمان ہوتا ہے۔ لہٰذا جو کام وہ دین و دنیا کا کرنا چاہتے ہیں تو ضرور اس حکیم کتاب کی ہدایت کے مطابق کرتے ہیں اور اس کے مطابق کرنے کے وقت چونکہ ان کو یقین کامل ہوتا ہے کہ ہم خداوند علیم و حکیم کی ہدایت کے مطابق کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے ارادے میں کسی قسم کا تذبذب نہیں ہوتا اور نہ کوئی خلجان ہوتا۔ اور نہ اللہ کریم کی رضا اور عدم رضا اور نہ نجات کے مرتب ہونے اور نہ ہونے اور نہ کامیاب اور ناکام ہونے میں کوئی تردّد ہوتا ہے۔

ہدایت حاصل کرنے کا طریق:

پس اس یقین سے کہ ہم اپنے رب کی ہدایت پر ہیں۔ علیٰ بصیرت ہوتے اور پوری استقامت رکھتے ہیں۔ اور اللہ کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور کبھی اس سے ناامید نہیں ہوتے۔ اور کامیابی کو ہر ایک انسان دل و جان سے چاہتا ہے اور وہ اللہ کریم کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو وہ دیتا ہے تو پھر کوئی نہیں کہ اس کو روک سکے۔ یہ تو کامیابی کی اصل جڑھ ہے۔ اور عالم اسباب پر نظر کرنے سے اس کے حاصل کرنے کا یہ طریق ہے کہ وہ راستہ اختیار کیا جائے جو کہ حقیقت میں اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ پس چونکہ یہ متقی اپنے رب کی ہدایت پر چلنے والے ہوتے ہیں اور ان کا ربّ علیم و حکیم ہے اور

[1]۔ جو خاتم النبیینؐ پر اتارا گیا۔ (از مرتب)

کامیابیوں کے ذریعوں اور طریقوں کو وہی جاننے والا ہے۔ اور جو ذریعہ اس نے بتایا ہوتا ہے اسی پر وہ چلتے ہیں اور اس پر چلنے کے باعث اللہ رحیم چاہتا ہی ہے کہ یہ کامیاب ہو جائیں۔ کیونکہ یہ اس کو اسی طریق سے تلاش کر رہے ہیں جو کہ اس نے ان کو بتایا تھا لہٰذا یہ لوگ ضرور ہی مظفر و منصور اور کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اس کا ظہر۔

اور اس کا بطن وہ ہے جو کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تقریر **جلسہ** سے ظاہر ہوتا ہے کہ اور کتابوں کی مانند اسی قدر نہیں کہ قرآن مجید بھی بمعنے مذکور متقی بننے کی ہدایت کرتا ہو بلکہ یہ تو ایسے متقیوں کو بھی آگے کے لئے ہدایت کرتا ہے۔ اور پھر آگے کے لئے بھی اسی قدر پر اس کی ہدایت بند نہیں کہ مَآ اُنْزِلَ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِہٖ الخ پر فقط ایمان لایا جاوے۔ بلکہ یہ اس امر کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ تم اپنے پر نازل ہونے کا بھی ایمان رکھو اور یہ کہ فلاں طریق سے نازل ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف کے ایک دوسرے مقام میں آیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔ (حٰمٓ السجدۃ:31 تا 33) (بیشک جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے یعنی جو کہ سب نقصوں سے پاک اور سب صفات کمال کا جامع ہے۔ پھر ایسے رب کے ساتھ جیسا معاملہ رکھنا چاہئے انہوں نے ویسا ہی رکھا اور اس پر استقامت دکھائی تو ان پر ضرور فرشتے نازل ہوتے ہیں یہ وحی اور الہام لے کر مت خوف یا غم کرو اور تم کو خوشخبری ہو اس جنت کی کہ جس کا تم کو وعدہ دیا گیا تھا۔[1] ہم تمہارے دوست اور مددگار ہیں۔ اس قریب زندگی میں اور پیچھے آنے والی میں۔ اور تمہارے لئے اس میں ہو گا جو تمہارے جی چاہیں گے اور تمہارے لئے اس میں وہ سب کچھ ہو گا جو تم مانگو گے۔ یہ ناشتہ ہے مہمانی کا بدنتائج اور بدیوں سے بچانے والے اور محنتوں اور دعاؤں پر اچھا دینے والے سے۔)

[1] نوٹ: قرآن مجید میں متقیوں کے لئے دو جنتوں کا وعدہ ہے ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں چنانچہ فرمایا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ (رحمٰن:47) (اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے تو اس کے لئے دو جنت ہیں۔ (نوٹ از رسالہ تعلیم الاسلام)

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قصص اور پھر خصوصاً ان کے بعد یہ فرمانا کہ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (الانعام:85)(اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں محسنوں کو) اور إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (یوسف:89)(اللہ صدقہ دینے والوں کو یقینا (بڑا) اجر دیتا ہے)[1] اور اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (الصافات:82)(بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا) یا اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف:25)(بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں سے تھا) اور پھر یہ فرمانا کہ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۔ (النساء:70)(اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے پس وہ ان کے ساتھ ہوں گے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین کے ساتھ۔ اور یہ بڑے اچھے رفیق ہیں) اور ان کی مانند اور بہت سے مقامات قرآنی اس امر کے مثبت ہیں کہ اللہ کریم جیسا پہلے اپنے مقرب بندوں سے کلام کرتا رہا ہے اسی طرح اب بھی اپنے مقرب بندوں سے کلام کرتا ہے اور کرے گا۔

تو جب قرآن مجید اس امر کی ہدایت کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ جن کو یہ شرف حاصل ہو گا کہ اللہ کریم ان سے ہم کلام ہو ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہوں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بہت سی مشکلات میں اور ایسے امور میں کہ جن میں اوروں کو غلطی لگی ہو اللہ کریم اپنے خاص کلام سے ان کو ہدایت کرتا ہے لہٰذا وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پاتے ہیں اور دوم اس وجہ سے کہ ان کے ہدایت پر ہونے کا بیّن ثبوت پایا جاتا ہے کیونکہ جب سب دنیا سے بالخصوص خداوند ان کو یہ امتیاز اور فخر عنایت فرماتا ہے کہ وہ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ[2] (ھود:46) ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ[3] (الرحمٰن:28) ان سے ہم کلام ہوتا ہے تو

---

[1] رسالہ میں كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں تصدق کرنے والوں کو) آیا ہے جبکہ قرآن میں یہ الفاظ نہیں آئے۔ آیت اور ترجمہ تفسیر صغیر کے مطابق کر دیا ہے۔ (از مرتب)

[2] ۔ سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر (بہتر اور درست) فیصلہ کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

[3] ۔ جلال اور عزت والا۔ (تفسیر صغیر)

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان کا چال چلن، ان کے عادات و اخلاق بلکہ ان کی ہر ایک اداء اس سَمِیْعٌ وَّبَصِیْرٌ[1] اور عَالِمُ الْغَیْبِ[2] (الانعام:74) کو پسند ہے۔ اور پھر چونکہ اللہ کریم ان سے ہمکلام ہو کر مشکلات کے وقت ان کی راہ نمائی اور دستگیری کرتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ مظفر و منصور اور کامیاب ہوں۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ کہ ظہر اور بطن میں اسی قدر فرق ہے کہ اوّل میں عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ سے یہ مراد ہے کہ قرآن مجید میں جو جو ہدایتیں ہیں وہ ان کی رب کی ہدایتیں ہیں اور ان پر چلنے والے وہی متقی ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا ہے۔ اور بَطْنٌ میں اس سے یہ مراد ہے کہ مشکلات دینی اور دنیوی کے وقت اللہ کریم اپنے خاص تازہ کلام کے ساتھ ان کی راہ نمائی اور دستگیری فرماتا ہے لہٰذا وہ ان مشکلات میں مظفر و منصور اور کامیاب ہوتے ہیں اور ان دونوں کو اگر انسان ملحوظ اور مد نظر رکھے تو مذکورہ فوائد اس کو ضرور حاصل ہوں گے۔ مثلاً جب انسان کو یہ بات مد نظر ہو کہ سچا مذہب وہ ہوتا ہے کہ جس کے اتباع میں سے مخلصین کے ساتھ خدا ہم کلام ہوتا ہے اور خدا کا کلام اپنے ساتھ بیّن ثبوت رکھا کرتا ہے تو وہ صاف دریافت کر سکتا ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے کونسا مذہب اللہ کریم کی مرضی کے مطابق ہے اور یہ بھی کہ فِیْ زَمَانِنَا کون شخص پیر و مرشد پکڑنے کے قابل ہے اور یہ بھی کہ میں اس اعلیٰ اور مطلوب مقام تک پہنچا ہوا ہوں یا نہیں۔

لیکن افسوس ہے تو یہی کہ اہل اسلام نے قرآن مجید کی ہدایتوں کو پس پشت ڈال دیا ہے جیسا کہ یہود نے مسیح علیہ السلام کے وقت تورات کی ہدایتوں کو ردّیات میں پھینک دیا تھا۔ ورنہ تو یہ ایک ہی آیت کریمہ قیامت تک کے خدا کے فرستادوں اور برگزیدوں کی شناخت کے لئے کافی تھی اور حضرت مسیح موعود کی شناخت میں ان کو ہرگز وہ ٹھوکر نہ لگتی جو کہ یہود کو حضرت مسیحؑ کی معرفت میں لگی تھی اور یہود کی مانند کبھی انکار پر کمر نہ باندھتے۔

---

[1]۔ بہت سننے والا اور دیکھنے والا۔ (از مرتب)

[2]۔ پوشیدہ... (باتوں) کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

فائدہ:

اللہ کریم کا ہمکلام ہونا یہ اس کا فضل ہے کسب یا اجر نہیں۔ لہٰذا اصل مطلوب مولیٰ کریم کی رضامندی اور خوشی ہے اور یہ امور اس رضامندی کے فروعات ہیں اور رضامندی اس سے حاصل ہوتی ہے کہ اللہ کریم اور اس کے رسول کریم کی اطاعت میں ان کی ہدایت کے مطابق وہ سب اشیاء اللہ کریم کو واپس دی جائیں جو کہ اس نے انسان کے پاس امانت رکھی ہیں اور اسی واپس کرنے کو فَنَا فِی اللہِ کہتے ہیں۔

آیت 7: إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

إِنَّ کے معنی ہیں بے شک، ضرور، تحقیق۔

الَّذِيْنَ کے معنی ہیں جو۔

كَفَرُوْا۔ كُفْرٌ سے بنا ہوا ہے اور اس کے متعلق مولانا صاحب نے فرمایا ہے۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) كُفْرٌ۔ کاف کی پیش کے ساتھ ایمان کی ضد ہے اور كَفْرٌ کاف کی زبر کے ساتھ ڈھانپنے کو کہتے ہیں اور یہاں پر اوّل ہے اور دوسرے کی مثال یہ آیت کریمہ ہے كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ (الحدید:21) (اس بارش کی مانند کہ جس کا اگانا کسانوں کو تعجب میں ڈالنا ہے۔) پس یہاں پر كُفَّارَ۔ كَفْرٌ سے ہے جو ڈھانپنے کے معنوں میں ہے کیونکہ کسان بھی تخم کو زمین میں پوشیدہ کر دیتا ہے اور نیز حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔ (نہ ہو جاؤ میرے بعد مسلح کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو۔)

(صحیح البخاری کتاب المغازی باب حجۃ الوداع حدیث نمبر 4403)

کیونکہ مسلح شخص اپنے بدن کو ہتھیاروں سے ڈھانپ دیتا ہے اور دجال اکبر کے متعلق جو حدیث میں آیا ہے کہ اس کی پیشانی پر ك۔ف۔ر۔ ہو گا یہ بھی اسی سے ہے۔ کیونکہ دلائل قاطعہ سے ثابت ہے کہ وہ عیسائی ہیں اور وہ اپنی پیشانی اور آنکھوں کو اپنی ٹوپی کے چھتّے سے ڈھانپتا ہے اور قدرتی بات ہے کہ انگریزی میں اس چھتّے کو کَوَر کہتے ہیں جو کہ عربی كَفَرَ سے بدلا ہوا ہے۔ اور لبید شاعر نے کہا ہے فِيْ لَيْلَةٍ كَفَرَ النُّجُوْمَ غَمَامُهَا (ایسی رات میں کہ بادل نے اس کے ستاروں کو چھپایا ہوا تھا۔

اور جو كُفْرٌ بمعنی انکار اور ایمان کی ضد ہے۔ اس کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ وہ انکار کرنا ہے اس کا کہ خواص و عوام میں اس کی نسبت مشہور ہو کہ رسول اللہ ﷺ اس کو لائے ہیں یا یہ کہ اس کا انکار کرنا ہے جو کہ دلیل قطعی کے ساتھ ثابت ہے۔ پس جس پر

اجماع ہو اور اس کے بارہ میں نص ہو اس کا انکار کفر ہے۔ اور کفر بڑے چھوٹے بھی ہیں اور علماء نے لکھا ہے کہ ایک کفر انکار ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص شرع کو جانتا ہی نہیں۔

دوم کفر جُحُوْدٌ ہے جیسا اس کا کفر کہ وہ جانتا ہے اور پھر انکار کرتا ہے۔ اور **سوم** کفر عناد ہے جیسا اس کا کفر جو کہ اقرار کرتا ہے اور اعتقاد نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں بیان کافروں کی نشانیاں:

اور اللہ کریم نے قرآن مجید میں بہت کچھ بیان فرمایا ہے کہ کافر کون ہے اور وہ کیا کہتے یا کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ کچھ ان امور سے جو قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں مع پتہ پارہ ورکوع کے یہاں پر بیان کئے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور رسولوں اور پیچھے آنے والے دن کا انکار کرنا 17/5، یہ کہنا کہ نہ ہم قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے۔ 10/22، الذِکْرُ جب آگیا تو پھر اس کا انکار کرنا۔ 19/24، کتاب اللہ کا کچھ حصہ ماننا اور کچھ نہ ماننا۔ 10/1، اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور اللہ کے رسولوں کا اور اللہ کریم کو قرض حسنہ دینے سے انکار کرنا۔ 7/6، لِقَاءُ اللہِ کا انکار کرنا اور اللہ رحیم کی رحمت سے نا امید ہونا۔ 15/20، یہ کہنا کہ جب ہم اور ہمارے آباء اجداد مٹی ہو جاویں گے تو کیا ہم پھر نکالے جاویں گے۔ 2/20، یہ کہا کہ وہ گھڑی ہم پر نہ آوے گی۔ 7/22، اللہ اور اس کے فرشتوں اور رسولوں اور جبرئیل اور میکال کی عداوت۔ 12/1، اِبَاء اور استکبار کرنا۔ 4/1، آیات اللہ کی تکذیب اور ان سے استکبار۔ 3/14، یہ کہنا کہ اس قرآن کی طرف مت کان لگاؤ اور شور وغوغا مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔ 18/24، جب حق آئے تو اس کو سِحْرٌ مُّبِیْنٌ کہنا۔ 11/22، آیات اللہ میں مجادلہ کرنا۔ 6/24، یہ کہنا کہ اللہ نے اس مثال سے کیا ارادہ کیا ہے۔ 3/1، یہ کہنا کہ قرآن مجید تو پہلے لوگوں کے فسانے ہے اور لوگوں کو اس سے منع کرنا اور خود اس سے دور ہونا۔ 9/7، مَآ اَنْزَلَ اللہُ کے ساتھ حکم نہ کرنا۔ 11/6، اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنی۔ 1/6، جلد آنے والی زندگی اور اشیاء سے محبت کرنی اور بھاری دن کو چھوڑ دینا۔ 20/29، نبی کا بندہ بننا اور فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانا۔ 16/3، مسافروں اور

غازیوں کی نسبت کہنا کہ اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ 8/4، اپنے رب کے ساتھ کسی کو برابر کرنا۔ 8/7، یہ کہنا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہے۔ 7/6، اللہ کے لئے اس کے عباد سے جزو قرار دینا اور اللہ کے لئے کھلا کھلانا شکر ہونا۔ 7/25، عزیر کو اللہ کا بیٹا کہنا یا مسیح کو ابن اللہ کہنا اور پہلے کافروں کی بات کے مشابہ بات کرنا۔ 11/10، اللہ کے سوا اس کے بندوں کو اپنے اولیاء مقرر کرنا۔ 3/16، قریب زندگی کو پیچھے آنے والی زندگی پر اختیار کرنا اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کو کج چاہنا۔ 13/13، آیات بینات سن کر مومنوں کو یہ کہنا کہ کونسا فریق مجلس کے لحاظ سے بہتر اور خوبصورت ہے اور اللہ کے رسولوں کو یہ کہنا کہ یا تم ہمارے مذہب میں لوٹ آویں گے اور یا ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے اور نبی کو دیکھ کر اس سے تمسخر کرنا اور کہنا کیا یہ ہے جو تمہارے معبودوں کو ذکر کرتا ہے اور خود الرحمان کے ذکر سے انکار کرنا 3/17، رسولوں کو دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ بھی تمہارے جیسے انسان ہیں ہاں چاہتے ہیں کہ تم پر فضیلت لے جائیں اور اگر خدا چاہتا تو پھر فرشتے اتارتا ہم نے تو یہ اپنے پہلے آباء واجداد سے یہ نہیں سنا یہ ایک انسان ہے جس کے ساتھ جنّ ہے پس ایک وقت تک اس کا انتظار کرو۔ 2/8۔

لقاء الآخرت کی تکذیب کرنا اور رسولوں کے حق میں یہ کہنا کہ یہ تو تمہارے جیسا انسان ہے اس ہی سے کھاتا ہے کہ جس سے تم کھاتے ہو اور اس ہی سے پیتا ہے کہ جس سے تم پیتے ہو اور اگر تم نے اپنے جیسے انسان کی اتباع کی تو بیشک تم خسارہ پانے والے ہو گے۔ کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مر گئے اور مٹی ہو گئے اور ہڈیاں ہو گے تو پھر بھی تم نکالے جاؤ گے دور ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے۔ 3/18، یہ کہنا کہ یہ اس نے از خود افتراء کیا ہے اور اور لوگوں نے اس میں اس کی اعانت کی ہے اور یہ کہنا کہ پہلوں کی کہاوتیں ہیں جو اس نے تکلیف کے ساتھ لکھی ہیں پس وہ اس پر صبح وشام املاء کرائی جاتی ہیں اور یہ کہنا کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ طعام کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے کیوں اس پر کوئی فرشتہ نہیں اترتا تا کہ اس کے ساتھ وہ وزیر ہوتا یا کیوں اس پر کوئی خزانہ نہیں ڈالا جاتا یا کیوں اس کے لئے کوئی باغ نہیں جس سے کھاتا اور پھر اس کے حق میں یہ کہنا کہ تم سحر شدہ انسان کی اتباع

کرتے ہو۔16/18، باطل کے ساتھ حق سے مجادلہ کرنا تاکہ حق کو کاٹ دیں اور آیات اللہ اور جن امور کے ساتھ ڈرائے گئے ہیں ان پر تمسخر کرنا20/15، فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ جنگ کرنا۔7/5، اللہ عزّ وجلّ پر کذب افتراء کرنا4/7، جب مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ اور رسول کی طرف بلایا جائے تو یہ کہنا کہ ہمارے لئے وہ کافی ہے کہ جس پر ہم نے اپنے آباء اجداد کو پایا ہے اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پانے والے ہوں۔4/7، کافر لوگ عزت اور شقاق (مخالفت) میں ہوتے ہیں10/23۔

محمد سرور۔ اس کے علاوہ اور بہت سے اقوال اور افعال اور صفات کفار کے بیان ہوئے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ سچا مومن کفر میں لوٹنے کو ایسا ہی بُرا سمجھتا ہے جیسا کہ آگ میں داخل ہونے کو برا جانتا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد4 صفحہ634 مسند انس بن مالکؓ حدیث نمبر13628 عالم الکتب بیروت1998ء)

اور ظاہر ہے کہ جو شخص ایسا ایمان رکھے گا وہ ضرور ہی قرآن مجید سے یا علماء اسلام سے ان امور کا پتہ لگائے گا جو کہ کفر میں داخل یا اس کے ساتھ لازم ہیں تاکہ ان سے بچنے کی کوشش کرے۔ اور جب تک وہ معلوم ہی نہ ہوں گے تو ان سے بچنے کی کوشش ہی محال ہوگی۔

(حکیم الامت) سَوَاءٌ ایک لفظ ہے جس سے اِسْتَوٰی مستوی مساوی وغیرہ الفاظ نکلے ہیں اسی طرح سُوٰی بھی اور یہ ایک اور دو اور زیادہ کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے برابری اور عدل اور وسط کے ہیں اوّل کی مثال ہے اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ (آل عمران:65)(ایک بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے میں برابر ہے) اور سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (حٰمٓ السجدۃ:11)(برابر ہے سائلوں کے لئے) اور دوسرے کی مثال ہے فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ (الانفال:59)(پس پھینک دے ان کی طرف عدل پر) اور سوم کی مثال ہے فَرَاٰہُ فِیْ سَوَاءِ الْجَحِیْمِ (الصّٰفّٰت:56)(پس دیکھا اس کو جہنم کے وسط میں) اور اِسْتَوٰی جس کا ماخذ سَوٰی ہے کبھی بمعنی اِعْتَدَلَ (معتدل ہوا) کے ہوتا ہے جیسا ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی (النجم:7)(بڑی طاقت والا پس برابر ہوا) اور بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰی (القصص:15) (پہنچا اپنی مضبوطی کو اور معتدل ہوگیا) اور کبھی بمعنی صَعَدَ (چڑھا) کے ہوتا ہے جیسا کہ ثُمَّ

اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ (البقرۃ:30)(پھر چڑھا آسمان کی طرف) یہ معنے رئیس المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کئے ہیں۔ یا یہ کہ اس کا امر چڑھا آسمان کی طرف۔

تو یہ معنے ابن اسحاق سے مروی ہیں۔ یا متوجہ ہوا آسمان کی طرف۔ یہ معنے امام فراء نے کئے ہیں۔ اور کبھی بمعنے ظَھَرَ اور اِرْتَفَعَ کے ہوتا ہے جیسا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الاعراف:55) (پھر بلند ہوا اور قابو پایا عرش پر) اور سَوَاءٌ کے لفظ کے اصل معنے تو برابر ہونے کے ہیں اور کبھی بمعنے برابر ہونے والے کے ہوتے ہیں جو کہ مستوی کے معنے ہیں تو جہاں پر یہ معنے ہوں گے وہاں پر قواعد عربی کے لحاظ سے برابری میں مبالغہ اور زیادتی مد نظر ہوتی ہے۔

(محمد سرور) عَلٰی کے معنے ہیں پر، لیکن یہاں پر پاس کے ہیں۔

اور ھُمْ کے معنے ہیں ان۔

أ۔ حرف استفہام ہے بمعنے کیا۔

اَنْذَرْتَ۔ اِنْذَارٌ سے ہے اور انذار کہتے ہیں ایسے وقت میں ڈرانے کو کہ جس وقت تلافی ممکن ہو۔ اور اَنْذَرْتَ کے معنے ہیں تُو نے بروقت ڈرایا لیکن یہاں پر أَأَنْذَرْتَ بمعنے اِنْذَارُكَ (تیرے ڈرانے) کے ہے۔

اَمْ۔ یہ اَمْ ہمزۂ استفہام یعنی أ کے بعد آیا کرتا ہے اور اس کے معنے یا ہوتے ہیں۔

لَمْ کے معنے ہیں نہیں۔ اور یہ جس فعل پر آتا ہے یہ اس کو زمانہ ماضی میں منفی کر دیتا ہے لہٰذا اس کے معنے ماضی منفی کے ہو جاتے ہیں۔ پس لَمْ تُنْذِرْ کے معنے ہوتے ہیں نہیں ڈرایا تُو نے لیکن یہاں پر اَمْ لَمْ تُنْذِرْ کے معنے عَدَمُ اِنْذَارِكَ (تیرے نہ ڈرانے) کے ہیں۔ اور دونوں جگہ ھُمْ کے معنے ہیں ان کو۔ پس سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ الخ کے معنے ہوئے تیرا ڈرانا ان کو اور تیرا نہ ڈرانا ان کو برابر ہیں ان کے نزدیک۔ اور اِنْذَارُكَ اور عَدَمُ اِنْذَارِكَ کو ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ کے ساتھ بیان کرنا اس وجہ سے ہوا ہے تاکہ بار بار ڈرانا سمجھا جائے۔ اور اگر انذار ہی رکھا جاتا تو پھر بار بار انذار کرنا نہ پایا جاتا جیسا کہ اب پایا جاتا ہے۔ اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ یہ جملہ معترضہ ہے جو کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يُؤْمِنُوْنَ کے جملہ کے درمیان لایا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا...لَا یُؤۡمِنُوۡنَ میں کفار کا ایمان نہ لانے کا سبب:

اور جملہ معترضہ ہمیشہ کسی فائدہ کے لئے کسی جملہ کے درمیان لایا جاتا ہے اور یہاں پر اس جملہ کا سبب بیان کرنے کے واسطے لایا گیا ہے کہ جس کے درمیان یہ واقع ہے یعنی اس کی وجہ بیان کرتا ہے کہ جو لوگ کافر ہوئے وہ کیوں ایمان نہیں لاتے یا نہ لائیں گے اور جو بعض علمائے عربیت کا قول ہے کہ جملہ معترضہ ہمیشہ کسی غیر مذکور اور مقدر اعتراض کا جواب ہوا کرتا ہے وہ بھی یہاں پر درست ہو جاتا ہے کیونکہ اگرچہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا پر یہاں کوئی اعتراض مذکور نہیں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اس پر کوئی یہ اعتراض کر سکتا تھا کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہوئے ہیں وہ ایمان نہیں لاتے یا نہ لائیں گے حالانکہ جو کافر تھے ان میں سے اس وقت بھی ایمان لائے اور اب تک لاتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید پر ہونے والے ہر اعتراض کا جواب قرآن میں موجود ہے:

اس اعتراض کو مفسرین نے محسوس کیا ہے لیکن اکثروں نے کوئی عمدہ جواب نہیں دیا۔ اور عمدہ جواب نہ ہونے کی عموماً یہ وجہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے جواب دیتے ہیں اور ان کو یہ علم نہیں ہوتا کہ قرآن مجید عَالِمُ الْغَیۡبِ[1] (الانعام:74) خدا کی کتاب ہے۔ اور اس کو قرآن مجید کے اتارنے کے وقت اور اس سے پہلے بخوبی معلوم تھا کہ فلاں بات یا فلاں آیت پر فلاں زمانہ میں فلاں شخص کی طرف سے فلاں اعتراض وارد ہو گا لہٰذا اس نے ہر ایک اعتراض کا جواب خود ہی دے دیا ہوا ہے بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس عبارت پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ اسی میں یا اس کے ماقبل یا مابعد میں اس کا جواب درج ہوتا ہے۔

پس قرآن مجید کی کسی بات یا آیت پر جب کوئی اعتراض ہو تو اس کا جواب از خود نہ دینا چاہئے۔ بلکہ تدبر سے تلاش کرنا چاہئے کہ قرآن مجید نے اس کا کیا جواب دیا ہے۔ ناظرین اس گُر کو خوب ملحوظ رکھیں یہ بھی علوم قرآن مجید کا ایک دروازہ ہے پس جب کوئی اعتراض قرآن مجید پر ہو تو علیم و حکیم کی جامع اور محفوظ کتاب کی بے قدری اور ہتک کر کے خود جواب نہ دو بلکہ اسی جامع کتاب سے اس اعتراض کا جواب تلاش کرو اگر جلدی سے نہ ملے تو

[1] ۔ پوشیدہ...(باتوں) کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

بار بار تلاش کرو اور خوب کوشش کرو تا کہ اصل اور صحیح جواب دیا جائے ورنہ تو پھر انسانی جواب تو عموماً کمزور ہی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً یہاں پر بھی اگر وہ مفسر الٰہی جواب پیش کرتے تو فیصلہ ہو جاتا لیکن انہوں نے الٰہی جواب کی تلاش نہ کی اور از خود یہ جواب دے دیا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا میں چند معیّن کافر مراد ہیں جو کہ آنحضرت ﷺ کو بتائے گئے تھے مثل ابو جہل وغیرہ کے جو کہ کفر ہی پر مرے ہیں اور ایمان نہیں لائے۔ لیکن یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کی کوئی قابل اعتبار دلیل نہیں۔ اور نہ یہ طرز بیان اس کتاب کی شان کے موزون ہے جو کہ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡھُدٰی[1] (البقرۃ:186) ہے۔

پس اصل جواب وہی ہے جو کہ خداوند حکیم نے اس جملہ معترضہ کے ساتھ دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے نہ سب کفار کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے یا نہ لائیں گے اور نہ مجمل طور پر یہ بیان فرمایا ہے کہ کچھ کافر ایسے ہوں گے تا کہ اوّل صورت میں خلاف واقعہ ہونا لازم آتا اور دوسری صورت میں غیر مفید اور لغو ہونا لازم آتا۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جو ایسے کافر ہو گئے ہیں کہ تیرا ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں ان پر اب مساوی ہو گئے ہیں۔ خواہ اس وجہ سے کہ وہ ہلاک شدہ اقوام کی مانند یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کوئی عذاب نہیں آنے والا کیونکہ اس قدر مدت گذر گئی ہے اور اب تک کوئی نہیں آیا حالانکہ ہر ایک طرح سے اس کی مخالفت کی گئی ہے اور اس کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئی ہیں پس اگر کوئی عذاب آنے والا ہوتا تو اب تک ضرور آجاتا۔ رہی یہ معمولی تکلیفیں جو کہ اب تک آئی ہیں۔ تو قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ (الاعراف:96) (ضرور یہ سردی گرمی ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتی رہی ہیں) اور یا اس وجہ سے کہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم اس کی اتباع نہ اختیار کریں گے خواہ عذاب آئے یا نہ آئے۔ وہ نہ اب ایمان لاتے ہیں اور نہ آئندہ لائیں گے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ انذار کے جھوٹا جاننے کے وقت میں یا اس فیصلہ کی صورت میں کہ خواہ کچھ ہی ہو ہم ہرگز نہ مانیں گے۔ وہ آنحضرتؐ کو اور آپ کی باتوں کو ہرگز نہیں مان سکتے اِلَّا اس صورت میں کہ وہ اس خیال اور اس فیصلہ سے باز آجائیں۔

---

[1]۔ (وہ قرآن) جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت (بنا کر بھیجا گیا) ہے اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے (ایسے دلائل) جو ہدایت پیدا کرتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ جو لوگ اس حد تک پہنچ جاتے ہیں پھر وہ رجوع نہیں کرتے اور نہ اللہ ان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ رجوع کریں بلکہ وہی خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ[1] (الحج:12) کے مصداق ہوتے ہیں۔ تو جب وہ رجوع نہیں کرتے اور اس حالت میں مان نہیں سکتے تو اس سے یہی لازم آتا ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ہاں ہم امکانی رنگ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ اس خیال اور اس فیصلہ سے رجوع کریں تو پھر مان سکتے ہیں۔ لیکن جب تک رجوع نہ کریں گے اور اسی حالت پر رہیں گے تب تک ہرگز نہیں مان سکتے اور یہ بات کچھ اسلام ہی کے متعلق نہیں اور نہ دین سے مختص ہے بلکہ سب دنیوی امور میں بھی ایسا ہی ہے کہ جس شخص میں کسی امر کی نسبت یہ دو حالتیں ہوں وہ اس حالت میں اس امر کو ہرگز نہیں مانا کرتا اور نہ اس کو اختیار کرتا ہے۔

پس اس جملہ معترضہ سے دو امر ثابت ہوتے ہیں ایک تو کافر ہونے والوں کے ایمان نہ لانے کا سبب معلوم ہو جاتا ہے اور دوم سوال مذکور کا حقیقی اور واقعی جواب نکلتا ہے جو کہ بناوٹ اور تکلف سے بالکل پاک ہے۔ تو اب اس ساری آیت کا ترجمہ یہ ہوا۔ بے شک جو لوگ کافر ہوئے (ایسے کہ) تیرا ان کو ڈرانا اور تیرا ان کو نہ ڈرانا ان کے نزدیک برابر ہے (اس مساوات کے سبب سے) وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اب رہی یہ بات کہ اللہ عزّ وجلّ نے یہاں پر ایسے کافروں کا ذکر کیوں فرمایا ہے۔ اور یہاں پر ان کے ذکر کرنے سے کیا غرض ہے۔

ہر ایک سورۃ میں ایک اصل مدعیٰ ہوتا ہے:

پس واضح ہو کہ ہر ایک سورۃ میں ایک اصل مدعیٰ ہوتا ہے اور باقی اس کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ اور جن سورتوں کے اوّل میں حروف مقطعات مثل الٓمّٓ، کٓهٰیٰعٓصٓ وغیرہ کے ہوتے ہیں تو ان حروف میں ان دعاوی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے جیسا کہ یہ حروف خداوند تعالیٰ کے ایک یا بہت ناموں کے اختصار اور اجزا ہوتے ہیں۔

چنانچہ میں نے الٓمّٓ کے بیان میں یہ لکھا تھا کہ الٓمّٓ اور الٓرٰ کو انزال کتاب کے ساتھ خاص مناسبت ہے کہ جہاں پر یہ آئے ہیں وہاں پر ضرور کتاب کے اتارنے کا ذکر

[1] ۔ وہ دنیا میں بھی گھاٹے میں پڑ جاتے ہیں اور آخرت میں بھی، اور یہی کھلا کھلا گھاٹا ہے۔ (تفسیر صغیر)

ہے۔ پس اس سورۂ بقرہ میں کہ جس کے اوّل میں الٓمّٓ ہے اصل دعویٰ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرۃ:3) ہے جس کا آگے دلائل کے ساتھ اثبات کیا جاوے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کسی امر میں کچھ مُعْتَدٌ بِہٖ فائدہ نہ معلوم ہو جائے تب تک اس کے دلائل سننے یا اس کی تحقیق کی مشقت برداشت کرنے کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا خداوند حکیم نے اس دعوے کے بعد پہلے اس کا فائدہ بیان فرمایا کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الخ ہے۔

یعنی اس کا یہ فائدہ ہے کہ جس حد تک اور کتابیں پہنچانا چاہتی ہیں اس حد تک پہنچے ہوئے لوگوں کو بھی آگے اور اعلیٰ ترین مراتب کی طرف یہ ہدایت کرتی ہے یہ تو ظہر ہوا اور بطن کے طور پر یہ بھی بیان کر دیا کہ کن لوگوں کو فائدہ ہو سکتا ہے اور کن کو فائدہ نہیں ہو سکتا تا کہ داعی الی الہدایت کو نہ دقت پیش آئے اور نہ اس کا وقت ضائع ہو۔

پس فرمایا کہ جو لوگ خدا کے غضب اور عذاب سے بچنا چاہتے ہیں اور پھر کچھ اپنے طور پر بعض امور غیب پر ایمان بھی رکھتے ہیں اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر اپنے طور پر کچھ پوجا بھی کرتے ہیں اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو اور پھر اللہ کریم کے دیئے ہوئے سے کچھ خرچ بھی کرتے ہیں خواہ وہ خرچ کرنا فی الحقیقت اللہ کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ ان سب امور کو اسی باعث سے کرتے ہیں کہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان امور سے خداوند کریم راضی ہوتا ہے۔

پس ایسے لوگ جب قرآن مجید کو سن لیں گے تو بباعث خوف خدا کے ضرور ہی اس کی طرف توجہ کریں گے اور ضد اور ہٹ دھرمی اور خود غرضی سے کام نہ لیں گے اور کچھ ان پہلے اعمال خیر اور نیک نیتی سے ان کو مدد ملے گی اور اَسْلَمْتَ عَلٰى مَا اَسْلَفْتَ کے مطابق مشرف باسلام ہو کر فرقان حمید کی ہدایت پر قائم ہو جاویں گے۔ اَسْلَمْتَ عَلٰى مَا اَسْلَفْتَ کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ مَیں نے کفر کی حالت میں بہت کچھ صدقات کئے تھے تو کیا مجھے ان کا کچھ اجر ملے گا الخ۔ تو اس کے جواب میں حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا یعنی تُو نے چونکہ یہ

اعمال خیر کئے تھے لہٰذا خداوند کریم نے تیرے ان نیک اعمال کے باعث تجھے مشرف باسلام کر دیا ہے۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم بعدہ حدیث نمبر 324)

الغرض کہ ایسے لوگ ہدایت پانے کے قابل ہیں۔

پھر آگے بتایا کہ جو ایسے ضدی اور اجھل ترین کافر ہوں کہ تیرا انذار عدم انذار ان کے حق میں مساوی ہو۔ پس وہ بالکل ایمان نہ لائیں گے۔

اس کے بعد پھر بتائے گا کہ ایک اور قسم کے لوگ ہیں جن میں نہ قوت فیصلہ ہے اور نہ تابِ مقابلہ اور باوجود بے شعور اور لایعقل اور مفسد ہونے کے پھر بھی اپنے آپ کو عقلمند دور اندیش اور مصلح اور دوسروں کو سفیہ، بیوقوف، ناعاقبت اندیش اور مفسد یقین کرتے ہیں۔ پس یہ لوگ بھی ایمان نہ لائیں گے۔ آگے پھر بتایا کہ یہ نہ سمجھو کہ ایسے بُرے دو گروہ مشرکوں ہی میں ہیں جو کہ لَا یَعْلَمُوْنَ ہیں۔ بلکہ اہل کتاب میں بھی یہ دو گروہ ہیں پس چونکہ وہ باوجود اہل علم ہونے کے پھر بھی ایسا کرتے ہیں لہٰذا وہ مشرکوں کے ان دو گروہ سے بدتر ہیں لہٰذا ان کے ایمان کی طمع نہ رکھنا۔ اس کے بعد پھر خداوند کریم نے اصل دعویٰ یعنی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کے دلائل بیان فرمائے ہیں لیکن چونکہ مشرکوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی تاکہ اس سے اس دعوے پر استدلال کیا جاتا اور اہل کتاب کے پاس کتاب تھی جس سے اس پر استدلال ہو سکتا تھا بلکہ وہی استدلال ان پر زیادہ موثر ہو سکتا تھا لہٰذا پہلے مشرکوں کے لئے یہ دلیل بیان فرمائی کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الخ (البقرۃ:24) یعنی اگر تمہیں اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں ریب اور شک ہے تو اس کتاب کی کسی سورۃ کی مثل بنا لاؤ اور سب مددگاروں کو بھی بلا لو اور منصف بھی اپنے ہی لے آؤ پر یاد رکھو کہ کبھی ایسا نہ کر سکو گے۔ چونکہ لَا رَيْبَ فِيْهِ اور اس کی دلیل میں بہت فاصلہ ہو گیا تھا اور ممکن تھا کہ قاری کا ذہن جلدی سے اس طرف منتقل نہ ہو کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ اس کی دلیل ہے۔

لہٰذا دلیل میں بھی وہی رَيْبٌ کا لفظ رکھ دیا جو کہ پہلے دعوے میں ذکر فرمایا تھا۔ پھر

اس کے بعد اہل کتاب کو مخاطب کر کے ان کے مذاق کے مطابق وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ الخ[1](البقرۃ:128) فرما کر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی وہ جامع اور کامل ترین دعا بیان فرمائی جو کہ بہت سی عظیم الشان پیشگوئیوں پر مشتمل تھی جن میں سے اکثر تو پوری ہو چکی تھیں مثل بیت اللہ کے محترم اور امن والا ہونے اور سال بسال ہزار ہا لوگوں کے دلوں میں حج بیت اللہ کی تحریک ڈال کر وہاں پر جمع کرنے اور وادیٔ غیر ذی زرع کے آباد کرنے وغیرہا کے جن سے ان کے ساتھ کی اس عظیم الشان پیشگوئی کے صدق کا بھی پورا پورا یقین حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے یہ سب کچھ بطور تمہید اور لوازم کے تھا اور وہ تھی ایک رسول کریم کی بعثت کی جو کہ مکہ کا رہنے والا، وہاں پر ہی مبعوث ہونے والا اور بنی ابراہیمؑ بلکہ خصوصاً بنی اسماعیلؑ سے ہونے والا اور مکہ والے بنی اسماعیلؑ پر آیات اللہ پڑھنے والا اور ان کو تزکیہ بخشنے والا اور ان کو کتاب اور حکمت پڑھانے والا ہو گا۔

پھر ایسی دائر سائر اور زبان زد خلائق پیشگوئی کہ جس کا نہ کسی اہل کتاب نے انکار کیا اور نہ اس کا حوالہ دریافت کیا۔ پھر ایسی کھلی کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے باوجود اس قدر صدیاں گزرنے کے مکہ والے بنی اسماعیل سے ان شرائط والا کیا کوئی صاحب کتاب اور صاحب صحیفہ رسول ہی نہ آیا جیسا کہ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ (یٰس:7)(تاکہ تُو ڈرائے ایسی قوم کو کہ جن کے آباء واجداد کو ڈرایا تک نہیں گیا) میں اللہ جل شانہ نے خبر دی ہے تاکہ کسی طرح کا اشتباہ اس پیشگوئی میں نہ واقع ہو یعنی تاکہ کوئی اس بہانہ سے انکار نہ کر دے کہ ایسا نبی تو فلاں ہو چکا ہے بلکہ جیسا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (البقرۃ:130)(اور اٹھا ان میں ایک بڑا رسول ان سے) میں ایک رسول پر عظیم الشان کی درخواست کی تھی اسی طرح خداوند کریم نے بھی وہاں پر ان میں ایک ہی رسول مبعوث فرمایا۔ الغرض کہ اصل مقصود تو یہاں پر دعوئے لَا رَیْبَ فِیْهِ اور اس کا اثبات تھا اور هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ کا ذکر اظہار فائدہ کے لئے اور متقیوں اور اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

[1]۔ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہا تھا اور (اس کے ساتھ) اسمٰعیل بھی۔ (تفسیر صغیر)

اور مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ الخ[1] (البقرۃ:9) کا ذکر اس بات کے بیان کرنے کے لئے ہے کہ کن لوگوں کو قرآن مجید کی ہدایت شامل ہو گی اور کون لوگ اس دولت بے بدل اور نعمت غیر مترقبہ سے محروم رہیں گے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ... یُؤْمِنُوْنَ الخ میں تو ان کو بیان فرمایا جو ہدایت یاب ہوں گے اور اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ میں ہدایت قرآنی سے محروم رہنے والوں کی ایک قسم کا بیان فرمایا ہے۔ پس ایک تو اس وجہ سے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ مذکور ہوا۔

فاتحہ قرآن کا متن اور باقی اس کی شرح ہے:

اور دوم مَیں نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کیا تھا کہ فاتحہ شریف قرآن صغیر ہے اور باقی فرقان حمید قرآن عظیم ہے یا یوں کہو کہ فاتحہ متن ہے اور قرآن عظیم اس کی شرح اور تفسیر ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کی ہر ایک آیت ہر ایک حکم ہر ایک اخبار اور قصص فاتحہ کی کسی نہ کسی لفظ یا آیت کی شرح اور تفسیر ہے۔ اور قرآن مجید کے تدبر کے وقت ضروری ہوتا ہے کہ اس کا لحاظ رکھا جائے اور حضرت سیدی حکیم الامت (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَسَلَّمَہُ وَاَوْصَلَہُ اِلٰی مَا یُحِبُّ یَرْضَاہُ) درس قرآن میں جبکہ سورۃ کو ختم کر کے اس کا خلاصۂ مضامین سنایا کرتے ہیں تو اس وقت ضرور اس امر کو بھی بیان فرما دیتے ہیں جس پر بڑے فوائد مرتب ہوتے ہیں۔

پس اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ سے لے کر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ تک کی تفسیر ہے۔ یعنی دیکھو کہ اللہ کریم کی ربوبیت عامہ اور رحمت عامہ اور خاصہ اور مَالِکِیْتِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا مُقْتَضَا ہے کہ اس نے ایسی کتاب اپنے ایک بندے پر اپنے بندوں کے فائدہ اور روحانی تربیت کے لئے انزال فرمائی ہے جو کہ جزاء وسزا کے بیان اور نظائر پر مشتمل ہے اور وہ اپنے جامع کمالات ہونے کے باعث اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اس

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 6 بابت دسمبر 1906ء صفحہ 205 تا 228)

کتاب کا نازل فرمانے والا ہی سب تعریفوں اور ثناؤں کا مستحق ہے اور پھر اس میں

[1] ۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

مجملاً اور ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ سے لے کر ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک مفصلاً منعم علیھم کا بیان ہے یعنی دیکھو کہ اللہ کریم کے ایک مخلص بندہ نے جب اس کی راہ میں قدم مارا تو خداوند کریم نے اس پر کیسا انعام کیا کہ ایسی عظیم الشان کتاب نازل فرمائی اور اپنی خاص وحی اور اپنے پاک کلام سے اس کے ساتھ بولا اور یہ کہ جو اس کیلئے کچھ کرتے ہیں دیکھو وہ ان پر کیسا انعام کرتا ہے کہ ہر ایک امر میں ان کو اپنی خاص ہدایتوں سے مشرف کرتا ہے اور پھر ان کو ان کے مطالب میں کامیاب کرتا ہے۔ اس کے بعد اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ میں اور اس کے بعد کی چند آیات میں مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کا بیان ہے۔ جو کہ اللہ کریم کی رحمت سے ابد کے لئے محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ضَالِّیْن کا بیان آئے گا۔ پس یہ دوسری وجہ ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ کے یہاں پر ذکر کرنے کی۔

آیت 8: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

(حضرت سیدی حکیم الامت) خَتْمٌ کہتے ہیں چھاپے کے ساتھ چھاپہ لگانے کو اور اس اثر کو جو چھاپہ لگانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور حفاظت اور آخر تک پہنچنے کو اور قُلُوْبٌ قَلْبٌ کی جمع ہے اور قلب کہتے ہیں دل کو اور دل کو قلب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ خون کو قلب کرتا ہے کیونکہ وہ ایک جانب سے لیتا ہے اور دوسری طرف سے بدن کی طرف بھیجتا ہے یا اس کے تقلب کے لئے کیونکہ وہ قرار نہیں پکڑتا اور اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔

اَلْقَلْبُ بَيْنَ اُصْبُعَيِ الرَّحْمٰنِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ شَاءَ[1]۔

(سنن الترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن، حدیث 2140)

(دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے الٹاتا ہے اس کو جیسا کہ چاہتا ہے۔)

(محمد سرور) هِمْ۔ بمعنے اُن کے کے ہے۔ وَ۔ بمعنے اور کے ہے۔

اور عَلٰى۔ بمعنے پر کے۔ اور سَمْعٌ۔ بمعنے کان۔ اور هِمْ۔ بمعنے ان کے ہے۔

اور اَبْصَارٌ بَصَرٌ کی جمع ہے اور بَصَرٌ کہتے ہیں آنکھ کو۔ اور غِشَاوَةٌ کے معنے ہیں پردہ۔ اور لَ کے معنے ہیں لیے۔ اور عَذَابٌ کہتے ہیں دکھ کو۔ اور عَظِيْمٌ کے معنے ہیں بڑا۔

پس ترجمہ یہ ہوا کہ اللہ نے مہر لگادی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کان پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا دکھ ہے۔

خدا کے کافروں کے دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے سے مراد:

اس آیت کریمہ میں اس امر کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ جو ایسے کافر ہوتے ہیں کہ ان پر حضرت خاتم النبیینؐ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہو جاتا ہے وہ کیوں ایمان نہیں لاتے اور وہ وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کے دل سمجھتے نہیں اور ان کے کان حق کو سنتے ہی نہیں اور ان کی آنکھیں حق کو دیکھتی نہیں۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود اور

[1] نوٹ: ان الفاظ کی حدیث نہیں مل سکی سنن الترمذی میں ہے إِنَّ الْقُلُوبَ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ۔ (از مرتب)

آنحضرتؐ کے بہت سے صحابہؓ سے خَتَمَ اللّٰہُ الخ کے معنوں میں یہی مروی ہے کہ فَلَا یَعْقِلُوْن۔ وَلَا یَسْمَعُوْنَ۔ وَلَا یُبْصِرُوْنَ۔ (پس نہ وہ سمجھیں گے اور نہ سنیں گے اور نہ دیکھیں گے) یعنی حق کے ماننے کے یہی ذرائع ہوتے ہیں کہ انسان عقلمند اور تدبر کرنے والا ہو اتو خود سوچ کر سمجھ لیتا ہے۔ کہ یہ حق بات ہے اور اگر ایسا عقلمند نہ ہو اتو پھر اس کے شواہد اور نظائر اور قرائن پر نظر کر کے اس بات کی حقانیت تک پہنچ جاتا ہے اور اگر اس سے بھی گرا ہوا ہو اتو پھر کسی انسان سے اس کے دلائل اور قرائن سن کر حق کو پالیتا ہے اور جس کے لئے یہ تین ہی ذریعے مفقود ہوں وہ کبھی بھی حق کو نہیں پاسکتا۔ اور یہاں پر خداوند کریم نے بتایا ہے کہ جن کافروں پر ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ یہ تین ہی ذریعے کھو بیٹھے ہیں لہٰذا وہ اب حق کو نہ پاسکیں گے۔

یہاں پر بعض دشمنان اسلام نے بڑی ناعاقبت اندیشی سے یہ سوال کیا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے خود ہی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے یا بالفاظ دیگر ان کی ہدایت کی سب راہیں بند کر دی ہیں تو ان کے ایمان نہ لانے یا ہدایت یاب نہ ہونے پر ان کو کیوں سزا دی جاتی ہے اور اُن کے لئے کیوں عذاب عظیم کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا بہت طریق سے جواب دیا گیا ہے۔ لیکن ہم سب سے پہلے وہ جواب ذکر کرتے ہیں جو کہ عالم الغیب خدا نے پہلے سے اپنی جامع کتاب میں درج فرمایا ہوا ہے۔

اور حضرت سیدی حکیم الامت نے بھی وہی جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے مہر لگانے کو کبھی طبع یعنی مہر اور چھاپہ لگانے سے اور کبھی غضب سے اور کبھی لعنت سے یعنی رحمت الٰہی سے دور ہونے سے تعبیر کیا ہے اور جہاں طبع اور غضب اور لعنت کا ذکر آیا ہے وہاں پر بھی بعض مقاموں میں یہ بیان کر دیا ہے کہ وہ ایمان نہ لاویں گے اور وہاں پر اس اعتراض کا جواب مفصل طور پر بیان کیا ہے مثلاً ایک مقام پر ہے بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین:15) (بلکہ ان کے دلوں پر اس کا زنگ بیٹھ گیا ہے جو کہ وہ کماتے رہے ہیں) جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ان کے دلوں کا ناسمجھ اور لایعقل ہونا ان کی اپنی کمائی یعنی بداعمالی اور برائیوں کا اثر ہے پھر ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ

عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:156)(بلکہ اللہ نے مہر لگادی ہے ان کے دلوں پر ان کے کفر کے ساتھ (یا ان کے کفر کے سبب سے) یہاں سے بھی صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دلوں کا لایعلم اور لایعقل ہونا ان کے کفر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ یہ آیت کریمہ صاف بتاتی ہے کہ ان کے دلوں پر کسی اور لاک یا سیاہی کی مہر نہیں لگی بلکہ انہی کے اپنے کفر کی سیاہی کی مہر لگی ہے۔ پھر ایک اور محل پر فرمایا ہے۔

کفار کی حالت:

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (النحل:107 تا109)

(اور لیکن جس کی کفر کے ساتھ شرح صدر ہو جائے پس ان پر اللہ کی طرف سے بڑا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا دکھ ہے اور یہ (یعنی غضب الٰہی اور عذاب عظیم کا ان کے لئے ہونا) اس وجہ اور اس باعث اور سبب سے ہے کہ انہوں نے قریب زندگی کو پیچھے آنے والی پر چن لیا ہے اور بے شک اللہ ایسے کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی غافل لوگ ہیں) یہاں پر تین چیزیں جمع کی ہیں جن سے ان کا لایعقل ہونا پایا جاتا ہے غضب الٰہی اور عذاب عظیم اور طبع۔ اور پھر اس کا سبب اور باعث بھی مفصل بیان فرمایا اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے اس قریب زندگی کو آخرت پر اختیار کر لیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح ہو ہم تو دنیوی فوائد کو حاصل کریں گے اور اس کی پرواہ تک نہ کریں گے کہ آخرت بھی کوئی ہے یا نہیں۔ اس فیصلہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہمارا مقصد کفر میں ہی حاصل ہو سکتا ہے لہٰذا اس کو شرح صدر سے مضبوط پکڑ لیا اور فیصلہ کر لیا کہ خواہ کوئی ہزار دلائل پیش کرے نشان بتائے، ہم نے اس طریق کو نہیں چھوڑنا اور نہ اس کے طریق کو اختیار کرنا ہے پس اس فیصلہ کے بعد وہ غافل بن گئے۔ ان کی آنکھیں حق اور اس کے نشان اور شواہد و قرائن دیکھنے سے

بند اور ان کے کان حق اور اس کے متعلقہ امور کے سننے سے بہرے اور ان کے دل حق اور اس کے دلائل سوچنے سمجھنے سے بیکار ہو گئے اور دیدہ و دانستہ حق سے اعراض اختیار کر لیا اور اس طریق کو اپنی ساری زندگی کا دستور العمل بنالیا۔

اور جس پر وہ خود چلتے تھے اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی ترغیب دیتے تھے چنانچہ خداوند کریم نے ان کی ترغیب دینے کو بدیں الفاظ ذکر فرمایا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (حٰمٓ السجدۃ:27)

(اور کافر بننے والوں نے کہا مت سنو اس قرآن کو اور اس میں شور و غل ڈالو تا کہ تم غالب آجاؤ۔)

پس پہلی آیت میں ہے کہ ان کے دلوں کی یہ حالت ان کی کمائی کی وجہ سے ہے اور دوسری میں اس کمائی کو بیان فرمادیا ہے کہ وہ کمائی کفر ہے کہ جس سے ان کے دلوں کی یہ حالت ہے۔ اور تیسری آیت میں بتایا کہ کفر بھی وہ ہے جو کہ دنیا کو آخرت پر اختیار کرنے اور سب دلائل و شواہد اور اور جملہ وعیدوں اور انذاروں کو پس پشت ڈالنے اور قطعی فیصلہ کرنے کے بعد بڑے مصمم اور پختہ عزم کے ساتھ اپنے لئے ہمیشہ کے واسطے اختیار کیا ہے اور فیصلہ کر لیا ہے کہ جو امر اس کے ترک کرنے کی طرف بلانے والا ہم پائیں گے اس کو نہ سوچیں گے، نہ سنیں گے، نہ دیکھیں گے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکا ہم ایسے امر سے دور رہیں گے اور سب دنیا جانتی ہے کہ جب کسی امر کی نسبت کسی انسان کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ انسان اس امر کو اس وقت تک ہر گز نہیں مان سکتا جب تک کہ وہ اپنی اس حالت کو نہ چھوڑ دے۔ اور جو لوگ دلائل اور شواہد اور قرائن دیکھ بھال کر اور انذار و مواعید سن کر دیدہ و دانستہ۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل:15) (اور انہوں نے انکار کیا ان کا حالانکہ ان کی جانوں نے ان پر یقین کیا تھا اور یہ محض ظلم اور تکبر سے کیا) کے مطابق انکار و مخالفت پر کمر باندھتے ہیں وہ کبھی اس حالت سے واپس نہیں ہوتے جیسا ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔

کفار کی حالت اپنے افعال کی وجہ سے ہے:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (البقرۃ:19) (بہرے، گونگے، اندھے ہیں پس وہ واپس

نہ ہوں گے)اور ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا امور کہ جن سے ان کے دلوں کی یہ حالت ہوئی ہے یہ ان کے خود کردہ افعال ہیں۔

پس اس سے صاف صاف ثابت ہو گیا کہ ان کے دل کی یہ حالت جبرًا خداوند کریم نے نہیں بنائی بلکہ ان کے اپنے افعال اور بد کرداریوں سے یہ حالت ان میں پیدا ہوئی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کے اِن افعال کا یہ اثر نہ از خود ہے اور نہ ان کی طرف سے ہے بلکہ خداوند کریم کے بنانے سے ہے اور اسی کو تقدیر الٰہی کہتے ہیں۔ پر اس سے خداوند کریم پر کوئی نقص یا الزام عائد نہیں ہوتا مثلاً پانی کا پینا، کھانا کھانا اور زہر کا نوش کرنا یہ سب انسانی فعل ہیں اور پانی پینے سے پیاس کا رفع ہونا اور کھانا کھانے سے بھوک کا بند ہونا اور زہر کے نوش سے ہلاک ہونا یہ وہ آثار ہیں جو کہ خداوند کریم نے ان فعال میں رکھے ہیں۔ لیکن اگر کوئی زہر نوش کرنے سے ہلاک ہو گا تو ہر گز کوئی عقلمند یہ نہیں کہتا ہے اور نہ کہہ سکتا ہے کہ خداوند کریم نے اس پر ظلم کیا ہے۔

خداوند کریم نے جس طرح اپنی نسبت قرآن مجید میں خبر دی ہے کہ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکہف:50)(تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا) وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حٰم السجدۃ:47) (اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے) ویسا ہی وہ فی الحقیقت بھی ظلم کرنے والا نہیں اور خداوند کریم نے اسی لئے پہلے سے اپنی نسبت یہ خبر دے دی ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بعض نادان گستاخ شوخ چشم بیباک اسلام کی ضد اور مخالفت میں آکر مجھ پر ظلم کا افتراء کرے گا۔

پس اگر ایسے معترض خیر اندیش ہوتے تو پہلے ان کے لئے اسی قدر کافی تھا کہ قرآن مجید جب صریح الفاظ میں خدا سے ظلم کی نفی کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو پھر اگر ان کو قرآن مجید کی کسی آیت سے خدا کی نسبت ظلم کا شبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی نادانی اور ناسمجھی کا اقبال کرتے نہ اعتراض کی جرأت۔ نیز جب وہ خدا کی فعلی کتاب میں خداوند کریم کے ایسے افعال دیکھتے اور مانتے ہیں کہ یہ خدا کے فعل ہیں اور ان پر ظلم کا اعتراض نہیں کرتے تو خدا کی قولی کتاب قرآن مجید میں ایسا فعل مذکور دیکھ کر کیوں اعتراض کی جرأت کرتے ہیں؟

جو مثال میں نے زہر پینے اور اس کے اثر کی نسبت بیان کی ہے۔ اس میں اور مذکورہ کافروں کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جس طرح زہر میں خداوند حکیم نے اثر رکھا ہے کہ جو شخص اس کو کھائے وہ مر جائے اسی طرح مذکورہ بالا طرز کے کفر یا بالفاظ دیگر مذکورہ بالا ہٹ دھرمی میں یہ اثر رکھا ہے کہ جو اس کو اختیار کرے وہ اس امر کو کبھی نہ اختیار کرے کہ جس کے مقابل یہ ہٹ دھرمی کی گئی ہے۔ کسی امر کے مقابلہ پر یا کسی امر پر ڈٹنے اور ہٹ باندھنے کو ہٹ دھرمی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ پختہ ہٹ دھرم میں ہوا کرتی ہے یہاں تک کہ خواہ انسان ہلاک بھی ہو جائے تو بھی اس ہٹ کو چھوڑنا نہیں چاہتا چنانچہ اس کے نظائر و شواہد سے دنیا کی تاریخ کے صفحے بھرے پڑے ہیں اور جس طرح زہر کا پینا اور استعمال کرنا انسان کا اپنا فعل اور کسب ہے اسی طرح ایسے کفر یا ہٹ دھرمی کا اختیار کرنا بھی انسان کا اپنا کام ہے۔ پس جس طرح کوئی ہلاک کرنے والی زہر استعمال کرتا ہے تو سب عدالتوں کے نزدیک اور عرف عام میں یہ اس کا اپنا گناہ اور قصور ہوتا ہے اور خداوند تعالیٰ پر اس سے کوئی بھی ظلم کا اتہام نہیں آتا اسی طرح جب کوئی انسان مذکورہ بالا کفر یا ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے جو کہ قبول حق سے اس کو باز رکھتی ہے تو یہ اس کا اپنا جرم اور قصور ہو گا اور اللہ عزوجل پر اس سے کوئی ظلم عائد نہیں ہو سکتا۔

اگر نفس اثر رکھنے سے یہاں پر خدا کی نسبت ظلم کا اتہام ہو سکتا ہے تو پھر زہر پینے اور اس کی مثل اور ہزارہا فعلوں میں (جو کہ فعل تو انسان کے ہیں پر ان میں بُرا اثر خدائے حکیم کا رکھا ہوا ہے) خدائے پاک پر ضرور ظلم کا الزام عائد ہو گا اور اس صورت میں یہ اعتراض اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہ رہے گا۔ بلکہ معترض صاحب کے مذہب پر بھی ضرور عائد ہو گا۔ الغرض کہ ان کے دل کی ایسی حالت ان کی مذکورہ بالا ہٹ دھرمی سے ہوئی جو کہ ان کا اپنا فعل ہے ہاں اس میں یہ اثر خداوند کریم نے رکھا ہے جیسا کہ زہر میں ہلاک کرنے کا اثر اس نے رکھا ہے اور اس اثر رکھنے سے جس طرح زہر سے ہلاک ہونے کی صورت میں خدائے پاک پر کوئی ظلم کا الزام عائد نہیں ہوتا اور نہ کوئی عائد کرتا ہے اسی طرح یہاں پر بھی اس اثر کے رکھنے سے اللہ کریم پر نہ کوئی ظلم کا الزام عائد ہوتا ہے اور نہ کوئی عائد کر سکتا ہے۔

اللہ کا دلوں پر مہر لگانے کی حقیقت:

رہی یہ بات کہ جب ان کے دلوں پر مہر کا لگنا ان کے اپنے ایک فعل اور عمل کا اثر تھا تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ اور یہ نہ کہا کہ انہوں نے اپنے دلوں پر مہر لگادی حالانکہ اس صورت میں یہ کہنا چاہیئے تھا نہ وہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محض اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ان کے فعل مذکور میں یہ اثر خداوند کریم ہی نے رکھا ہوا ہے اور جہاں ایسی صورت ہوتی ہے کہ انسان کے فعل کا اثر مرتب ہوتا ہے اور اثر اس فعل میں خداوند کریم نے رکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو وہاں پر اس اثر کا مرتب کرنا خداوند تعالیٰ کی طرف نسبت کیا جاتا ہے۔

پہلے میں مثال مذکور میں بتاتا ہوں اور پھر اور افعال میں بتاؤں گا۔ غور کرو کہ جب زہر کھا کر کوئی مر جائے تو اگرچہ ہلاکت اس کے اپنے فعل کا اثر ہے لیکن چونکہ یہ اثر خداوند کریم نے رکھا ہوا ہے تو یہاں پر یہ کہنا صحیح ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے مارا ہے چنانچہ قرآن مجید میں سب زندوں اور سب مردوں کے متعلق خداوند کریم فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (المؤمن:69) (اللہ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے (یعنی سب زندہ اشیاء کو) اور مارتا ہے (یعنی سب مردہ چیزوں کو)) اور یہ عام مقولہ ہے کہ موت حیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر دیکھو کہ جس قدر برے کام ہیں جن کا اثر دکھ اور عذاب ہے وہ کرتا تو انسان ہی ہے لیکن چونکہ دکھ کا اثر خداوند کریم ہی نے ان میں رکھا ہے تو کہا جاتا ہے کہ خداوند کریم نے اس کو سزا دی یا دکھ یعنی عذاب دیا یا عذاب میں ڈالا۔ پھر جس قدر پہلی قومیں عذاب الٰہی سے ہلاک ہوئی ہیں وہ بدکار قومیں تھیں اور انہوں نے خود اس بدی کا ارتکاب کیا تھا جس کا اثر ہلاکت اور تباہی تھا لیکن چونکہ یہ اثر خداوند کریم نے رکھا ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ خداوند قدیر نے ان کو ہلاک اور تباہ کیا ہے۔

ہنود ہی کی اصطلاح دیکھ لو جب کوئی ایسی بدی کرے کہ جس کا یہ اثر ہو کہ کسی بُری جون میں ڈالا جائے تو باوجودیکہ وہ بدی انسان کرتا ہے لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ پرمیشر نے اس کو فلان جون میں ڈالا یا پیدا کیا ہے۔ الغرض کہ یہ بڑی پکی اور صحیح بات ہے کہ جب انسان

کوئی ایسا فعل کرتا ہے کہ اس پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہو اور وہ خداوند کریم نے اس میں رکھا ہو تو اس کے اثر کا مرتب کرنا خداوند کریم کی طرف نسبت کیا جاتا ہے اور خاص کر جب وہ ایسا اثر ہو کہ سزا یا انعام کی قسم سے ہو اور مقام بھی انعام یا سزا کے بیان کا ہو پھر تو ضرور ہی اللہ عزوجل کی طرف نسبت کیا جاتا ہے۔ اگر معترض صاحب ہزار کوشش بھی کریں مگر اس کے برخلاف ہرگز نہ پائیں گے۔ پس یہاں پر بھی چونکہ یہ ہٹ دھرمی ان کا ایک فعل تھی جس کا یہ اثر تھا کہ ان کے دلوں پر حق کے سمجھنے سے مہر لگائی جائے اور وہ حق نہ سمجھیں اور یہ اثر خداوند حکیم نے اس میں رکھا تھا۔

اور اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ:6) کے مقابل پر ہونے سے یہ مقام بھی بیان سزاء کا مقام تھا جیسا کہ اس کا مقابل مقام بیانِ انعام تھا لہٰذا یہاں پر بھی اس اثر کا مرتب کرنا خداوند کریم کی طرف سے نسبت کیا گیا ہے۔ یہ ہے وہ اصل جواب جو کہ قرآن مجید سے پایا جاتا ہے اور یہاں پر بھی قُلُوْبٌ اور سَمْعٌ اور اَبْصَارٌ کے بعد هُمْ کو اسی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ مہر لگانا ان کے انذار اور عدم انذار کو مساوی کرنے کے باعث ہوا ہے نہ ظلم کے طور پر۔

اب اس اصل جواب کے بعد میں وہ جواب بھی ذکر کر دیتا ہوں جو کہ لوگوں نے دیئے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ ایک خلق فعل ہے اور دوسرا کسب فعل ہے اور خالق پر فعل کی بدی عائد نہیں ہوتی بلکہ کاسب پر عائد ہوتی ہے اور چونکہ کاسب بندہ ہے اور خالق افعال عباد خداوند تعالیٰ ہے لہٰذا فعل کی بدی بندے کی طرف راجع ہوتی ہے نہ اللہ کریم کی طرف مثلاً۔ زنا زید سے سرزد ہوا تو یہ فعل تو زید کا ہے لیکن چونکہ بندوں کے ہر ایک فعل کا خالق خدا ہے لہٰذا زید کے اس فعل کو بھی خدا نے ہی خلق کیا ہے پر زنا کی بدی زید کی طرف منسوب ہوگی نہ اللہ کریم کی طرف علیٰ ہذا القیاس ختم یعنی مہر لگانا بھی ان کا اپنا فعل ہے لیکن چونکہ ان کے اس فعل کا خالق بھی خداوند کریم ہی ہے لہٰذا اس کی نسبت کسب کے لحاظ سے ان کی طرف اور خلق کے اعتبار سے اللہ کریم کی طرف ہو سکتی ہے ہاں اس کی بدی کی نسبت اللہ کریم کی طرف نہیں ہو سکتی یہ جواب بہت مشہور ہے لیکن بہت سے

دعووں پر مبنی ہے کہ جن کی مخالف کے سامنے ثابت کرنے کی ضرورت ہے اور جن میں پہلے سے خلاف چلا آتا ہے۔

دوسرا یہ جواب ہے کہ ختم سے مراد کوئی علامت ہے کہ جس سے فرشتے شناخت کرکے ان سے نفرت کرتے یا ان کو عذاب دیتے ہیں۔ تیسرا یہ جواب ہے کہ ختم سے مراد اللہ علیم کی یہ گواہی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اور ظاہر ہے کہ گواہی دینے میں یا علامت مقرر کرنے میں کوئی ظلم نہیں۔

مختلف مقامات پر بصر، قلوب اور سمع کو مقدم رکھنے کی حکمت:

یہاں پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جن آیات کریمہ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے بعض میں عَلٰٓی اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ہے جیسا اس آیت میں ہے اور بعض میں وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً[1] (الجاثیۃ:24) جیسا کہ 19/25 کی آیت میں ہے اور بعض میں قلوب کو مقدم کیا ہے اور بعض میں سمع کو۔ پس واضح ہو کہ جہاں پر یہ بیان کرنا منظور تھا کہ ان کی آنکھیں ہمیشہ سے بیکار تھیں وہاں پر تو عَلٰٓی اَبۡصَارِهِمۡ الخ فرمایا ہے۔ اور جہاں پر یہ بیان کرنا منظور تھا کہ پہلے اگرچہ ان کی آنکھیں کام دے سکتی تھیں لیکن بیکار بنادی گئی ہیں تو وہاں پر جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فرمایا اور جہاں پر ایسے کفار کا بیان ہے کہ جن کے لئے عقلی دلائل زیادہ مفید ہو سکتے تھے جیسے مشرکین عرب وہاں پر تو قلوب کو پہلے ذکر فرمایا ہے اور جہاں پر ایسے لوگ مراد ہیں کہ جن کے لئے سمعی دلائل زیادہ مفید ہو سکتے تھے وہاں پر سمع کو مقدم کیا ہے۔

دو فرق اور بھی ہیں لیکن انشاء اللہ ان کو کسی دوسرے مقام پر بیان کر دیں گے۔ اور کانوں اور آنکھوں کا قلوب کے ساتھ ذکر کرنا یا تو تاکید کے لئے ہے کیونکہ اصل خزانہ اور مرکز تو قلب ہے۔ پس جب قلب پر مہر ہوئی تو کانوں یا آنکھوں سے انسان فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ پس یہ ایسا ہے جیسا کوئی کہے کہ حاکم بھی پاگل ہے اور اس کے جاسوس اور مخبر بھی۔ اور یا یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ انساں کے لئے حق حاصل کرنے کے تین ذرائع ہوتے ہیں دل، آنکھ، کان اور یہ ایسے ہیں کہ نہ عقلی دلائل سے کام لے سکتے ہیں اور نہ شواہد

[1]۔ اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

اور نشانات کے مشاہدہ سے اور نہ سمعی دلائل اور نصائح سے تو اس صورت میں ایسا ہو گا جیسا کوئی کہے کہ حاکم نے نہ اپنی عقل سے کام لیا اور نہ اپنے دونوں مشیروں کے مشورہ سے۔

علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟:

اس زمانہ میں یہ مسئلہ بھی بہت معرکۃ الآراء بنا ہوا ہے کہ علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ ہے جس قدر آسمانی اور الہامی کہلانے والی کتابیں ہیں انہوں نے یا یوں کہو کہ انبیاء علیہم السلام نے قلب کو مرکز قرار دیا ہے اور فلاسفروں کا قول اور زمانہ حال کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ قلب کا کام فقط خون کا تصفیہ ہے۔ اور علوم کا مرکز دماغ ہے اس مسئلہ پر انشاء اللہ العلیم آگے کی آیتوں کی تفسیر میں ہم بحث کریں گے۔

رہا یہ کہ ان کو عذاب عظیم دنیا میں ملے گا۔ یا قیامت میں پس واضح ہو کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں جزاء و سزاء اخروی کا ذکر آیا ہے وہاں پر خداوند حکیم نے دنیا کا کوئی امر بھی بطور پیشگوئی ساتھ بیان فرما دیا ہے خواہ وہ امر بھی از قسم جزاء و سزاء ہو یا کوئی اور امر ہو۔ یہ اس لئے کیا ہے تا کہ دنیوی امر کی پیشگوئی پوری ہو کر آخرت اور آخرت کی جزاء و سزاء کی صداقت کا یقین دلائے اور پھر ایسے امور ہر ایک زمانہ کے متعلق بیان فرمائے ہیں تا کہ ہر ایک زمانہ کے لوگوں پر حجت پوری ہو اور کسی زمانے کے لوگوں کے لئے قیامت اور اس کے احوال کا ثبوت بے ثبوت یا قصہ کہانیوں کے رنگ میں نہ ہو۔

اور اس دنیوی امر سے قیامت اور اس کے احوال کا اثبات اس طور پر ہوتا ہے کہ جب ایک خبر دہندہ نے دو عظیم الشان امروں کی متعلق قبل از وقت خبر دی ہو جو کہ ایک انسان کی طاقت سے باہر ہوں اور ان کا قبل از وقت جان لینا بھی انسان کی طاقت میں نہ ہو اور دو میں سے ایک پورا ہو چکے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوسرے امر کے صدق کا ضرور یقین ہو جاتا ہے۔

پس اسی طرح جب قیامت کے ساتھ ایک عظیم الشان امر کو ملا کر دونوں کے واقع ہونے کی قبل از وقت خبر دی جائے اور وہ دوسرا امر پورا ہو جائے تو ضروری ہے کہ قیامت کا بھی اس سے یقین ہو جائے گا۔ مثلاً صحابہ کرام کے متعلق یہ خبر دی گئی تھی کہ قیامت ہو گی

اور کفار عذاب میں ڈالے جائیں گے اور مومنوں کو باغ ملیں گے۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور عمدہ اور خوبصورت محل اور اعلیٰ درجہ کی عورتیں اور غلام دیئے جائیں گے اور تختوں پر بٹھلائے جائیں گے اور دنیامیں بھی ان مومنوں کے مقابل اور مخالف کفار کو عذاب دیا جائے گا اور خدا تعالیٰ مومنوں کو کامیاب کرے گا اور اخروی نعمتوں کی مانند دنیا میں بھی ان کو ایسے باغ دے گا۔ کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور اعلیٰ درجہ کے محل اور ماڑیاں اور خوبصورت اور خوش سیرت عورتیں اور غلام دے گا اور ان کو تختوں پر بٹھلائے گا۔ اور جس طرح قیامت کا لانا صحابہ کرام یا آنحضرتؐ کی طاقت سے باہر تھا اسی طرح دنیامیں مذکورہ بالا حالت کا پیدا کرلینا اور اس کا قبل از وقت یقینی علم حاصل کرلینا بھی ان کی طاقت سے باہر تھا۔

پھر خصوصاً آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی کو ملحوظ رکھ کر اس پر نظر کی جائے کہ پیشگوئی مذکور کے اعلان و تحدی کا زمانہ ہے تو ایسے وقت تحدی کرنا سخت حیرت میں ڈالتا ہے لیکن باوجود ان سب متضاد امور کے پھر بھی خداوند کریم نے یہ سب کچھ صحابہؓ کے سامنے حرف بحرف پورا کر دیاتو اس سے ان کو قیامت پر اور اس کے متعلقہ وعدوں اور وعیدوں پر ایسا کامل یقین حاصل ہو گیا گویا انہوں نے قیامت اور اس کے احوال کو بچشم خود مشاہدہ کرلیااسی طرح ہر ایک زمانہ کے لوگوں پر حجت پوری کرنے کے لئے قیامت اور اس کے احوال کے ساتھ ان کے زمانہ کے کچھ عظیم الشان امور کی پیشگوئی کر دی گئی ہے تاکہ ان کی صداقت سے قیامت اور اس کے احوال کی صداقت کے نشان ان کے چشم دید ہو جائیں اور ہمارے زمانہ کے متعلق بھی ایسا ہی کیا ہے کہ جہاں قیامت کا بیان فرمایا ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ دنیامیں ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ زلزلے آئیں گے اور طاعون پھوٹے گی، نہریں بکثرت نکالی جائیں گی۔

غیر آباد ملک بکثرت آباد کئے جائیں گے، تار ڈاک عجیب طرز پر ہوں گی، اشاعت کتب بکثرت ہو گی اور دنیا پر صلیب کا غلبہ ہو گا۔ صنعت وایجاد کی بڑی ترقی ہو گی اور ایک نئی سواری نکالی جائے گی جس کے باعث اونٹ بیکار ہو جائیں گے اور خدا کا برگزیدہ مسیح

موعود آئے گا وغیر ذالک۔ اور عذاب عظیم میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کے مخالف کفار کے لئے خبر دی کہ قیامت کو بڑا عذاب ہو گا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں بھی ان کو بڑا عذاب ہو گا چنانچہ اسی وجہ سے یہ نہیں فرمایا کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فِي الْآخِرَةِ (یا) فِي الدُّنْيَا۔ بلکہ عام فرمادیا جو کہ دنیا اور آخرت کو شامل ہے اور دوسرے مقام پر اس دنیوی عذاب کی تعیین بھی فرمادی کہ کیا ہو گا جہاں پر فرمایا ہے۔ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ الخ (التوبۃ:14) (جنگ کرو ان کے ساتھ اللہ عذاب دے گا ان کو تمہارے ہاتھوں سے۔ اور ان کو ذلیل کرے گا اور مومن لوگوں کو ان پر مظفر و منصور کر دے گا۔)

پس جیسے اس علیم و قدیر نے قبل از وقت عذاب عظیم کی خبر دی تھی ویسا ہی کر دیا عرب کے ملک میں نہ کوئی بت رہا۔ جن کی حمایت پر وہ کمر بستہ تھے اور نہ کوئی بت پرست رہا اور دونوں کی ایسی صفائی ہوئی کہ جس کی نظیر کسی نبی کی امت میں ہر گز نہیں ملتی تو جب مخالفین کو دنیا میں عذاب عظیم مل گیا تو اس سے یقین کامل حاصل ہو گیا کہ قیامت میں بھی ان کو ضرور ہی عذاب عظیم ملے گا۔ کیونکہ دونوں عذابوں کی خبر ایک مخبر صادق نے قبل از وقت دی تھی۔

آیت 9: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

(حکیم الامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

وَ۔ بمعنے اور۔ال بمعنے جنس۔

نَاسٌ بمعنے انس وجن کے آتا ہے ایک اور بہت اور مذکر اور مونث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور نَاسٌ اور اُنَاس مستقل مادہ ہیں۔

اور مِنْ بمعنے بعض ہے۔

مَنْ نکرہ ہے جس کے اصل معنے شَیْءٌ کے ہیں اور مقام کے مناسب انسان، حیوان، جماد، شجر وغیرہ سب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر بمعنے انسان کے ہیں اور جن کے نزدیک ال یہاں پر بمعنے جنس نہیں بلکہ عہد یعنی بعض معین فرد یا افراد کے لئے ہے تو ان کے نزدیک مَنْ بھی نکرہ نہیں بلکہ موصول ہے جو بمعنے جو ہوتا ہے۔

پس یہ آیت بعینہ اس آیت کریمہ کی مانند ہے۔ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ (التوبۃ:61) (بعض ان میں سے وہ ہیں جو ایذا دیتے ہیں اس عظیم الشان نبی کو) تو اس صورت میں مَنْ بجائے اَلَّذِيْنَ کے ہے فقط فرق یہ ہے کہ اَلَّذِيْنَ جمع کے لئے آتا ہے اور مَنْ واحد، تثنیہ، جمع سب کے لئے آتا ہے اور اسی وجہ سے یہاں پر مَنْ اختیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے ایک مقام پر آیا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (الانعام:26) (اور بعض ان سے وہ شخص ہے جو تیری طرف کان لگاتا ہے) اور دوسرے مقام پر آیا ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس:43) (اور بعض ان میں سے وہ اشخاص ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں۔)

يَقُوْلُ۔ قَوْلٌ سے ہے اور لغت عرب میں قول کے ساتھ سب فعلوں کی تعبیر کی جاتی ہے اور زبان کے ساتھ بولنے سے مخصوص نہیں ہے جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ صبح کے پھیلنے کے لئے حدیث میں آیا ہے۔ حَتّٰى يَقُوْلَ هٰكَذَا (یہاں تک کہ ہو جائے اس طرح۔)

(صحیح البخاری کتاب الاذان باب الاذان قبل الفجر حدیث نمبر 621)

اور صدقہ دینے کے لئے آیا ہے قَالَ بِیَدِہٖ ھٰکَذَا۔ (اپنے ہاتھ سے یوں دیا۔)
(تفسیر الدر المنثور جلد 4 صفحہ 229 سورۃ التوبہ زیر آیت 79 مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت 2001ء)
پھر دو کاغذوں کی نسبت آیا ہے قَالَ بِیَدِہٖ ھٰکَذَا (پھر اپنے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا)
تیمم کے بارہ میں بھی اسی طرح انہی معنوں میں آیا ہے أَتَقُوْلُہٗ مُرَائِیًا (کیا اس کو تو ریاکار خیال کرتا ہے۔)
(مسند احمد بن حنبل جلد 7 صفحہ 619 مسند بریدۃ الاسلمی حدیث 23340 مطبوعہ عالم الکتب 1998ء)
اِذَا دَخَلَ الْبَیْتَ قَالَ بِالسِّوَاكِ[1] (جب گھر میں داخل ہوتے تو مسواک کرتے)
(الانوار فی شمائل النبی المختار جلد 2 صفحہ 376 باب فی سواکہ... حدیث 509 دار المکتبی دمشق 1995ء)
پس یَقُوْلُ کے معنے ہوئے ظاہر کرتے ہیں۔
(محمد سرور) اٰمَنَّا کے معنے ہیں ہم ایمان لائے اور ایمان کی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔
بِ کے معنے ہیں پر۔
اللہ اسم ذات ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا اور اس کے معنے ہیں وہ ذات جو سب صفات کی جامع ہے۔
وَ کے معنے ہیں اور۔ بَ کے معنے پر۔
یوم کہتے ہیں رات اور دن کے مجموعہ کو اور دن کو جو رات کے مقابل ہے اور وقت کو خواہ وہ کوئی وقت ہو۔ اَلْیَوْمِ بڑا دن (یا) بڑا وقت۔ یعنی جس میں عظیم الشان امر واقع ہونیوالا ہے کیونکہ وقت کی عظمت شان اسی سے ہوتی ہے۔
آخر کے معنے ہیں پیچھے آنے والا۔
وَ۔ بمعنے حالانکہ۔ مَا۔ بمعنے نہیں۔ ھُمْ۔ وہ۔
بِ۔ ہرگز۔ مُؤْمِنِیْنَ۔ مُؤْمِنٌ کی جمع ہے۔
سب کا ترجمہ یہ ہوا (اور بعض لوگ ہیں (یا بعض لوگ وہ ہیں جو) کہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور پیچھے آنے والے دن (یا وقت) پر حالانکہ وہ ہرگز ایمان لانے والے ہی نہیں) یعنی بعض لوگ باوجود انسان ہونے کے ایسی حرکت کرتے ہیں جو کہ

[1]۔ الانوار فی شمائل النبی المختار میں البَیْتَ کی بجائے بَیْتَہٗ آیا ہے۔ (از مرتب)

انسانیت سے بالکل بعید ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند کریم ایسے لوگوں کے حق میں لَا یَعْلَمُوْنَ (نہیں جانتے) لَا یَشْعُرُوْنَ (شعور تک نہیں رکھتے۔)

منافقین کی حالت:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (بہرے، گنگ، اندھے ہیں لہٰذا یہ کبھی رجوع نہ کریں گے) بلکہ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا (الفرقان:45) (یہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر راستہ سے بہکے ہوئے ہیں) فرماتا ہے۔ اور وہ حرکت یہ ہے کہ باوجودیکہ ان لوگوں نے اسلام کی صداقت کے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے رسول اللہ ہونے اور قرآن مجید کے کتاب اللہ ہونے کے ہزارہا بیّن ترین دلائل وبراہین اور آیات ونشانات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلئے ہیں اور ان کے سامنے خداوند کریم کے ہزاروں وعدے پورے ہوچکے ہیں جو کہ پیشگوئی کے رنگ میں تھے۔ اور آنحضرتؐ کے منجانب اللہ ہونے کے لئے بیّن نشان ہیں اور فتح مبین اور غلبہ تام کے حتمی وعدوں کے علاوہ ان کے صدق کے روشن ترین اور عام فہم آثار وقرائن بھی ان کے سامنے اور زیر نظر ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ یہ خیال کرکے کہ اہل اسلام کی اور کفار کی جنگ شروع ہے اور نہیں معلوم کہ کون غالب آتا ہے اور کون ہارتا ہے اور غالب سے قطع تعلق یا مخالفت کرنا اور مغلوب سے تعلق رکھنا نہایت خطرناک امر ہے یہی پسند کیا کہ فریقین سے تعلق رکھا جائے تاکہ جو غالب ہو تو ہم اسی کو یہ کہہ سکیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ اور نیز یہ بھی خیال کرلیا کہ اس چال سے ہم فریقین کے اس موجودہ ضرر سے بھی محفوظ رہیں گے جس کے خطرہ میں فریقین کے لوگ ہیں۔

پس اس گندے خیال اور خلاف واقعہ احتمال سے ان ہزارہا نشانوں اور براہین کو پس پشت ڈال کر ایمان کو ہاتھ سے دے دیا اور یہ چال بازی اختیار کی کہ باوجودیکہ ان کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان نہیں پر اہل اسلام پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور پیچھے آنے والے وقت پر ایمان لائے اور ان دو کی تخصیص اس لئے کی تاکہ یہ ظاہر کریں کہ اوّل سے آخر تک ہم ایمان لائے ہیں کیونکہ جیسا واقعہ کے لحاظ سے اللہ کریم پہلے ہے اور باقی ایمانیات بعد میں اور آخرت

سب سے آخر ہے اسی طرح آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ۔
(سنن الترمذی کتاب الفتن باب ماجاء فی ذکر ابن صیاد حدیث نمبر 2247)

میں بھی اللہ پہلے اور یوم آخر پیچھے ہے اور اللہ کا لفظ بھی اسی وجہ سے اختیار کیا ہے کہ یہ سب صفات کمال پر مشتمل ہے اس لئے کہ اللہ کے معنے ہیں وہ ذات جو کہ جامع صفات کمال ہے پس ایمان باللہ سے سب صفات الٰہیہ پر اظہار ایمان لازم آتا ہے بلکہ یہ وہ جامع لفظ ہے۔ جو کہ سب ایمانیات کو مستلزم ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا الخ۔ (حم السجدۃ:31)

(بیشک جو کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر استقامت کرتے ہیں تو ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ مت کچھ خوف رکھو یا رنج کرو۔ الخ) سے اس امر کا صاف ثبوت ملتا ہے غرض کہ منافق لوگوں کے دل میں اگرچہ بالکل ایمان نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی زبان اور عمل سے کمال ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور یہ محض اس وجہ سے کرتے ہیں تاکہ مومنوں کو دھوکا دے دیں حالانکہ وہ دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہیں کہ جن کے ساتھ عالم الغیب اور قادر مطلق خدا بول رہا ہے۔ اور ان کو بہت سے غیبوں پر اطلاع دے رہا ہے اور ان کی تائید اور نصرت پر کمربستہ ہے اور ان سے حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (آل عمران:180) (یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا کردے) کا پختہ عہد کرچکا ہے اور وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (النساء:123) (اللہ سے بڑھ کر کون بات میں زیادہ سچا ہوسکتا ہے) ایک سچی صداقت ہے۔ پس مومنوں کو دھوکہ دینے کا ارادہ کرنا بالفاظ دیگر عَالِمُ الْغَیْبِ[1] (الانعام:74) اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[2] (البقرۃ:21) خدا کو دھوکہ دینے کا ارادہ کرنا ہے نیز اس کارروائی سے انہوں نے ہمیشہ کے لئے اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ[3] (یوسف:65) خدا کو یک قلم چھوڑ دیا اور کمال بخل کا ثبوت دیا لہٰذا اس کے بعد خداوند کریم ان کے حق میں فرماتا ہے۔

---

[1]۔ پوشیدہ... (باتوں) کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)
[2]۔ ہر (اس) امر پر (جس کا وہ ارادہ کرے) یقیناً پوری طرح قادر۔ (تفسیر صغیر)
[3]۔ سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ (تفسیر صغیر)

آیت10: يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔

(حضرت مولانا حکیم الامت) يُخَادِعُوْنَ۔ مُخَادَعَةٌ سے ہے اور مُخَادَعَةٌ کے معنے ہیں ترک کے۔ پس يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ کے معنے ہوئی يَتْرُكُوْنَ اللّٰهَ (وہ چھوڑتے ہیں اللہ کو) جیسا کہ ایک دوسرے محل پر آیا ہے نَسُوا اللّٰهَ (چھوڑ دیا انہوں نے اللہ کو) کیونکہ اس کے مقابل اللہ عزوجل کی نسبت بھی نَسِيَهُمْ آیا ہے اور اس کے معنے بجز ترک کے اور کچھ نہیں ہیں اور يَخْدَعُوْنَ۔ خَدْعٌ سے ہے اور خَدْعٌ کے معنے امساک یعنی رکنے اور بخل کے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ كَانَ يُعْطِيْ فَخَدَعَ (فلاں دیا کرتا تھا لیکن اب دینے سے رک گیا ہے اور بخل کرتا ہے) اور منافقوں میں یہ وصف تھا جیسا کہ خداوند علیم نے اور محل پر بیان فرمایا ہے کہ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا (التوبۃ:77) (پس جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا تو بخل کرنے لگے (یا) انہوں نے بخل کیا) اور فرمایا هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا۔ (المنافقون:8) (یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ خرچ کرو ان پر جو رسول اللہ کے پاس ہیں تاکہ وہ پراگندہ ہو جاویں۔)

نفس کی حقیقت:

اور نفس کہتے ہیں ذات اور حقیقت اور عین شئے اور روح اور قلب اور خون اور پانی اور جسم اور چشم اور عظمت اور عزت اور ہمت اور اکڑبازی اور فراخی اور تروتازگی اور کلام طویل کو اور بمعنے پاس بھی آتا ہے جیسا فرمایا ہے تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ (المائدۃ:117) (تو جانتا ہے اس کو جو میرے پاس ہے اور میں اس کو نہیں جانتا جو تیرے پاس ہے) اور علماء نے کہا ہے کہ یہ اجسام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ کے لئے بھی آتا ہے جو کہ جسم سے پاک اور منزہ ہے جیسا فرمایا ہے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام:55) (تمہارے رب نے اپنے نفس پر (یعنی اپنے پر) رحمت مقرر کی ہے) اور فرمایا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (آل عمران:31) (اور اللہ تم کو اپنے نفس سے ڈرا کر بچانا چاہتا ہے۔)

پس معنے یہ ہوئے۔ وہ چھوڑتے ہیں اللہ اور مومنوں کو حالانکہ وہ نہیں بخل کرتے مگر

اپنی جانوں پر۔ اور ان معنوں کی تشریح حضرت مولانا صاحب نے یوں فرمائی ہے کہ منافقوں نے اپنی جانوں کو اللہ کریم کی راہ میں خرچ کرنے سے روکا۔ پس اس سے انہوں نے اپنے نفسوں کو اس عزت و نصرت اور رزق و فلاح سے محروم کر دیا کہ جس کا خداوند کریم نے اللہ کے راستہ میں صرف کرنے والوں کو وعدہ فرمایا ہوا تھا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (المنافقون:9)

(اور اللہ ہی کے لئے عزت ہے اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے لیکن منافق لوگ نہیں جانتے) اور فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المومن:52) (ضرور ہم مدد دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور مومنوں کو دنیا میں) اور فرمایا كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا (البقرۃ:26) (جب کبھی رزق دیا جائے گا ان کو (مومنوں کو) اس سے۔) اور يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کی تشریح میں حضرت مولانا صاحب سلمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ منافق لوگ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اظہار کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے مال و جان کو حفاظت میں کر لیں۔

پس منافق لوگ کشتی کے کناروں کی مانند ہوتے ہیں جب اور جس طرف ہوا چلتی ہے تو اس وقت اور اسی طرف کشتی بھی چل پڑتی ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ انفس سے یہاں پر وہی مراد ہو جو کہ لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ[1] ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (النور:13) (جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہ مومنوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ میں اچھا گمان کیا) اور نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ (آل عمران:62) اور (ہم پکاریں اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو) میں ہے اور کوئی اور معنے انفس سے یہاں پر نہ لئے جاویں تو اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ منافق لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور پھر وہ خود ہی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور مومنوں پر خرچ کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ اور خِدَاعٌ فساد کو بھی کہتے ہیں تو اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ وہ نہیں بگاڑتے مگر اپنی جانوں کو۔ اور شعور اس علم کو کہتے ہیں جو کہ بذریعہ حواس یعنی آنکھ، کان وغیرھما کے حاصل ہو۔

[1] ۔ رسالہ تعلیم الاسلام میں اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ کے الفاظ موجود نہ تھے۔ آیت اور ترجمہ درست کر دیا ہے۔ (از مرتب)

قرآن مجید پر زیادہ اعتراضات کی وجہ:

(محمد سرور) ناظرین پر مخفی نہ رہے کہ جب سے قرآن مجید کا اور زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے تب ہی سے قرآن مجید کی بعض آیات کے معنوں پر دشمنان اسلام پر جاہل اور ناعاقبت اندیشوں نے نہایت گندے اعتراض کئے ہیں اور پھر خصوصاً جب سے کہ اردو زبان میں تراجم ہوئے ہیں تو ایسے اعتراضوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیاہے اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ان تراجم سے پہلے قرآن مجید کے مطالب پر کسی کو اطلاع تک نہ تھی تو اعتراض کیا کرتے اور جب تراجم ہوئے اور اوروں کو اس کے مطالب پر اطلاع ہوئی تو اعتراض کئے گئے۔ کیونکہ قرآن مجید نہ توویدا ور تورات کی مانند کسی ایسی مردہ زبان میں تھا کہ جس کے جاننے والوں کا صفحہ دنیا پر نام ونشان تک نہ ملتا ہو بلکہ قرآن مجید اس زبان، ہاں پاک اور وسیع ترین زبان میں تھا۔ جو کہ اہل اسلام کے سواء اور بہت سے مذاہب کے ایسے لوگوں کی مادری زبان تھی جو کہ سب سے اوّل اور شدید تر اسلام کے دشمن تھے اور جنہوں نے اس مذہب کو صفحہ دنیا پر سے مٹادینے کے خیال سے اپنے اور اپنے عزیز واقارب اور عزیز ہم مشرب اور ہم وطنوں کے مال اور خون پانی کی مانند بہادیئے تھے اور نہ یہ وجہ ہے کہ اعتراض تو بڑے بھاری اور دقیق علوم وفنون پر مبنی تھے جو کہ پہلے زمانہ میں مفقود تھے۔ کیونکہ جن اعتراضوں کا ہم یہاں پر ذکر کر رہے ہیں ناظرین مشاہدہ کرلیں گے کہ وہ کسی باریک علم یا گہری تحقیق پر ہر گز مبنی نہیں ہیں بلکہ ان اعتراضوں کا منشاء اور سبب دوسری زبانوں میں ترجمہ ہی کرنا ہے کیونکہ عربی زبان چونکہ نہایت وسیع زبان ہے اور دوسری زبانیں ہر گز اس قدر وسیع نہیں لہٰذا عربی کے دوسری کسی زبان میں ترجمہ کرنے سے عموماً اور اردو زبان میں کرنے سے خصوصاً دو نقص پیدا ہو گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ عربی زبان چونکہ وسیع ہے لہٰذا اس میں ایک چیز کے مختلف مراتب کے لئے مختلف الفاظ بولے جاتے ہیں بخلاف اردو وغیرہ کے کہ ان میں مراتب کی کچھ تفریق نہیں ہوتی اور ایک ہی لفظ ان سب مراتب مختلفہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً خداوند تعالیٰ کی نافرمانی سے جب انسان سزاوار ٹھہرتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ جس طرح دنیوی حکام کی نافرمانی سے

نافرمان انسان مختلف اور کثیر التعداد سزاؤں کا مستحق ٹھہرتا ہے تو اسی طرح خدا کی نافرمانی سے بھی مختلف سزاؤں کا مستوجب ہوتا ہے اور اس کے بہت سے ایسے مختلف مراتب ہیں کہ اگر ان میں فرق کا لحاظ نہ کیا جائے تو عظیم الشان خرابی پیدا ہوتی ہے تو عربی زبان میں تو ان کے لئے جرم، جناح، ذنب وغیرہ بکثرت الفاظ موجود ہیں جو کہ نافرمانی کے مختلف مراتب کا جداگانہ اظہار کرتے ہیں لیکن بخلاف اس کے اردو وغیرہ میں ان مراتب مختلفہ کے اظہار کے لئے کوئی جدا الفاظ مقرر نہیں ہیں بلکہ ایک ہی لفظ مثل گناہ کے ان سب مراتب مختلفہ کے لئے ہے جس سے اس کے مراتب مختلفہ میں خلط ہو کر گندے اور ناعاقبت اندیش دل و دماغ کے لئے بہت غلط، پر گندے اعتراضوں کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس کی اگر زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں ذَنْبٌ کی بحث کو ملاحظہ فرماویں۔

دوم یہ کہ اور زبانوں کے الفاظ عموماً اور عربی کے خصوصاً اردو زبان میں بکثرت مخلوط اور مستعمل ہیں لیکن بعض وقت یہ خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک زبان کا لفظ ان معنوں میں اچھے محل پر مستعمل ہوتا ہے اور وہی لفظ انہی معنوں کے لحاظ سے بُرے محل پر استعمال ہوتا ہے تو اردو دان جب اس لفظ کو پاتا ہے تو اپنے استعمال کی خصوصیت اس کا ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ عربی میں بھی یہ برائی کو مستلزم ہے اور برائی اس کے ساتھ لازم ہے حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ عمدہ معنوں میں عمدہ محل پر مستعمل ہوتا ہے مثلاً مکر کا لفظ ہے اس کے عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے معنے ہیں اور بس اور سب جانتے ہیں کہ خفیہ تدبیر کوئی بُری چیز نہیں ہے ہاں اگر وہ خفیہ تدبیر کسی عمدہ کام کے لئے ہوئی اور جائز طریق پر ہوئی تو عمدہ ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی یتیم اور مسکین بے کس کی تربیت اور تعلیم کے لئے خفیہ طور پر کوئی جائز تدبیر کرتا ہے تو کوئی عقلمند اس کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔ اور اگر کسی بُرے کام یا ناجائز طریق پر ہو تو وہ بُری ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کسی کے ناحق قتل کرنے یا دوسرے کے مال چرانے کے لیے خفیہ تدبیر کرے یا کسی مسکین، یتیم، بے کس کی امداد کی لیے خفیہ تدبیر اس طور پر کرے کہ کسی غیر کا مال چھین کر اس کو دے دے تو یقیناً یہ خفیہ تدبیر یا بلفظ دیگر یہ مکر بُرا ہے لیکن چونکہ اردو

زبان میں مکر کا لفظ بُرے محل پر استعمال ہوتا ہے لہٰذا جب جاہل، نادان، ناعاقبت اندیش دشمنان اسلام نے دیکھا کہ قرآن مجید میں مکر کا لفظ اللہ عزوجل کے لئے استعمال ہوا ہے تو اردو زبان کی خصوصیت استعمال کو مد نظر رکھ کر جھٹ یہ اعتراض کر دیا کہ قرآن مجید نے جس خدا کو پیش کیا ہے وہ مکار فریبی دھوکہ باز ہے اسی طرح جزاء فعل چونکہ فعل کے ہم رنگ اور مشابہ ہوتی ہے لہٰذا عربی زبان میں بعض وقت جزاء فعل پر بھی وہی لفظ بول دیتے ہیں جو کہ اس فعل پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرۃ:195)(پس تعدی کرو تم ان پر اس کی مانند کہ انہوں نے تم پر تعدی کی ہے) ایک طرف تو خداوند کریم حکم دیتا ہے کہ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرۃ 191)(اور تعدی مت کر کیونکہ اللہ تعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

اور دوسری طرف یہاں پر حکم دیتا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرۃ:195)(پس اگر وہ تم پر تعدی کریں تو تم بھی ان پر تعدی کرو اس کی مثل کہ انہوں نے تم پر کی ہے) اور ظاہر ہے کہ تعدی کرو اور تعدی نہ کرو یہ دونوں متعارض باتیں ہیں پر قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جو کہ تعارض تو کیا مطلق اور معمولی اختلاف کی بھی اپنے سے نفی کرتی ہے بلکہ عدم اختلاف کو اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل اور نشان قرار دیتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء:83)(اور اگر یہ قرآن اللہ کریم کے سواء کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔)

اور تاریخ اور اخبار و آثار شاہد ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب وغیرھم نے جو کہ اسلام کے جانی دشمن تھے اور کہ جنہوں نے اس کی تکذیب پر اپنا خون و مال پانی کی طرح بہا دیا تھا اس دعویٰ کے اعلان کو سن کر کوئی ایک آدھ اختلاف بھی ثابت یا کم از کم پیش کر کے اس دعویٰ اور عظیم الشان دلیل کی مضبوط بنیاد کو کمزور نہیں کیا جو کہ اس دعویٰ کے صدق کا بیّن نشان ہے اور جب یہ ثابت شدہ صداقت ہے کہ قرآن مجید میں اختلاف نہیں تو

یقیناً ثابت ہوا کہ فَاعْتَدُوْا یا لَا تَعْتَدُوْا میں سے ایک کے معنے تعدی کے نہیں ہیں اور چونکہ فَاعْتَدُوْا، فَاِنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ کے بعد ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کسی پر ابتداءً ظلم کرے اور اس کو دکھ دے اور ستائے تو ضرور اس کا یہ فعل تعدی کہلاتا ہے لیکن اس کی تعدی کے بعد جب وہ مظلوم شخص شارع اور حاکم کے حکم سے ظالم کے دکھ اور ستانے کا بدلہ لے تو کسی کے نزدیک بھی اس کا یہ بدلہ لینا ہے ظلم اور تعدی نہیں ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ فَاعْتَدُوْا کے معنے یہاں پر تعدی کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ بدلہ لینے کے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس کے بعد بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فرمایا ہے۔ پس تعدی کا لفظ جو کہ ظلم کے فعل پر بولا جاتا ہے فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ الخ میں وہی تعدی کا لفظ فعل ظلم کی جزاء پر بھی بولا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَہْزِءُوْنَ۔ اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ (البقرۃ:16-15)(اور جب یہ لوگ اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو استہزاء کرنے والے ہی ہیں۔ اللہ ان سے استہزاء کر رہا ہے۔)

استہزاء کے معنی:

تو جس طرح مکر کے لفظ کا حال ہے اسی طرح استہزاء کا حال بھی ہے کیونکہ استہزاء اس کو کہتے ہیں کہ کسی سے ایسا کلام یا کام کیا جائے جو ہو تو بظاہر تعظیم کا لیکن فی الحقیقت اس سے یہاں پر تحقیر مقصود ہو اور اس میں بدی نہیں ہے ہاں کبھی یہ محض بے حقیقت بات یا کام پر بھی بولا جاتا ہے کہ جس سے محض خوش طبعی منظور ہوتی ہے اور بس اور یہ بُرا ہے اور شرفاء کی شان سے بعید ہے لیکن اردو میں اس کے معنے مسخری کے ساتھ مشہور ہو گئے ہیں اور مسخری شرفاء کی شان سے بعید ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے جواب میں کہا کیا تو ہم سے مسخری کرتا ہے تو تب حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰہِلِیْنَ (البقرۃ:68)(میں تو اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔)

یعنی مسخری تو جاہلوں کا کام ہے اور جہالت سے مجھے اس قدر نفرت ہے کہ میں خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ میں جاہل نہ ہوں۔ پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ استہزاء کے جو بُرے معنے ہیں یعنی مسخری تو قرآن مجید ان کو ایک شریف یا عالم کے لئے بھی تجویز نہیں کرتا بلکہ جاہلوں کے مناسب حال قرار دیتا ہے۔ تو جب قرآن مجید ایک شریف انسان اور عالم کے لئے بھی اس استہزاء کو تجویز نہیں کرتا اور بآواز بلند بتاتا ہے کہ ایسا استہزاء جہلاء کا کام ہے تو کیا پھر ایسے گندے کام کو اس خدا کے لئے تجویز یا استعمال کرے گا کہ جس کی نسبت وہ بڑے زور وشور سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ سبوح وقدوس ہے۔ اور ہر ایک نقص سے پاک اور ہر ایک خوبی سے متصف ہے۔ اور ہر ایک زبان میں یہی قاعدہ ہے کہ جس کے متعلق بات کی جاتی ہے اس کے مناسب حال معنے لئے جاتے ہیں اور اگر کوئی اس کے خلاف کرتا ہے تو وہ بے وقوف پاگل جاہل قرار دیا جاتا ہے۔

مثلاً جب ایک درزی کسی کو کہتا ہے کہ ٹکٹ لا دو تو دھاگے کا ٹکٹ لایا جاتا ہے اور جب ایک خط لکھنے والا ٹکٹ مانگتا ہے تو خط کا ٹکٹ لایا جاتا ہے اور جب ایک مسافر ٹکٹ مانگتا ہے تو ریل گاڑی کا ٹکٹ دیا جاتا ہے اور جب ایک عرضی نویس ٹکٹ مانگتا ہے تو وہ ٹکٹ دیا جاتا ہے جو کہ عرائض پر لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی کہتا ہے کہ زید بیٹھ گیا ہے تو اس کے اور معنی ہوتے ہیں اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں دوکاندار یا تاجر بیٹھ گیا ہے تو اس کے کچھ اور ہی معنے لئے جاتے ہیں۔ تو کلی قاعدہ بھی یہی چاہتا ہے کہ منافقوں کے لئے جہاں استہزاء آیا ہے وہاں پر ان کے مناسب حال معنے لئے جاویں اور جہاں پر سبوح وقدوس اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ:12) خدا کے لئے آیا ہے وہاں پر وہ معنے لئے جاویں جو کہ اس کی رفیع بلکہ ارفع شان کے مناسب ہوں اور وہ دو ہیں اوّل وہ معنے کہ جن کی نسبت میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ ان میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ہم جب خداوند کریم کی سنت پر نظر کرتے ہیں تو اس کے ہزاروں نظائر دکھائی دیتے ہیں مثلاً ہم دیکھتے کہ مشرک بدکار ظالم کو خداوند کریم ناپسند فرماتا ہے اور اس نے پہلے سے خبر دی ہوئی ہے کہ میں ایسے لوگوں کو سزا دوں گا اور سخت عذاب دوں گا۔ باوجود

اس کے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ایسے بدکاروں کو دنیا میں مال ودولت اور ظاہری عزت دی ہوئی ہوتی ہے جو کہ بظاہر ایک اعزاز نظر آتا ہے اور وہ شخص خود اس حالت کو مشاہدہ کر کے یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں یا میری کارروائی اللہ کی نظر میں بُری ہوتی تو کبھی میرا ایسا اعزاز نہ کیا جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی اس سے تعجب آتا ہے اسی وجہ سے قرآن مجید میں آیا ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبۃ:55)(پس ان کے مال اور اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈالیں اللہ تو چاہتا ہے کہ ان کو ان کے ساتھ دنیا میں عذاب دے اور تاکہ ان کی جانیں کفر کی حالت میں نکلیں۔)

لیکن فی الحقیقت یہ اعزاز نہیں بلکہ تحقیر اور عذاب اور تذلیل ہے۔ پس جب سنت اللہ میں ہم ایسا دیکھتے ہیں کہ بظاہر ایک فعل اعزاز معلوم ہوتا ہے اور فی الحقیقت وہ تحقیر ہوتا ہے تو پھر اگر منافقوں کی نسبت خداوند کریم نے ایسا کیا یا بیان فرمایا تو اس میں کون سی برائی ہوگی۔ اور دوم یہ کہ یہاں پر استہزاء سے جزاء استہزاء مراد ہو اور ہم ابھی بتا آئے ہیں کہ عربی زبان میں جزاء پر بھی بولتے ہیں اسی طرح خداع کے لفظ کا حال ہے کہ خداع خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اور یہ کوئی بری چیز نہیں ہے اور نیز جب کسی کے خداع کے بعد بطور عوض خداع آتا ہے تو یقیناً وہاں پر جزاء خداع مراد ہوتی ہے۔ جس کا شاہد ناطق مقابلہ کے طور پر ذکر کرنا ہے اور کلیہ قاعدہ یہی ہے کہ جب ایسے مقابلہ کی صورت پر کوئی فعل مذکور ہوتا ہے تو ہمیشہ اور ضرور دوسرے فعل سے جزاء مراد ہوتی ہے لیکن جس طرح استہزاء کا ترجمہ اردو زبان میں ٹھٹھا مسخری استعمال ہوتا ہے یا بلفظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ استہزاء کا ترجمہ اردو زبان میں ٹھٹھہ مسخری ہے اسی طرح خداع بھی بمعنے فریب مستعمل ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ خداع کا ترجمہ فریب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

لہٰذا جب اردو دان پر نادان دشمنان حیاء وایمان نے دیکھا کہ قرآن مجید میں استہزاء اور خداع کا استعمال خداءِ ذوالجلال کے لئے ہوا ہے جیسا آیا ہے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور اِنَّ

الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ [1](النساء:143)۔ تو یہ نہ خیال کیا کہ قرآن مجید کس طرح خدا تعالیٰ کو سب نقصوں سے پاک اور سب صفات کمال سے متصف بتاتا ہے اور نہ یہ کہ وہ اختلاف سے پاک ہونے کے دعوے میں کیسا صادق ثابت ہوا ہے کہ اس کی اوّل اور اعلیٰ درجہ کے جانی دشمن اس کے اس دعوے کی تکذیب کے لئے منہ نہیں کھول سکے اور نہ اس بات کو خیال کیا کہ اگر یہاں پر کوئی ایسا اعتراض وارد ہو سکتا ہوتا کہ جس کی بنا محض لغت پر ہے۔ تو قرآن شریف کے جانی دشمن ضرور ہی اس پر یہ اعتراض کرتے جو کہ لغت عرب کے ماہر ہی نہیں بلکہ یہ ان کی مادری زبان اور مایہ ناز تھی اور مخالفت ایسی رکھتے تھے کہ قرآن مجید کی اشاعت کے روکنے کیلئے پانی کی مانند اپنے خون ومال بہاتے تھے تو جب باوجود اس حالت کے صدیوں تک ان کی زبان اس اعتراض سے بند رہی ہے بلکہ عربی والوں کی زبان ہمیشہ کے لئے اس اعتراض سے بند رہی ہے تو ضرور یقین کرنا چاہئے تھا کہ یہاں پر یہ اعتراض بنظر انصاف وارد نہیں ہوتا اور نہ اس بات کو سوچا کہ عربی زبان میں ان الفاظ کے کیا معنے ہیں اور نہ اس پر غور وفکر کیا کہ مقابلہ کے طور پر یہ مذکور ہیں اور ایسی صورت میں دوسرے فعل سے جزاء فعل اوّل مراد ہوتی ہے۔ غرض کہ کچھ بھی نہ سوچا اور بالکل تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر یہ اعتراض کر کے اپنے آپ کو مورد غضب الٰہی بنا کر یہ اعتراض کر ہی دیا کہ قرآن کا خدا ٹھٹھے باز مسخرہ اور مکار فریبی دغاباز ہے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا الْبُهْتَانِ وَالْهِزْيَانِ [2]۔

پھر بے حیائی پر اس قدر کمر باندھی کہ بار بار ان اعتراضوں کے دندان شکن جواب دیئے گئے اور ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ قرآن مجید عربی ہے اردو نہیں اور یہ گندے معنے اردو میں ہیں نہ عربی میں اور کہ یہ مقابلہ کے طور پر مذکور ہوئے ہیں کیونکہ پہلے منافقوں کا استہزاء اور خداع ذکر کیا گیا ہے اور پھر جزاء اور مقابلہ کے طور پر یہ الفاظ خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور ایسی صورت قواعد کے لحاظ سے جزاء استہزاء اور

[1]۔ منافق یقیناً اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ انہیں ان کے دھوکے کی سزا دے گا۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ میں اس بہتان اور ہزیان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ (از مرتب)

جزاء خداع معنے ہوں گے اور یہ کہ چونکہ ہر ایک لفظ کے مناسب حال اور مناسب مقام معنے لئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان لفظوں کے بھی وہی معنے لینے چاہئے جو کہ اللہ جل شانہ' کی شان کے مناسب ہوں گے۔ پر ان تعصب کے اندھوں اور بغض کے بہروں نے نہ کچھ دیکھا اور نہ سنا اور جب کوئی تقریر، تحریر شائع کی اس میں یہی اعتراض سواء کسی تبدیلی کے شائع کر دیئے اور ان بار بار شائع شدہ جوابوں کا ذکر تک نہیں کرتے جو کہ ان کے حیاسوز تعصب کو ثابت کرتا ہے۔ ان متعصبوں کے اس خائنانہ طریق کو ملحوظ رکھ کر حضرت مولانا صاحب نے یُخَادِعُوْنَ اور یَخْدَعُوْنَ کے معنے ترک کرنے اور بخل امساک وغیرہ کے کئے ہیں اور وہ معنے نہیں کئے جو کہ عام طور پر کئے گئے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان معنوں کو دیکھ کر ہلاک ہونے والے فَهُوَ خَادِعُهُمْ میں ہلاک نہ ہوں ورنہ وہ معنے جو کہ عام طور پر کئے گئے ہیں۔ یہاں پر درست بھی ہیں اور واقعہ کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں جیسا خداوند کریم نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران:168)(وہ کہتے ہیں اپنے منہوں سے وہ جو کہ ان کے دلوں میں نہیں) اور یہاں پر بھی جو ان کی چال بازی بیان فرمائی ہے۔ وہ بھی اسی قسم کی ہے۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسی خفیہ تدابیر کرتے تھے کہ جن سے ظاہر تو کچھ اور معلوم ہوتا تھا اور حقیقت میں ان کا اور ہی منشا ہوتا تھا۔

پس اس کہنے میں کچھ بُعد نہیں کہ وہ اللہ اور مومنوں کے مقابلہ میں خفیہ تدبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خفیہ تدبیر نہیں کرتے مگر اپنی جانوں کے مقابلہ میں لیکن محسوس نہیں کرتے۔ یعنی وہ باوجود کافر بے ایمان ہونے کے اظہار ایمان اس خیال سے کرتے ہیں۔ تاکہ مومن لوگ ان کو مومن خیال کرکے دکھ نہ دیں۔ بلکہ ان سب کو منافع میں شریک کر دیں کہ جن میں سب اہل اسلام شریک تھے۔ لیکن خود اہل اسلام کو بھی ضرر سے بچانے والا اور نفع پہنچانے والا عالم الغیب اور قادر مطلق خدا ہی ہے۔ پس گویا وہ اس چالاکی سے خدا کے اس فضل کا مورد اور محل بننا چاہتے ہیں کہ جس کا محل سچے مومن تھے۔ نیز اس وقت خدا کا برگزیدہ اہل اسلام میں موجود تھا جس کو خداوند تعالیٰ

اپنے بہت سے غیبوں پر اطلاع بخشتا تھا اور اس کے مخلص خدام کی تائید ونصرت پر کمربستہ تھا۔ اور یہ ممکن تھا کہ خداءِ عالم الغیب ان کی پوشیدہ چالاکی پر اپنے برگزیدہ حبیب کو مطلع کر دے اور ایسا نہ تھا کہ منافقوں کو اس کا خیال نہ ہو۔ بلکہ وہ اس امر کو خوب جانتے تھے بلکہ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں خدائے عالم الغیب ہمارے مافی الضمیر پر مومنوں کو متنبہ نہ کر دے۔

چنانچہ خداوند کریم نے ان کی اس حالت کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچتے ہوئے یوں فرمایا ہے۔ یَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَیۡہِمۡ سُوۡرَۃٌ تُنَبِّئُہُمۡ بِمَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ (التوبۃ:64) (منافق ڈرتے رہتے ہیں کہ مومنوں پر کوئی ایسی سورت نہ نازل کی جائے جو کہ ان کو ان باتوں پر متنبہ کر دے جو کہ ہمارے دلوں میں ہیں) پس باوجود اس کے مومنوں سے یہ چالاکی کرنی گویا خدا سے کرنی ہے اور یہ ان کی اعلیٰ درجہ کی بے وقوفانہ حرکت تھی۔ پھر خصوصًا جبکہ یہ چالاکی خود انہی کی طرف عائد ہوتی تھی۔ کیونکہ اس چالاکی سے جب انہوں نے چند روز کے لئے یہ دیکھا کہ ہم نے مومنوں کو بھی راضی کر لیا ہے اور کفار کو بھی تو یہ خیال کرنے لگے کہ ہم نے بڑی دوراندیشی کی ہے۔ جس سے دونوں فریق ناواقف ہیں اور ہم بڑے عمدہ اور بے خطر طریق پر ہیں جیسا کہ آیا ہے۔ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ (المجادلۃ:19) (اور خیال کرتے ہیں کہ ہم عظیم الشان امر پر ہیں) اور یہی وہ حالت ہے کہ جس کو قرآن مجید نے زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ (الانفال:49) (اور خوب صورت کر دکھائے شیطان نے ان کو ان کے اعمال) اور جن لوگوں کی بدقسمتی سے یہ شیطانی تزیین نصیب ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے حق کے پانے سے محروم اور بے نصیب رہتے ہیں۔

لہٰذا منافق لوگ اسی چالاکی کے بد اثر سے حق سے بے بہرہ رہیں گے اور اس چالاکی پر جس اثر کے مرتب ہونے کے وہ امیدوار تھے اور ابتداء میں کچھ کچھ اس کے ترتب کے آثار بھی مشاہدہ کر کے کامیابی کے قریب الحصول ہونے سے خوش ہوتے تھے آخر وہ اثر بھی مرتب نہ ہوا۔ بلکہ یوں ہوا کہ عالم الغیب نے ان کے سارے تانے بانے کو طشت از بام

افتادہ کر کے پہلے تو وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد:31) (اور ضرور تو شناخت کر لے گا ان کو بات کے لہجے میں) فرمایا۔ اور پھر ان کی سب امیدوں پر پانی پھیر کر حکم دے دیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبۃ:73) (اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر) یہ ہے مطلب ان معنوں کا جو کہ عام طور پر کئے گئے ہیں۔ ہاں اگر ان میں کچھ نقص ہے تو یہی ہے کہ بد قسمتی سے اور اردو زبان کے محدود ہونے سے خداع اور مکر کا ترجمہ دھوکے اور فریب سے کیا گیا ہے اور یہ دونوں برے معنوں میں یعنی اس خفیہ تدبیر میں مستعمل ہوتے ہیں جو بری ہو اور بد نیتی پر مبنی ہو۔

تو اگرچہ یہاں پر ان معنوں کے لحاظ سے بھی کچھ برائی اور قباحت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ یہاں پر منافقوں کا ذکر ہے اور ہے بھی بطور مذمت لیکن جب یہاں پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ دھوکا دیتے ہیں۔ اللہ کو اور ان کو جو ایمان لائے۔ حالانکہ وہ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو (یا یوں کہو کہ اپنے آپ کو) اور پھر خداع کا استعمال خداوند کریم کے لئے بھی آیا ہے۔ جیسا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (النساء:143) تو نادان دشمنان اسلام خدا کی شان اور باقی قرائن اور قواعد زبان کو پس پشت ڈال کر یہی ترجمہ وہاں پر کر کے (کہ منافق لوگ اللہ کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکا اور فریب دینے والا ہے) جھٹ بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ کہ واہ جی قرآن کا خدا (نعوذ باللہ منہ) دھوکا باز اور فریبی ہے لیکن میں نے ابھی بتایا ہے کہ عربی زبان میں اس کے معنے خفیہ تدبیر کے ہیں اور فریب اور دھوکہ کی مانند برے محل سے مخصوص نہیں اور اس کا کھلا کھلا قرینہ یہ ہے کہ ان مشرکوں اور عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ نے ہرگز یہ اعتراض نہیں کیا جو کہ عربی اللسان تھے اور یہ اعتراض بھی کچھ ایسا اعتراض نہیں کہ لغت کے علاوہ کسی اور علم یا تحقیق پر مبنی ہو جس سے وہ لوگ بے خبر ہوں۔

پھر علاوہ اس کے میں نے بتایا ہے کہ ہر زبان کا قاعدہ یہی ہے۔ کہ جس کے متعلق بات کی جاتی ہے۔ اسی کے مناسب حال معنے لئے جاتے ہیں۔ پھر موقعہ اور محل کی مناسبت کا ضروری لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر مقام مدح ہو تو اور معنے ہوں گے اور مقام

مذمت ہوا تو اور معنے کرنے پڑیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (المائدۃ:52) (بے شک اللہ ان ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا) اور اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ (البقرۃ:68) (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں جاہل لوگوں سے ہو جاؤں) میں ظلم اور جہل کا ذکر محل ذم پر ہے لہٰذا یہاں پر ظالم اور جاہل کے وہی بُرے معنے کریں گے جو کہ سب کے نزدیک متعارف ہیں۔ اور اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَھَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡھَا وَ حَمَلَھَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَھُوۡلًا (الاحزاب:73) (بے شک ہم نے وہ امانت پیش کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا کیونکہ وہ بہت ظلم کرنے والا اور بہت جہالت والا تھا۔)

میں چونکہ ظلوم وجہول جو کہ ظالم وجاہل کے مبالغہ ہیں مقام مدح پر ذکر ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر ان کے معنے بُرے نہیں کرسکتے بلکہ ایسے معنے کرنے پڑیں گے جو کہ موجب تعریف ہوں اور وہ یہ ہیں کہ انسان چونکہ خدا کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنے والا اور خدا کے لئے اپنی ذات اور اپنی خواہشات ولذات کو بھول دینے والا تھا۔ لہٰذا اس نے اس بار گراں کو برداشت کرلیا کہ جس کے اٹھانے سے آسمان وزمین اور پہاڑ عاجز آگئے تھے۔ الغرض کہ مقام کی مناسبت کا لحاظ معنے کرنے میں ضروری ہوتا ہے۔ پس چونکہ منافقوں کے لئے ذم کے طور پر خداع کا ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے ایسے معنے ہونے چاہئے جو کہ مذمت پر مشتمل ہوں۔ اور اللہ جل شانہ کے لئے مذمت کے طور پر ہرگز مذکور نہیں لہٰذا وہاں پر ہرگز ایسے معنے نہ ہونے چاہئے جو موجب مذمت ہوں پھر میں نے بتایا ہے کہ عربی زبان میں جزاء فعل پر بھی وہ لفظ بولتے ہیں جو کہ فعل پر بولا جاتا ہے۔

چنانچہ اس کی ایک مثال تو میں نے پہلے بیان کی ہے اور دوسری یہ ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُھَا (الشوریٰ:41) (بدی کی سزاء اس کی مثل بدی ہے) دیکھو کہ بدی کو جس طرح

سَیِّئَۃٌ کہا جاتا ہے یہاں پر اس کی جزاء کو جو اس کی مثل ہے نہ مقدار میں زیادہ ہے اور نہ کیفیت میں اس سے شدید ہے سَیِّئَۃٌ کہا گیا ہے۔ جس کے اصلی معنے بدی کے ہیں۔ حالانکہ حقیقۃً ایسی جزاء میں کسی طرح کی برائی نہیں ہے تاکہ اس کو سَیِّئَۃٌ یا بدی کہا جائے۔ علی ہذا القیاس نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمْ (التوبۃ:67)(انہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ لہٰذا خدا نے ان کو بھلانے کی سزا دی) کیونکہ نسیان خدا کی شان سے نہیں پس یا تو نسیان بمعنے ترک لینا چاہئے یا جو خدا کی طرف منسوب ہے وہ بمعنے جزاء نسیان لیا جائے۔ پس باوجود اس قدر وجوہات کے جو پھر بھی تعصب کے سیاہ گڑھے سے باہر قدم نہیں رکھتا وہ بے شک یا ان لوگوں سے ہے کہ جن کے حق میں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (البقرۃ:7) (بے شک جو ایسے کافر ہوئے کہ ان پر تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہیں ایمان نہ لائیں گے) آیا ہے یا جن کے حق میں صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَہُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (البقرۃ:19) (بہرے، گونگے، اندھے ہیں لہٰذا رجوع نہ کریں گے) آیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ دھرم پال نے جہاں پر یہ اعتراض لکھا ہے وہاں پر ان الفاظ کی گردان لکھی ہے تاکہ یہ بتائے کہ جب ایک ہی گردان کے دو لفظ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک کے اور معنے ہوں اور دوسرے کے اور ہوں حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ایک گردان کے دو لفظ کیا بلکہ ایک ہی لفظ کے محل اور مقام اور قرائن اور مخاطب اور متکلم کے لحاظ سے کئی کئی مختلف معنے ہوتے ہیں کیا اگنی وغیرہ کے معنے ہمیشہ خدا کے ہوتے ہیں کہ ان کے راہبر گوماتا کے فرزند نے وید میں ان الفاظ کے معنے خدا کے کئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ لیکن دھرم پال نے ہٹ دھرمی میں آکر قرآن مجید پر اعتراض کرنے کے لئے یہ کہہ دیا کہ ایک گردان کے دو لفظوں کے بھی جدا جدا دو معنے نہیں ہوسکتے خواہ دونوں کے محل اور مقام میں کیسا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ اور ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ ایک گردان کے دو لفظ کیا ایک ہی لفظ کے محل اور متکلم اور مخاطب کے لحاظ سے بالکل جدا معنے لئے جاتے ہیں اور یہ کوئی عربی زبان کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر ایک زبان میں ایسا ہی پایا جاتا ہے اور جب سب زبانوں کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے تو پھر عاجز محتاج بندہ کو ذوالجلال اور

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ[1] (الشوریٰ:12) خدا کے ساتھ عظمت کے تخت پر بٹھلانا بجز ایک نادان جاہل ناشکر اور ناقدر شناس مشرک کے اور کون کر سکتا ہے جو کہ ہمیشہ سے خدا کے لئے شریک تجویز کرنے کا عادی ہوتا ہے۔

اور جس طرح متقی یا یوں کہو کہ ایمان لانے والے لوگوں کی نسبت خداوند کریم نے چند صفات بیان فرما کر یہ بتایا تھا کہ مومن لوگ قوت نظریہ اور قوت عملیہ اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایمان نہ لانے والوں کی دونوں گروہوں کی نسبت خَتَمَ اللّٰہُ الخ اور وَمَا يَشْعُرُوْنَ فرما کر یہ بتادیا ہے کہ ان لوگوں کی قوت نظریہ اپنی شامت اعمال سے بالکل مفقود ہو جاتی ہے لہٰذا یہ لوگ پرلے درجے کے ڈبل احمق اور بے وقوف اور جاہل ہوتے ہیں حتی کہ شعور تک بھی نہیں رکھتے۔

[1]۔اس جیسی کوئی چیز نہیں۔(تفسیر صغیر)

آیت 11: فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) یہ الفاظ کچھ زیادہ تشریح کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان الفاظ کو اردو دان لوگ بھی اپنے روزمرہ کے بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ہم پھر بھی ان کے معانی بیان کر دیتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

فِیۡ۔ بمعنے بیچ اور میں کے ہے۔ قُلُوۡبٌ۔ قَلْبٌ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں دل۔

ھُمْ۔ کے معنے ہیں، ان کے۔ مرض بمعنے بیماری ہے۔

ف۔ لہٰذا۔ زَادَ۔ کے معنے ہوتے ہیں زیادہ ہوا لیکن بعض اوقات بمعنے زیادہ کیا کے آتا ہے اور یہاں پر بھی یہی معنے ہیں۔ ھُمْ۔ بمعنے ان کے ہے۔

اَللّٰہُ۔ کے معنے بہت دفعہ بیان ہو چکے ہیں یعنی وہ ذات جو کہ سب صفات کمال کے لئے جامع ہے۔

سب کا ترجمہ یہ ہوا (ان کے دلوں میں بیماری تھی لہٰذا اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی) رہا یہ کہ وہ کیا بیماری تھی اور اس میں کیا زیادتی ہوئی۔ حضرت مولٰنا صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔

(حکیم الامت رضی اللہ عنہ) فرمایا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن مسعود سے اور اور بہت سے صحابہ کرام سے یہی مروی ہے کہ مرض سے مراد شک ہے یعنی ان کے دلوں میں شک کا مرض تھا یا بزدلی اور صادق و کاذب اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والی قوت کی کمی کی بیماری تھی۔ یا حسد کی بیماری تھی۔ جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقبال اور رفعت شان کو دیکھ دیکھ کر حسد اور غم کی آگ سے جل جاتے تھے۔ اور فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا دعا اور بشارت ہے۔ پس اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا (پس اللہ ان کی بیماری کو زیادہ کرے) پس وہ بزدل ہو گئے قلیل جماعت سے حالانکہ وہ روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور تھوڑے سے مسائل کو امتیاز نہ کر سکے حالانکہ وہ زائد ہو رہے ہیں۔ **(محمد سرور عفی اللہ عنہ)**

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 7 بابت ماہ جنوری 1907ء صفحہ 245 تا 276)

خدا نے ہر گز کفار کے مرض کو زائد نہیں کیا:

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا جیسا کہ دعا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ اخبار بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کا ترجمہ یہ ہو گا (لہٰذا اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی ہے) یعنی چونکہ ان کے دلوں میں پہلے مرض تھا لہٰذا خداوند کریم نے ان کے مرض کو زائد کر دیا مثلاً وہ پہلے تھوڑی سی جماعت کے مقابلہ میں بزدلی دکھاتے تھے تو اب خداوند کریم نے اس جماعت کو بہت کچھ زیادہ کر کے ان کی بزدلی کو اور زیادہ کر دیا۔ اسی طرح پہلے تھوڑے سے مسائل میں ان کی قوت فیصلہ دنگ تھی تو اب خداوند کریم نے بہت سے احکام اور مسائل نازل فرما کر ان کی قوت فیصلہ کو اور بھی حیرت میں ڈال دیا ہے اور اہل اسلام کی تھوڑی سے ترقی کو دیکھ کر وہ جلا کرتے تھے تو اب خداوند کریم نے مخلصین کی جماعت کو ہر ایک پہلو میں رنگارنگ ترقیات کثیرہ اور عظیمہ عنایت فرما کر ان کے جلن اور جہنم کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہاں پر بھی دشمنان اسلام نے ویسا ہی اعتراض کیا ہے جیسا کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ [1] الخ پر کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تو کریم رحیم ہونا چاہئے جو کہ شفا بخشے نہ یہ کہ پہلے مرض کو اور بھی ایزاد کرے۔ نیز جب خدا نے خود ان کے مرض کو ایزاد کیا ہے تو پھر ان غریبوں کا قصور ہی کیا ہے کہ ان کو جہنم بلکہ جہنم کے نچلے درجہ میں ڈالا جاتا ہے کیا وہ خدا سے زور آور ہیں کہ خدا تو ان کی مرض کو بڑھائے اور وہ گھٹا سکیں۔ پس یہ صورت سزا اور عذاب علاوہ خلاف رحم و کرم ہونے کے خلاف عقل بھی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سب دنیا جانتی ہے کہ دنیا میں جس قدر اشیاء ہیں خداوند کریم نے ان میں مخلوق کے لئے بڑے بڑے فائدے رکھے ہوئے ہیں لیکن جب کوئی انسان اپنی کسی غلط کاری اور بے احتیاطی سے اپنی خداداد صحت و تندرستی کو کھو بیٹھتا ہے تو پھر بہت سی ایسی چیزیں جو کہ صحت کی حالت میں اعلیٰ درجہ کی مفید اور لذیذ ہوتی ہیں۔ اس مریض شخص کے لئے سخت مضر اور مزید مرض ہوتی ہیں۔ پس اگر کوئی ایسی چیزوں کو استعمال کرے گا یا قدرتاً ایسی چیزیں اس کے شامل حال ہوں گی۔ جیسے نمونیا کے مریض پر نہایت

[1] ۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ (تفسیر صغیر)

سرد محل اور سرد موسم میں برف کا زور سے برسنا تو ضرور اس کی مرض زائد ہو گی اور ایسی حالت میں اس پر صادق آئے گا کہ وہ پہلے سے مریض تھا اور اب خدا نے اس کی مرض کو اور بھی زائد کر دیا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی شخص میں حسد اور بغض کا مرض ہوتا ہے تو وہ اپنے دشمن کو خوش و خرم دیکھ کر جلا کرتا ہے اور جب خداوند کریم اپنے فضل و کرم سے اس کی عزت و جاہ اور مال و دولت میں ایزاد فرماتا ہے تو حاسد کا حسد اور جلن بہت بڑھ جاتا ہے اور ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے جل رہا تھا اور اب خداوند کریم نے فلاں فلاں امر سے اس کے جلن کو اور بھی زائد کر دیا ہے۔

پس یہ وہ امور ہیں کہ جن کی تسلیم سے معترض صاحب اور اس کے مذہب کے لئے کوئی مضر باقی نہیں ہے لیکن تعجب کی بات ہے خداوند کریم کی اس سنت عامہ اور مستمرہ پر یا اس کی کسی جزوی مثال پر تو اس نے کبھی اعتراض نہ کیا اور جب قرآن مجید میں منافقوں کے حق میں یہی سنت بیان فرمائی تو معاً اعتراض کر دیا حالانکہ مذکورہ بالا صورتوں میں اور اس صورت میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت کی ذات بابرکات اور خداوند تعالیٰ کی پاک وحی اور پاک شریعت دنیا کے لئے اعلیٰ درجہ کی مفید چیز تھی جیسا کہ عرب کی پہلی اور پیچھے کی حالت پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے لیکن منافقوں نے اپنی غلط کاریوں اور شرارتوں سے اپنی فطرت خداداکی صحت کا وہ ستیاناس کیا ہوا تھا کہ باوجود اعلیٰ درجہ کی مفید اور بابرکت ہونے کے ان کے لئے ایزاد مرض کا موجب ہوئیں پھر ان میں حسد کا مرض تھا تو جوں جوں خداوند تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو ترقی دیتا گیا توں توں ہی وہ کمبخت شیخ سعدی کے اس قول کا مصداق بنتے گئے ع کہ

حسود را چہ کنم کو ز خود بر نج در ست [1]

یہ تو وہ ہے جو کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے لیکن میرا اپنا خیال ہے جو مرض ان کے دلوں میں تھا وہ جھوٹ کا مرض تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خداوند کریم نے

[1]۔ میں حاسد کا کیا کروں وہ تو خود بخود رنج میں ہے۔ (از مرتب)

ان کے مرض کے بیان کے بعد متصل یہ فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (البقرۃ: 11) وَاوٗ بمعنے اور۔

لَ۔ کے معنے واسطے۔ هُمْ۔ ان۔ عَذَابٌ۔ دکھ۔ اَلِيْمٌ۔ دردناک۔ بِ۔ بسبب۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) بَاء بمعنے سبب کے ہے اور ما مصدریہ ہے (جو کہ اپنے مابعد کے فعل کو بمعنے مصدر بنا دیتی ہے) اور کان کا مصدر کون ہے اور یہ لغت عرب میں مستعمل ہے۔ اور کان دوام واستمرار کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا۔ (اللہ ہمیشہ جاننے والا ہے)

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) يَكْذِبُوْنَ۔ كِذْبٌ سے ہے۔ جس کے معنے ہیں جھوٹ۔

کل کا ترجمہ یہ ہوا اور ان کے لئے دردناک دکھ ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ جھوٹ بولتے تھے پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں جھوٹ کا مرض تھا۔ اور خداوند کریم نے اب اس کو بڑھا دیا اور بڑھایا اس طرح کہ دعوت اسلام سے پہلے تو وہ لوگوں کی معمولی خانہ جنگیوں میں جھوٹ بول کر فریقین کی طرفداری اور مددگاری کا دم بھرا کرتے تھے تاکہ دونوں کی نظروں میں عزیز ہو جاویں اور اب تو اہل اسلام اور کفار میں عظیم الشان جنگ چھڑی ہے جس میں خانہ جنگیوں کی نسبت بہت بڑھ کر جھوٹ کی ضرورت وہ خیال کرتے اور جھوٹ بولتے تھے۔ پس یہی مرض تھا اور یہی اس طور پر زائد کیا گیا کہ ان کی خیالی ضرورتِ جھوٹ کو زائد کر دیا۔ اور اسی میں خداوند علیم وحکیم نے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیا ہے کہ وہ مرض لوگوں کو راضی کرنے کے لئے جھوٹ بولنے کی عادت تھی اور اب چونکہ خداوند کریم نے اسلام کی جماعت کو ترقی دی ہے اور سنت اللہ کے مطابق سب باطل پرست حق کے مقابلہ پر کمربستہ ہوگئے ہیں تو اس گندی عادت کے باعث ان کو زیادہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور یہ ان کا اپنا قصور ہے خداوند کریم کی طرف کوئی نقص یا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے یہاں پر فرمایا کہ انسان کو جھوٹ سے بہت ہی بچنا چاہئے دیکھو کہ نفاق جیسے گندے گناہ اور مرض کا سبب بھی یہی جھوٹ ہے پھر

نفاق بھی ایسا کہ جس کی نسبت فرمایا ہے۔ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (پس وہ رجوع نہ کریں گے) اور جہاں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کے علامات بیان فرمائے ہیں۔ وہاں پر فرمایا ہے کہ منافق کے پاس جب امانت رکھو تو خیانت کرے گا اور جب جھگڑتا ہے تو گالی گلوچ دیتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف کرتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ اور قرآن مجید میں جھوٹ بولنے والوں پر لعنت آئی ہے اور آنحضرتؐ سے جب دریافت کیا گیا کہ مومن سے فلاں فلاں گناہ ہوسکتے ہیں فرمایا ہاں لیکن جب جھوٹ کی نسبت دریافت کیا گیا تو فرمایا نہیں۔

(الدر المنثور فی التفسیر بالماثور جلد 5 صفحہ 168 سورۃ النحل آیت 103 دار الفکر بیروت)

الغرض کہ جھوٹ بہت برا مرض ہے مومن کو اس سے ہمیشہ بہت ہی بچنا چاہئیے۔

جسمانی اور روحانی قویٰ کا مرکز:

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) ناظرین کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک محل پر وعدہ کیا تھا کہ جو نزاع دل اور دماغ کے مرکز قویٰ ہونے میں ہے اس کا فیصلہ آئندہ پیش کروں گا تو چونکہ یہاں پر قلوب کا ذکر آیا ہے بلکہ قلوب ہی کو نفاق کا مرکز گردانا گیا ہے۔ لہٰذا میں مختصر طور پر یہاں پر بیان کر دیتا ہوں۔ متقدمین فلاسفروں کا اعتقاد اور آج کل کی نئی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ قویٰ کا مرکز دماغ ہے اور کل انبیاء اور صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قویٰ کا مرکز قلب ہے۔ اس گروہ کے متاخرین بعض اتباع نے گو فریق ثانی کے دلائل اور اعتراضوں سے دب کر قلب کے کچھ ایسے معنے بتائے ہیں جو کہ پہلے مذہب سے تطبیق کھاتے ہیں لیکن یہ بہت بعید تاویل ہے جو کہ نقل صحیح اور لغت کے خلاف ہے۔ فریقین نے اپنے اپنے مذہب کے دلائل بیان کئے ہیں۔ فریق اوّل نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ دماغ کے خلل سے قویٰ میں خلل آتا اور دماغ کی درستی سے قویٰ کا درست ہونا اس بات کا شاہد ناطق ہے کہ مرکز قوی دماغ ہے۔ نیز چونکہ قویٰ کے حامل پٹھے ہیں اور ان کا مرکز دماغ ہے لہٰذا مرکز قویٰ بھی دماغ ہی ہونا چاہیئے۔ فریق ثانی کے متاخرین اتباع نے ایک تو یہ وجہ بیان کی ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قلب مرکز ہے۔ اور انبیاء کے علوم کی بناء کسی انسانی

من گھڑت پر نہیں ہوتی۔ بلکہ براہ راست عالم الغیب اور حکیم خدا سے لیتے ہیں۔ اس لئے ممکن نہیں کہ ان کے علوم اور خصوصاً متفق علیہ علوم میں کسی طرح کی غلطی ہو۔

پھر انبیاء کے سوا ہم اور دنیا کو دیکھتے ہیں کہ حب وبغض وغیرہ امور کو قلب ہی سے متعلق بیان کرتے ہیں اور تجربہ بھی گواہ ہے کہ ان امور کے باعث جو کیفیات عارض ہوتی ہیں وہ بھی قلب پر ہی عارض ہوتی ہیں اور دنیا بھی ان کو قلب ہی کی طرف منسوب کرتی ہے اور دماغ کے خلل اور صحت سے قویٰ کا خلل ناک یا درست ہونا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ ان کا مرکز دماغ ہے کیونکہ آلات وغیرہا میں نقص آنے سے بھی فعل میں نقص آجایا کرتا ہے مثلاً آنکھ کے ذریعہ سے جو علوم حاصل ہوتے ہیں فلاسفروں کے نزدیک ان کا مرکز آنکھ کا کوئی پردہ یا پانی نہیں ہے لیکن آنکھ کے اجزاء کے خلل سے ان علوم میں خلل آجاتا ہے اور ان کی صحت سے یہ علوم صحیح ہوتے ہیں الغرض کہ فریقین کی طرف سے اس قسم کی بہت کچھ لے دے ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ محققین کے مابین نزاع حقیقی نہیں ہوتا بلکہ لفظی ہی ہوتا ہے جو کہ فقط لفظوں کی تشریح سے ختم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح عقل صحیح اور نقل صحیح میں بھی حقیقی نزاع اور مخالفت نہیں ہوتی اور جہاں کہیں بظاہر تخالف نظر آتا ہے تو وہ تخالف لفظی ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ناسمجھی کا نتیجہ ہوتا ہے اور بس۔ اور یہاں پر بھی ایسا ہی ہے ایک طرف تو سب انبیا علیہم السلام قلب کو مرکز قرار دیتے ہیں اور ایک طرف پرانی اور نئی تحقیق اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ دماغ مرکز ہے اور بظاہر دونوں نہایت متخالف امور ہیں حالانکہ نقل اور عقل صحیح کا قاعدہ چاہتا ہے کہ ان کے درمیان تخالف ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی ہے یہی کہ ان دونوں میں بالکل تخالف نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قویٰ ایک عام لفظ ہے جو کہ قویٰ جسمانیہ اور قویٰ روحانیہ کے سب اقسام پر بولا جاتا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ جسمانی لوگ (جو کہ جسمانی قویٰ سے بحث کرنے والے ہوتے ہیں) جب قویٰ کا لفظ مطلق سوا کسی قید کے بولتے ہیں تو اس سے قوت جسمانیہ مراد ہوتے ہیں اور روحانی لوگ (جو کہ روحانی امور اور

روحانی قویٰ سے بحث کرتے ہیں) جب اس لفظ کو مطلق بغیر کسی قید کے ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد قویٰ روحانیہ ہوتے ہیں۔ تو چونکہ فلاسفر لوگ جسمانی ہوتے ہیں لہٰذا ان کے کلام میں قویٰ سے مراد قویٰ جسمانیہ ہوتے ہیں اور انبیاء اور صوفیا چونکہ روحانی لوگ ہوتے ہیں لہٰذا ان کے کلام میں قویٰ سے مراد قویٰ روحانیہ ہوتے ہیں۔

پس اس قاعدہ کے موافق ان دونوں قولوں کا مطلب یہ ہوا کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ قویٰ جسمانیہ کا مرکز دماغ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کہتی ہے کہ قویٰ روحانیہ کا مرکز قلب ہوتا ہے اور ان دونوں میں کوئی تخالف نہیں کیونکہ فلاسفروں نے قویٰ جسمانیہ کا حال بیان کیا ہے اور قویٰ روحانیہ سے سکوت کیا اور ان کی نسبت کچھ بھی نہیں بتایا۔ اس لئے کہ ان کو روحانی قویٰ سے کچھ سروکار نہیں ہے اور نہ وہ ان کے زیر بحث ہیں۔ ان کے زیر بحث فقط جسمانی قویٰ تھے اور ان کی نسبت بتادیا کہ ان کا مرکز دماغ ہے اور انبیاءؑ نے روحانی قویٰ کا مرکز قلب کو قرار دیا ہے اور قویٰ جسمانیہ سے سکوت اختیار کیا ہے اس لئے کہ ان کے زیر بحث فقط روحانی قویٰ ہیں جن کا حال انہوں نے بیان کر دیا ہے اور جسمانی قویٰ سے چونکہ ان کو کچھ سروکار نہیں لہٰذا انہوں نے ان کو چھیڑا تک نہیں ہے۔ الغرض کہ جن کا مرکز دماغ بتایا گیا ہے انبیاءؑ نے ان کے اس مرکز سے انکار نہیں کیا اور جن کا مرکز قلب قرار دیا ہے۔ فلاسفروں نے ان کے لئے قلب کے مرکز ہونے سے انکار نہیں کیا۔ اور یہ بالکل صحیح بات ہے کیونکہ جس طرح جسمانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ شہادت دیتا ہے کہ قویٰ جسمانیہ کا مرکز دماغ ہے۔

اسی طرح سب روحانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ بالاتفاق شہادت دیتا ہے کہ روحانی قویٰ کا مرکز قلب ہے اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ جس امر کا وہ اہل نہ ہو اس امر کے متعلق اہل مشاہدہ اور اصحاب تجربہ کے تجربہ اور مشاہدہ کا انکار کرے۔ نیز جس طرح یہ امر صحیح ہے کہ حس و حرکت کا تعلق پٹھوں سے ہے اور پٹھوں کا مرکز دماغ ہے۔ اسی طرح یہ بھی سچی بات ہے کہ روحانی امور کا تعلق روح انسانی سے ہے اور روح انسانی کا مرکب روح طبّی ہے۔ جس کا اصل تعلق قلب سے ہے۔ پس اس طریق سے بھی یہی فتویٰ دینا پڑتا ہے کہ یہ دونوں دعوے بجائے

خود صحیح ہیں اور ان میں کسی قسم کا تخالف تعارض ہر گز نہیں ہے۔ یہاں پر اسی قدر لکھنا کافی خیال کرتا ہوں۔ انشاءاللہ تعالیٰ کسی دوسرے محل پر اس کی اور توضیح کر دوں گا۔

اس بحث سے ناظرین یہ فائدہ قاعدہ کلیہ کے طور پر ملحوظ رکھیں کہ جہاں کہیں عقل صحیح اور نقل صحیح میں تخالف دیکھیں وہاں پر جلدی سے کسی ایک طرف کی تکذیب و تغلیط نہ کر دیں بلکہ توقف کریں اور ان کے اتفاق اور جمع کی راہ بڑی غور سے تلاش کریں۔ اسی قاعدہ قویہ کے ملحوظ نہ رکھنے سے جلد باز لوگوں نے سائنس کے دباؤ کے نیچے آکر مذہب بلکہ صحیح اور قوی مذہب کو جواب دے دیا ہے اور اگر وہ اس قاعدہ کو اپنا دستور العمل بناتے تو اوّل ضرور ان پر تطبیق کی راہ کھل جاتی ورنہ تو کم از کم اس شدید ٹھوکر کے شکار جاودانی ہونے سے بچ جاتے اور اپنی جلد بازی سے ہلاکت کے گھڑے بلکہ سیاہ گھڑے میں نہ گرتے مَنْ يَّهْدِى اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔

(سنن ابی داؤد کتاب الصلاۃ باب الرجل یخطب علیٰ قوس حدیث 1097)

(جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو کوئی بے راہ نہیں کرنے والا۔ اور جس کو اللہ بے راہ قرار دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔)

آیت12-13: وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ. اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ.

(محمد سرور عفی اللہ عنہ)

وَ۔ اور۔ اِذَا۔ جب۔

قِيۡلَ۔ قَوۡلٌ سے ہے اور میں نے پہلے بتایا ہے قول مطلق اظہار کو کہتے ہیں خواہ زبان سے ہو یا اشارات وافعال سے یا حال سے ہو۔ اور قِيۡلَ کے معنے ہوئے ظاہر کیا گیا یا کہا گیا اور اہل زبان نے لکھا ہے کہ قول کے بعد جب حرف لام آجائے تو اس کے معنے خطاب کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس لام کو لام خطاب یا لام تبلیغ کہتے ہیں یعنی اس کو خطاب کرنا یا اس تک بات کو پہنچانا جو کہ حرف لام کے بعد مذکور ہوتا ہے۔

اور اِذَا کی نسبت اہل زبان نے لکھا ہے کہ یہ جس فعل پر آئے اس کو استقبال یعنی آئندہ زمانہ کے معنوں میں کر دیتا ہے۔ اور حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ نے اِذَا کے متعلق فرمایا ہے کہ اِذَا ظرف زمان ہے۔ اور مبرد کے نزدیک ظرف مکان ہے۔ اور شرط کے معنے اس کے ساتھ لازم ہیں یعنی ہمیشہ اس کے بعد شرط وجزاء آتی ہے لیکن گاہے گاہے شرط کے لئے نہیں آتا جیسا کہ ان دو آیتوں میں ہے۔ اِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ يَغۡفِرُوۡنَ [1](الشوریٰ:38) اور اِذَآ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡىُ هُمۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ [2](الشوریٰ:40) اور ہمیشہ استقبال یعنی آئندہ زمانہ کے لئے آتا ہے اور کبھی اس سے خالی بھی آتا ہے جیسا کہ ان آیتوں میں ہے۔ وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَا ِۨ انۡفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا (الجمعۃ:12)(اور جب دیکھی انہوں نے (یا دیکھتے ہیں) اور اِذَا مَاۤ اَتَوۡكَ لِتَحۡمِلَهُمۡ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحۡمِلُكُمۡ عَلَيۡهِ (التوبۃ:92) (جب آئے تیرے پاس تاکہ تو ان کو سوار کر دے تو تُو نے کہا میرے پاس کچھ نہیں کہ جس پر تم کو سوار کروں) اور یہ بات بھی اس کے ساتھ لازم ہے کہ اس کی شرط ایک محقق اور یقینی یا امر راجح اور غالب ظن والا امر ہوتا ہے۔

---

[1]۔ جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ جب ان پر کوئی ظلم ہوتا ہے تو وہ بدلہ تو لے لیتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

لَا کے معنے ہیں نہ۔ تُفْسِدُوْا فَسَادٌ سے ہے جو کہ اردو زبان میں بھی خرابی اور بگاڑ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ فِیْ۔ بمعنے بیچ ہے۔ ال۔ اس۔ اَرْضِ۔ زمین۔

قَالُوْا۔ بھی قول سے ہے اور اس کے معنے ہیں کہا یا ظاہر کیا انہوں نے۔ لیکن اِذَا چونکہ استقبال یعنی آئندہ زمانہ کے لئے آتا ہے لہٰذا یہاں پر اس کے معنے ہوں گے۔ وہ کہیں گے۔

اِنَّمَا۔ کے معنے ہیں ضروری اور سواء اس کے اور کچھ نہیں۔ نَحْنُ۔ ہم۔

مُصْلِحُوْنَ۔ اِصْلَاحٌ سے ہے جس کے معنے ہیں سنوار اور درست کرنے کے اور انہی معنوں میں اردو زبان میں بھی یہ مستعمل ہے۔ اور اس کے معنے ہیں سنوار کرنے والے۔

اَلَا۔ یہ ایک کلمہ ہے جس کے ساتھ دوسرے کو ہوشیار کیا جاتا ہے تاکہ مابعد کے کلام کو ہوشیاری سے سنے۔ اور یہاں پر بھی اسی واسطے آیا ہے اور کبھی یہ توبیخ اور ملامت کے لئے آتا ہے۔ اور کبھی یہ آمادہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ اور جب پہلے طور پر آئے تو اس وقت اس کے معنے خبردار یا ہوش سے سنو کئے جاتے ہیں۔

اِنَّ۔ بے شک ضرور۔ هُمْ۔ هُمْ وہی۔

ال۔ کامل۔ مُفْسِدُوْنَ۔ فساد کرنے والے۔

وَ۔ حرف عطف ہے جس کے معنے اور ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ واؤ لٰکِنْ کے ساتھ آتا ہے تو چونکہ وہ بھی حرف عطف ہے جس کے معنے لیکن، مگر، پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت وَ کے معنے اور کے نہیں ہوتے بلکہ محض تاکید کے لئے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قواعد زبان والوں نے اس واؤ کو زائد کہا ہے لیکن یاد رہے کہ جہاں کہیں یہ لوگ کسی لفظ کو زائد کہتے ہیں تو اس سے ان کی یہ مراد نہیں ہوتی کہ یہ بے معنے اور بے فائدہ اور لغو طور پر لایا گیا ہے بلکہ اس سے ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ جو معنے اس کے اور مقاموں میں لئے جاتے ہیں وہ یہاں پر نہیں لئے گئے بلکہ محض تاکید وغیرہ اور فوائد اور اغراض کے لئے لایا گیا ہے۔ اور یہاں پر بھی زائد کہنے کا یہی مطلب ہے کہ وَ اپنے اصلی معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ لٰکِنْ کی تاکید کے لئے آیا ہے۔ اور اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ وَ یہاں پر بالکل بے معنے اور بے فائدہ مذکور ہوا ہے۔

پس اکیلے لٰکِنْ کا ترجمہ اردو زبان میں مگر یا پر یا لیکن ہوتا ہے اور وَلٰکِنْ کا ہاں مگر۔ یا ہاں پر۔ یاہاں لیکن آتا ہے۔

لَا۔ نہیں۔

یَشْعُرُوْنَ۔ شُعُوْرٌ سے ہے جس کی نسبت میں نے پہلے بتایا ہے کہ اس علم کو کہتے ہیں جو کہ حواس ظاہرہ یعنی آنکھ، کان، زبان وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس یَشْعُرُوْنَ کے معنے ہوئے محسوس کرتے ہیں یا کریں گے۔

تو ان معنوں کے رو سے کل ترجمہ یہ ہوا (اور جب ان پر ظاہر کیا جائے (یا ان کو خطاب کیا جائے یا ان تک یہ پہنچایا جائے) کہ فساد نہ کرو اس زمین میں تو کہیں گے ضرور ہم تو سنوار کرنے والے ہیں۔ ہاں ہاں ضرور ٹھیک یہی کامل مفسد ہیں۔ ہاں مگر محسوس نہیں کرتے۔)

(حضرت سیدی حکیم الامت رضی اللہ عنہ) یہ عطف ہے مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ الخ پر۔ پس اوّل میں تو کمال ایمان کا ادعاء ہے اور دوم میں کمال اصلاح کا ادعا ہے گویا وہ کہتے ہیں کہ ہم کامل ایمان اور کامل اصلاح والے ہیں اور اس زمین سے مراد مدینہ منورہ کی زمین ہے۔ اور جن کو کہا جاتا ہے یا کہا جائے وہ تو منافق ہی ہیں ہاں کہنے والوں کا یقینی پتہ نہیں لگتا کہ وہ کون ہیں آیا اہل اسلام ان کو یہ کہتے تھے کہ مدینہ کی سرزمین میں فساد نہ کرو یا کہ کفار ان کو یہ کہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کہنے والے کفار ہیں اور ان کے نزدیک منافق لوگ یہ فساد کرتے تھے کہ اہل ایمان کے پاس جاتے اور ان سے باتیں چیتیں کرتے ہیں تو ان کے اس ملاپ کو فساد قرار دے کر اس سے منع کرتے ہیں کہ تم ان سے کیوں ملتے ہو۔ اور جب ان کی اس ممانعت سے وہ باز نہ آتے تو پھر وہ کہتے کہ اچھا پھر تم بھی ان معروف لوگوں کی مانند ایمان لے آؤ اور منافق ان کو جواب میں کہتے کہ کیا ہم بھی ان نادانوں کی طرح ایمان لائیں چنانچہ ان کا یہ سوال وجواب بھی اس کے بعد متصل بدیں الفاظ خداوند علیم نے بیان فرمایا ہے کہ

آیت14: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ۔

(اور جب ان کو کہا جائے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ وہ لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں گے کیا ہم ان کی مانند ایمان لائیں جو کہ نادان ہیں۔)

منافق مومنین سے کیوں ملتے ہیں؟:

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِذَا یہاں پر استقبال سے مجرد ہو اور معنے یہ ہوں اور جب کہا گیا الخ اور میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اگر کہنے والے مومن قرار دیئے جاویں تو اس میں کچھ حرج کی بات نہیں بلکہ زیادہ موزوں یہی ہے۔ اس لئے کہ مومنوں کے ساتھ منافقوں کے ملنے جلنے کو اگرچہ کفار فساد ہی خیال کرتے تھے لیکن قرآن مجید کی اور آیتوں سے ثابت ہے کہ منافق لوگ اس بات کا ان کو یہ جواب دیا کرتے تھے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ (ہم تو بجز اس کے اور نہیں کہ ان کے ساتھ استہزا کرنے والے ہیں) یعنی ہم تو ان کی تحقیر کرتے ہیں اور بس۔ اور کسی آیت کریمہ سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ انہوں نے اس ملاقات اور ملاپ کے سوال کا یہ جواب دیا ہو کہ ہم تو مومنوں کے ساتھ اصلاح کی غرض سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ثابت ہے تو یہی کہ استہزاء کی غرض سے ملاپ رکھتے ہیں اور بس۔

نیز اس صورت میں سب کا خلاصہ یہ ہو گا کہ کفار نے مومنوں کے ساتھ منافقوں کے ملنے کو فساد کہا اور منافقوں نے کہا کہ مومنوں کے ملنے میں ہم مفسد نہیں بلکہ مصلح ہیں تو خداوند کریم نے فرمایا کہ منافق جو کہتے ہیں یہ غلط ہے اور کفار نے جو کہا ہے وہ درست ہے اور یہ چنداں موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ پس عمدہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کے بعد ان کے دو گروہ یعنی مومنوں اور کافروں کے ساتھ ملاقات کرنے کا اور دونوں فریق سے مختلف باتیں کرنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح یہاں پر دو قیل ذکر کر کے دونوں فریقوں کی ان دو باتوں کا ذکر کیا ہے جو کہ ہر ایک فریق نے دوسرے فریق کے ساتھ میل جول رکھنے پر منافقوں کو کہی تھی اور جو کہ

منافقوں نے ان کی باتوں کا جواب دیا تھا اور جس طرح دونوں ملاقاتوں میں سے پہلے مومنوں کی ملاقات کا ذکر ہے اور پھر کفار کی ملاقات کا۔ تو اسی طرح یہاں پر پہلے قِیْلَ میں اس بات کا ذکر ہے جو کہ مومنوں نے کفار کی ملاقات پر منافقوں کو کہی یا منافقوں نے جواب میں ان کو کہی اور پھر دوسرے قِیْلَ میں اس کا ذکر ہے جو کہ کفار نے مومنوں کی ملاقات پر ان کو کہی یا انہوں نے جواب میں کفار کو کہی اور اس صورت میں پہلے قِیْلَ الخ کا خلاصۂ مطلب یہ ہو گا کہ جب مومنوں نے کفار کی ملاقات پر منافقوں کو یہ کہا کہ تمہاری یہ ملاقات موجب فساد ہے۔ پس اس سرزمین میں فساد مت کرو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم تو محض اصلاح ہی کرنے والے ہیں اور بس یعنی ہمارا کفار سے ملنا موجب فساد یا بغرض فساد نہیں بلکہ موجب اصلاح اور بغرض اصلاح ہے اور بس۔ اور چونکہ ان کا یہ جواب واقعہ کے مخالف تھا لہٰذا خداوند کریم نے اس کی تردید فرمادی کہ اصلاح کوئی نہیں بلکہ یہ بڑے مفسد ہیں ہاں ان کی سمجھ ایسی ماری گئی ہے کہ یہ اس فساد کو محسوس تک نہیں کر سکتے۔

اور دوسرے قِیْلَ کی تفسیر اگرچہ انشاء اللہ تعالیٰ آگے آنے والی ہے لیکن خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب کفار لوگ مومنوں کے ساتھ ان کی ملاقات نہ ترک کرنے پر رنج ہو کر ان کو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے فائدے کے لئے منع کرتے ہیں ورنہ تو ہمیں اس کی کیا پرواہ ہے۔ جاؤ تم بھی ویسا ہی ایمان لے آؤ جیسا کہ یہ ادنیٰ لوگ لائے ہیں۔ تو منافق لوگ جواب میں کہتے ہیں کیا ہم ایسے نادان ہو گئے ہیں کہ ہم بھی ان نادانوں اور کوتاہ اندیشوں کی طرح ایمان لے آئیں کہ جنہوں نے انجام کو نہیں سوچا اور ایمان لا کر اپنے آپ کو طرح طرح کے دکھوں اور خطروں میں ڈال دیا ہوا ہے۔ تو خداوند کریم ان کی تردید فرماتا ہے کہ ہرگز ایسا نہیں کہ جو ایمان لائے ہیں وہ نادان اور کوتاہ اندیش ہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے دانا اور دور اندیش ہیں کہ جو امور اوروں پر اب تک پوشیدہ اور غیب ہیں انہوں نے ان کے دلائل اور نشانات پر غور کر کے ان پر یقین کر لیا ہے اور صحیح اور واقعی نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں اور ان کو اب اس میں کسی طرح کا تذبذب نہیں ہے اور جس پر ہیں علیٰ وجہ البصیرت ہیں۔

ہاں بے شک پورے پورے نادان اور ناعاقبت اندیش یہی منافق لوگ ہیں جنہوں

نے باوجود یکہ ایمانیات کے بین ترین دلائل قاطعہ ہزارہا دیکھے اور کفار کی مغلوبی اور مومنوں کی کامیابی اور فتح یابی کے ہزارہا روشن اور اقویٰ ترین نظائر ونشانات مشاہدہ کئے لیکن پھر بھی یہ خیال رکھتے ہیں کہ نہیں معلوم کون غالب آتا ہے۔

لہٰذا دور اندیشی یہی چاہتی ہے کہ ابھی فریقین سے تعلق رکھا جائے تاکہ فی الحال بھی ہم فریقین کے حملوں سے امن میں رہیں اور آئندہ بھی کسی ایک فریق کے غالب ومغلوب ہونے سے کچھ اندیشہ نہ ہو بلکہ اس سے ہم فریقین کے فوائد میں حصہ دار رہیں گے۔ حالانکہ یہ اعلیٰ درجہ کی حماقت تھی جبکہ وہ بار بار مشاہدہ کر چکے تھے عالم الغیب خدا اپنے رسول کو بہت سے غیبوں پر اطلاع بخشتا ہے اور قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے بڑے قوی دلائل جان چکے تھے اور قرآن مجید میں مومنوں کے غلبہ کا حتمی وعدہ بار بار سن چکے تھے اور آثار غلبہ بھی مشاہدہ کر چکے تھے اور ان آثار غلبہ سے جو نتیجہ بر آمد ہوتا تھا۔ اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الانبیاء:45) (کیا وہ اپنے غلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح اس زمین کو (یعنی زمین کفر کو) گھٹاتے چلے آتے ہیں۔ کیا (جب ضعف اور بے اسبابی کی حالت میں کفر کی زمین گھٹتی اور اسلام کی بڑھتی ہے) تو (طاقت وقوت اور اسباب کے وقت اور اپنے ضعف کی حالت میں) وہ غالب ہونے والے ہوں گے) فرما کر اس نتیجہ پر متنبہ بھی کر دیا گیا تھا۔

پس باوجود ان سب باتوں کے یہ خیال کرنا بڑی نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے لہٰذا یہی کامل نادان اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ اور یہ بالکل کھلی بات ہے لیکن تاہم وہ جانتے تک نہیں ہیں۔ یہ ہے دوسرے اِذَا قِیْلَ کا مطلب۔ پس پہلے اِذَا قِیْلَ میں تو اس بات کا بیان ہے جو کہ اہل اسلام نے کفار کے ملنے پر منافقوں کو کہی تھی اور منافقوں نے ان کے جواب میں کہی تھی اور اس کے بعد ان کے جواب کی تردید ہے جو کہ خدائے علیم وحکیم نے فرمائی ہے۔ اور دوسرے اِذَا قِیْلَ میں پہلے کفار کا وہ قول مذکور ہے جو کہ مومنوں کے ملنے پر انہوں نے منافقوں کو کہا ہے اور پھر ان کا جواب ہے اور بعد ازاں وہ تردید ہے جو کہ اللہ جل شانہٗ نے فرمائی ہے اور ان سب امور کے بیان سے اصل مقصود ان کے دلوں کی مرض کا بیان ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ منافق لوگوں کے دلوں پر دنیا کی زندگی اور اس کے مال وجاہ اوراس کی لذات اور خواہشات کی محبت اور خواہش بہت غالب اور مستولی ہے۔ اور چونکہ قاعدہ ہے کہ انسان اپنے محبوب کے کھوئے جانے سے نہایت ڈرتا ہے اور کہ اس میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں رہتی کہ جن کی رنجیدگی کو اپنے محبوب کے کھوئے جانے کا یقینی سبب خیال کرتا ہے۔ اور منافق لوگوں کے دلوں میں یہ پختہ اعتقاد تھا کہ ہمارا محبوب مومنوں اور کافروں کی رضامندی ہی سے ہاتھ آسکتا ہے اور اگر کوئی فریق ہم سے ناراض ہوگیا تو پھر ہماری سب آرزوں کا پرندہ ہمارے ہاتھ سے اڑ جائے گا لہٰذا ان کے دل نہایت کمزور ہوگئے تھے اور ان میں ذرہ بھر بھی تاب مقابلہ نہ تھی اور دنیا جانتی ہے کہ ایسے متضاد دو گروہ کا راضی رکھنا کچھ آسان امر نہ تھا۔ اس کا ذریعہ انہوں نے یہی تصور کیا تھا کہ فریقین کے آگے محض دروغگوئی سے اپنا خیر خواہ ہونا اور فریق ثانی کا معاند ہونا ثابت کرتے رہیں اور اگر کسی فریق کے دل میں ان کی کسی حرکت سے یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ لوگ فریق ثانی کے ساتھ بھی تعلق رکھتے ہیں یا یہ کہ یہ لوگ فی الحقیقت ہمارے مدد اور معاون نہیں ہیں تو جھوٹی قسمیں کھا کر اور جھوٹ بول کر ان کو یقین دلاویں کہ ہم فریق ثانی سے ہرگز تعلق نہیں رکھتے اور تمہارے خیر خواہ اور مددگار ہیں۔

پس اس باعث سے ان کو جھوٹ بھی بہت ہی بولنا پڑتا تھا۔ علاوہ بریں وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ جس قدر ہمارا فائدہ فریقین کی مخالفت کی حالت میں متصور ہے اتحاد کی حالت میں اسی قدر نقصان کا اندیشہ ہے۔ نیز فریق حاضر کی دوستی اور غائب کی مخالفت ثابت کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا تھا کہ غائب فریق کے کچھ اصلی راز اور کچھ اس پر بہتان لگا کر فریق حاضر کو سنائیں تاکہ اس سے وہ یقین کرے کہ یہ لوگ ہمارے دوست اور فریق ثانی کے دشمن ہیں اور یہ باتیں بڑے بڑے فساد کا موجب ہوتی تھیں۔ پس اس لحاظ سے بڑے بڑے فسادوں کے موجب ٹھہرتے تھے۔

اور یہ سب باتیں (یعنی حب دنیا اور کمزوری اور فقدان تاب مقابلہ اور عادت کذب اور محض خود غرضی سے بڑے بڑے فساد کرنے کی عادت) ان میں پہلے بھی تھیں جبکہ

اسلام اور کفر کی مخالفت اور جنگ شروع نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب سے اسلام اور کفر کا مقابلہ شروع ہوا اور سارا عرب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر مقابلہ بھی دنیوی رنگ سے مذہبی رنگ میں آکر شدید ہو گیا جس سے ان کو ان امور کی زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی تو اس وقت ان میں یہ سب باتیں بہت ترقی کر گئیں پھر اسی حالت کو خداوند کریم نے بدیں الفاظ ذکر فرمایا دیا کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (البقرۃ:11)(ان کے دلوں میں مرض تھا تو اللہ نے ان کے مرض کو اور زیادہ کر دیا) لیکن چونکہ یہ مقولہ ایک سچا قاعدہ ہے کہ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ۔

(سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الھوی حدیث نمبر 5130)

(کسی شے سے محبت کرنا تجھے اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے) لہٰذا منافقوں کی آنکھیں بالکل نابینا تھیں ان امور کو دیکھتے تھے پر الٹ دیکھتے تھے۔ ان کے کان بہرے تھے، ان کے کان ان امور کو اور ان کی برائی کو فریقین کی زبان سے بار بار سنتے تھے لیکن الٹ سمجھتے تھے۔ جھوٹ ان کی نظر میں عین صداقت اور فساد عین اصلاح اور عقلمندی بے وقوفی اور دوراندیشی ناعاقبت اندیشی ہوتی تھی غرض کہ ان کے حواس حق نمانہ رہے تھے بلکہ الٹ نما تھے یا یوں کہو کہ وہ باوجود انسان ہونے کے انعام سے بھی گر کر بے حواس ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے خداوند کریم نے ان کے حق میں فرمایا ہے وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔ (لیکن محسوس نہیں کرتے)

منافقین کا فساد:

ہماری اس تقریر سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ کیا فساد کرتے تھے کہ جس سے منع کرنے کی مومنوں کو ضرورت پیش آئی۔ اور وہ یہ تھی کہ جب وہ کفار کو ملتے تھے اور ان کے دلوں میں یہ کھٹکا لگا ہوا ہوتا تھا کہ اہل اسلام کی ملاقات سے یہ لوگ ہم پر ناراض ہیں اور ہم پر یہ اشتباہ کرتے ہیں کہ ہم اہل اسلام کے طرف دار ہیں اور دل سے یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ہمیں اہل اسلام کے دشمن اور اپنے طرفدار بلکہ اپنے گروہ کے رکن رکین یقین کریں تاکہ ہمارے اغراض بوجہ احسن بر آئیں تو اس وقت وہ بہت سی

مضر باتیں اہل اسلام کے بر خلاف کفار کے ساتھ کر دیتے تھے اور کچھ افتراء پردازی کر کے کفار کو اہل اسلام کے مقابلہ پر گاہے اکسا آتے تھے اور کبھی خفیہ مدد دے آتے تھے یا کم از کم اپنی اندرونی امداد کے جھوٹے وعدے دے کر ان کو آمادۂ پرخاش کر دیتے تھے اور یہ ان کا عظیم الشان فساد تھا جو کہ اہل مدینہ کی باامن زندگی کو بے امنی سے اور با آرام زندگی کو بے آرامی سے بدل دیتے تھے اور اگر اور کچھ نہ ہوا تو امن یا خوف کی کوئی بات اڑا کر اس کو شائع کر دیتے تھے تاکہ امن کی خبر سے بے خبر ہو جائیں اور دفعۃً ان پر دشمن آپڑے اور خوف کی خبر سن کر بے چین ہو جائیں جیسا کہ ایک اور مقام پر خداوند کریم نے بدیں الفاظ ذکر فرمایا ہے:

اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ (النساء:84) (جب ان کے پاس کوئی امن یا خوف کی بات آتی ہے تو اس کو شائع کرتے اور پھیلاتے ہیں) اور یہ فتنہ اگرچہ بادی النظر میں کسی کو خفیف نظر آئے لیکن فی الحقیقت وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرۃ:192) (اور یہ فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید ہے) کے مطابق عظیم الشان فساد تھا۔

سیدی و مولائی حضرت مولوی صاحب درس قرآن مجید میں اکثر اوقات فرمایا کرتے ہیں کہ قرآن مجید قصے کہانیں نہیں تاکہ کسی گذشتہ واقعہ کے بیان میں اسی قدر پر قناعت کی جائے کہ فلاں زمانہ میں فلاں شخص نے ایسا کیا یا اس سے فلاں امر سرزد ہوا اور بس۔ بلکہ یہ وہ کتاب ہے جو کہ ساری دنیا کے لئے ہادی ہے۔

لہٰذا اس کا ہر ایک ایسا واقعہ اس لئے بیان ہوا ہے کہ امت محمدیہ سے بھی کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو کہ ایسے واقعہ کا مصداق ہوں گے اور قرآن مجید کی تلاوت کے وقت قاری کو چاہئے کہ ہر ایک ایسے واقعہ کو اپنی ذات پر بھی لگا کر دیکھ لے۔ پس اگر کوئی قابل تعریف واقعہ ہے تو یہ دیکھ لے کہ کیا میں اس کا مصداق ہوں اور جب نہ ہو تو پھر کوشش کرنی چاہئے تاکہ اس کا مصداق بن جائے اور اگر قابل مذمت واقعہ ہے تو پھر یہ دیکھ لے کہ میں اس کا مصداق تو نہیں۔ اور اگر ہو تو پھر بہت جلد کوشش کر کے اصلاح کر لینی چاہئے۔ مثلاً حضرت آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ جب قاری پڑھے تو اپنی ذات پر غور کر لے کہ کیا میں

آدم ہوں یا ابلیس ہوں اگر آدم ہو تو شکر کرے اور اگر ابلیس ہو تو آدم بننے کی کوشش کرے اور اگر اپنے آپ کو درمیانی مرتبہ پر پائے تو ترقی کی کوشش کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت تھوڑی سی ٹھوکر کے ساتھ ابلیس کے درجہ پر آجائے۔

پس منافقوں کی نسبت خداوند کریم نے جو کچھ یہاں پر بیان فرمایا ہے اس کو یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ ایک قصہ تھا جو کہ خداوند کریم نے پڑھنے سننے والوں کے دل بہلانے کو بیان فرمایا دیا ہے خدا حکیم کی کتاب ایسے امور سے پاک اور منزہ ہیں بلکہ یہ اس لئے بیان کیا ہے کہ قیامت تک ایسے لوگ ہوتے رہیں گے اور یہ ان کے لئے عبرت اور ہدایت یا کم از کم ان پر حجت ہو۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب میں منطبق کر کے بتاؤں گا کہ دنیا میں ایک بڑا بھاری فرقہ مدت سے موجود ہے جو کہ حرف بحرف اس کا مصداق ہے۔

اور انشاء اللہ تعالیٰ میں وہاں یہ بھی بتاؤں گا کہ ان آیات میں اس فرقہ کی نسبت کھلی کھلی پیشگوئی ہے اور اس فرقے کا نشان بھی یہاں پر بتایا گیا ہے۔ لیکن یہاں پر میں یہ بیان کر دینا بہت ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس پرانے گروہ کے علاوہ آج کل ایک نیا گروہ بھی ترقی کر رہا ہے اور اس نئے فرقے کا مختصر حال یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز دنیا میں پائی جاتی ہے تو اس کے لوازم اور مناسبات بھی اس کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اور خصوصاً جب وہ امور سنت اللہ میں داخل ہوں پھر تو ان کا پایا جانا از بس ضروری ہوتا ہے۔

ہر نبی کے دور میں منافقین کا گروہ ہوتا ہے:

جب خداوند کریم نے اس زمانہ میں اپنا وعدہ پورا کیا جو کہ قریباً سب انبیاء کے ساتھ کیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی اپنی امت کو اس کی خبر دی تھی۔ اور وہ یہ وعدہ تھا کہ خداوند کریم قتل دجال کے لئے اپنے ایک پاک بندہ کو مبعوث فرمائے گا۔ جو کہ اسرائیلی مسیح کا ہم رنگ ہو گا اور وہ موعود آگیا تو اب جس طرح یہ ضروری ٹھہرا کہ کچھ لوگ اس خدا کے برگزیدہ کی دل آزاری کر کے اس عہدہ کو پر کریں کہ جس کو حضرت مسیح اسرائیلی کے مخالف یہود نے آپ کی دل آزاری پر کیا تھا۔ اور کچھ ایسے علماء اور فقہاء بھی ضرور ہوں جو آپ پر کفر کا فتویٰ لگا کر اپنا منہ سیاہ کریں جس طرح کہ فقیہوں اور فریسیوں نے حضرت مسیح اسرائیلی پر کفر کا فتویٰ لگا

کر اپنی روسیاہی کی تھی اور یہ سب لوازم پورے ہو گئے تو اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں ایک ایسی جماعت بھی ہوا کرتی ہے جو کہ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ۔ (النساء:144)(اس کے درمیان متردّد ہوتے ہیں نہ اس طرف نہ اس طرف) کا مصداق ہوتی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ خدا کے مرسل جَرِیُ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ[1] (تذکرہ صفحہ:63) کے زمانہ میں بھی اس زمانہ کے مطابق یہ جماعت بھی ہو۔

اگرچہ ایک ظاہر بین یہ خیال کر سکتا ہے کہ جب اس زمانہ میں فریقین کے ہاتھ میں تلوار نہیں اور دونوں فریق ایک باامن سلطنت کے ماتحت ہیں تو پھر امن زمانہ میں یہ جماعت کہاں ہو سکتی ہے۔ جس کا وجود فریقین کے خوف اور بے امنی سے ہوتا ہے لیکن میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس گروہ کا وجود حب دنیا اور بزدلی سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ جماعت اس وقت بھی موجود ہے کہ جب احمدیوں کو یہ لوگ ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم احمدی ہیں اور جب دنیا کے لوگوں سے ملتے ہیں تو احمدیوں کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اگر قرآن مجید کو کتاب الٰہی مانتے ہیں تو پھر شیطان کے دھوکا میں آکر اپنی اس صلح کل حالت کو اپنے لئے خیر نہ سمجھیں کیونکہ حقیقت میں یہ حالت جیسی پہلی جماعت کے خائب خاسر اور فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ[2] (النساء:146) ہونے کا موجب ٹھہری ہے اسی طرح ان کے لئے بھی ٹھہرے گی۔ مجھے بہت دفعہ ایسے لوگوں کو سمجھانے کا موقع لگا ہے تو جب ان کو اس سے منع کیا ہے تو جھٹ کہہ دیا ہے کہ ہم تو اس لئے کھلے کھلے احمدی نہیں بنتے اور غیروں سے تعلق رکھتے ہیں تا کہ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ الخ (النحل:126)(اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت کے ساتھ بلا) کے مطابق حکمت سے لوگوں کو احمدی بناویں۔

پھر میں نے ان کو بہت سمجھایا کہ حکمت کے ساتھ بلانے کے اگر یہ معنے ہوتے تو آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور آپ کے صحابہ کو لازم تھا کہ وہ یہی چال اختیار کرتے اور اپنے آپ کو

[1]۔ جری اللہ نبیوں کے حُلّوں میں۔ (تذکرہ صفحہ:63)
[2]۔ جہنم کی گہرائی کے سب سے نچلے حصہ میں۔ (تفسیر صغیر)

دنیا کی مخالفت اور مصائب کے گرداب میں دیدہ دانستہ نہ ڈالتے لیکن انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس گندی حالت کو اختیار نہیں کیا اسی طرح جس امام کی اتباع کا تم دم بھرتے ہو اس نے اور اس کے برگزیدہ اصحاب نے کبھی اس حالت کو اختیار نہیں کیا بلکہ قرآن مجید نے یہ حالت ان منافقوں کی بیان کی ہے جن کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء:146)(بے شک منافق لوگ آگ کے نچلے درجے میں ہوں گے) اور جن کو کفار کے ساتھ شامل کر کے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبۃ:128) (کہ مومنوں پر مہربان اور رحیم) نبی کو حکم دیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبۃ:73)(اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے ساتھ سختی برت) تو یہ سب کچھ سن کر یہ کہہ دیا کہ یہ باتیں تب کرتے ہو کہ قادیان میں رہتے ہو اگر ہماری طرح باہر رہتے اور مخالفوں سے پالا پڑتا تو تم کو بھی یہی حالت اختیار کرنی پڑتی اور اسی قسم کی چند اور باتیں کر کے صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (البقرۃ:19)(بہرے، گونگے، اندھے ہیں لہٰذا یہ رجوع نہ کریں گے) کا نقشہ دکھاتے اور چلتے ہوئے۔ پس ہر ایک سعادت کے طالب کو چاہئے کہ نہ ایسے لوگوں کے جال میں آئے اور نہ ان سے تعلق رکھے ان لوگوں کا زہر بہت خطرناک ہوتا ہے خداوند تعالیٰ ہر ایک طالب حق کو ان کے خطرناک زہر سے محفوظ رکھے آمین۔

آیت14: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔

وَ۔ اور۔ اِذَا۔ جب یا اگر۔ قِيْلَ لَهُمْ۔ ان کو خطاب کیا جاتا ہے یا کہا جائے یا ان پر ظاہر کیا جائے یا ان تک بات پہنچائی جائے۔

اٰمِنُوْا۔ تم ایمان لاؤ۔

كَ۔ مثل۔ مَا۔ حضرت مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ مَا مصدر یہ ہے جو کہ اپنے مابعد کے فعل کو بمعنے مصدر بنا دیتی ہے۔ لہٰذا اٰمَنَ جو اس کے بعد آیا ہے اس کے معنے ایمان لانے کے ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ایمان لائے۔

ال۔ یہ۔ نَاسُ۔ لوگ، اس کی تشریح پہلے بیان ہو چکی ہے۔

(حضرت سیدی حکیم الامتؒ) نے یہاں پر فرمایا ہے کہ ال جنس کے لئے ہے یعنی جنس انسان اور کبھی اس سے معتبر افراد مراد ہوتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے یہاں پر کامل انسان مراد ہوں گے۔

قَالُوْا کے اصل معنے ہیں کہا یا ظاہر کیا انہوں نے لیکن اِذَا کے بعد آنے سے اور اس مقام کے لحاظ سے کہیں گے، یا کہتے ہیں ہوں گے۔

آ۔ کیا۔ نُؤْمِنُ۔ ہم ایمان لائیں۔

كَ۔ مثل۔ مَا۔ مصدر یہ۔ اٰمَنَ۔ ایمان لائے۔

ال۔ کامل۔ سُفَهَاءُ۔ سَفِيْهٌ کی جمع ہے اور اس کے معنوں میں (حضرت سیدی حکیم الامتؒ) نے فرمایا ہے کہ سَفِيْهٌ کہتے ہیں ضعیف العقل، کذّاب، جلد باز، بڑے ظالم، مخالفِ حق، ضعیف الرائے، اَن جان کو۔ اسی وجہ سے بچوں اور عورتوں کو سُفَهَاءُ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمْ (النساء:6) (نہ دو ضعیف العقلوں کو اپنے مال) یعنی بچوں اور عورتوں کو۔

اَلَا۔ خبردار یا ہوش سے سنو۔

اِنَّ۔ ضرور، بے شک۔ هُمْ۔ هُمْ وہی۔
ال۔ کامل۔ سُفَهَاءُ۔ جَمْعُ سَفِيْه ہے۔
وَ تاکید کے لئے اور اردو زبان میں جس کے معنے اس مقام پر ہاں کے کئے جاتے ہیں۔
لٰكِنْ۔ مگر۔
لَا۔ نہیں۔ يَعْلَمُوْنَ۔ وہ جانتے، جس طرح شعور حواس ظاہرہ کے علم کو بولتے ہیں اسی طرح مطلق علم حواس باطنی کے علم کو بولتے۔

(حضرت حکیم الامتؒ) نے كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ کمال ایمان نامناسب کے ترک کرنے اور مناسب کے کرنے کے ساتھ ہوتا ہے اور اوّل کو لَا تُفْسِدُوْا میں بیان فرمایا اور دوم کو اٰمِنُوْا میں بیان کیا گیا ہے اور فرمایا کہ أَنُؤْمِنُ میں جو استفہام کا ہمزہ ہے یعنی دریافت کرنے کا یہ یہاں پر انکار کے لئے ہے۔ پس کیا ہم ایمان لائیں کا مطلب یہ ٹھہرا کہ ہم سے ایسی بے وقوفانہ حرکت کبھی نہیں ہو سکتی یعنی ہم ایسا ایمان نہ لائیں گے اور ان دونوں کے لانے سے مطلب یہ بنا کہ گویا منافقوں کو کہا گیا کہ ایسا کامل ایمان لے آؤ جیسا کہ وہ کامل لوگ لائے ہیں۔

اور فرمایا کہ ان کے فساد کے بیان کے وقت تو ان کی نسبت لَا يَشْعُرُوْنَ فرمایا ہے اور ایمان کے بیان میں لَا يَعْلَمُوْنَ فرمایا ہے اس لئے کہ فساد ایک ظاہری اور محسوس امر ہے لہٰذا اس میں لَا يَشْعُرُوْنَ فرمایا جو کہ حواس ظاہرہ کے علم کو کہتے ہیں اور ایمان کے بہت کچھ لوازم اور آثار اگرچہ محسوس بحواس ظاہرہ ہیں لیکن چونکہ نفس ایمان امور مخفیہ سے ہے اور حواس باطنہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا ایمان کے بیان میں لَا يَعْلَمُوْنَ فرمایا ہے جو کہ باطنی علوم پر بولا جاتا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس طرح یہاں پر كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ فرمایا ہے۔ اس طرح فساد کے متعلق كَمَا کو ذکر نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ ایمان میں تو ان کو کہا گیا ہے کہ فلاں کی مانند ایمان لاؤ اور اس کی مثل ہو سکتی تھی لہٰذا یہاں پر كَمَا لایا گیا اور فساد میں ان کے واقعی فساد کا بیان ہے اور چونکہ منافقوں کا فساد بے مثل تھا اور اس کے بے مثل ہونے کا بیان کرنا مقصود تھا لہٰذا فساد کے بیان میں كَمَا کو ذکر نہیں کیا۔

منافق کمزور دل ہوتے ہیں:

(محمد سرور) میں نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ ان کو یہ بات کہنے والا کون ہے لیکن یہاں پر ہم وہ بیان کرتے ہیں جو کہ اوروں نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کہنے والے مومن ہیں اور لکھا ہے کہ بعض صحابہ نے حضرت ابو بکرؓ وغیرہ اصحاب کبار کی طرف اشارہ کر کے منافقوں کو کہا تھا کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی بعض صحابہ نے ان حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم ایمان کا بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہو اور پھر کفار سے بھی تعلق رکھتے ہو اور یہ اچھا نہیں۔ پس اگر تم مومن ہو تو ان کامل اصحاب (ابو بکر وغیرہ رضی اللہ عنہم) کی مانند ایمان لاؤ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کیا ہم ان کم عقلوں اور ناعاقبت اندیشوں کی مانند ایمان لائیں۔

یہ ہے خلاصہ اس کا جو انہوں نے لکھا ہے لیکن اس پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ اس کے آگے کی آیت کریمہ میں خداوند کریم بیان فرماتا ہے کہ منافق لوگ دل کے ایسے کمزور ہیں کہ جب مومنوں کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب کفار کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں تو جو ایسے کمزور دل والے ہیں ان سے کب ایسی جرأت ممکن ہے کہ وہ رؤساء مومنین کی نسبت یہ کہیں کہ وہ کم عقل نادان اور ناعاقبت اندیش ہیں یا یہ کہیں کہ کیا ہم ان کی مثل ایمان لاویں اس اعتراض سے بچنے کے واسطے بعض نے یہ توجیہ کی کہ جب مومن لوگوں نے ان کو یہ کہا تو ان کے سامنے تو کچھ جواب نہ دیا اور جب دور چلے گئے جہاں کہ مومن نہ سن سکتے تھے تو آپس میں کہنے لگے کہ ہم ان بے وقوفوں کی مانند ایمان لاویں اس توجیہ سے یہ اعتراض رفع تو ہو جاتا ہے۔

لیکن قرآن مجید پر اپنے پاس سے بہت سا حاشیہ چڑھانا پڑتا ہے جس کا قرآن مجید میں نہ کوئی ثبوت یا تصدیق ہے اور نہ کوئی اشارہ کنایہ ہے علاوہ بریں یہ مطلب اس بات پر مبنی ہے کہ النَّاس سے کامل انسان حضرت ابو بکر جیسے مراد ہوں حالانکہ عربیت کے لحاظ سے اَلنَّاس سے کامل انسان لینے درست نہیں کیونکہ زبان عرب میں اگرچہ ال کا لفظ کمال کے لئے آتا ہے۔ لیکن اَلنَّاس کا لفظ کمال کے لئے نہیں آتا بلکہ حقارت کے لئے ہی آتا ہے اور قرآن مجید نے

بھی اس کو اس طور پر استعمال کیا ہے مثلاً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ (البقرۃ:9) میں اَلنَّاس کہہ کر یہ بتایا ہے کہ بے وقوفوں اور ناعاقبت اندیش اور کمینہ اور حقیر لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں الخ۔ اسی طرح جہاں سابقین مومنین کو بیان کیا ہے جو کہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں تو وہاں پر اور اور الفاظ اختیار کئے ہیں اور جہاں فتح کے بعد کے مومنوں کو بیان فرمایا ہے جو کہ اعلیٰ درجہ کے مومنوں میں شمار نہیں ہوسکتے تو ان کو وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (النصر:3) (اور لوگوں کو دیکھے کہ فوج در فوج دین میں داخل ہورہے ہیں) میں اَلنَّاس کے لفظ سے بیان فرما کر بتادیا ہے کہ وہ ادنیٰ درجہ کے ہوں گے۔

تو جب اَلنَّاس زبان عرب میں کمالیت کے لئے نہیں بلکہ حقارت کے لئے آتا ہے تو پھر یہ بیان درست نہیں جس کا سہارا اس بات پر ہے کہ اس سے کامل انسان مراد ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رضی اللہ عنہ سے حنفی لوگ محض اسی وجہ سے زیادہ ناراض ہوئے ہیں کہ آپ نے بعض مقامات پر حنفی مذہب کو بیان کرنے کے وقت حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بَعْضُ النَّاسِ کہہ کر بیان کیا ہے جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اَلنَّاس تحقیر کے لئے ہے یا کم از کم کوئی بڑی عزت کا کلمہ نہیں ہے تو جب یہ کوئی بڑی عزت کا کلمہ نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ مومنوں کا قول نہیں جو کہ انہوں نے حضرت ابو بکر جیسے اصحاب کبار کی طرف اشارہ کرکے کہا ہو بلکہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہ ایمان لانے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور حقارت کے کلمات کے ساتھ یاد کرتے ہوں اور جن کے حضور میں منافق لوگ مومنوں کو سفیہ کہہ سکتے ہوں اور ان کے سامنے اپنے ایمان کی نفی بڑے شدّومد کے ساتھ آزادانہ طور پر کرسکتے ہوں اور یہ ایسے صفات ہیں کہ ہر ایک سننے والا بے تامل کہہ سکتا ہے کہ پھر ایسا کہنے والا بجز کفار کے اور کوئی نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اہل اسلام ہرگز نہیں ہیں۔

اور میں پہلے بھی بیان کر آیا ہوں کہ پہلے قِیْلَ کے قائل اہل اسلام کو قرار دینا اور دوسرے قِیْلَ کا قائل کفار کو ٹھہرانا علاوہ اور خوبیوں کے آگے آنے والی ان دو آیتوں کے بھی مطابق اور مناسب ہے کہ جن میں منافقوں کی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور

علاوہ مطابقت اور مناسبت کے ترتیب بھی ملحوظ رہتی ہے کیونکہ جس طرح یہاں پر پہلے اہل اسلام کا قول مذکور ہوا ہے اور پھر کفار کا اسی طرح آگے پہلے اہل اسلام کی ملاقات کا ذکر ہے۔ اور پھر کفار کی ملاقات کا بیان ہے اس سے بھی ان کے دلوں کی مرض کا بیان مقصود ہے جیسا کہ اس سے پہلے کی آیتوں کا یہ منشا ہے۔ یعنی ان کے دل ایسے کمزور ہیں کہ کفار کے معمولی دباؤ سے اس ایمان کے لانے کو اپنے لئے ناممکن قرار دیتے ہیں جس کا مومنوں کے سامنے بڑے شدّومد سے اقرار کرتے تھے اور علاوہ کمزوری کے ان کے دل ایسے ناسمجھ ہوگئے ہیں کہ جن کے اعلیٰ درجہ کے عقلمند اور دور اندیش ہونے کا بارہا مدتوں سے تجربہ کرچکے ہیں ان کو بے وقوف اور ناعاقبت اندیش قرار دیتے ہیں اور باوجودیکہ آپ اعلیٰ درجہ کے بیوقوف اور ناعاقبت اندیش ہیں اور اپنی بار بار ناکامی اور مومنوں کی کامیابی سے اپنی بیوقوفی اور نادانی اور ناعاقبت اندیشی کا بخوبی تجربہ کرچکے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کے دانا اور دور اندیش تصور کرتے ہیں اور پھر تجربہ کرچکے ہیں کہ عالم الغیب خدا مومنوں کے ساتھ ہے اور بہت سے غیبوں پر اپنے رسول کی معرفت ان کو اطلاع دیتا ہے۔

منافقین کی بزدلی اوران کی نشانیاں:

پس ممکن ہے بلکہ غالب یقین ہے کہ ہماری اس چال بازی کی بھی ان کو اطلاع دے دے بلکہ عجیب تر یہ ہے کہ یہ خطرہ ان کے دلوں میں کھٹکتا رہتا تھا جیسا خداوند علیم نے فرمایا ہے۔ یَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَیۡہِمۡ سُوۡرَۃٌ تُنَبِّئُہُمۡ بِمَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ ۔(التوبۃ:64)(منافق لوگ اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں مومنوں پر کوئی سورت اتر کر ہمارے دلی خیالوں اور ارادوں پر ان کو آگاہ نہ کردے) لیکن باوجود اس کھٹکے اور خطرۂ عظیم کے پھر بھی بے خطرہ اور بے کھٹکے یہ چال بازی استعمال میں لاتے تھے اور یہ ان کی اعلیٰ درجہ کی بے وقوفی اور ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہے جیسا کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے۔ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ السُّفَہَآءُ پھر خالی جہالت ہی نہ تھی بلکہ جہل مرکب تھا کہ اپنی نادانی کو جانتے تک بھی نہ تھے جیسا فرمایا وَلٰکِنۡ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ (ہاں مگر (اپنی اس بے وقوفی کو) وہ جانتے بھی نہیں) نفس جہل اور نادانی بھی عظیم الشان

مرض ہے جس کا علاج مشکل کیا قریباً لا علاج ہی ہے لیکن تاہم پند و نصائح اور مشورہ وغیرہ سے اس کے ضرر کے خطرہ سے انسان بچ سکتا ہے۔

پر جہل مرکب میں چونکہ باوجود جہالت اور بے علمی اور نادانی کے انسان اپنے علم و دانائی کا پورا پورا یقین رکھتا ہے اور خود پسندی سے اپنے آپ کو کسی ناصح اور مشیر کی نصیحت اور مشورہ سے مستغنی اور بے نیاز ہی نہیں خیال کرتا بلکہ نصیحت اور مشورہ پر عملدرآمد کرنے سے پہلے ہی اس کی طرف متوجہ ہونے اور کان لگانے کو اپنی منقصت کا موجب اور باعث عار اور کسرِ شان یقین کرتا ہے لہٰذا یہ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے اور لاعلاج مرض ہونے کے علاوہ اس کے ضرر کے خطرہ سے بچنے کے لئے کوئی اور طریق باقی نہیں رہتا اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ خطرناک ناقابل علاج مرض کہ جس کا نام جہل مرکب ہے دنیا کے مال و دولت اور جاہ و حشم اور عزت و نام آوری کی بے حد محبت سے پیدا ہوتا ہے۔

پس ایک مسلمان جو کہ نفاق سے بچنا چاہتا ہو اس کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ مال و دولت وغیرہ کی محبت سے اپنے دل کو بہت ہی بچائے ورنہ خدانخواستہ جب یہ محبت دل میں جگہ پکڑے گی تو اس کا لازمی نتیجہ نفاق اور اس کا ہمزاد جہل مرکب ہوگا اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْھُمَا[1] اور قرآن مجید نے منافقوں کی نسبت بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے کہ وہ دنیا سے محبت رکھنے والے ہیں اور پھر اسی محبت کے ثابت کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ منافق بخیل اور ممسک ہوتا ہے اور یہ کہ اگر اس کو صدقات اور مال غنیمت سے کچھ مل گیا تو راضی ہو جاتا ہے ورنہ تو بہت غیض و غضب میں آجاتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے دیئے ہوئے پر راضی نہیں ہوتا حالانکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ اس کے لئے بہتر ہوتا بلکہ ایک محل پر دائمی منافق بننے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

وَ مِنْھُمْ مَّنْ عٰھَدَ اللّٰہَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ فَلَمَّآ اٰتٰھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ بَخِلُوْا بِہٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ ھُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلٰی

[1]۔ اللہ ہمیں ان دونوں سے محفوظ رکھے۔ (از مرتب)

يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ (التوبۃ:75تا77)(اور کچھ ان میں سے وہ ہیں۔ جو اللہ سے عہد کیا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے کچھ دیا تو ہم ضرور ہی صدقہ خیرات دیا کریں گے اور ضرور ہی صالح لوگوں سے ہو جاویں گے۔ تو جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے کچھ دیا تو اس پر بخل کرنے لگے اور پھر گئے اور وہ اعراض کرنے والے لوگ تو تھے ہی۔ پس اللہ نے اس کی سزا میں ان کو وہ نفاق دیا جو کہ اللہ کریم کے آگے پیش ہونے کے دن تک رہے گا اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور جھوٹ بولتے رہے۔)

پس یہاں سے خوب پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں اصل مرض یہی محبت تھی اور کذب وغیرہ باقی خصال اس خطرناک مرض کے عوارض لازمہ میں سے تھے۔ پس کیا ہی سعید ہے وہ جو دنیا سے دل نہ لگائے اور کیا ہی کم بخت بلکہ بد بخت ہے وہ جو اس کو اپنی آرزو کا قبلہ بنائے اور رات دن اس کی طرف حرکت کرتا رہے یا اس کے طواف میں لگا رہے۔

آیت15: وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ)

وَ۔ اور۔ اِذَا۔ جب یا اگر۔ اَلَّذِیْنَ۔ جو۔ اٰمَنُوْا۔ ایمان لائے۔
اٰمَنَّا۔ ہم ایمان لائے۔
اِلٰی۔ تک، طرف۔ هُمْ۔ ان کے یعنی اپنے۔
قَالُوْا۔ وہ ظاہر کرتے ہیں یا وہ کہتے ہیں۔
اِنَّا۔ ضرور ہم۔ مَعَ۔ ساتھ۔ كُمْ۔ تم، تمہارے۔
نَحْنُ۔ ہم۔

(حکیم الامت رضی اللہ عنہ)

لَقُوْا۔ لَقِیَ کی جمع ہے لِقَاءٌ سے جس کے معنے قرب کے ہیں پس لَقِیَ کے معنے ہوئے قَرُبَ نزدیک ہوا اور لَقُوْا کے معنے ہوئے وہ نزدیک ہوئے جیسا کہ قرآن مجید کے ایک اور مقام پر آیا ہے کہ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ (آل عمران:156) (جس دن قریب قریب ہوئیں دو جماعتیں) اور اس کے معنے ملنے کے بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی قرب ہی ہے۔

خَلَوْا۔ خَلَی کی جمع ہے۔ جس کے معنے ہیں مَضَی گیا۔ جیسا کہا کرتے ہیں اَلْقُرُوْنُ الْخَالِیَةُ گذشتہ صدیاں اور جب خَلَی کے بعد باء آتا ہے تو اس کے معنے اکیلا ہونے کے ہوتے ہیں جیسا خَلَوْتُ بِهٖ۔ (میں اس کے ساتھ اکیلا ہوا۔)

شَیٰطِیْنُ کے لفظ میں اختلاف ہے کہ یہ شَطْنٌ سے ہے یا شَیْطٌ سے پس اگر اوّل سے ہے تو اس کے معنے ہوئے بہت دور ہونے والا کیونکہ شَطَنَ بمعنے بَعُدَ (دور ہوا) کے آیا ہے اور اگر دوم سے ہے۔ تب اس کے معنے ہوئے بہت ہلاک ہونے والا اور بہت بطلان والا کیونکہ شَیْطٌ ہلاکت اور بطلان کو کہتے ہیں اور ہر ایک سرکش چیز کو شیطان کہتے ہیں اور یہاں پر جو شَیٰطِیْنِهِمْ آیا ہے اس سے مراد ان کے سردار اور بڑے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور ابن مسعود اور اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد

وہ لوگ ہیں جو کہ کفر میں ان کے سردار تھے۔ جیسا قرآن مجید میں آیا ہے کہ وہ کہیں گے کہ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (الاحزاب:68)(بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انہوں نے ہم کو اس راستہ سے بہکا دیا۔)

اور اِنَّمَا اس خبر کے لئے آتا ہے جس سے مخاطب جاہل نہ ہو اور نہ اس کی صحت سے انکار کرتا ہو۔ دلائل الاعجاز میں عبد القاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے استہزاء حقیر کرنے اور جاننے اور اہانت کرنے کو کہتے ہیں اور یہ لفظ هَزَاءٌ سے بنایا ہوا ہے هَزَاءٌ کہتے ہیں ہلکا پن اور ہلنے ہلانے کو چنانچہ کہا جاتا ہے نَاقَةٌ تَهَزَّأُ (اونٹنی تیز اور ہلکی چلتی ہے۔)

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) کل ترجمہ یہ ہوا اور جب (یا اگر) ملتے ہیں ان کو جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں (یا ظاہر کرتے ہیں) کہ ہم ایمان لائے اور جب (یا اگر) جاتے ہیں۔ اپنے سرکشوں کے پاس تو کہتے (یا ظاہر کرتے) ہیں کہ بیشک ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ بجز اس کے نہیں کہ ہم تحقیر کرنے والے ہیں۔ ان آیات میں بھی خداوند کریم نے ان کے دلوں کی مذکورہ بالا مرض کا ثبوت دیا ہے یعنی ان کے دل ایسے کمزور ہیں کہ ہرگز ان میں تاب مقابلہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اہل اسلام یا کفار اگر ان کو کچھ کہتے اور اس کے جواب میں وہ دبک جاتے تو بھی ایک بات تھی۔ جیسا کہ پہلے دونوں اِذَا قِيْلَ میں گذرا ہے لیکن یہاں پر تو نفس ملاقات ہے اور نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کوئی باز پرس ہے لیکن پھر بھی اس قدر کمزوری دکھاتے ہیں کہ جس فریق کو ملتے ہیں اس کے آگے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ کفار نے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ تم اہل اسلام کو کیوں ملتے ہو۔ لیکن خود ہی دل میں یہ خطرہ گذر گیا کہ شاید مخاطب یہ خیال کریں کہ پھر یہ اہل اسلام کو کیوں ملتے ہیں تو قبل اس کے کہ مخاطب کوئی اعتراض کریں خود ہی جواب دے دیا کہ ہم تو ان کی تحقیر کے لئے ان سے ملا کرتے ہیں اور بس۔ اس کے آگے خدا غیور ان کی اس شریرانہ چال کی سزا بیان فرماتا ہے۔

آیت16: اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَیَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ۔ (حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ)

یَسۡتَہۡزِئُ۔ اِسۡتِہۡزَاءٌ کا بدلہ دے گا یا حقیر کرے گا ان کو۔

اور یَمُدُّ کے معنے یہاں پر زیادہ کرنے کے ہیں نہ عمر میں لمبائی کرنے کے کیونکہ اس کے بعد لام آیا کرتا ہے جو کہ یہاں پر نہیں ہے۔ پس یَمُدُّہُمۡ کے معنے ہوئے زیادہ کرتا ہے ان کو جیسا کہ مَدَّ الۡجَیۡشَ اور اَمَدَّ الۡجَیۡشَ کے معنے ہیں لشکر کو زیادہ کیا اور قوی کیا۔

طُغۡیَانٌ کے معنے سرکشی کے ہیں اور حضرت ابن عباس اور بہت سے صحابہؓ سے مروی ہے کہ طُغۡیَانٌ سے مراد کفر ہے اور معنے یہ ہوئے اور ان کو زیادہ کرتا یا مہلت دیتا ہے کفر میں۔

یَعۡمَہُوۡنَ۔ عَمَہٌ سے ہے اور عَمَہٌ کہتے ہیں تردّد کو۔ یَعۡمَہُوۡنَ حیران اور متردّد ہیں۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) سب کا ترجمہ یہ ہوا۔ اللہ خود ان کو استہزاء کی سزا دیتا ہے۔ (یا دے گا یا ان کو حقیر کرتا ہے یا کرے گا) اور ان کو بڑھاتا ہے ان کے کفر میں حیران پھرتے ہوئے یہ معنے اس صورت میں ہوں گے جبکہ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ کو یَمُدُّہُمۡ کے ساتھ ملایا جائے اور اگر اس کو یَعۡمَہُوۡنَ کے ساتھ لگایا جائے تو پھر معنے یوں ہوں گے اللہ ان کو ان کے استہزاء کی سزا دیتا ہے اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ (یا قوت دیتا اور بڑھاتا ہے) کہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔

اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ پر وارد ہونے والے اعتراض اور ان کے جواب:

یہاں پر اعتراض کیا گیا ہے کہ قرآن اور اسلام کا خدا ٹھٹھے باز ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ اور اسلام کے دشمنوں بلکہ اپنی جان کے دشمنوں نے عجیب در عجیب بے باکی اور گندہ دہنی اور بدزبانی سے اس اعتراض کو ادا کیا ہے جس کو ایک غیور مسلمان اور خداترس دل ہرگز سن نہیں سکتا بلکہ ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے کہ جس کو ہر ایک شریف زادہ کے کان برداشت نہیں کرسکتے اور اس پر نظر ڈالنے ہی سے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا لکھنے والا مصرع اصل شیطان گر نہ گویم نسل شیطان است وبس یا کم از کم یہ کہ

جس روح نے اس کو ایجاد کیا ہے وہ پہلے جنم میں کوئی فحش گو تھا۔ جس کو ابھی فحش گوئی اور مسخرہ پن اور ہرزہ درائی کا طریق بھولا نہیں۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں ہی ایسے اعتراضوں کے کھلے کھلے دندان شکن جواب موجود ہیں کیونکہ یہ عالم الغیب خدا کا کلام ہے جو کہ معترض اور اعتراض کے وجود سے بھی پہلے جانتا تھا کہ اس پر کوئی یہ اعتراض کرے گا۔ لہٰذا اس نے اعتراضوں سے پہلے ہی ان کے جواب بیان کر دیئے ہیں اور قرآن مجید کے خدام نے بھی ان جوابوں کو بار بار شائع کیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ حیا اور انصاف بلکہ انسانیت کے دشمن ان جوابوں کو ہضم کر کے ہنوز روزاوّل کے مطابق خالی اعتراضوں کو دہرا دیتے ہیں قرآن مجید نے ایک عجیب سنہری قاعدہ بیان فرمایا ہے اور سب عقلمند لیکن انصاف پسند انسانوں کا اس پر اتفاق اور عملدرآمد ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک متکلم کا کلام دو رنگ کا ہوتا ہے ایک وہ کہ جس کا مطلب بالکل واضح ہوتا ہے اور کسی اور مطلب کا اس میں اشتباہ نہیں ہوتا اور دوم وہ جس کا مطلب واضح نہ ہو اور غیر مقصود معنوں کا بھی اس میں احتمال اور اشتباہ پیدا ہوتا ہو۔

پس قسم اوّل کو اصل قرار دینا چاہئے اور قسم ثانی کے ایسے معنے کرنے چاہئیں جو کہ قسم اوّل کے خلاف نہ ہوں مثلاً قرآن مجید میں توحید اور نفی شرک کے لئے واضح سے واضح آیتیں مثل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ[1] (الاخلاص:2) مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ[2] (آل عمران:63) هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ[3] (فاطر:4) وغیرھا کے بکثرت موجود ہیں۔ پس یہ آیات کریمہ قسم اوّل سے ہیں پھر قرآن مجید میں بہت جگہ پر متکلم مع الغیر یعنی جمع کی صورت میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے بعض افعال اور صفات بیان فرمائے ہیں مثل خَلَقْنَاكُمْ (ہم نے تم کو پیدا کیا ہے) قَدْ

---

[1]۔ (ہم ہر زمانہ کے مسلمان کو حکم دیتے ہیں کہ) تو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ (اصل) بات یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اللہ کے سوا کوئی (بھی) پرستش کا مستحق نہیں۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے۔ (تفسیر صغیر)

نَعْلَمُ (ضرور ہم جانتے ہیں) وغیرھا کے۔ اور ان کے جیسے توحید کے مناسب حال معنے ہوسکتے ہیں ویسا ہی یہ بھی اشتباہ گذر سکتا ہے کہ بہت سے خدا ہوں۔ اور اس لئے جمع کی صورت میں بیان کیا گیا ہو اور یہ قسم ثانی سے ہے اور قاعدہ مذکور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہاں پر وہ معنے ہر گز جائز اور درست نہیں جو کہ توحید اور نفی شرک جیسے واضح ترین مطالب کے خلاف ہوں اور تجربہ اور مشاہدہ شاہد ناطق ہیں کہ دنیا اس سنہری پختہ اور کلیہ قاعدہ پر عملدرآمد رکھتی ہے لیکن تعجب ہے کہ قرآن مجید پر اعتراض کرنے والے اعتراض کرنے کے وقت اس کو بالکل بھول جاتے ہیں شاید تعصب کے علاوہ اس کی یہ وجہ بھی ہو کہ معترض صاحبان جن کتابوں کی اتباع کا دم بھرتے ہیں ان میں اہم مطالب بھی کسی عبارت سے واضح طور پر ثابت نہیں ہوتے یہاں تک کہ جو مذاہب توحید کے قائل ہیں ان سب کے نزدیک توحید سب سے زیادہ اہم مقصد ہے لیکن ان کتابوں میں اس کو بھی کسی واضح عبارت میں بیان نہیں کیا گیا۔

مثلاً آرین لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ وید توحید کی تعلیم دیتا ہے اور شرک کی نفی کرتا ہے لیکن کوئی آریہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ویدوں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (الاخلاص:2) مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران:63) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ[1] (النساء:49) کی مانند کسی عبارت میں توحید اور نفی شرک کو بیان کیا ہو اور وید کے قدیمی پرستاروں کے مشرک ہونے سے بھی اس کا یقین کرنا پڑتا ہے۔

پس گویا وید میں قسم اوّل سے کوئی کلام ہی نہیں۔ تو جب اس میں قسم اوّل سرے سے ندارد ہے تو اس میں اس قاعدہ پر عملدرآمد کیونکر ہو پس شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے پرستار اس قاعدہ پر عمل کرنے سے محروم ہیں اگر اس قاعدہ کے مطابق یہاں پر چلتے تو کبھی یہ اعتراض نہ کرتے کیونکہ قرآن مجید نے واضح ترین عبارت میں بتادیا ہوا ہے کہ استہزاء کا منشا جہالت ہے یا یوں کہو کہ استہزاء جاہلوں کا خاصہ ہے جیسا کہ بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم سنایا اور انہوں نے سن کر کہا

[1] ۔ اللہ (اس بات کو) ہر گز معاف نہیں کرے گا کہ (کسی کو) اس کا شریک قرار دیا جائے۔ (تفسیر صغیر)

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (البقرۃ:68)(یعنی کیا تو ہم سے مسخری کرتا ہے) تو موسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (البقرۃ:68)(میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں سے ہوں) یعنی استہزاء میری شان سے بعید ہے کیونکہ یہ جہالت سے ہوتا ہے۔ یا یہ کہ جاہلوں کا خاصہ ہے اور میں نبی اور رسول ہوں اور جاہل نہیں ہوں ایک طرف تو قرآن مجید نے استہزاء کو جاہلوں کا کام قرار دیا اور بتایا کہ علم والوں کی شان اس سے ارفع ہوتی ہے کہ استہزاء کریں بلکہ وہ اس سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔

اور پھر دوسری طرف خداوند کریم کی نسبت بتایا ہے کہ وہ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (فاطر:39)(آسمان وزمین کے سب غیب جاننے والا ہے) لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ (آل عمران:6)(بے شک اللہ پر زمین وآسمان میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے) جس کے سامنے فرشتے بھی کہتے ہیں لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرۃ:33)(ہمیں تو اسی قدر علم ہے جو کہ تو نے بتایا ہے) تو ایک انسان کا بچہ خیال کر سکتا ہے کہ جب قرآن مجید ایک عالم انسان کے لئے بھی مسخری کو جائز قرار نہیں دیتا وہ عالم الغیب خدا کے لئے کس طرح جائز قرار دے گا یا جس خدا سے ایک عالم استہزاء سے پناہ چاہتا ہے۔ وہ خود خدا استہزاء میں کیونکر مبتلا ہو گا۔

الغرض کہ قرآن مجید سے کھلے طور پر ثابت ہے کہ مسخری ایک عالم انسان کی شان سے بھی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ عالم الغیب خدا کی شان سے ہو پھر قرآن مجید سُبْحَانَ اللّٰہِ، سَبَّحَ لِلّٰہِ، یُسَبِّحُ لِلّٰہِ، سُبُّوْحٌ، قُدُّوْسٌ وغیرہ سے پُر ہے جو کہ خداوند کریم کے سب نقائص سے پاک ہونے پر کھلی کھلی دلالت کرتے ہیں اور مسخری وہ چیز ہے کہ جس کو معترض بھی نقص مانتا ہے۔ تب ہی تو یہ اعتراض کرتا ہے۔ تو جب قرآن مجید کھلے طور پر خدا کو مسخری سے منزہ ثابت کرتا ہے تو قاعدہ مذکورہ کے لحاظ سے ضروری تھا کہ وہ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ میں استہزاء کے معنے ایسے نہ کرتا جو کہ مذکورہ بالا کھلی کھلی صداقت کے بالکل خلاف ہیں پھر خاص کر جب کہ قرآن مجید نے خود ہی اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کے معنے یہاں پر ہی کھول کر بتادیئے تھے تو پھر کسی کو اختیار نہ تھا کہ وہ اس کھلی صداقت اور قرآن مجید کے بیان کردہ

معنوں کے خلاف کوئی معنے کرتا لیکن تعصب اور عادت انسان سے وہ کچھ ظاہر کراتے ہیں جو کہ ایک پاگل سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اگر اور باتیں ان کی نظر سے پوشیدہ ہو گئی تھیں تو کم از کم اس قدر تو غور کر لیتے کہ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ میں منافقوں کے ساتھ کوئی بات کرنے کی خبر دی ہے تو اب ہم قرآن مجید اور احادیث اور تواریخ سے پتہ لگائیں کہ یہ ان کے ساتھ کون سی بات کرنے کی شہادت دیتے ہیں تو جب اس طرف رخ کرتے تو ان کو ایک لفظ بھی ایسا نہ ملتا جو کہ خداوند کریم نے ان کے ساتھ مسخری کے طور پر بولا ہو بلکہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ساری دنیا کو چھان مارتے تو بھی خدا کی مسخری کے ثابت کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں کوئی نظیر نہ آتی کہ جس سے وہ بتاتے کہ دیکھو خدا نے ان کے ساتھ یہ مسخری کی ہے مثلاً قرآن میں آیا ہے کہ اللہ کفار کو عذاب دے گا تو واقعات پر نظر کرنے سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ان کو فلاں فلاں عذاب دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ آیا ہے۔

پس دیکھنا چاہئے کہ واقعات کس امر کو استہزاء کا مصداق قرار دیتے ہیں لیکن جہاں تک ممکن ہے کوئی تلاش کرے ہر گز وہ ایسا کوئی فقرہ یا کام نہ پائے گا جو کہ خداوند کریم نے منافقوں سے بولا یا کیا ہو اور پھر وہ از قسم مسخری ہو اب میں آپ کو وہ معنے بتاتا ہوں جو کہ قرآن مجید نے خود بتائے ہیں۔ خداوند کریم نے پہلے ان کے استہزاء کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ جب ایک فعل کے عوض اور مقابلہ میں کوئی چیز ہوتی ہے یا ذکر کی جاتی ہے تو اس کو اس کی جزا کہتے ہیں اور ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ عربی زبان میں جزاء فعل پر وہی لفظ بول دیتے ہیں جو کہ اصل فعل پر بولا جاتا ہے اگرچہ حقیقت میں وہ دوسرا فعل ایسا نہیں ہوتا کہ اس پر وہ لفظ بولا جائے۔ جیسا کہ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ (البقرۃ:195) (تم بھی اس سے (اس کی) زیادتی کا جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی کی ہو بدلہ لے لو)[1] وغیرہ مثالیں بتائی گئی ہیں اور

[1] نوٹ: رسالہ تعلیم الاسلام میں فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰوۡا عَلَیۡکُمۡ (ان پر اس قدر تعدی کرو جس قدر کہ انہوں نے تم پر کی ہے) آیا ہے۔ آیت قرآن کے مطابق اور ترجمہ تفسیر صغیر کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ (از مرتب)

یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ خداوند کریم نے ان کے حقیقی استہزاء کی سزا میں ان سے ایک بات کی ہے جو کہ خود خداوند کریم نے بتادی ہے اور وہ ہر گز استہزاء نہیں لیکن یہ بتانے کے لئے کہ یہ ان کے استہزاء کی سزا ہے۔ اس قاعدہ کے موافق اس کو پہلے استہزاء کے لفظ سے ذکر کیا ہے اور پھر یہ وہم رفع کرنے کے لئے (کہ کوئی ناسمجھ اس کو حقیقی استہزاء نہ خیال کرلے جو کہ اللہ کی شان سے بعید ہے) اُس بات کو ذکر بھی کر دیا تا کہ ہر ایک دیکھنے والا اس کو دیکھ کر جان لے کہ یہ فعل استہزاء نہیں ہے بلکہ جزاءِ استہزاء ہونے کے باعث مشاکلت کے طور پر اس کو استہزاء کہا گیا ہے۔

چنانچہ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کے بعد اس کی تفسیر وَیَمُدُّھُمْ سے فرمائی۔ پس معنے یہ ہوئے اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے۔ یعنی ان کو مہلت دیتا ہے اور چونکہ مہلت بظاہر کوئی ایسا امر نہیں جو کہ سزا ہو چہ جائیکہ ایسے شریروں کی ایک عظیم الشان شرارت کی سزا بننے کے قابل ہو لہٰذا آگے فرمایا۔ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (تا کہ اپنی سرکشی میں سرگردان رہیں) یعنی مہلت دینا سزا تو نہیں لیکن اس مہلت سے وہ امر اپنے کمال تک پہنچ جائے گا جو کہ سخت ترین عذاب نازل ہونے کا موجب ہے اور وہ ہے ان شرارتوں میں لگے رہنا بلکہ ترقی کرنا جو کہ منافقوں کے حالات میں بار بار مفصل بیان ہوئی ہیں۔

پس خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے کہ ان کے اس عمل سے ہم ان کو سخت سزا دینا چاہتے ہیں لہٰذا ہم ان کو مہلت دیتے ہیں۔ تا کہ وہ اپنی سرکشی میں لگ کر اپنی ہلاکت اور تباہی کا ذخیرہ خوب جمع کرلیں اور اگر ہم ان کو جلد پکڑتے تو پھر اس قدر ڈبل سزا کے مستحق نہ ٹھہرتے کہ جس کے اس مہلت سے مستحق ٹھہریں گے اور اگر وَیَمُدُّھُمْ کو تفسیر نہ قرار دیں تو پھر مطلب یہ ہو گا کہ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ میں تو بیان فرمایا کہ ہم ان کو سخت سزا دیں گے تو اب یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب استہزاء کے باعث وہ سخت سزا کے مستحق ہو چکے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ابھی ان کو سزا نہیں دیجاتی تو خداوند کریم نے وَیَمُدُّھُمْ الخ فرما کر بتادیا کہ فی الحال ہم ان کو اس لئے نہیں پکڑتے اور مہلت دیتے ہیں تا کہ وہ اپنی سرکشی میں ایک عرصہ تک سرگرداں رہ کر زیادہ سخت سزاء کے مستحق ٹھہر جاویں۔

نیز اس واسطے بھی کہ یہ بے فائدہ سر گردانی بھی فی الحقیقت عذاب ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی اور آیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ منافقوں کو فریقین کے راضی رکھنے میں اور اپنی چال بازیوں کے پوشیدہ کرنے میں اور اپنے وعدہائے امداد کی خلاف ورزی کے وقت لایعنی عذر گھڑنے میں کیا کیا رنج والم اور عذاب کا سامنا پڑتا تھا اور اپنی راز افشائی اور پردہ دری کا کس قدر جانکاہ دھڑکا ان کے شامل حال رہتا تھا۔ پس جس طرح کہ یہ مہلت عذاب کے شدید و عظیم ہونے کا موجب تھی۔ اسی طرح سر گردانی کے لحاظ سے خود بھی ایک عذاب الیم تھی۔

الغرض کہ یہاں سے صاف صاف پتہ لگتا ہے کہ استہزاء کیا ہے۔ وہ بھی مہلت ہے یا استہزاء وہ عذاب ہے کہ جس کی تکمیل کے لئے یہ مہلت ہے اور یہ بالکل کھلی اور یقینی بات ہے اور یہ دونوں ہر گز مسخری نہیں ہیں اور کوئی انسان کا بچہ ان دونوں کو (یعنی مہلت اور عذاب کو) مسخری نہیں کہہ سکتا۔ مگر اسی طرح کہ جس طرح فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ میں جزاء تعدی کو تعدی کہا گیا ہے اور بس۔

پس تعجب پر تعجب کہ باوجود ایسی کھلی بات ہونے کے پھر بھی ان تعصب کے اندھوں نے کیوں یہ اعتراض کر کے اپنے خبث باطن کا ثبوت دیا ہے اور اس کے جواب میں یہ بھی لکھا ہے کہ استہزاء کی حقیقت یہی ہے کہ کوئی بات یا کام ایک شخص کرتا ہے جو بظاہر موجب عزت فریق ثانی یا مفید ہو اور حقیقت میں ایسا نہ ہو بلکہ موجب تحقیر اور مضر ہو۔ اور چونکہ خداوند تعالیٰ کے اکثر افعال کی حکمت بندوں پر پوشیدہ ہوتی ہے لہٰذا بہت سے افعال میں ایسا ہو جاتا ہے کہ بظاہر ان کو مفید یا باعث اعزاز خود خیال کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا پس جو استہزاء کی حقیقت ہے وہ ایسے افعال پر ضرور صادق آتی ہے۔ ہاں بندوں کے استہزاء

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 8 بابت ماہ فروری 1907ء صفحہ 285 تا 316)

میں اور خداوند کریم کے ایسے افعال میں یہ فرق ہوتا ہے کہ انسان محض دل لگی کے لئے استہزاء میں دوسرے کو ضرر دیتا اس کی تحقیر کرتا ہے اور بعض اوقات اعتبار دینے کے لئے جھوٹ فریب وغیرہ مذموم امر بھی اس کو کرنے پڑتے ہیں لیکن خداوند کریم کے

ایسے افعال میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوتیں اور استہزاء میں جو کوئی برائی ہے وہ انہی دو امر سے ہے ورنہ نفس حقیقت میں کوئی برائی نہیں اور نہ اس سے کسی انسان کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ حقیقت خداوند کریم کے بہت سے افعال میں پائی جاتی ہے اور نہ اس سے کہ یہ دونوں امر ان میں پائے جاتے جو کہ انسانوں کے استہزاء میں موجود ہو کر اس کو معیوب قرار دے دیتے ہیں تو جب یہ کیفیت ہوئی تو پھر خداوند کریم کے ایسے فعلوں کو استہزاء کی حقیقت پر مشتمل ہونے سے استہزاء کہنا صحیح ہے اور بے جا تحقیر اور ضرر رسانی سے پاک ہونے کے باعث کوئی نقص بھی عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ انسانوں کے استہزاء میں اس کے پائے جانے کے سبب ایسی خرابی لازم آتی ہے کہ یہ کسی شریف اور عالم انسان کی شان کے مناسب حال نہیں رہتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند کریم نے جو اپنا فعل یہاں پر بیان فرمایا ہے (یعنی منافقوں کو مہلت دینا اور جلد نہ گرفتار کرنا) وہ ایسا ہی ہے کہ منافق لوگ اس کو اپنے لئے مفید یقین کرتے تھے اور فی الحقیقت ان کے لئے سخت مضر تھا اور یہ ضرر نہ بے جا تھا اور نہ مفید ہونے کے اعتبار دلانے کے لئے خداوند کریم نے نعوذ باللہ کوئی دروغ یا فریب استعمال کیا بلکہ انسانی استہزاء میں تو اخفاء ہوتا اور جس سے استہزاء کرنا ہوتا ہے اس پر پہلے سے ظاہر نہیں کیا جاتا کہ میں تم سے استہزاء کرنے لگا ہوں اور یہاں پر تو خداوند کریم نے ان پر صاف صاف ظاہر کر دیا ہے اور ان دونوں جوابوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے میں مہلت کو جزا ہونے کے باعث مشاکلت کے طور پر استہزاء کیا گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ استہزاء نہیں ہے۔

اور دوسرے جواب میں مہلت دینے کو جزاء و مشاکلت کے طور پر استہزاء نہیں کہا گیا بلکہ اس باعث سے اس کو استہزاء بولا گیا ہے کہ استہزاء کی حقیقت اس میں پائی جاتی ہے۔ گو اس کے وہ لوازم اس مہلت میں موجود نہیں ہیں جن کے باعث انسانی استہزاء معیوب اور بعید از شان اہل علم تسلیم کیا جاتا ہے اور شریف انسان اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔

استہزاء کے اعتراض کے جواب کا خلاصہ:

پس پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ چونکہ قرآن خدا کو سب نقصوں سے پاک بتاتا

ہے اور استہزاء وہ نقص ہے جس کو قرآن مجید ایک ذی علم انسان کے لئے بھی تجویز نہیں کرتا اور اہل علم کی شان کو اس سے منزہ قرار دیتا ہے لہٰذا جہاں کہیں استہزاء کا خدا قدوس کی طرف منسوب ہو گا وہاں پر استہزاء کے متعارف معنے ہر گز مراد نہ ہوں گے کیونکہ قرآن مجید اور عقل ان دونوں متعارف معنوں سے خداءِ قدوس کو منزہ اور مقدس بتاتے ہیں بلکہ وہاں پر جزاء استہزاء مراد ہو گی اور دوسرے کا خلاصہ یہ ہے استہزاء کی حقیقت تو اسی قدر ہے کہ ایسا کام کیا جائے جو بظاہر مفید اور باعث اعزاز ہو اور حقیقت میں اس سے ضرر اور توہین لازم آتی ہو۔ اور چونکہ یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے اور نہ قرآن مجید نے اس کو کہیں معیوب بتایا ہے لہٰذا اس کی نسبت خدا قدوس کی طرف ہو سکتی ہے ہاں انسانی استہزاء میں بے وجہ محض دل لگی کے لئے اضرار اور توہین غیر ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں جھوٹ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور یہ دونوں سخت مذموم ہیں اور خدا قدوس عقلاً اور نقلاً ایسے نقائص سے پاک ہے لہٰذا انسانی استہزاء کے لوازم مذکورہ کی نسبت خدائے قدوس کی طرف ناجائز ہے پس جہاں کہیں لفظ استہزاء خدا قدوس کی طرف منسوب ہو وہاں پر استہزاء سے مراد حقیقت استہزاء ہو گی ہاں جو امور انسانی استہزاء میں موجود ہو کر اس کو معیوب اور اہل علم اور شرفا کی شان سے بعید کر دیا کرتے ہیں ان سے یہ استہزاء مجرد اور خالی ہو گا۔

پس اس صورت میں استہزاء میں جو چیز موجود ہے اور اللہ جل شانہ کی طرف منسوب ہے وہ نہ معیوب ہے اور نہ باعث اعتراض ہے اور جو چیز اس میں موجود نہیں اور ہے معیوب وہ منسوب نہیں غرض جو منسوب ہے وہ معیوب نہیں اور جو معیوب ہے وہ نہ حقیقۃً یہاں پر موجود ہے اور نہ اللہ عزوجل کی طرف منسوب ہے۔

اب رہی یہ بات یہاں پر وہ معنے کیوں نہیں لیتے جو کہ انسانی استہزاء میں لئے جاتے ہیں تو اس کا جواب ہم نے بار بار مفصل سنا دیا ہے کہ سب زبانوں کا متفق علیہ قاعدہ ہے کہ جس کے متعلق بات ہوتی ہے۔ اس کے مناسب حال معنے لئے جاتے ہیں اور جو اس کے مناسب حال نہ ہوں وہ ہر گز ہر گز نہیں لئے جاتے مثلاً عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرا دل

گواہی دیتا ہے اور یہ کہ فلاں شخص کا حال فلاں امر پر گواہی دیتا ہے اور یہ کہ زید نے فلاں امر پر گواہی دی ہے تین ہی چیزوں کی طرف گواہی نسبت کی گئی ہے۔ لیکن تینوں میں گواہی سے جدا جدا معنے مراد ہیں زید کی گواہی تو زبان سے کہنا کہ فلاں امر یوں ہے اور حال کی گواہی یہ ہے کہ اس کے حال سے فلاں امر معلوم ہوتا ہے اور دل کی گواہی یہ ہے کہ میرا دل فلاں امر کو اطمینان سے قبول کرتا ہے اور کبھی کوئی انسان ایسا نہیں کرتا ہے کہ دل اور حال کی گواہی کے یہ معنے کردے کہ دل اور حال کا منہ ہے اور منہ میں زید کی زبان کی مثل زبان ہے اور اس زبان سے دل اور حال نے زید کی زبان کی طرح یہ الفاظ بولے ہیں کہ فلاں امر یوں ہے اور یہ الفاظ سامعین کو اس طرح سنے گئے ہوں جیسے کہ زید کی زبان سے سنے گئے تھے اور اگر کوئی ایسا خیال کرے گا تو سب دنیا اس کو پاگل قرار دے گی۔

علیٰ ہذا القیاس دنیا کے سب الفاظ اور سب اشیاء کا یہی حال ہے تو جب یہ حال ہے تو کیا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرکے اعتراض کرنے سے معترض کو شرم نہیں آتی پھر علاوہ اس قاعدہ کے یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب متکلم اپنے کلام کے متعلق کچھ ہدایتیں بیان کردیا کرتا ہے تو اس کے کلام کے سمجھنے میں ان کی پیروی کرنی ضروری ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی قطعاً جائز نہیں ہوتی مثلاً طب کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ مزاج سے ہم فلاں چیز مراد لیں گے تو اگرچہ لغت کے لحاظ سے اس کے کچھ ہی معنے ہوں پر طب کی کتابوں میں وہی معنے لئے جاویں گے جو کہ اطباء نے بیان کردیئے ہیں یا مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم کے اگرچہ لغت میں دعا اور درختوں کے چھانگنے اور بیٹھ کے معنے ہیں لیکن شارع نے جب بتادیا ہے کہ کلام شرع میں ان سے نماز اور صدقہ مخصوص اور روزہ مراد ہے تو ہر ایک انسان کے لئے ضروری ہے کہ کلام شرع میں ان سے وہی معنے مراد لے جو کہ شارع نے بیان فرمادیئے ہیں اور سب ایسا ہی کرتے بھی ہیں تو جب ان قواعد پر دنیا کا عملدرآمد ہے تو کیا وجہ ہے کہ دشمنان اسلام قرآن مجید پر اعتراض کرنے کے وقت ان قواعد پر عمل نہیں کرتے۔

کیا قرآن مجید نے بار بار یہ نہیں بتایا کہ جزاء فعل پر بھی وہ لفظ بولا جاتا ہے جو کہ اصل

فعل پر بولا جاتا ہے اور کیا قرآن مجید نے یہ نہیں بتایا کہ مسخری اہل علم انسان کی شان سے بھی بعید ہے اور کہ اہل علم لوگ مسخری سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں تا کہ اس میں مبتلا ہو کر وہ جاہل نہ ٹھہریں اور کیا قرآن مجید نے متشابہ آیتوں کے معنے لینے کا طریق نہیں بتایا کہ محکمات کے مخالف نہ لئے جاویں بلکہ موافق ہوں اور کیا قرآن مجید نے یہ نہیں بیان کیا کہ اسلام کا خدا سبوح وقدوس خدا ہے جو کہ سب عیوب ونقائص سے منزہ اور پاک ہے اور ظاہر ہے کہ معترض نے استہزاء کے ساتھ تب ہی تو اعتراض کیا ہے کہ وہ اس کو ایسا عیب یقین کرتا ہے جس سے خداوند کریم کا پاک ہونا ضروری خیال کرتا ہے تو جب قرآن نے مذکورہ بالا قاعدہ کلیہؑ بیان فرمایا اور استہزاء بمعنے مسخری کا عیب ہونا مسلم ہے تو پھر کیوں قاعدہ مذکورہ کے موافق استہزاء کے وہ معنے نہیں کئے جاتے جن کی زبان عرب مستعمل ہے اور خدا اقدوس کی شان اور آیات محکمات کے موافق ہیں ناظرین میں نے یہاں پر مختلف قواعد اور متعدد جواب کرر سہ کرر اس لئے نہیں بیان کئے کہ معترضین اپنے اعتراضوں سے باز آجاویں کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ باز نہیں آیا کرتے بلکہ میں نے اس لئے یہ کیا ہے تا کہ ناظرین ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنی قوت مناظرہ کو ترقی دیں کیونکہ اس وقت کا جہاد مشروع یہی ہے جو کہ زبان اور قلم کے ساتھ ہے۔ نہ وہ جو کہ تیر اور تلوار سے تھا۔

موجودہ زمانہ میں منافقین سے مراد کون سا فرقہ ہے:

میں نے پہلے ایک پرچہ میں وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ میں وہ دوئم فرقہ بتاؤں گا کہ جس پر یہ سب باتیں صادق آتی ہیں جو کہ منافقوں کے بارہ میں وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ الخ (البقرۃ:9) میں بیان ہوئی ہیں۔ اب میں وہ وعدہ ایفا کرنے کے لئے ناظرین کو بتاتا ہوں کہ یہ فرقہ اہل تشیع کا ہے۔ اس فرقہ میں بہت کچھ گند ہیں لیکن یہ موقع نہیں کہ میں ان کے سب گندے عقائد یا برے اعمال بیان کروں۔ یہاں پر میں اسی قدر بتاؤں گا کہ ان میں یہ باتیں کس طرح پائی جاتی ہیں اور کہ اس فرقہ کی طرف ان آیات میں کس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

پس واضح ہو کہ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

حضرت علیؓ خلیفہ برحق تھے لیکن ابو بکر نے پہلے اور پھر عمر نے اور بعد ازاں عثمان نے خلافت غصب کرلی اور کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ[1]) یہ تینوں اور سب صحابہ چونکہ ان کے ساتھی تھے۔ یہ سب منافق تھے۔ اب یہ ایسا گندہ اعتقاد تھا جو کہ حضرت علی کے اپنے افعال اور اقوال کے برخلاف تھا کیونکہ ان کو ماننا پڑتا ہے کہ حضرت علی نے ان تینوں حضرات کے ہاتھ پر بیعت اطاعت کی تھی اور ان کے پیچھے پانچوں نمازیں ادا کرتے تھے اور کہ بعض اقوال میں انہوں نے ان حضرات کی نسبت تعریفیہ کلمات کہے ہیں اور یہ سب باتیں ان کے عقیدہ کے خلاف تھیں تو اس فرقہ نے اس زد سے بچنے کے لئے اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے یہ کہہ دیا کہ بے شک یہ افعال اور اقوال خیال مذکورہ کے خلاف ہیں اور ہیں بھی واقعی لیکن یہ سب باتیں تقیہ کے طور پر سرزد ہوئی تھیں اور کہ تقیہ کرنا فرض ہے اور (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْہُ[2]) سب انبیاء نے تقیہ کیا ہے اور تقیہ کی تفسیر یہ کی کہ اپنے مذہب کو پوشیدہ کرنے کے لئے خلاف واقعہ بیان کرنا یعنی حقیقت میں تو حضرت علی ان کو منافق اور غاصب یقین کرتے تھے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْہُ) اور خلیفہ برحق اپنے آپ کو یقین کرتے تھے لیکن تقیہ یعنی اپنا عقیدہ پوشیدہ رکھنا چونکہ فرض جانتے تھے لہٰذا بظاہر انہوں نے ان کی بیعت بھی کی تھی اور ان کو زبان سے خلیفہ رسول اللہ اور امیر المومنین بھی کہہ دیتے اور ان کی تعریفیں بھی کرتے اور ان کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتے تاکہ وہ ان کو اپنی جماعت سے یقین کریں اور ان کا اصلی اعتقاد ان پر پوشیدہ رہ جائے۔

پس خلفاء کے بارہ میں تو ان کا اعتقاد باطل تھا ہی لیکن اس کے بچاؤ کے لئے جو تقیہ گھڑا ہے یہ بھی علاوہ باطل ہونے کے اپنے قائل اور عامل کو صحیح طور پر صفات منافقین کا مصداق بنا دیتا ہے کیونکہ یہاں پر منافقوں کی نسبت جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ تو اسی قدر ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو منہ سے اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں اور حقیقت میں مومن نہیں ہیں اور پھر آگے ان کے مومن نہ ہونے کی وجہ بتائی ہے کہ وہ اس لئے

[1]۔ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)
[2]۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

مومن نہیں کہ ان کا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہے کیونکہ ان کی عملی حالت یہ ہے کہ جب مومنوں کو ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور جب اور لوگوں کو ملتے ہیں تو کہہ دیتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور یہ حالت بعینہ اہل تقیہ میں موجود ہے بلکہ بقول شیعہ حضرت علی میں بھی (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) موجود تھی۔ کیونکہ بقول شیعہ وہ ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی جماعت سے نہ تھے۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ حضرات (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ[1]) منافق تھے لیکن حضرت علی نے باوجود اَسَدُ اللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ (شیر خدا ہر ایک غالب سے غالب) ہونے کے پھر بھی ابو بکر، عمر، عثمان کی بیعت کی اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں اور ان کو خلیفہ رسول اللہ اور امیر المومنین وغیرہ کہا اور اس کا اقرار واظہار کیا کہ میں تمہاری جماعت سے ہوں اور جب اپنے شیعہ اور ان کے مخالفوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری طرح میں ان کو منافق غاصب ظالم یقین کرتا ہوں۔

پس حضرت علی کی اس کارروائی میں (جس کے شیعہ قائل ہیں) اور منافقوں کی اس حالت میں (جو کہ قرآن مجید نے اس مقام پر بیان فرمائی ہے) ذرہ بھر بھی فرق نہیں ہے اور اسی طرح سب اہل تقیہ کا حال ہے کہ جب یہ لوگ دوسرے لوگوں سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تم سے ہیں اور جب اپنے شیعہ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے تقیہ کرتے ہیں اصل میں تو ہم شیعہ اور تمہارے ساتھی ہیں اور یہ وہ حالت ہے جو کہ یہاں پر اہل نفاق کی بیان ہوئی ہے۔

اور قرآن مجید مخصوص الوقت کتاب ہے اور نہ مخصوص القوم صحیفہ ہے کہ جب کسی وقت یا قوم کا حال بیان ہو تو وہ انہی تک محدود رہے بلکہ اس میں ایک تو پیشگوئی ہوتی ہے کہ امت محمدیہ میں بھی ایسے لوگ یا ایسا وقت ہوگا اور دوسری نصیحت ہوتی ہے کہ ہر ایک مومن ایسی حالت سے بچتا رہے یا اگر اچھی ہے تو اس کو حاصل کرے اور یہاں پر بھی اگرچہ وَ مِنَ النَّاسِ الخ فرما کر آنحضرت کے زمانہ کے منافقوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے لیکن جیسا

[1]۔ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

میں نے ابھی بتایا ہے اس میں اس فرقہ یعنی اہل تقیہ کے ہونے کی پیشگوئی ہے اور یَقُوْلُ کا لفظ جو کہ حال اور استقبال دونوں کے لئے ہے اس پیشگوئی کے خوب مطابق ہے یعنی کچھ لوگ اب ایسے موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ در حقیقت ہر گز مومن نہیں ہیں اور کچھ آئندہ ایسے ہوں گے جو یہ کہیں گے اور فی الحقیقت مومن نہ ہوں گے۔

پس یَقُوْلُ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ آئندہ بھی ایسے کہنے والے ضرور ہی ہوں گے اور اس پیشگوئی کا معنوی طور پر لفظ بلفظ صادق آنا تو ابھی بیان کر آیا ہوں لیکن خدا کی شان ہے کہ لفظی طور پر بھی یہ اس فرقہ پر خوب چسپاں ہوتی ہے کہ بجائے مسلم وغیرہ کے یہ فرقہ اپنا نام مومن ہی بتاتا ہے۔

پس جیسا کہ ان آیات میں آیا ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم مومن ہیں اسی طرح یہ لوگ اپنے آپ کو مومن ہی کہتے ہیں اور منافقوں کی مانند فی الحقیقت مومن نہیں کیونکہ جو وجہ خداوند کریم نے منافقوں کے مومن نہ ہونے کی بیان فرمائی ہے۔ (یعنی ظاہر باطن کا ایک نہ ہونا) وہ ان میں بھی ٹھیک موجود ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے اہل تقیہ کا فرقہ بھی عجیب ہی فرقہ ہے قرآن مجید جیسی محکم کتاب کو توبیاض عثمانی کہہ کر اس فرقہ نے اپنے عملدرآمد میں پایۂ اعتبار سے گرا ہی دیا تھا اور اگر کوئی جزوی اعتبار کسی ایک آدھ کے نزدیک تھا تو اس نے اس کو قرآن صَامِتٌ (یعنی چپ چاپ اور گنگ قرآن کہہ کر قرآن ناطق (یعنی حضرت علی اور باقی اہل بیت) کی منقول در منقول اور ہزارہا انسانوں کی دست مال شدہ باتوں کا محتاج اور تابع بنا کر نظر اعتبار سے گرا ہی دیا تھا لیکن تقیہ کا مسئلہ ایجاد کر کے قرآن ناطق کی باتوں کو بھی بالکل جڑھ سے کاٹ دیا ہے کیونکہ جب یہ ثابت ہوا کہ اہل بیت تقیہ کرتے تھے اور ایمان اور نماز جیسی ضروری چیزوں میں بھی وہ تقیہ کر کے اصل حق کے خلاف ظاہر کرتے تھے بلکہ عمل بھی حق کے خلاف کر لیتے ہیں تو پھر کون سا ایسا ضروری مسئلہ ہے کہ جس میں تقیہ ممنوع ہو سکتا ہے تو جب سب مسائل کے بیان کرنے اور ان پر عمل کرنے میں تقیہ کا احتمال ہوا تو پھر اہل بیت کا کوئی بیان اور کوئی عمل قابل اعتبار نہیں رہتا کیونکہ جو بیان اور عمل ہو اس میں اب یہ احتمال ہے کہ شاید اصل مسئلہ کچھ اور ہی ہو

جس کا راوی کو علم نہیں ہے اور جو راوی بیان کرتا ہے وہ تقیہ کے طور پر ہو تو اب شیعہ کے نزدیک قرآن اور حدیث دونوں مرتبہ اعتبار سے گر گئے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت علی اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ پر تو تقیہ فرض کر کے منافقوں کے پیچھے نمازیں پڑھاتے ان کی بیعت اور خوشامد اور تعریفیں کراتے ہیں اور ان کے جگر گوشہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لئے تقیہ کا ترک کرنا جائز اور بلکہ ضروری قرار دے کر ان کو شہیدِ کربلا بناتے۔ پس اگر تقیہ فرض تھا تو امام حسین نے کیوں اس کا خلاف کیا اور اگر ضروری نہ تھا تو پھر شیر خدا نے کیوں بقول شیعہ روباہ بازی دکھائی کیا اس کارروائی کو دیکھ کر حضرت علی کا شیر خدا اور اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ نام رکھنا مصرع برعکس نہند نام زنگی کافور کے مطابق نہ ہو گا اس فرقہ کے اور گندوں کے علاوہ تقیہ بھی مَجْمَعُ الْفَسَادَاتِ وَالْاَبَاطِیْلِ[1] ہے لیکن یہاں پر اسی قدر پر کفایت کرتا ہوں۔

[1]۔ جھوٹ اور فسادات کا مجموعہ۔ (از مرتب)

آیت17: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ۔

(محمد سرور عفی عنہ)

أُولَٰئِكَ۔ دو لفظوں سے ملا ہوا ہے اوّل أُولَآءِ جس کے معنے ہیں یہ اور دوم كَ جو کہ محض خطاب کے لئے آتا ہے اور اردو زبان میں اس کے معنے کچھ بھی ادا نہیں کئے جاتے۔ ہاں اس کا مفہوم اَوْ یا دیکھو وغیرہ کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔

اَلَّذِينَ۔ جو، جنہوں۔

اِشْتَرَوْا۔ شِرَاءٌ سے بنایا ہوا اور شِرَاءٌ خرید کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی اس کے معنے فروخت کرنے کے بھی آجاتے ہیں جیسا کہ بیع فروخت کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی بمعنی خرید کرنے کے بھی آتا ہے۔ پس اِشْتَرَوْا کے معنے ہوئے خرید لیا انہوں نے۔

ال۔ کامل۔ هُدًى۔ ہدایت۔

فَ۔ پس، لہٰذا، تو۔ مَا۔ نہ۔

رَبِحَتْ۔ رِبْحٌ سے بنایا ہوا ہے اور رِبْحٌ کہتے ہیں نفع کو جو کہ سوداگری پر مرتب ہوتا ہے۔ پس رَبِحَتْ کے معنے ہوئے نفع دیا۔

تِجَارَتُهُمْ۔ ان کی سوداگری۔

وَ۔ اور۔ مَا۔ نہ۔ كَانُوا۔ تھے۔ مُهْتَدِينَ۔ ہدایت پانے والے۔

سب کا ترجمہ یہ ہوا دیکھو یہ ہیں جنہوں نے خرید کیا ہے۔ کامل گمراہی کو کامل ہدایت کے عوض پس (یا لہٰذا) نہ تو فائدہ مند ہوئی ان کی تجارت اور نہ وہ راہ پانے والے تھے۔

(حضرت سیدی حکیم الامتؒ) نے بیان فرمایا ہے کہ اِشْتِرَاءٌ سے یہاں پر کوئی حقیقی خرید و فروخت مراد نہیں ہے بلکہ یہاں پر اس سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے ہدایت کو ترک کر دیا ہے اور بجائے اس کے گمراہی کو اختیار کر لیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن مسعود اور اور بہت سے صحابہؓ نے یہی معنے کئے ہیں اور فرمایا کہ مَا

كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (نہ وہ راہ پانے والے بنے) سے یہ مراد ہے کہ وہ تجارت کی صحیح راہ نہ پا سکے یہاں تک کہ تجارت سے اصل مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ اصل مال قائم رہے اور اس سے علاوہ کچھ زائد فائدہ بھی حاصل ہو جائے لیکن منافقوں نے اصل مال (یعنی فطرت سلیم اور تحصیل کمالات کی فطرتی استعداد) کو ہی ضائع کر دیا۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ منافق لوگوں نے ہزارہا نشان اور دلائل مشاہدہ کر کے پھر بھی اسلام میں اپنا قدم آگے نہ بڑھایا بلکہ یہ خیال کر کے کہ ہم اگر کسی ایک طرف ہوتے ہیں تو اوّل تو اسی وقت ہمارے مال اور جانیں خطرہ میں پڑ جاتی ہیں۔ دوم معلوم نہیں کہ کون مغلوب ہوتا ہے پس اگر فریق ثانی غالب اور ہمارا فریق مغلوب ہو گیا تو آئندہ کے لئے بھی خیر نظر نہیں آتی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم کسی ایک فریق کے نہ ہو جاویں بلکہ دونوں کے ساتھ ملتے جلتے رہیں تا کہ ہر ایک خطرہ سے محفوظ رہیں اور ان کے منافع میں شریک رہیں۔ پس اس چال کے اختیار کرنے میں انہوں نے ہزارہا نشان اور دلائل کو پس پُشت ڈال کر دین کو جواب دے دیا اور دنیا کو اختیار کیا اور وہ بھی ایسے طریق پر جو کہ نہایت گندہ طریق ہے۔ اور اس میں جھوٹ اور بے ایمانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے بلکہ اس میں وہ وہ باتیں کرنی پڑتی ہیں جو کہ انسانیت کے بھی بالکل خلاف ہیں۔

اب اس چال کے اختیار کرنے سے وہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (یہی ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے ساتھ بدل لیا ہے) کے مصداق بن گئے لیکن ایسے گندے طریق کی بدبودار نجاست کا گند کب تک وہ پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔ آخر بہت جلد ان کی گندی چال بازی کی ناپاک اور سڑی ہوئی بدبو ان ذی فراست اہل اسلام کی پاک ناکوں تک پہنچی جن کی شان میں ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ۔

(سنن الترمذی ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر، حدیث نمبر 3127)

(مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے) وارد ہے اور پھر تو اس قدر اس کی بدبو پھیلی کہ ان مشرکوں کو بھی اس نے تنگ کر دیا جو کہ لَا يَعْلَمُوْنَ

(نہیں جانتے) اور لَا یَفْقَهُوْنَ (نہیں سمجھتے) کے مصداق ہیں تو جب ان کی یہ چال بازی طشت از بام افتادہ ہوگئی تو یہی نہیں کہ فریقین کی نظروں سے گر گئے بلکہ فریقین ان کو بدترین مفسدین اور فریق مقابل سے بھی بڑھ کر اپنے لئے مضر وجود یقین کرنے لگے اور اس وقت وہ دونوں فریق کے منافع سے محروم ہو کر بجائے ایک فریق کے خطرہ کے دونوں کے ضرر کے خطرہ اور سخت خطرہ میں آگئی اور اس چال سے جو کہ غرض ان کی تھی وہ مفقود ہی نہیں بلکہ بالکل برعکس ہوگئی اور یہ امر ان پوشیدہ نہ تھا بار بار فریقین سے لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (البقرۃ:12) (زمین میں مت فساد کرو) کی ڈانٹ سن سن کر ان کی وہ نازک حالت تھی جس کا نقشہ قرآن مجید کی ان دو آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اوّل ہے یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ (التوبۃ:64) (منافق لوگ ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں اہل اسلام پر کوئی سورت نازل ہو کر ہماری ان چال بازیوں پر ان کو نہ متنبہ کر دے جو ہمارے دلوں میں ہیں اور دوم یہ ہے کہ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ (المنافقون:5) (ہر ایک آواز کو اپنی تباہی کے لئے خیال کرتے ہیں یعنی جب کوئی بلند آواز سنتے ہیں تو یہی خیال کرتے ہیں کہ شاید ہمارے پکڑنے اور ہلاک کرنے کا حکم ہو گیا ہے۔ پس ان کی حالت کو خداوند کریم نے فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (پس ان کی تجارت نے نفع نہ دیا) کے ساتھ بیان کیا ہے یعنی انہوں نے دین کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کیا تھا لیکن اب ان کو ثابت ہو گیا کہ اس چال سے ہمیں دنیا بھی ہرگز حاصل نہیں ہوتی بلکہ دین اختیار کرنے سے اگر ایک فریق کے ضرر کا اندیشہ ہوتا تھا تو ایک فریق سے نفع کی امید بھی تھی لیکن اب تو نفع کی امید ایک سے بھی نہیں ہے اور دونوں کے ضرر کا صحیح اور قوی اندیشہ ہے اور چونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی تاجر دیکھتا ہے کہ یہ تجارت سود مند نہیں بلکہ مضر ہے تو ضرور ہی وہ تجارت کا پہلو بدل دیتا ہے لیکن باوجود یکہ منافقوں نے خود تجربہ کر لیا کہ ہماری یہ تجارت مفید کیا بلکہ سخت مضر ہے پر ایسے لَا یَشْعُرُوْنَ اور لَا یَعْلَمُوْنَ ہیں کہ پھر بھی نہ ان کو کوئی مفید راستہ ملتا ہے اور نہ ایسے راستہ پر چلنا چاہتے ہیں بلکہ اسی مضر ترین تجارت پر جمے ہوئے ہیں اور ذرہ بھر بھی اس سے نادم اور پشیمان نہیں ہیں۔ پس ان کی

حالت کو خداوند کریم نے وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (اور نہ وہ راستہ (یعنی مفید تجارت کا راستہ) پانے والے ہوئے) کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

پس ناظرین اس تقریر سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کی تجارت سے کیا مراد ہے اور اس کے نافع اور سود مند نہ ہونے کا کیا مطلب ہے اور راستہ نہ پانے سے کیا مقصود ہے یعنی تجارت یہ ہے کہ دین کو چھوڑ کر بطرز مذکور دنیا کو اختیار کیا اور ان کی تجارت کے سود مند نہ ہونے سے یہ مطلب ہے کہ ان کی چال بازی ظاہر ہوگئی اور دنیا حاصل نہ ہوئی بلکہ سخت خطرہ میں پڑ گئے اور ہدایت نہ پانے سے یہ مقصود ہے کہ باوجود اس علم کے ہو جانے کے کہ ہماری یہ چال مفید کیا بلکہ سخت مضر ہے۔ پھر بھی اس کو چھوڑ کر کوئی اور طریق اختیار نہیں کرتے اور یہ سب باتیں ان کی بیوقوفی اور ان کے دلوں کی مرض کے زیادہ ہونے کی دلیل ہے۔

آیت18: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔

(حضرت مولانا حکیم الامت رضہ اللہ عنہ) نے فرمایا ہے کہ مَثَلٌ اور مِثْلٌ اور مَثِیْلٌ مشابہ اور نظیر کو کہتے ہیں اور یہ مُثُوْلٌ سے ہے۔ جس کے معنے ہیں سیدھا کھڑا ہونا بعد ازاں یہ اس کلام پر بولا گیا جو کہ علاوہ فصیح و بلیغ ہونے کے شایع زایع ہو اور نیز اس حکمت پر بھی جو نافع ہو۔ اس کے بعد یہ ہر ایک حال پر بولا گیا جو کہ شاندار اور عجیب ہو۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ)

كَ۔ بمعنے مثل۔ اَلَّذِیْ۔ جو۔ جس

اِسْتَوْقَدَ۔ اِسْتِیْقَادٌ سے ہے اور اس کی اصل وَقْدٌ ہے۔ جس کے معنے ہیں آگ جلانا اور اِسْتِیْقَادٌ کہتے ہیں آگ جلانے اور آگ جلانے کی خواہش کرنے کو اور یہاں پر دونوں معنے درست ہیں اور اِسْتَوْقَدَ کے معنے ہوئے آگ جلائی یا آگ جلانی چاہی اس نے۔

نَارٌ۔ آگ۔ فَ۔ پس۔ لَمَّا۔ جب۔

اَضَآءَتْ۔ ضَوْءٌ سے ہے۔ ضَوْءٌ روشنی کو کہتے ہیں اور اَضَآءَتْ کے معنے ہوئے روشن کیا اس نے۔

مَا۔ جو۔ حَوْلَ۔ ارد گرد۔ ہٗ۔ اس۔

ذَهَبَ۔ گیا۔ لیکن چونکہ قاعدہ ہے کہ جب فعل لازمی کے بعد بِ آئے تو اس کو متعدی کر دیا کرتی ہے لہٰذا یہاں پر ذَهَبَ کے معنے ہوئے لے گیا۔

بِ۔ یہ باء متعدی کرنے کے لئے ہے۔

نُوْرٌ۔ مشہور ہے۔ هُمْ۔ ان۔ وَ۔ اور۔ تَرَكَ۔ چھوڑ دیا، بنا دیا۔ فِیْ۔ بیچ۔

ظُلُمَاتٌ۔ جمع ہے ظلمت کی۔ جس کے معنے اندھیرے کے ہیں۔

لَا۔ نہیں۔ یُبْصِرُوْنَ۔ وہ دیکھتے۔

سب کا ترجمہ یہ ہے ان کی حالت اس کی مانند ہے جو آگ جلائے (یا جلانی چاہے) تو

جب وہ ان چیزوں کو روشن کر دے جو کہ اس کے ارد گرد ہیں تو اللہ ان کے نور کو لے جائے اور ان کو چھوڑ دے اندھیروں میں کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے (یا بنادے ان کو ایسا کہ اندھیروں میں کچھ نہیں دیکھتے۔)

یہ بات تو کچھ مشکل نہیں کہ کسی جماعت کی تمثیل کسی ایک چیز سے دی جاوے جیسی یہاں پر منافقوں کی جماعت کی تمثیل ایک شخص کے ساتھ دی گئی ہے جو کہ آگ جلائے لیکن مشکل یہ ہے کہ تمثیل اَلَّذِیْ سے شروع ہو کر لَا یُبْصِرُوْنَ پر ختم ہوتی ہے اور ناظرین دیکھتے ہیں کہ اَلَّذِیْ۔ اِسْتَوْقَدَ۔ہٗ۔ یہ سب مفرد ہیں اور ھِمْ۔ھُمْ۔لَا یُبْصِرُوْنَ۔ یہ سب جمع ہیں اور ایک ہی چیز کا گاہے مفرد اور گاہے جمع ہونا غیر معقول امر ہے۔

اس اشکال کا تین طرح پر جواب دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ ذَھَبَ اللّٰہُ سے لَا یُبْصِرُوْنَ تک مثال کی جزو نہیں ہے بلکہ یہ وہ نتیجہ ہے جو کہ مثال سے ظاہر ہوا ہے اور مثال میں بھی یہ تھا لیکن چونکہ بعد میں نتیجہ کے طور پر ذکر کرنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ امور مثال میں ضرور ہونے چاہئیں اور ذکر کرنے سے تکرار بے ضرورت لازم آتا تھا لہٰذا نتیجہ میں ذکر کر دیا اور مثال میں سے گرا دیا گیا اور اگر نہ گراتے تو پھر عبارت یوں ہوتی فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَہٗ ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِہٖ وَتَرَکَہٗ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُ ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ وَتَرَکَھُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَا یُبْصِرُوْنَ (تو جب آگ نے اس کا ارد گرد روشن کیا تو اللہ اس کا نور لے گیا اور اس کو ایسا بنادیا کہ اندھیروں میں نہیں دیکھتا (اسی طرح) اللہ ان (منافقوں) کا (بھی) نور لے گیا ہے اور ان کو ایسا بنادیا ہے کہ اندھیروں میں نہیں دیکھتے) پس مثال میں جو ذَھَبَ اللّٰہُ سے لَا یُبْصِرُ تک تھا وہ گرا دیا گیا اور ذکر نہ کیا گیا اور جو نتیجہ میں ذَھَبَ اللّٰہُ سے لَا یُبْصِرُوْنَ تک تھا وہ ذکر کیا گیا ہے تو اب یہ اشکال رفع ہو گیا کیونکہ مفرد الفاظ مثال میں ہیں اور جو جمع ہیں وہ مثال میں نہیں یعنی آگ جلانے والے کے لئے نہیں بلکہ نتیجہ میں ہیں اور منافقوں کے لئے ہیں۔

دوم یہ کہ ذَھَبَ اللّٰہُ الخ ہے تو مثال کی جزو اور آگ جلانے والے کی نسبت ہے لیکن اس جزو کو بالفاظ جمع اس بات کے بتانے کے لئے لایا گیا ہے کہ مشبّہ (جن کے لئے مثال

بیان کی گئی ہے یعنی منافق لوگ) اور مشبّہ بہ (جو مثال کے طور پر مذکور ہوا ہے یعنی وہ شخص جس نے آگ جلائی) کے درمیان اس قدر کثیر اور شدید مشابہت ہے کہ دونوں میں امتیاز نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ دیکھنے سننے والے کو دونوں میں اس قدر اشتباہ ہو جاتا ہے کہ مشبّہ کو مشبّہ بہ اور مشبّہ بہ کو مشبّہ تصور کرلیتا ہے چنانچہ مشبّہ بہ کو بیان کرتے ہوئے (جو کہ آگ جلانے والا اور مفرد یعنی ایک ہے) مشبّہ قرار دے کر (جو کہ منافقوں کی کثیر جماعت ہے) بجائے مفرد کے بالفاظ جمع بیان کر دیا ہے ورنہ فی الحقیقت یہ آگ جلانے والے کا حال ہے لہٰذا مفرد ہونا چاہئے تھا۔ اور تیسرا جواب وہ ہے جو کہ (سیدی حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے پسند فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ذَهَبَ اللّٰهُ الخ مثال کی جزو ہے پس چونکہ مثال کا آخری جزو بصورت جمع ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ جمع کی مثال جب جمع لائی جاسکتی ہو تو جمع ہی لانی چاہئے تاکہ اصل اور مثال میں مطابقت پیدا ہو جاوے اور یہاں پر جمع لائی جاسکتی ہے کیونکہ آگ جلانے والے بہت بھی تو ہو سکتے ہیں۔ کوئی یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی ہو لہٰذا مثال کی پہلی جزو کو بھی جمع کی صورت میں لانا چاہئے تھا لیکن زبان عرب میں یہ عام استعمال ہے کہ جب کوئی اشتباہ نہ پیدا ہوتا ہو تو پھر بعض اوقات جمع کو بلفظ مفرد بیان کر دیا کرتے ہیں جیسا قرآن مجید میں آیا ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (المؤمن:68) (پھر تم کو نکالتا ہے اس حالت میں کہ تم بچہ ہوتے ہو) تو كُمْ جمع ہے اور طِفْلٌ مفرد ہے اور آیا ہے وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوْا (التوبۃ:69) (اور تم گھسے اس کے مانند کہ وہ گھسی) تو تم جمع ہے اور اَلَّذِي مفرد ہے بلکہ خصوصیت کے ساتھ اَلَّذِي جو کہ مفرد ہے جمع کے مقام پر بہت کثرت کے ساتھ آتا ہے۔

پس خلاصہ جواب یہ ہوا کہ یہاں پر اگرچہ بظاہر مفرد اور جمع کو جمع کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں جو مفرد ہے وہ بھی بمعنے جمع ہے۔ رہا یہ کہ مفرد کے ساتھ جمع کو کیوں بیان کیا گیا ہے تو یاد رہے کہ جہاں کہیں ایسا کیا جاتا ہے وہاں پر ضرور کوئی وجہ ہوتی ہے۔ مثلاً يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا طفل کو مفرد لاکر یہ بتایا ہے کہ تم اس وقت نہایت کمزور ہوتے ہو کیونکہ کمزوروں کی بھی جب ایک کثیر جماعت ہو تو نسبتاً اس میں طاقت ہوتی ہے جیسا اکیلا دھاگا کیا ہی کمزور

ہوتا ہے لیکن جب کمزور دھاگوں کی ایک جماعت کثیر مل جاتی ہے تو نسبتاً طاقتور ہو جاتی ہے اور اسی کمزوری کے اظہار کے لئے یہاں پر بھی جمع کو مفرد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر جنگل میں اکیلا انسان ہوتا ہے تو ایک کثیر جماعت کی نسبت اس کو زیادہ خوف ہوتا ہے اور آگ جلانے کی ضرورت اس کو زیادہ ہوتی ہے پس اسی ضرورت کے ظاہر کرنے کے لئے یہاں پر جمع کو بصورت مفرد ذکر کیا گیا ہے۔

منافقوں کی مثال:

خداوند کریم نے منافقوں کی حالت کی جو مثال بیان فرمائی ہے اس کا مطلب تو بالکل ظاہر ہے کہ ایک شخص جنگل میں سخت اندھیرے کی حالت میں ہو اور وہ درندوں سے بچنے اور روشنی حاصل کرنے کے لئے آگ جلائے تو جب آگ خوب روشن ہو جائے یہاں تک کہ وہ شخص اپنے اردگرد کی چیزوں کو خوب دیکھنے بھالنے لگے تو خداوند کریم معاً آندھی وغیرہ بھیج کر اس کی آگ کو بجھا دے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ اندھیرے میں رہ جائے ایسا کہ اس کو کچھ بھی نہ نظر آئے کیونکہ روشنی سے جب دفعۃً انسان اندھیرے میں آجاتا ہے تو اس کو بہت اندھیرا محسوس ہوتا ہے پس مثال کا یہ مطلب ہے اور یہ بالکل واضح ہے رہا یہ کہ یہ مثال منافقوں کے حال پر کس طرح چسپاں ہوتی ہے تو واضح ہو کہ اس کے بارہ میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے اس کی نسبت ایک حدیث بیان فرمائی ہے جو کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے اور وہ یہ ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَآءَتْ مَاحَوْلَھَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَھٰذِہِ الدَّوَابُّ الَّتِیْ تَقَعُ فِی النَّارِ یَقَعْنَ فِیْھَا وَجَعَلَ یَحْجُزُھُنَّ وَیَغْلِبْنَہٗ فَیَتَقَحَّمْنَ فِیْھَا فَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْھَا۔

(مشکوۃ المصابیح کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ حدیث 149 جلد 1 صفحہ 53 المکتب الاسلامی بیروت 1979ء)

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری مثال اس انسان کی سی ہے جو کہ آگ جلائے تو جب آگ اپنے اردگرد کو روشن کرے تو کیڑے مکوڑے اور یہ زمین پر چلنے

والے جانور جو کہ آگ میں گرا کرتے ہیں۔ اس میں پڑنے لگیں اور وہ شخص ان کو روکنا شروع کرے لیکن وہ کیڑے مکوڑے اس پر غالب ہو کر آگ میں گرتے جائیں۔ پس میں ہوں جو کہ تمہاری کمر کو پکڑ کر آگ سے روکتا ہوں اور تم اس میں گھستے جاتے ہو۔)

اس حدیث کے مطابق منافقوں کی حالت پر یہ مثال اس طرح چسپاں ہو گی کہ جس طرح ایک شخص باہر جنگل میں آگ جلاتا ہے جو کہ ایک لحاظ سے مفید ہے اور ایک لحاظ سے مہلک ہے۔ اسی طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کتاب الٰہی لائے جو کہ ایک لحاظ سے آگ کی مانند روشنی دینے والی اور مفید ہے اور دوسرے لحاظ سے آگ کی طرح جلانے والی اور سخت مہلک ہے اور جس طرح جب اس شخص نے آگ جلائی تو کیڑے مکوڑوں نے اس آگ سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اس کے مہلک پہلو کو اختیار کر کے اپنی جانوں کو ہلاک کر دیا تو اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ آگ کی مانند روشن کتاب لائے تو منافقوں نے اس کے مفید پہلو کو ترک کر کے فائدہ تو کچھ نہ اٹھایا اور مضر پہلو کو لے کر اپنی جانوں کو ہلاک کر دیا اور یہ بالکل سچ ہے کیونکہ کتاب الٰہی کے اتارنے سے اصل مقصود دین ہے جس سے وہ محروم ہیں اور دنیوی امور بھی اس سے حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کو خالص دنیا کا ذریعہ بنانا موجب ہلاکت ہے اور یہ بھی ہے کہ اس حدیث کے الفاظ، الفاظ آیت کریمہ سے ملتے جلتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حدیث میں آگ جلانے والا مرد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ وہ میں ہوں یعنی اس کے مشابہ آنحضرتؐ ہیں اور قرآن مجید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آگ جلانے والے کے مشابہ منافق ہیں نہ آنحضرتؐ اور دوسری مشکل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو تشبیہ بیان ہوئی ہے اس کا آخری جزو ہے۔ روشنی کا بجھ جانا اور آگ جلانے والے کا اندھیرے میں رہ جانا ایسے طور پر کہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے اور جو حدیث میں تشبیہ بیان ہوئی ہے اس کا آخری جزو کیڑے مکوڑوں کا آگ میں گرنا اور آگ جلانے والے کا ان کو روکنا اور ان کا اس پر غالب آ کر آگ میں گر جانا ہے۔

پس یہ دو امر ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیت اور حدیث کا ایک ہی مطلب ہے اور نہ یہ کہ حدیث مذکور آیت مذکورہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔ بلکہ ان

دونوں کا جدا جدا مطلب ہے ہاں ان میں لفظی مشابہت ضرور ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ یہ مثال اس طور پر ان کے حال پر چسپاں ہے کہ منافق لوگ قرآن مجید کے نزول سے پہلے شرک و کفر کی تاریک رات میں جہالت کے خطرناک جنگل میں پڑے ہوئے تھے تو جب قرآن مجید کا نزول ہوا اور بارش کی طرح نشانات و معجزات اترنے لگے اور ان کے فیضان سے ان لوگوں کو بھی کسی قدر روشنی حاصل ہوئی اور پہلی جہالت کی تاریکی سے کسی قدر باہر ہو کر کچھ کچھ خیر و شر میں امتیاز کرنے لگے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ حبّ دنیا اور بخل اور جاہ طلبی اور بزدلی چونکہ ان پر غالب تھی اور اسلام ان امور کے بالکل خلاف اور منافی تھا لہٰذا وہ اسلام کی طرف قدم نہ اٹھا سکے اور دنیا کو دین پر اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے نہایت گندی چال بازی کو اپنا دستور العمل بنالیا تو جو روشنی ان کو پہلے حاصل ہوئی تھی اس وجہ سے سنت اللہ کے موافق وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی اور پہلے سے بھی زیادہ اندھیرے میں جا پڑے کہ اب کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

نور سے کیا مراد ہے؟:

یہ تقریر تو اس صورت میں ہے جبکہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں نور سے مردوہ آگ ہو جو کہ اس شخص نے جلائی تھی اور اگر نور سے آگ نہ لی جائے بلکہ کوئی نور ہی مراد لیا جائے جیسا کہ نورِ بصر یعنی بینائی تو پھر اس مثال کا یہ خلاصہ ہو گا کہ کوئی شخص اندھیرے میں ہو اور روشنی کے لئے آگ جلائے تو جب آگ اس کے اردگرد کے اشیاء کو روشن کرے تو خداوند کریم کسی آفت کے ذریعہ سے اس کی آنکھوں کو اندھا کر دے تو پہلے جب کہ اس کی آنکھیں درست تھیں تو تاریکی سے آگ کے ذریعہ سے نجات حاصل کر لیتا تھا لیکن اب جبکہ اس کی دونوں آنکھیں ہی اندھی ہو گئی ہیں تو اب ہمیشہ تاریکی میں پڑا رہے گا اور آئندہ کبھی بھی کسی ہی ذریعہ سے کچھ نہ دیکھ سکے گا اور منافقوں کے حال پر یہ بالکل چسپاں ہے کہ پہلے جب اور کافروں کی مانند وہ بھی کافر تھے تب تو آیات و بینات کے ذریعہ سے روشنی حاصل کر کے خیر و شر میں امتیاز کر سکتے تھے لیکن اب جبکہ وہ اپنی مذکورہ بالا چال بازی کے اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے جیسا کہ بار بار مذکور ہوا ہے تو اب کسی قسم کی آیات و بینات اور

دلائل ونشانات سے وہ روشنی نہیں حاصل کر سکتے کیونکہ اس چال بازی کے اختیار کرنے سے ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔ اب کوئی روشنی ان کو کام نہیں آسکتی اور وہ ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رہیں گے اور کبھی بھی کچھ نہ دیکھ سکیں گے۔

یہ جو میں نے بیان کیا ہے کہ (نور سے آگ نہ لی جائے بلکہ نور سے نور ہی لیا جائے جو کہ نار کے سوا اور شے ہے) اگرچہ میں نے نہ کسی تحریر میں یہ پڑھا ہے اور نہ کسی عالم سے یہ سنا ہے بلکہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے لیکن جہاں تک میں نے سوچا ہے یہ بات ہے معقول کیونکہ قرآن مجید نے بہت جگہ پر نَارٌ یعنی آگ کا ذکر کیا ہے اور کہیں بھی نَارٌ کو نُوْرٌ نہیں فرمایا بلکہ نُوْرٌ اور نَارٌ کو بالمقابل رکھا ہے۔ جہاں فرمایا ہے وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (النور:36) (اگرچہ اس کو آگ نہ چھوئے وہ تو نور علیٰ نور ہے) حضرت مولوی رومؒ نے بھی مثنوی میں نوری اور ناری کو مقابل بیان کیا ہے چنانچہ فرمایا ہے

نوریاں مر نوریاں را جاذب اند

ناریاں مر ناریاں را طالب اند۔[1]

پس اگر یہاں پر آگ مراد ہوتی تو ذَهَبَ اللّٰهُ بِنَارِهِمْ ہوتا نہ بِنُوْرِهِمْ۔ نیز خداوند کریم نے جہاں پر آگ کے بجھانے کا ذکر فرمایا ہے۔ وہاں پر ذَهَبَ اللّٰهُ نہیں فرمایا بلکہ اَطْفَأَ فرمایا ہے۔ جیسا فرمایا ہے كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدۃ:65) (جب کبھی وہ جنگ کے لئے آگ جلائیں گے اللہ اس کو بجھادے گا) اور جہاں پر کان آنکھ کا بیکار کرنا فرمایا ہے وہاں پر ذھب فرمایا ہے جیسا فرمایا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (البقرۃ:21) (اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو لے جاتا) علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جن سے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ بِنُوْرِهِمْ سے آگ نہ لی جائے بلکہ نور سے نور ہی لیا جائے خواہ آنکھ کا ہو یا اور چیز کا ہو اور آگے کی آیت کے ساتھ بھی یہی موزوں اور چسپاں ہے اور آگ لینا بالکل چسپاں نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (البقرۃ:19) (بہرے، گونگے، اندھے ہیں لہٰذا یہ رجوع نہ کریں گے۔)

[1]۔ نورانیوں کو نورانی لوگ اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوزخی لوگ دوزخیوں کے طالب ہوتے ہیں۔ (از مرتب)

تو جب نور سے نور مراد ہوا پھر تو ظاہر ہے کہ جب خداوند کریم ان کا ہر ایک نور لے گیا خواہ آنکھ کا ہو یا کان کا تو ضرور ان پر صادق آئے گا کہ وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں اور بے شک وہ رجوع بھی نہ کریں گے لیکن جب نور سے آگ مراد ہو تو پھر نہ ان کا بہرا، گونگا، اندھا ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رجوع نہ کریں گے بلکہ رجوع کی امید ہوتی ہے کیونکہ آنکھیں جب درست ہیں تو کبھی نہ کبھی کسی روشنی سے مستفید ہو کر رجوع کرنا ممکن رہے گا غرض یہ میرا خیال ہے اور مجھے پسند ہے ناظرین کو حق معلوم ہو تو قبول فرمائیں ورنہ تو کالاے بد بریش خاوند[1] مشہور مقولہ ہے۔ مثال مذکور پر مفسرین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

[1]۔ بری چیز مالک کے منہ پر (یعنی خراب چیز مالک کی بدنامی کرواتی ہے)۔ (از مرتب)

آیت 19: صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡيٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُونَ۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) اَصَمُّ۔ بہرہ اور صُمٌّ۔ بہرے۔

اَبۡكَمُ۔ گنگ اور بُكۡمٌ۔ گونگے۔

اَعۡمٰی۔ اندھا۔ عُمۡیٌ۔ اندھے۔

فَ۔ لہٰذا۔ هُمۡ۔ وہ۔ لَا۔ نہیں۔

يَرۡجِعُوۡنَ۔ رجوع سے ہے، جس کے معنے ہیں لوٹنے کے يَرۡجِعُوۡنَ کے معنے ہوئے لوٹتے ہیں یا لوٹیں گے۔

سب کا ترجمہ ہوا یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں لہٰذا یہ نہ لوٹتے ہیں اور نہ لوٹیں گے۔ خداوند کریم نے پہلے بیان فرمایا تھا کہ منافقوں کی تجارت نے نفع تو نہ دیا لیکن باوجود اس کے پھر بھی ان کو یہ ہدایت نہ ہوئی کہ اب اس گھاٹے والی تجارت کو ترک کر کے کوئی اور طریق اختیار کریں تو مثال مذکور بیان فرما کر ثابت کیا کہ وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں اور اخیر میں اس کا نتیجہ یہ نکالا کہ رجوع نہ کریں گے یا نہیں کرتے۔ پس اگر اس کے معنے کئے جاویں کہ نہیں کرتے تب تو یہ سب مَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ[1] (البقرۃ:17) کی وجہ اور دلیل ہے گویا خداوند کریم نے فرمایا ہے کہ انہوں نے اس گھاٹے والی تجارت سے رجوع کیوں نہ کیا تو اس کی وجہ بیان فرما کر بتایا کہ اس وجہ سے رجوع نہیں کرتے اور اگر یہ معنے کئے کہ نہ کریں گے۔ تب یہ مطلب ہے کہ مَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ میں تو بتایا ہے کہ اب تک انہوں نے گھاٹے والی سوداگری سے رجوع نہیں کیا اور اس کے بعد مثال بیان فرمایا کر ثابت کیا ہے کہ چونکہ یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے ہیں لہٰذ آئندہ بھی رجوع نہ کریں گے۔ جیسا کہ اب تک انہوں نے نہیں کیا۔

منافقین کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے سے مراد:

بہرہ ہونے کا ثبوت تو اس سے ملتا ہے کہ دلائل وبراہین بتا کر ان کو کہا جاتا ہے کہ

[1]۔ نہ انہوں نے ہدایت پائی۔ (تفسیر صغیر)

ایمان لاؤ اور حق کو قبول کرو اور اس پر قائم ہو جاؤ پر ان کو ذرہ بھی اثر نہیں ہوتا اور قبول نہیں کرتے اور (**حضرت مولانا حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ**) نے فرمایا ہے کہ فطری بہرہ پن گنگ ہونے کو مستلزم ہوتا ہے یعنی جو پیدائشی طور پر بہرہ ہوتا ہے وہ باتیں کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہوتا۔

(**محمد سرور عفی اللہ عنہ**) پس جبکہ وہ حق کے سننے سے بہرے ہیں تو ضرور ہی حق کے بولنے اور حق کے دریافت کرنے سے گنگ بھی ہیں ہاں آنکھیں کسی قدر باقی ہیں لہٰذا ابتداء میں حق کی روشنی اور نشانات وآیات کی چمک کسی قدر دیکھتے تھے اور خیر وشر میں امتیاز کرنے کا ذریعہ ان کے ہاتھ آسکتا تھا۔ لیکن ان کی چال بازی اور بد کرداری کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا نور بصر بھی چھن گیا اور ایسے دائمی اندھیرے میں پڑے کہ کبھی بھی حق کو نہ دیکھ سکیں گے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ میں یہ ترتیب رکھی گئی ہے اور واقعہ کے مطابق بھی یہی ہے کہ پہلے مامور من اللہ سے حق اور اس کے دلائل سنے جاتے ہیں جو کہ کان کا کام ہے پھر جو اشکال یا تردّد ہوتا ہے تو اس کی نسبت دریافت کیا جاتا ہے جو کہ زبان کا کام ہے اور پھر زمینی اور آسمانی نشانات مشاہدہ کرتا ہے جو کہ آنکھوں کا کام ہے پس اس لحاظ سے بھی یہی ترتیب ہونی چاہئے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (البقرۃ:18) پر بھی وہی اعتراض کیا گیا ہے جو کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ[1] (البقرۃ:8) پر وارد کیا گیا ہے اور یہاں پر بھی وہی جواب ہے جو کہ وہاں پر دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نور کا نہ رہنا یہ ان کی چال بازی اور بد اطواری اور بد کرداری کا اثر ہے جیسا کہ اس سے پہلے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (البقرۃ:11) (اوران کے لئے ان کے ہمیشہ جھوٹ بولنے کے باعث دردناک عذاب ہے) وغیرہا آیات میں اس بات کو بیان فرمادیا گیا ہے اور انسانی کل اعمال کے نیک وبد آثار جیسے کہ خود انسان کی طرف منسوب ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح خداوند کریم کی طرف بھی منسوب ہوسکتے ہیں۔

[1]۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے۔ (تفسیر صغیر)

اور جب انعام و سزا کا مقام ہو تو تب تو ضرور ہی خداوند کریم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے بار بار مثالوں میں بیان کیا گیا ہے۔ (حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے مثال مذکور میں اور دو باتیں بیان فرمائی ہیں اوّل یہ کہ عربی زبان میں آگ جلانا جنگ سے بھی کنایۃ ہوتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ اِسْتَوْقَدَ نَارًا (آگ جلائے) سے مراد جنگ ہو تو اب مثال کا یہ مطلب ہو گا کہ منافقوں کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو جنگ شروع کرے تو جب کچھ کچھ کامیابی کے آثار دکھائی دینے لگیں تو خداوند کریم اس کو روک دے یعنی منافق لوگ اسلام کے مقابل لوگوں کو اکسائیں گے لیکن آخر خداوند کریم ان کو روک دے گا دوم یہاں پر یہ بات بیان فرمائی ہے کہ منافق دو قسم کے ہوتے ہیں اعتقادی اور عملی۔ پس اوّل قسم تو وہ ہیں جو ظاہر تو کرتے ہیں ہم مومن ہیں لیکن ایمانیات پر ان کا ایمان ہر گز نہیں ہوتا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہوتا ہے اور ثانی قسم وہ ہیں کہ ایمان تو کمزور جیسا ہوتا ہے لیکن ان کی عملی حالت بہت خراب ہوتی ہے اور اگر کوئی عمل خیر کرتے ہیں تو ایمانی جوش سے نہیں کرتے بلکہ محض بناوٹ کے طور پر کرتے ہیں اور فرمایا کہ مثال مذکور میں اعتقادی منافقوں کی حالت بیان کی ہے اور دوسری مثال میں عملی منافقوں کا حال بیان ہو گا۔

آیت20تا21: اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعۡدٌ وَّ بَرۡقٌ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ. يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ وَاِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَ اَبۡصَارِهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ.

(حضرت سیدی حکیم الامت رضی اللہ عنہ)

اَوۡ۔ دو چیزوں میں سے ایک کے لئے آتا ہے۔ یعنی یہ یا وہ اور کبھی بمعنے بَلۡ یعنی کبھی اس کے معنے بلکہ کے ہوتے ہیں اور گاہے بمعنے واؤ یعنی بمعنے اور آتا ہے پس اگر پہلے معنوں میں آئے تو گاہے شک پیدا ہوتا ہے اور گاہے ابہام واجمال اور گاہے تفصیل ہوتی ہے خبر میں خواہ وہ تفصیل واقعی ہو یا متکلم کے اعتبار کے موافق ہو اور جب بمعنے واو ہو تو اس سے اباحت اور تخییر پیدا ہوتی ہے انشاء میں اور یہاں پر دو امر میں سے ایک کے لئے ہے اور متکلم کے اعتبار کے مطابق تفصیل ہے۔

صَيِّبٌ۔ کہتے ہیں بارش کو یہ صَوۡبٌ سے بنایا ہوا ہے اور صَوۡبٌ کہتے ہیں نازل ہونے کو۔

سَمَآءٌ۔ کہتے ہیں ہر ایک بلند شے کو جو کہ انسان کے اوپر ہو، یہ سُمُوٌّ سے ہے جو کہ صورت اور معنے کے رو سے عُلُوٌّ کی مانند ہے۔

اور مِنۡ کے معنے ہیں سے۔

رَعۡدٌ۔ بادل کے گرجنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

بَرۡقٌ۔ بجلی جو کہ بادل میں یا آسمان کے کناروں پر چمکا کرتی ہے۔

يَجۡعَلُوۡنَ۔ جَعۡلٌ سے ہے جو بمعنے رکھنے کے ہے پس يَجۡعَلُوۡنَ کے معنے ہوئے رکھتے ہیں۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ)

كَ۔ مانند مثل۔ فِیۡ۔ بیچ، میں۔ ہٗ۔ اس۔

ظُلُمَاتٌ۔ ظُلْمَتٌ کی جمع ہے، اندھیرے۔وَ۔ اور۔

اَصَابِعُ۔ اِصْبَعٌ کی جمع ہے بمعنے انگلی۔ پس اَصَابِعُ کے معنے ہوئے انگلیاں۔

هُمْ۔ ان، لیکن اردو کے محاورہ کے مطابق یہاں پر اس کے معنے کئے جائیں گے اپنے۔

فِیْ۔ بیچ میں۔

اٰذَانٌ۔ اُذُنٌ کی جمع ہے جو بمعنے کان ہے۔

اور صَاعِقَةٌ کہتے ہیں گرنے والی بجلی کو جو کہ گرجنے چمکنے والی بارش میں گر کر جس شیء پر پڑتی ہے اس کو تباہ کر دیتی ہے یا کم از کم کچھ نہ کچھ ضرر پہنچاتی ہے۔

حَذَرٌ۔ بچنا، ڈرنا، موت، مرنا۔وَ۔ لیکن۔

مُحِیْطٌ۔ اِحَاطَةٌ سے بنایا ہوا ہے اور احاطہ کہتے ہیں گھیرنے کو۔

بِ کے زبان عرب میں بہت سے معانی ہیں۔ لیکن بعض مقام پر ان معانی میں سے اس سے کوئی معنے نہیں لئے جاتے بلکہ محض کسی امر کی تاکید کے لئے آتی ہے اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ چونکہ یہ بَاء اپنے اصلی معنوں میں مستعمل نہیں ہوتی لہٰذا اہل زبان اس کو زائد بولتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس طور پر زائد نہیں ہوتی کہ وہ بالکل بے معنے ہو کیونکہ وہ اس وقت بمعنے تاکید ہوتی ہے۔ پس یہاں پر اس کے معنے ہیں ٹھیک ٹھیک۔ پورے طور پر وغیرہ۔

یَکَادُ کے معنے ہیں قریب ہے۔ یَکَادُ اس بات کے لئے آتا ہے کہ جس خبر پر یہ آیا ہے وہ عنقریب حاصل ہونے والی ہے کیونکہ اس کے اسباب موجود ہو چکے ہیں لیکن کسی مانع کے باعث یا اس کی کسی ضروری شرط کے موجود نہ ہونے کے باعث اب تک وہ حاصل نہیں ہوئی۔

یَخْطَفُ۔ خَطْفٌ سے ہے اور خَطْفٌ کہتے ہیں جلدی کے ساتھ لے لینے اور اچک لے جانے کو۔

اَبْصَارٌ۔ بَصَرٌ کی جمع ہے اور بَصَرٌ آنکھ اور بینائی کو کہتے ہیں۔

هُمْ۔ ان۔ کُلَّمَا۔ جب کبھی۔

اَضَاءَ۔ ضَوْءٌ سے ہے اور ضوء روشنی کو کہتے ہیں اور اِضَائَةٌ کے معنی ہیں روشن کرنا۔

لَ۔ لئے اور لَ۔ اس بات کا بھی فائدہ دیتا ہے کہ اس کے مابعد کے لئے اس کا ماقبل مفید ہے۔

مَشَوْا۔ مَشْیٌ سے ہے، مَشْیٌ کہتے ہیں چلنے کو اور مَشَوْا کے معنے ہوئے چلتے ہیں۔

فِیْ۔ بیچ، میں۔ ہٖ۔ اس۔ وَ۔ اور۔ اِذَا۔ جب۔

اَظْلَمَ۔ کے دو معنے ہیں سیاہ ہوا یا اندھیرا ہوا اور سیاہ کیا یا اندھیرا کیا۔

عَلٰی۔ پر، اوپر عَلٰی کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ اس ما قبل مابعد کے لئے مضر ہوتا ہے۔

ھُمْ۔ ان۔ قَامُوْا۔ قِیَامٌ سے ہے، بمعنے کھڑا ہونے کے، توقَامُوْا کے معنے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ۔ اور۔

لَوْ۔ اس میں اہل زبان نے بڑی بڑی بحثیں کی ہیں کہ اس کے کیا معنے ہوتے ہیں اس میں تو شک نہیں کہ اِنْ کی طرح اس کے بعد بھی دو باتیں آیا کرتی ہیں کہ ایک کو شرط کہتے ہیں اور دوسری کو جزاء بولتے ہیں اور یہ بھی کہ اِنْ کی مانند اس کے معنے بھی اگر کے ہوتے ہیں ہاں اِنْ اپنے مابعد کو جزم دیتا ہے اور یہ نہیں دیتا اور دوم فرق یہ ہے کہ ان میں یہ ہوتا ہے کہ اگر فلاں بات ہوئی تو یوں ہوگا اور لَوْ میں یوں ہوتا ہے کہ اگر فلاں بات ہوتی تو یوں ہوتا اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ دو ہی امر نہیں ہوتے۔ پس نزاع اس میں کیا ہے کہ لَوْ دونوں کی نفی پر یعنی نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے یا کہ دو میں سے ایک کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس کے نہ ہونے سے دوسرے کا نہ ہونا خود ثابت ہو جاتا ہے۔

پس حق یہ ہے کہ لَوْ کبھی تو پہلی چیز کی نفی کے لئے آتا ہے اور دوسری کی نفی یا تو اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ امر اوّل امر دوم کے لئے اکیلا سبب ہوتا ہے اور دوسرا کوئی امر اس کا سبب نہیں ہو سکتا۔ پس اس صورت میں جب امر اوّل نہ ہوا تو دوسرا بھی ضروری ہے کہ نہ ہو جیسا کوئی کہے اگر سورج ہوتا تو دن ضرور ہوتا۔ پس یہاں لَوْ اور اگر نے تو اسی قدر بتایا ہے کہ سورج نہیں تھا اور دن کی نفی اس سے ہو گئی کہ سورج کا ہونا دن کے ہونے کے لئے اکیلا سبب ہے اور کوئی دوسرا سبب اس کا نہیں ہے۔

پس جب سورج نہ ہوا تو دن بھی نہ ہوگا اگر امر اوّل اکیلا سبب نہ ہو دوسرے کے لئے تب اس کی نفی کسی خارجی امر کی وجہ سے ہوگی نہ اس کی وجہ سے اور کبھی امر دوم کے نہ

ہونے پر یہ دلالت کرتا ہے اور دوسرے کے نہ ہونے سے پہلے کا نہ ہونا ثابت ہو جائے گا جبکہ امر دوم اوّل کے ساتھ لازم ہو اور مساوی ہو عام وغیرہ نہ ہو۔ جیسالَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء:23) (اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ان میں فساد پڑ جاتا) اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر نفی نہیں ہونا لازم نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ثابت بھی رہتا ہے۔

شَاءَ۔ مَشِيْئَةٌ سے ہے جس کے معنے چاہنے کے ہیں۔ پس شَاءَ کے اصلی معنے ہوئے چاہا لیکن لَوْ کے بعد آنے سے اس کے معنے کئے جائیں گے چاہتا۔

لَ۔ اس لَ کو لام تاکید کہتے ہیں اس کے معنے ہوتے ہیں ضرور۔

ذَهَبَ۔ ذَهَابٌ سے ہے جس کے معنے ہیں جانا تو ذَهَبَ کے معنے ہوئے گیا اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ جب اس کے بعد بِ آجاتی ہے جس کو باء تعدیہ بولتے ہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں لے گیا اور لَوْ کے بعد آنے سے اس کے معنے کئے جاویں گے لے جاتا۔

سَمْعٌ۔ سننا اور شنوائی کی قوت اور کان۔ هُمْ۔ ان۔

وَ۔ اور۔ اَبْصَارٌ۔ آنکھیں۔ هُمْ۔ ان۔

اِنَّ۔ ضرور، تحقیق، بے شک۔ عَلٰی۔ پر، اوپر۔

كُلَّ۔ سب، ہر ایک یعنی جس پر یہ آئے اس کے سب افراد اور ہر ایک فرد۔

شَیْءٌ۔ چیز اور چاہنا اور چاہی ہوئی چیز یا کام۔

قَدِيْرٌ۔ قُدْرَةٌ سے ہے، جو بمعنے طاقت اور غلبہ کے اور بمعنے انداز کرنے اور تنگ کرنے کے ہے تو قَدِيْرٌ کے معنے ہوئے طاقت والا، انداز کرنے والا، تنگ کرنے والا۔

سب کا ترجمہ یہ ہوا یا بارش کی مانند جو اوپر سے اترتی ہے اس میں اندھیرے اور گرج اور چمک ہوتی ہے۔ گرنے والی بجلی کے باعث اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ڈالتے ہیں موت سے بچنے کے لئے (یا موت کے خوف سے) لیکن اللہ کافروں پر مُحِيْطٌ (محاصرہ ڈالنے والا) ہے۔ قریب ہوتا ہے کہ چمکنے والی بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے جب کبھی ان کے لئے روشنی کرتی ہے تو اس میں وہ چلتے ہیں اور جب ان پر (جہان کو) سیاہ کر دیتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں اور (یا لیکن اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان یا (شنوائی) اور آنکھوں کو لے جاتا بے شک اللہ ہر ایک چیز پر (یا ہر ایک چاہے ہوئے امر پر) قابو رکھنے والا ہے۔

منافقوں کی حالت:

یہ تو ظاہر ہے کہ خداوند کریم نے یہاں پر منافقوں کی حالت کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَنَارًا الخ کے ساتھ اور دوم کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ الخ کے ساتھ پس اگر دوسری مثال اس طور پر لائی گئی ہے کہ مخاطب خواہ پہلی مثال سے ان کی حالت کا پتہ لگائے یا دوسری سے یا بلفظ دیگر یہ کہ متکلم ان کی حالت کی اس طور پر بھی تشریح کر سکتا ہے اور اس طور پر بھی تب لفظ اَوْ تفصیل کے کے لئے ہو گا جو کہ متکلم کے اعتبارات کے مطابق ہے جیسا کہ اَوْ کی تشریح میں حضرت مولانا صاحب نے فرمایا ہے اوراس صورت میں منافق دو قسم کے نہ ہوں گے بلکہ سب منافقوں کی ایک لحاظ سے پہلی مثال ہو گی اور دوسرے لحاظ سے دوسری اور اگر اس لئے دو مثالیں بیان ہوئی ہیں کہ منافقوں کی حالت جدا جدا دو قسم کی تھی جن کی توضیح ایک مثال سے نہ ہو سکتی تھی بلکہ ضروری تھا کہ دو مثالیں لا کر توضیح کی جاتی تب یہ اَوْ واقعی تفصیل اور تقسیم کے لئے ہو گا اور اس صورت میں حالات کے لحاظ سے منافق دو قسم کے ہوں گے ایک اس حالت والے کہ جس پر پہلی مثال منطبق ہوتی ہے نہ دوسری۔ دوم اس حالت والے کہ جس پر پہلی مثال صادق نہیں آتی بلکہ دوسری مثال اس پر منطبق ہوتی ہے جیسا کہ حضرت مولانا صاحب کی تقریر میں مَیں نے بتایا تھا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ منافق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک اعتقادی اور دوسرے عملی اور مثال اوّل قسم۔ اوّل کا حال بیان کرنے کے لئے بیان ہوئی ہے اور مثال دوم قسم دوم کی حالت ظاہر کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

بارش والی مثال کا خلاصہ:

اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ اوپر سے بارش برس رہی ہو اور اس میں کئی اسباب کے ملنے سے سخت اندھیرا ہو۔ اوّل تو رات ہے پھر سیاہ بادل ہے اور وہ بھی نہایت کثیف ہے اورافق کو بالکل بند کیا ہوا ہے اور پھر بارش بھی موٹی اور زور کی موسلا دھار ہے اور ان سب امور کے باعث بہت ہی سخت اندھیرا ہو اور بادلوں کے گرجنے اور بجلی کے چمکنے سے خوف آتا ہو اور بجلی کے گرنے کے خطرہ سے موت سامنے نظر آتی ہو اور راہ گذر بیچارے بجلی کے

خطرہ کے باعث او سان باختہ ہو کر موت سے بچاؤ حاصل کرنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں دیں تو قریب ہو کہ انگلیاں وہاں پر ہی دھری رہیں اور بجلی آنکھیں ہی اچک لے جائے پھر ایک طرف تو بجلی کو اپنی موت کا پیغام تصور کرتے ہوں اور دوسری طرف اس کے چمکنے کے منتظر رہتے ہوں تا اس کی روشنی میں منزل مقصود کی طرف چند قدم چلیں تو جب وہ اپنی چمک سے جہان کو روشن کرے تو دو چار قدم چلیں اور جب چمک بند ہو کر عام قاعدہ کے مطابق آگے سے بھی زیادہ سخت اندھیرا ہو جائے تو حیران کھڑے ہو جاویں۔ پس ایسے وقت میں خدا ہی بچائے تو بچائے ورنہ اگر اللہ چاہے تو ان کی آنکھیں اور کان سب اس کے ساتھ تباہ کر دے اور یہ کوئی مشکل امر نہیں کیونکہ وہ تو انگلیاں ڈالنے وغیرہ سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے اور خدا وہ ہے کہ جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔

وحی الٰہی کے نزول کی مثال بارش سے ہے:

یہ ہے خلاصہ اس مثال کا اور بظاہر یہ خیال گذر سکتا ہے کہ منافقوں کی حالت کی تشبیہ مذکورہ بارش کے ساتھ دی گئی ہے۔ جیسا کہ اَوۡ كَصَيِّبٍ (یا بارش کی مانند ہے) سے خیال گذرتا ہے لیکن حقیقت میں منافقوں کی حالت کی تشبیہ ان مسافروں اور راہ گزروں کے ساتھ دی گئی ہے جو کہ ایسی بارش میں ایسی حالت والے ہوں اور یہ مثال ان کے حال پر اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ چونکہ قرآن مجید نے وحی اور کلام الٰہی کی بارش کے ساتھ بکثرت تشبیہ دی ہے۔ لہٰذا یہاں پر بھی بارش سے مراد وحی الٰہی اور قرآن مجید ہے یعنی جس طرح ان راہ گزروں پر بارش برستی ہے اسی طرح منافق لوگ اس وقت وحی الٰہی کی بارش میں تھے اور اس کی بارش اس وقت زور شور سے ہو رہی تھی اور جس طرح بارش مِنَ السَّمَآءِ ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی بھی مِنَ السَّمَآءِ ہوتی ہے اور جس طرح بارش مذکور رات میں اُتری ہے اسی طرح وحی الٰہی بھی جہالت کی سیاہ ترین رات میں اتر رہی تھی اور قرآن مجید نے بارہا زمانہ جاہلیت کو لَيۡلٌ (رات) فرمایا ہے پھر جس طرح اس بارش میں رات کے اندھیرے کے علاوہ اور بہت سے اسباب کے باعث سخت ظلمت ہو گئی تھی۔ اسی طرح وحی کی بارش کے وقت علاوہ جاہلیت کی رات کے اندھیرے کے اور بہت سے امور (مثل عادت، رسم،

تقلید جامد، وہم پرستی اور ان شبہات کے جو کہ قرآن مجید کی آیات کی نسبت ان کے گندے دلوں میں پیدا ہوتے تھے) ظلمت کے زائد ہونے کے موجب ٹھہرے ہوئے تھے اور جس طرح اس بارش میں بادلوں کا گرجنا تھا۔ اسی طرح وحی کی بارش میں ان مہیب اور خوفناک وعیدوں کی گرج تھی کہ جن کے ذریعہ سے وحی الٰہی کے مخالفوں کو رنگا رنگ عذابوں کے نازل ہونے کی یقینی خبر دی گئی تھی اور ان وعیدوں کا گرجنا ایسا خوفناک تھا کہ اس سے ان کے دل کانپ اٹھتے تھے۔

پھر جس طرح بجلی اپنی چمک اور اپنے گرنے سے اس بارش کے مسافروں اور راہ گذروں پر امید وبیم اور خوف ورجا کو عجیب رنگ سے جمع کر دیتی ہے اور باوجود اس خوف کے اس کی روشنی میں کسی قدر آگے قدم بڑھاتے اور چلتے ہیں اسی طرح وحی الٰہی یعنی قرآن مجید کے بجلی سے بھی زیادہ تر چمک دار اور روشن دلائل ان پر امید وبیم اور خوف ورجاء جمع کر دیتے تھے۔ اور ان کی روشنی کے وقت کسی قدر حق کی طرف قدم بڑھاتے اور چلتے تھے اور خوف یوں پیدا ہوتا تھا کہ جب وہ دلائل کی روشنی سے کسی قدر حق شناسی کے قریب ہوتے تھے تو ساتھ ہی یہ خوف پیدا ہوتا تھا کہ حق کی مخالفت کرنے کے باعث وعیدوں کے مطابق عذاب الٰہی ہم پر نازل نہ ہو جائے اور جس طرح وہ راہ گذر لوگ بجلی کے گرنے سے جو موت کا خطرہ رکھتے تھے اس سے بچنے کے لئے یہ احمقانہ اور لایعنی حرکت بیجا کرتے تھے کہ کانوں میں انگلیاں دیتے تھے اور یہ نہ خیال کرتے تھے کہ قریب ہے کہ بجلی ہماری آنکھوں کو اچک لے جائے اور انگلیاں ڈالنا اس سے ہر گز نہیں بچا سکتا اسی طرح یہ لوگ بھی وعیدوں کے مطابق عذاب الٰہی کے اترنے کا جو خطرہ رکھتے تھے اس سے بچنے کے لئے یہ حیلہ کرتے تھے کہ ان وعیدوں کے سننے سے رکتے اور کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے تاکہ ہمارے کانوں میں ان کی آواز نہ آئے لیکن بارش کے مسافروں کی مانند ان کی یہ حرکت بھی محض احمقانہ حرکت تھی کیونکہ کان بند کرنے اور وعیدوں کے نہ سننے سے ان عذابوں سے وہ بچ نہیں سکتے اور ان کی بدکرداری سے قریب تھا کہ عذاب الٰہی ان پر نازل ہو جائے کیونکہ وہ مستحق عذاب ٹھہرے ہوئے ہیں اگر اللہ بھی چاہتا کہ ان کو جلد پکڑے تو ان کے

کانوں میں انگلیاں پڑی رہتیں اور خداوند قدیر ان کے کانوں اور آنکھوں کو تباہ کر دیتا اور یہ امر کچھ مشکل نہ ہوتا کیونکہ انگلیوں کا ڈالنا وغیرہ تو عذاب الٰہی سے بچا نہیں سکتا اور خدا بھی وہ ہے کہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

اور جس طرح بارش میں عام خلق اللہ کا بہت ہی فائدہ ہے بلکہ بہت سی مخلوق کی جسمانی اور دنیوی زندگی کے بقاء کے لئے بہت ہی ضروری چیز ہے لیکن تاہم بعض وجوہات سے بعض خاص اشخاص کے لئے اس میں ضرر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی بھی روحانی اور جسمانی دونوں زندگیوں کے لئے عام طور پر بہت ہی مفید اور بہت ہی ضروری چیز ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی بعض وجوہات سے بعض اشخاص کے لئے مضر بلکہ موجب ہلاکت ہو جاتی ہے اور جس طرح بارش مذکور کے مسافر اس کے ضرر کے خطرہ میں آئے ہوئے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی روحانی بارش کی طرف سے نہایت شدید خطرہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

غرض کہ ایک طرف انسان منافقوں کے اس خطرہ اور ان تعلقات پر نظر کرے جو کہ آیات قرآنی سے ثابت ہوتے ہیں اور پھر مثال مذکور پر نظر کرے تو وہ اس مثال کو ان کی حالت کا پورا پورا نقشہ یقین کرے گا۔ دونوں مثالوں کے مطلب پر واقف ہونے کے بعد انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ دونوں مثالوں سے جدا جدا منافق مراد ہیں یا کہ سب منافقوں کی دو مثالیں ہیں میرے نزدیک اس کا فیصلہ یہ ہے کہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ سے یہ مراد ہے کہ اللہ ان کی بینائی لے گیا اور صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ میں بھی بتادیا ہے کہ وہ نہ شنوائی کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ گویائی کی اور نہ بینائی کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن منافقوں کے لئے پہلی مثال بیان کی گئی ہے وہ تو وہ ہیں جو اپنے کان اور آنکھیں تباہ کر چکے ہیں اور جب دوسری مثال میں ہے کہ اپنے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور یہ کہ قریب تھا کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لیتی۔ اور یہ کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو تباہ کر دیتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب تک ان کے کان اور آنکھیں سلامت ہیں ہاں خطرۂ تباہی میں ضرور ہیں۔ تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی ان منافقوں کی ہے جو اپنی شرارت کے انتہائی نکتہ پر پہنچ کر حق شناسی کے ذرائع کو مثل کان وغیرہ کے ضائع کر بیٹھے ہیں اور دوسری مثال ان

منافقوں کی ہے جو اپنی شرارت سے اس خطرہ میں آ پھنسے ہیں کہ اس کے کان وغیرہ ذرائع حق شناسی تباہ ہو جاویں لیکن تاحال تباہ نہیں ہوئے۔ پس یہ فرق تو بالکل ظاہر ہے اور قرآن مجید کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ رہا یہ کہ یہ فرق کس وجہ سے ہے تو خواہ یہ ابتداء اور انتہا کی وجہ سے ہو یا شرارت کی کمی بیشی کے باعث ہو بہر حال فرق ضرور ہے۔

خدا کے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہونے کا مفہوم:

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلام کے دشمنوں نے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ:21) پر اعتراض کیا ہے کہ شَیْءٌ کی تعریف لوگوں نے یہ کی ہے کہ مَا یُعْلَمُ وَیُخْبَرُ عَنْہُ (جو علم میں آ سکے اور اس کی نسبت خبر دی جا سکے) پس جب شَیْءٌ کی یہ تعریف ہے تو یہ خدا پر اور خدا کے فرضی شریک پر کہ (جس کا موجود ہونا عقلاً اور شرعاً محال ہے) اور اسی طرح اور بہت سی محال چیزوں پر بولی جاوے گی۔

عقائد والوں نے بھی لکھا ہے مصرع نُسَمِّی اللّٰہَ شَیْئًا لَا کَشَیْءٍ (ہم اللہ کو شیء تو کہتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی شے یا فلاں شیء کی مثل ہے) تو جب خدا پر اور اس کے شریک پر (کہ جس کا وجود محال ہے) اور سب محالات پر لفظ شے بولا جاتا ہے اور کُلِّ شَیْءٍ میں وہ سب چیزیں لی گئی ہیں کہ جن پر لفظ شَیْءٌ بولا جاتا ہے تو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بے شک اللہ ہر ایک شے پر قادر ہے) سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ جلّ شانہ اپنی ذات اور اپنے شریک محال اور باقی سب محالات پر قادر ہے اور اس سے بڑے بڑے مشکلات پیش آتے ہیں مثلاً جب اپنی ذات پر قادر ہوا اور ظاہر ہے کہ جو چیز قدرت کے ماتحت آتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے تو لازم آوے گا کہ خداوند تعالیٰ ممکن ہو اور یہ بالکل باطل ہے اسی طرح جب اپنے شریک پر قادر ہوا جو کہ محال ہے تو لازم آئے گا کہ خداوند تعالیٰ کے شریک کا وجود بھی ممکن ہو حالانکہ سب اہل اسلام اور عقل سلیم والے اس کو ممتنع اور محال یقین کرتے ہیں اسی طرح اور محالات پر قادر ہونے سے ان سب محالات کا ممکن ہونا لازم آوے گا بلکہ جب خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے اور جو نقائص ایسے ہیں کہ اللہ جل شانہ' کی ذات کا ان سے پاک ہونا سب کے نزدیک ضروری ہے ان پر بھی خداوند کریم

قادر ہے کیونکہ وہ بھی شَیْءٌ ہیں اور کُلِّ شَیْءٍ میں داخل ہیں تو اس سے سبوح وقدوس کی قدوسیت میں فرق آتا ہے۔

خدا کے قدیر ہونے کا غلط دیوبندی مفہوم:

یہی باعث تھا کہ دیوبند کے علماء نے ایسی باتوں کے رعب میں آکر علانیہ اس بات کا اقرار کیا کہ خدائے قدوس جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے اور خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے اوراس بات پر ہند کے علماء میں مدت دراز تک مباحثات اور تکفیر و تضلیل کے فتاویٰ بازی کا بازار گرم رہا اور فریقین کی طرف سے بہت سی کتابیں اور رسالے اس مسئلہ پر شائع ہوئے اور یہ اعتراض اور اعتراضوں کی طرح زمانہ حال کی ایجادوں اور خصوصیات سے نہیں ہے بلکہ یہ اعتراض ہے جو کہ پہلے علماء کرامؒ کے زیر بحث رہ چکا ہے اور مفسروں نے اس کے جواب میں بڑی بڑی طبع آزمائی کی ہے یہاں پر میں ان جوابوں میں سے جو کہ انہوں نے لکھے ہیں دو جواب پیش کروں گا اور وہ یہ ہیں۔

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ پر وارد ہونے والے شبہات کا رفع:

جواب اوّل یہ سب صحیح ہے کہ شے کا لفظ اللہ جل شانہ اور اس کے شریک محال اور سب محالات اور نقائص پر بولا جاتا ہے اور یہ بھی کہ خداوند تعالیٰ کے ان امور پر قادر ہونے سے بہت سی خرابیاں لازم آتی ہیں لیکن ہم یہ نہیں مانتے کہ آیت مذکورہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم ان سب امور پر قادر ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منطقی اور فلسفی لوگ خواہ لفظ کُلّ کو کیسا ہی عام اور شامل اور محیط کیوں نہ قرار دیں لیکن زبان عرب کہ جس کے استعمال اور محاورہ کو قرآن مجید نے ہر ایک آیت میں ملحوظ رکھا ہے اس بات کی کافی گواہ ہے کہ لفظ کُلّ میں ہمیشہ وہ احاطہ اور شمول و عموم نہیں ہوتا کہ جس سے کوئی فرد بھی باہر نہ رہے بلکہ خود قرآن مجید میں بہت سے مقامات ہیں کہ جن میں کُلّ موجود ہے اور پھر بھی بہت سے افراد باہر ہیں بلکہ ایسے مقامات بھی قرآن مجید میں موجود ہیں کہ جن میں بعینہٖ یہی کُلُّ شَیءٍ موجود ہے اور پھر بھی ہزارہا اشیاء باہر ہیں۔

مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (الانبیاء:31) (اور ہر ایک

زندہ شے کو ہم نے پانی سے بنایا ہے) پس یہاں پر کُلِّ شَیْءٍ موجود ہے اور اللہ جل شانہ اور فرشتے اور جن وشیاطین اس سے باہر ہیں۔ پس اسی طرح اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں بھی وہ سب اشیاء باہر ہیں جو کہ اعتراض میں مذکور ہوئی ہیں اور خصوصاً جب قرائن موجود ہوں تو پھر ان کو کوئی داخل کر سکتا ہی نہیں ہے۔ اور یہاں پر قوی سے قوی قرائن موجود ہیں۔ کیونکہ سب سے قوی تر قرینہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے داخل رکھنے سے عقلی طور پر کوئی خرابی لازم آتی ہو اور اس سے بڑھ کر اور کون سی خرابی ہو سکتی ہے کہ واجب الوجود خدا اور اس کا ممتنع اور محال شریک اور اور ممتنع اور محال امور ممکن ہو جاتے ہوں۔ یا جن نقائص سے خداوند تعالیٰ کی ذات کو منزہ ثابت کرنے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اور اس تَنْزِیْہ اور تقدیس کی ہزاروں آیتیں شاہد ناطق ہیں۔ ان نقائص کا خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب ہونا لازم آئے۔ جیسا کہ اعتراض میں بیان ہو چکا ہے اور علاوہ اس کے ان کے داخل ہونے کے موانع اور خارج ہونے کے قرائن اور بھی بہت سے موجود ہیں۔

مثلاً جب یہ ضروری امر ہے کہ قادر اور مقدور دونوں جدا جدا چیز ہوتی ہیں۔ تو پھر خداوند تعالیٰ کو اپنی ذات پر قادر کس طرح کوئی تجویز کر سکتا ہے۔ اور جب خدا قادر ہے اور مقدور نہیں ہے اور خدا کا شریک وہ چیز ہو سکتی ہے۔ جو کہ سب امور میں خداوند تعالیٰ کی مانند ہو تو پھر خدا کا شریک وہ ہو گا جو خدا کی مانند قادر ہو اور مقدور نہ ہو۔ اور جو چیز مقدور ہو سکتی نہیں اس کو کوئی یہاں پر کُلِّ شَیْءٍ میں کس طرح داخل کر سکتا ہے۔ پس قدیر کا لفظ ہی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ اشیاء یہاں پر کُلِّ شَیْءٍ میں داخل نہیں ہیں۔ اور حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ نے بارہا درس قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے۔ کہ کُلّ سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ سب چیزوں کو شامل ہے بلکہ عموماً اس سے بہت سی اشیاء باہر رہ جاتی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ شے کے یہ معنے بھی ہیں۔ جو معترض نے بیان کئے ہیں اور یہ بھی کہ اگر یہ معنے لئے جاویں تو یہ اعتراض وارد ہو گا۔ لیکن ہم یہ نہیں مانتے کہ یہاں پر شے کے یہ معنے ہیں اور نہ یہ کہ شے کے ہمیشہ یہی معنے ہوا کرتے ہیں بلکہ لفظ شے کے

ایک اور معنے بھی ہیں جو کہ یہاں پر مراد ہیں اور وہ ایسے ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا اور وہ ہیں چاہنا یا چاہا ہوا امر کیونکہ شَاءَ یَشَاءُ (جن کے معنے ہیں چاہا اور چاہتا ہے یا چاہے گا) ان کا مصدر اور اصل کہ جس سے یہ بنائے گئے ہیں۔ وہ بھی شَیْءٌ ہے جس کے معنے ہوں گے چاہنا۔ لیکن یہ عام قاعدہ ہے کہ مصدر گاہے اسم مفعول کے معنے دیتا ہے۔

پس اس وقت اس کے معنے ہوں گے چاہی ہوئی چیز۔ اور یہاں پر اس بات کا قرینہ بھی موجود ہے کہ یہاں پر شَیْءٌ کے یہ معنے ہیں نہ وہ جو کہ معترض نے لئے ہیں اور وہ قرینہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اپنے سے پہلے جملہ کی دلیل ہے۔ اور وہ یہ ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ (اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو لے جاتا) اس کا ثبوت کیا ہے؟ تو بتایا کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تو وہ ہے جو کہ سب نقائص سے پاک اور سب صفات کمال والا اور منجملہ نقائص سے یہ ہے کہ کسی ارادہ کئے ہوئے اور چاہے ہوئے امر کے پورا کرنے سے عاجز ہو اور منجملہ صفات کمال سے یہ ہے کہ ہر ایک چاہے ہوئے امر پر پورا پورا قابو رکھتا ہو۔ اور جب ان کے کان لے جانا چاہے گا تو چونکہ وہ بھی ایک چاہا ہوا امر ہو گا لہٰذا اس کے پورا کرنے پر بھی پورا قابو رکھے گا۔ اس دلیل میں ناظرین نے دیکھا ہے کہ سارا مدار چاہے ہوئے امر پر ہے۔ کیونکہ دعویٰ میں بھی یہ شرط رکھی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو لے جاتا لہٰذا ضروری ہے کہ دلیل میں جو شیء کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنے بھی چاہے ہوئے امر کے لئے جاویں تاکہ دلیل دعوے کے مطابق ہو جائے ورنہ تو پھر یہ جملہ پہلے دعوے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اور علاوہ اس قرینہ کے اس کا بڑا بھاری ثبوت ایک یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں خداوند کریم کی قدرت اور تصرف کا کمال اور عموم بیان فرمایا ہے۔ وہاں پر لفظ شے کے علاوہ صریح طور پر آیا ہے کہ جس کو چاہے یا ارادہ کرے اس پر قدرت اور قابو رکھنے والا اور اس کو کرنے والا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (آل عمران:41) (کرتا ہے جو چاہتا ہے) اور فرمایا فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (ھود:108) (کرنے والا ہے ان سب کاموں کو جن کا وہ ارادہ کرلے) اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (الشوریٰ:30) (جب وہ چاہے گا ... قادر ہو گا)[1] وعلیٰ ہذا القیاس تو جب

[1] نوٹ: رسالہ تعلیم الاسلام میں عَلٰی مَا یَشَاءُ قَدِیْرٌ (بے شک وہ ان سب امور پر قادر ہے کہ جن کو چاہے) لکھا ہے۔ آیت قرآن کے مطابق اور ترجمہ تفسیر صغیر کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ (از مرتب)

خداوند کریم نے صریح الفاظ میں اپنی قدرت کو ارادہ اور مشیت کے ساتھ مقید کیا ہے اور لفظ شئ سوائے کسی قسم کی تکلف اور بناوٹ کے بمعنے چاہنے اور چاہے ہوئے امر کے آتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں کوئی اور معنے کئے جاویں اور چاہنے اور چاہے ہوئے امر کے نہ کئے جاویں جو کہ ان سب آیات قرآنی کے مطابق ہیں جو کہ خداوند تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے بیان کے لئے آئی ہوئی ہیں اور پھر شے کے جو دوسرے معنے ہیں ان کے لینے میں بہت سے مشکلات پیش آتے ہیں جو کہ معترض نے اور مجیب اوّل نے بیان کی ہیں اور جو معنے ہم لیتے ہیں ان میں ایک مشکل بھی پیش نہیں آتی تو جب یہ حال ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ معنے لئے جاویں اور یہ نہ لئے جاویں بلکہ ضروری اور نہایت ضروری ہے کہ یہی معنے لئے جاویں یہ جواب مجھے بہت پسند ہے کیونکہ اس سے بہت سی آیات کے معنے ایک رنگ کے ہو جاتے ہیں اور اس کی تائید بہت سی آیات سے مل جاتی ہے اور نہ کسی تکلف کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کوئی قرینہ تلاش کرنا پڑتا ہے اور اس سے پہلے دعوے کا اثبات بھی بوجہ احسن ہو جاتا ہے۔

سورۃ الفاتحہ قرآن کی تفسیر اور شرح:

میں نے فاتحہ شریف کی تفسیر میں ذکر کیا تھا کہ سورۃ فاتحہ متن ہے اور قرآن عظیم اس کی تفسیر اور شرح ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم بتاتے جائیں گے کہ قرآن عظیم کی یہ آیتیں یا یہ حصہ فاتحہ شریف کے کس حصہ کی تفسیر ہے چنانچہ اس کے مطابق پہلے بھی کچھ بتایا تھا اور اب بھی کچھ بتاتا ہوں۔

(حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے فرمایا ہے کہ الٓمّٓ سے لے کر هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ:6) تک تواِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ:6-7) کی تفسیر ہے۔ اور اس کی نسبت فرمایا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ:6) اور اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (البقرۃ:7) سے لے کر لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (البقرۃ:8) تک الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی راہ بتائی ہے اور فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ یہود کی مانند فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (المومن:84) (جو علم ان کے پاس تھا اس پر خوش ہو کر اکڑ باز ہو گئے) کے مصداق تھے تو یہود کی مانند ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ (البقرۃ:62) (ان پر ذلت اور محتاجی کی مار پڑ گئی) کے مصداق ہو گئے اور وَ مِنَ

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ (البقرۃ:9) سے لے کر قَدِيْرٌ تک الضَّالِّيْنَ الدَّجَّالِيْن کی راہ بتائی ہے جو کہ خدا اور اس کے رسول کو چھوڑنے والے اور دھوکا دینے والے اور گمراہی کو ہدایت کے عوض اختیار کرنے والے ہیں اور دَجَّالٌ، دَجَالَةٌ سے ہے اور لغت عرب میں اس کی تشریح یوں ہوئی ہے کہ هِيَ فِرْقَةٌ عَظِيْمَةٌ تَحْمِلُ الْمَتَاعَ لِلتِّجَارَةِ (دجال ایک بھاری گروہ کو کہتے ہیں جو کہ تجارت کا مال دور دراز لے جاتا ہو) تو اسی وجہ سے خداوند کریم نے الضَّالِّيْنَ الدَّجَّالِيْن کی تفسیر میں فرمایا ہے فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ[1] (البقرۃ:17) اور یہ فرقہ اہل نفاق کا ہے خواہ کسی مکان میں ہو اور کسی زمانہ میں ہو۔ رَبَّنَا اَعِذْنَا مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَالِ[2]۔

قرآن مجید میں اللہ جل شانہ نے منافقوں کے بہت سے حالات بیان فرمائے ہیں جن پر نظر کرنے سے منافقوں کی علامتوں کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جاتا ہے اور علامات کے علم اور منافقوں کی شناخت کے علاوہ انسان اپنے آپ کو منافق بننے سے بچا سکتا ہے بشرطیکہ خداوند کریم کا فضل شامل حال ہوا اور جب اس کے نفس میں ان علامتوں میں سے کوئی علامت موجود ہو تو انسان اس کو شناخت کر کے اس کے دفعیہ کی کوشش کر سکتا ہے لہٰذا قرآن مجید کے بیان کردہ احوال منافقین میں سے کسی قدر حالات یہاں لکھ دیتا ہوں۔

قرآن میں موجود منافقوں کی علامات:

فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (النساء:143-144) (بے شک منافق لوگ خدا کو چھوڑتے ہیں اور خدا ان کو چھوڑنے والا ہے (یا منافق لوگ خدا کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ ان کو اس کی سزا دیتا ہے) اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں اور لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بہت ہی کم یاد کرتے ہیں طرفین کے درمیان متردّد

[1]۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو انہیں دنیوی فائدہ پہنچا اور نہ انہوں نے ہدایت پائی۔ (تفسیر صغیر)
[2]۔ اے ہمارے رب! ہمیں مسیح دجال کے فتنے سے محفوظ رکھ۔ (از مرتب)

رہتے ہیں نہ ادھر اور نہ ادھر اور جس کو اللہ کریم گمراہ ٹھہرا دے تو پھر اس کے لئے کوئی راہ تم کو نہیں مل سکتی۔)

وَ اللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ۔ وَ اِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُھُمْ وَ اِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِھِمْ کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْھِمْ ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ۔ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوَّوْا رُءُوْسَھُمْ وَ رَاَیْتَھُمْ یَصُدُّوْنَ وَ ھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (المنافقون:2تا6)(اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ منافق لوگ ضرور جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہوا ہے۔ پس لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا ہے بیشک جو یہ کرتے ہیں وہ برا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے تو ان کے دلوں پر چھاپہ لگا دیا گیا لہٰذا وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہیں نہ کبھی سمجھیں گے اور جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کے جسم تم کو تعجب میں ڈالیں گے اور جب بات کریں گے تو تم کان لگا کر ان کی بات کو سنو گے گویا وہ سہارا دی ہوئی لکڑیاں ہیں وہ ہر ایک آواز کو اپنے اوپر (تباہی) خیال کرتے ہیں وہ پورے پورے دشمن ہیں لہٰذا ان سے بچتے رہو اللہ ان کو تباہ کرے کہاں بہکے پھرتے ہیں اور جب ان کو کہا جاتا ہے آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لئے اللہ سے مغفرت چاہے تو اپنے سروں کو پھیرتے ہیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ رکتے اور روکتے ہیں تکبر کرتے ہوئے۔)

ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا (المنافقون:8)(یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے پاس رہنے والوں پر کچھ نہ خرچ کرو تا کہ وہ متفرق ہو جاویں) یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ (المنافقون:9)(کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں واپس گئے تو ہم جو عزت والے لوگ ہیں ان ذلیلوں کو ضرور ہی نکال دیں گے) وَ تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْھُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَکْلِھِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (المائدۃ:63)(اور تم دیکھو گے کہ بہت سے ان میں سے جلدی گھس جاتے ہیں گناہ اور تعدی اور حرام خوری میں جو یہ کرتے ہیں بہت ہی برا ہے۔)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ اَوَ لَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ (العنکبوت:11)(ان لوگوں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے توجب اللہ کے بارے میں ان کو کچھ دکھ دیا جاتا ہے تو لوگوں کے دکھ کو اللہ کے عذاب کی مانند بنادیتے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے کچھ نصرت مل جائے تو ضرور کہتے ہیں ہم تو ضرور تمہارے ہی ساتھ ہیں کیا (یہ چالبازی کرتے ہیں) اور (یہ خیال کرتے ہیں کہ) (اللہ ان باتوں کو نہیں جانتا جو کہ جہان کے دلوں میں ہیں۔)

وَ اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا (الاحزاب:13)(اور جب منافق اور وہ لوگ کہتے تھے جن کے دلوں میں مرض ہے کہ خدا اور رسول نے ہمیں جو کچھ وعدہ دیا تھا وہ دھوکا ہی تھا۔)

وَ اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ یٰۤاَہۡلَ یَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمۡ فَارۡجِعُوۡا وَ یَسۡتَاۡذِنُ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمُ النَّبِیَّ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُیُوۡتَنَا عَوۡرَۃٌ وَ مَا ہِیَ بِعَوۡرَۃٍ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ۔ وَ لَوۡ دُخِلَتۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَقۡطَارِہَا ثُمَّ سُئِلُوا الۡفِتۡنَۃَ لَاٰتَوۡہَا وَ مَا تَلَبَّثُوۡا بِہَاۤ اِلَّا یَسِیۡرًا ۔ وَ لَقَدۡ کَانُوۡا عَاہَدُوا اللّٰہَ مِنۡ قَبۡلُ لَا یُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ وَ کَانَ عَہۡدُ اللّٰہِ مَسۡـُٔوۡلًا ۔ قُلۡ لَّنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡفِرَارُ اِنۡ فَرَرۡتُمۡ مِّنَ الۡمَوۡتِ اَوِ الۡقَتۡلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا (الاحزاب:14 تا 17)(اور جب کہ ان کا ایک گروہ کہتا تھا اے مدینہ والو تمہارے کھڑے ہونے کی جگہ نہیں لہٰذا لوٹ جاؤ اور ایک گروہ اس کا نبی سے اجازت چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے وہ تو بھاگنا ہی چاہتے تھے اور بس اور اگر ان پر آجاویں اس کے اطراف سے اور پھر فتنہ کی طرف ان کو بلایا جائے تو ضرور ہی اس کو لاویں گے اور پھر اس میں تھوڑا ہی ٹھہریں گے حالانکہ انہوں نے ٹھیک ٹھیک اللہ سے معاہدہ کیا تھا پہلے ہی سے کہ ہم پیٹھ نہ دیں گے اور جو اللہ کے ساتھ عہد کئے جاتے ہیں ان کی نسبت ضرور ہی باز پرس ہوگی کہہ دو کہ اگر تم موت اور قتل سے بھاگو گے تو بھاگنا تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ دے گا اور پھر تم بہت ہی کم متمتع ہوگے۔)

وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (آل عمران:155) (اور ایک گروہ کو ان کی جانوں نے فکر میں ڈالا تو اللہ پر ناحق جہالت کی بدگمانی کرنے لگے کہنے لگے کیا ہمارے لئے اس سے کچھ ہے کہہ دو بے شک یہ امر سب اللہ ہی کے لئے ہے چھپاتے تھے اپنے جی میں وہ کچھ جو کہ تیرے لئے ظاہر نہ کرتے تھے کہتے تھے کہ اگر ہمارے لئے اس امر سے کچھ بھی ہوتا تو ہم ہرگز یہاں پر قتل نہ ہوتے۔)

وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ۔ (آل عمران:168) (اور ان کو کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا مدافعت کرو۔ کہنے لگے اگر ہم جنگ جانتے تو ضرور ہم تمہاری اتباع کرتے۔)

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَ لَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَ لَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ۔ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ۔ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (الحشر:13تا17) (اگر وہ) (کہ جن سے عہد کیا تھا کہ ہم تمہارے مددگار ہیں اور ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں) نکالے جاویں تو ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان کے ساتھ جنگ ہو تو ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر ان کی مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر دیں گے پھر مدد بھی نہ دیئے جاویں گے ضرور تمہارا خوف ان کے دلوں میں اللہ کے خوف سے زیادہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں یہ لوگ اکٹھے ہو کر تم سے نہ لڑیں گے مگر قلعہ دار بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے ان کی آپس میں خانہ جنگی سخت ہے تم ان کو مجتمع خیال کرتے ہو پر ان کے دل متفرق ہیں اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں ان کی

مثال ان کی سی ہے جو ان سے تھوڑے عرصہ پہلے ہوئے ہیں جو کہ اپنے کام کا وبال چکھ چکے ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے شیطان کی مانند جبکہ وہ انسان کو کہتا ہے کہ کافر ہو پس جب وہ کافر ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں بری ہوں تجھ سے میں تو رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۔ (النساء:61-62) (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور اس پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی ہے۔ چاہتے ہیں کہ سرکش شیطان کے پاس فیصلہ لے جاویں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان کو کہا جائے کہ آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے اتارا ہے اور رسول کی طرف تو تم دیکھو گے منافقوں کو کہ تم سے سخت رکیں گے۔)

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۔ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۔ (النساء:73 تا 74) (اور کچھ تم میں سے ضرور دیر کرتے ہیں پس اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر بڑا انعام کیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ حاضر نہ تھے اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے کوئی فضل ملتا ہے تو ایسا کہتا ہے گویا کہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی کہ کاش میں اس کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا۔)

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 9 بابت ماہ مارچ 1907ء صفحہ 325 تا 360)

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۔ (المائدۃ:53) (پس تم دیکھو گے دل میں مرض رکھنے والوں کو کہ جلد ان میں کہیں گے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی گردش نہ پہنچے۔)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔ (الانفال:22)(اور ان کی مانند مت بنو! جو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے حالانکہ وہ نہیں سنتے۔)

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (الانفال:50)(جبکہ منافق اور وہ لوگ کہتے تھے جن کے دلوں میں مرض ہے کہ ان لوگوں کو (صحابہ کو) ان کے دین نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔)

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ۔ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ۔ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ۔ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔ وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ۔ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (التوبۃ:44تا58)

(اللہ اور آخری دن پر جو ایمان لاتے ہیں وہ کبھی تم سے اجازت نہیں چاہتے کہ کوشش کریں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے تم سے اذن تو وہی مانگتے ہیں جو کہ اللہ اور آخری دن پر ایمان نہیں لاتے اور ان کے دل میں شک پڑے ہوئے ہیں لہٰذا وہ اپنے شک میں متردّد ہو رہے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ (آپ کے ساتھ جہاد میں) نکلنا چاہتے تو ضرور ہی اس کے لئے کچھ تیاری کرتے لیکن (اصل بات تو یہ ہے) کہ اللہ نے ان کا (جہاد کے لئے) اٹھنا ناپسند کیا لہٰذا ان کو روک دیا اور ان کو کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ اگر تم میں نکلتے تو بجز فساد کے تمہارے لئے اور کچھ نہ بڑھاتے۔ اور ضرور تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے تمہارے لئے فتنہ چاہتے اور تم میں (رہ کر) ان کے لئے سنتے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ انہوں نے پہلے بھی فتنہ چاہا تھا اور تمہارے لئے بہت سے امور الٹ پلٹ کئے حتیٰ کہ حق آگیا اور ان کے برا مناتے ہی ہوئے اللہ کی بات ظاہر ہو گی اور کچھ ان میں سے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم مجھے اجازت دے دو (کہ میں جہاد میں شریک نہ ہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالو خوب سنو! فتنہ میں تو وہ پڑ ہی چکے اور بیشک جہنم کافروں پر خوب محیط ہے۔

اگر تمہیں کوئی اچھی بات ملے تو وہ ان کو دکھ دیتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اپنا امر پہلے سے پکڑ چکے ہیں (یعنی علیحدہ ہو گئے ہیں) اور خوب خوش ہوتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔ کہہ دو ہمیں تو وہی ملے گا جو کہ اللہ نے ہمارے لئے لکھا ہے وہی ہمارا آقا (حامی) ہے لہٰذا سب مومن اسی پر سہارا رکھیں کہہ دو تم تو ہمارے نسبت دو خوبیوں میں سے ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہاری نسبت اس کے منتظر ہیں کہ اللہ اپنے پاس سے تم کو کوئی عذاب دے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ پس تم منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں کہہ دو خواہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے ہرگز تم سے قبول نہ کیا جاوے گا۔ کیونکہ تم حکم عدولی کرنے والے ہو۔ اور ان کے خرچوں کو قبول ہونے سے محض اسی امر نے روکا ہے کہ بیشک وہ اللہ اور اس کے رسول سے منکر ہوئے ہیں اور جب نماز کو آتے ہیں تو ضرور سست ہی آتے ہیں۔ اور خرچ کرتے ہیں تو ضرور ناخوش ہی

ہو کر کرتے ہیں۔ پس ان کے اموال اور اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں کیونکہ (اصل بات تو یہ ہے) کہ اللہ ان کے ساتھ ان کو عذاب ہی دینا چاہتا ہے۔

اس قریب زندگی میں اور کہ ان کی جانیں اسی حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم تم سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم سے نہیں ہیں ولیکن یہ ڈرنے والے لوگ ہیں۔ اگر یہ کوئی جائے پناہ پائیں یا گڑھا یا کوئی اور داخل ہونے کی جگہ پائیں تو ضرور ہی دوڑتے ہوئے اسی کی طرف لوٹ جاویں۔ اور کچھ ان میں سے وہ بھی ہیں جو کہ صدقات میں تمہارے پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اگر ان کو ان سے کچھ دیا جائے تو راضی ہو جائیں اور اگر ان کو کچھ نہ دیا جائے پھر تو جھٹ پٹ وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور کاش وہ اس پر راضی ہو جاتے جو کہ اللہ اور اس کے فرستادہ نے ان کو دیا ہے اور کہتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے دے گا بے شک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔)

وَ مِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَ يَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ (التوبۃ:61) (اور کچھ ان سے وہ ہیں جو کہ اس کامل نبیؐ کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کان رکھنے والا ہے۔)

اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡكَرِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَقۡبِضُوۡنَ اَيۡدِيَهُمۡ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمۡ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (التوبۃ:67) (منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی جنس سے ہیں ناپسند باتوں کا حکم دیتے ہیں اور دستور کی باتوں سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند کرتے ہیں انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا ہے لہٰذا اللہ نے ان کو چھوڑ دیا ہے بے شک منافق خلاف حکم کرنے والے ہیں۔)

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ۔ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (التوبۃ:75-76) (اور کچھ ان سے وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے کچھ دیا تو ہم ضرور ہی تصدّق کریں گے اور ضرور ہی ہم سنوار والوں سے ہو جاویں گے تو جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے کچھ دیا تو اس پر بخل کرنے لگے اور لوٹ گئے اور یہ ہمیشہ اعراض کرنے والے ہیں۔)

اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ اِلَّا جُهۡدَهُمۡ فَیَسۡخَرُوۡنَ مِنۡهُمۡ ۙ (التوبۃ:79) (جو کہ حرف گیری کرتے ہیں ذی رغبت مومنوں پر صدقات میں اور ان لوگوں سے جو کہ بجز اپنی محنت کے اور کچھ نہیں پاتے تو ان سے مسخری کرتے۔)

فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِهِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ وَ کَرِهُوۡۤا اَنۡ یُّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ قَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ ؕ قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَفۡقَهُوۡنَ (التوبۃ:81) (پیچھے چھوڑ گئے ہوئے رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھے رہنے سے خوش ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کو ناپسند کیا اور کہا گرمی میں مت جاؤ کہہ دو جہنم کی آگ کی گرمی بہت شدید ہے کاش یہ سمجھتے۔)

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ (التوبۃ:97) (گنوار لوگوں کا کفر اور نفاق بہت سخت ہے اور اس امر کے بہت لائق ہیں کہ اس کے حدود نہ جانیں جو کہ اللہ نے اپنے رسول پر اتارا ہے۔)

وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ (التوبۃ:98) (اور گنواروں میں سے وہ بھی ہیں کہ جو خرچ کرتے ہیں اس کو ڈانڈ تصور کرتے ہیں اور تم پر گردشوں کے منتظر رہتے ہیں۔)

مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ (التوبۃ:101) (نفاق سرکشی کرتے ہیں۔)

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مَسۡجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفۡرًا وَّ تَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ مِنۡ قَبۡلُ (التوبۃ:107) (اور جنہوں نے مسجد بنائی تاکہ ضرر پہنچائیں اور کفر کریں اور اس شخص کی تاڑ میں رہیں جو کہ اللہ اور اس کے فرستادہ سے لڑا ہے پہلے سے۔)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتۡنَةَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰهِ (العنکبوت:11) (کچھ وہ انسان ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے تو جب اللہ کے بارہ میں اس کو دکھ دیا جائے تو لوگوں کے فتنہ کو اللہ کے عذاب کی مانند بنانے لگتے ہیں۔)

سَیَقُوۡلُ لَکَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ شَغَلَتۡنَاۤ اَمۡوَالُنَا وَ اَهۡلُوۡنَا (الفتح:12) (ابھی

گنواروں میں سے پیچھے چھوڑے گئے ہوئے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور گھر والوں نے ہمیں مشغول کر کے روک دیا۔)

فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (المجادلۃ:19) (تو اس کے لئے ویسے ہی حلف اٹھاتے ہیں جیسے کہ تمہارے لئے حلف اٹھاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم بے شک کسی بڑی چیز پر ہیں دیکھو ضرور یہ پکے دروغ گو ہیں۔)

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ (البقرۃ:77) (اور جب ملتے ہیں ایمان والوں کو تو ان کو کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں ہم اور جب ایک دوسرے کی طرف جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم ان کو وہ باتیں سناتے ہو جو کہ اللہ نے تم پر کھولی ہیں تا کہ ان کے ساتھ تمہارے رب کے نزدیک وہ تم پر حجت پکڑیں۔)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (البقرۃ:205تا207) (اور لوگوں سے کچھ وہ بھی ہیں جن کی بات ورلی زندگی میں تجھے تعجب میں ڈالے گی اور اللہ کو اس بات پر گواہ بنائے گا جو کہ اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ خصومت کرنے والا ہوتا ہے اور جب حکومت والا بنتا ہے تو زمین میں کوشش کرتا ہے کہ فساد کرے اس میں اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور جب اس کو کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو عزت اس کو گناہ پر پکڑتی ہے۔ پس جہنم اس کے لئے کافی ہے۔)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ (النساء:146-147) (بے شک منافق لوگ آگ کے نچلے درجے میں ہوں گے اور ہرگز اس کے لئے کوئی مددگار نہ پاؤ گے ہاں جو توبہ کریں گے اور اصلاح کریں گے اللہ کو مضبوط پکڑیں گے اور اپنا دین اللہ کے لئے خالص کریں۔)

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۔ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۔ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الحدید:14 تا16) (جس دن کہ منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں کو کہیں گے ہمارا انتظار کرو تا کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں تو کہا جاوے گا لوٹ جاؤ اپنے پیچھے اور نور تلاش کرو تو ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کی جاوے گی جس کا دروازہ ہو گا کہ اس کے اندر کامل رحمت ہو گی اور اس کے باہر اسی کی طرف عذاب ہو گا ان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ مومن کہیں گے ہاں تھے ولیکن تم نے خود اپنی جانوں کو فتنہ میں ڈالا ہے اور تم نے انتظار کیا ہے اور شک میں پڑے اور آرزوؤں نے تم کو فریب دیا ہے یہاں تک کہ حکم خدا آ گیا اور ایک بڑے دھوکہ باز نے تمہیں اللہ کی نسبت دھوکہ دیا ہے تو آج کے دن نہ تم سے بدلا لیا جاوے گا اور نہ کفار سے۔ تمہارا ٹھکانہ آگ ہے وہی تمہاری رفیق ہے اور بہت برا مرجع ہے۔)

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (المنافقون:7) (ان پر برابر ہے کہ تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اللہ ان کو نہ بخشے گا اور نہ بدی کے ترک کرنے کی توفیق دے گا۔ بے شک اللہ خلاف ورزی کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۔ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ

بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء:139 تا142) (منافقوں کو خوشخبری دے دو کہ تمہارے لئے دردناک عذاب ہے جو کہ مومنوں کے سوا کافروں کو اپنے حمایتی قرار دیتے ہیں کیا ان کے پاس سے عزت چاہتے ہیں۔ پس عزت تو سب کی سب اللہ کے ہی پاس ہے اور ضرور کتاب میں ان پر یہ اتارا گیا تھا کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کفر کیا جائے ان کا اور ان پر استہزاء کیا جائے تو مت بیٹھو ان کے ساتھ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاویں (اور اگر تم اسی حالت میں ان کے ساتھ بیٹھو گے) تو تب تم بھی ان کی مانند ہو گے بے شک اللہ سب منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرے گا جو کہ تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ پس اگر تمہارے لئے فتح ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کی کچھ قسمت ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں آئے اور ہم نے تم کو منع نہیں کیا مومنوں سے پس اللہ ہی قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ کافروں کے لئے مومنوں پر ہرگز کوئی راہ نہ بنائے گا۔)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التوبۃ:73) (اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر تشدد کر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا انجام ہے۔)

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا (التوبۃ:83) (تو اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف لوٹاوے تو ان کو کہہ دے کہ تم ہرگز میرے ساتھ نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔)

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (التوبۃ:84) (اور ان میں سے کسی پر بھی نماز جنازہ نہ پڑھو جب مر جائے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔)

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب:61 تا63)

(اگر منافق لوگ باز نہ آئے اور وہ کہ جن کے دلوں میں مرض ہے اور مدینہ میں بد خبریں اڑانے والے تو واللہ ہم ضرور ہی تم کو ان کے پیچھے لگا دیویں گے پھر وہ تمہارے پڑوس میں بہت ہی قلیل ٹھہریں گے (اور وہ بھی) لعنت کئے ہوئے جہاں کہیں پائے جاویں گے وہاں ہی پکڑے جاویں گے اور خوب قتل کئے جاویں گے یہ اللہ کی سنت (عادت طریق دستور) ہے ان میں جو گذر چکے پہلے اور تم کبھی بھی اللہ کی سنت کے لئے تبدیلی نہ پاؤ گے۔)

وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ (الفتح:7)(اور ان منافقوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اللہ عذاب دے گا جو کہ اللہ پر بدگمانی کرنے والے ہیں انہی پر میری گردش ہے اور اللہ نے غضب کیا ہے ان پر اور ان کے لئے جہنم تیار کیا ہے۔)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (النساء:89)(پس تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو اور اللہ نے لوٹا دیا ہے ان کو اس کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا ہے۔)

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۔ (النساء:90-91)(یہ لوگ پسند کرتے ہیں کاش کہ تم بھی ویسے ہی کافر ہو جاؤ جیسے کہ وہ خود کافر ہیں تو پھر تم برابر ہو جاؤ پس مت بناؤ ان سے حامی یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں اور اگر پھر جاویں تو پھر ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں پاؤ اور نہ بناؤ ان سے حامی اور مددگار بجز ان کے جو کہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جن کے اور تمہارے درمیان پختہ عہد ہے یا جو کہ تمہارے پاس اس حالت میں آئیں کہ تمہارے ساتھ اور اپنی قوم کے ساتھ لڑائی کرنے سے ان کے دل رُک گئے ہوں۔)

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَةِ اُرْکِسُوْا فِیْهَا فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْکُمْ وَ یُلْقُوْٓا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ وَ یَکُفُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اُولٰٓئِکُمْ جَعَلْنَا لَکُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا۔ (النساء:92)
(تم کچھ اور لوگ بھی ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہوں گے کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں فتنہ کی طرف تو لوٹ پڑتے ہیں اس میں پس اگر وہ تم سے کنارہ نہ کریں اور تم سے صلح نہ کریں اور اپنے ہاتھوں کو تم سے نہ روکیں تو پھر پکڑو ان کو اور ان کو جہاں پاؤ وہاں ہی قتل کرو ان کو اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ہم نے تمہارے لئے کھلا کھلا غلبہ بنایا ہے۔)

اور بھی ایسی آیتیں ہیں کہ جن میں منافقوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ لیکن تدبر کی نظر سے قرآن مجید کو پڑھنے والے کے لئے مذکورہ بالا آیات ان اغراض کے لحاظ سے بالکل کافی بلکہ کافی مقدار سے زائد ہیں۔ کہ جن کے لئے یہ آیتیں یہاں پر جمع کی گئی ہیں لہٰذا اسی قدر پر کفایت کی جاتی ہے۔ اور جن اغراض کے لئے یہ آیات کریمہ یہاں پر لکھی گئی ہیں اگرچہ تفصیلی نظر سے تعداد میں بہت سی ہیں لیکن حقیقت میں سب کا مرجع اور اصل اور جڑھ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید نے منافق کن لوگوں کو قرار دیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں اور ان کے لئے کون سی ایسی سزا تجویز فرمائی ہے۔ جو کہ واقع ہونے کے بعد سب سے بڑھ کر ان کی شناخت اور امتیاز کے لئے واقعی اور بیّن ترین علامت اور نشان ہو۔

جیسا کہ خداوند کریم نے خود فرمایا ہے کہ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ (الرحمٰن:42)
(مجرم لوگ اپنی علامت سے پہچانے جاویں گے) اور ہمارے مفسرین نے اگرچہ اس کو قیامت ہی کی نسبت بیان کیا ہے لیکن جو لوگ مجرموں کے حالات پر عبرت کی نگاہ سے نظر کرنے والے ہیں وہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کر سکتے کہ خداوند کریم اسی دنیا میں مجرموں کو ایسی سزا دے دیتا ہے کہ جس کے آثار اپنے دوام اور قیام کے لحاظ سے ان مجرموں کی شناخت کے لئے کافی اور واضح ترین علامت ہوتے ہیں مثلاً سب سے پرانے اور

مشہور مجرم یہود لوگ ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ خداوند کریم نے ان کو دنیا ہی میں وہ سزا دی ہے کہ باوجود اس قدر عرصہ دراز گذرنے کے اب تک اس کے آثار ان میں بیّن طور پر موجود ہیں کہ بادی النظر میں اپنے وجود کا یقین دلا کر آیت کریمہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ (البقرۃ:62)(ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ڈالی گئی ہے) اور آیت کریمہ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدۃ:34)(اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے والوں اور فساد کی غرض سے ملک میں (جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے) دوڑتے (پھرتے) ہیں ان کی جزاء تو یہی ہے کہ وہ قتل کئے جاویں یا صلیب پر چڑھائے جاویں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے کاٹے جاویں یا جلاوطن کئے جاویں اس سرزمین سے)[1] کی ہمیشہ تصدیق کرتے رہتے ہیں۔ کیا جب مشرق سے مغرب تک ساری دنیا کئی صدیوں سے دیکھ رہی ہے۔ کہ یہود لوگ باوجود کثیر التعداد ہونے کے ان میں سے کوئی ایک بھی کسی ملک کا بادشاہ یا راجہ نواب کیا کسی ادنیٰ سی بستی کا نمبردار تک بھی نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ باوجودیکہ اس زمانہ کی عیسائی سلطنتیں ہمدردی انسان اور اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی مدعی ہیں۔ لیکن پھر بھی آئے دن ہر ایک سلطنت ان کو اپنے ملک سے جلاوطن کر دیتی ہے تو کیا ان آثار سے دنیا ان کو اور اقوام سے ممتاز نہیں کرتی ضرور کرتی ہے۔ اور ایسا کرتی ہے کہ جس میں ذرہ بھر بھی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ رہا یہ کہ اس شناخت سے فائدہ کیا ہوتا ہے تو واضح ہو کہ اس سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

منافقین سے احتراز:

ہم ان میں سے فقط تین فائدے یہاں پر بیان کرنے چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جب انسان کو نفاق کی حقیقت اور اس کے علامات کا پورا پورا علم ہو یہاں تک کہ وہ ان کے ذریعہ سے منافق کو پہچان سکے اور اس کی سزا کو بھی خوب جانتا ہو تو ضرور وہ نفاق اور اس کے

[1] ۔ رسالہ تعلیم الاسلام میں وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا نہیں لکھا ہوا تھا۔ آیت کا یہ حصہ اور ترجمہ تفسیر صغیر سے شامل کر دیا گیا ہے۔ (از مرتب)

علامات سے بچنے کی کوشش کرے گا اور اس سے اس کی نہایت خطرناک سزا سے محفوظ رہے گا اور اگر اس کو نفاق اور اس کے علامات اور سزا کا علم نہ ہو گا تو وہ ان سے بچنے کی نہ کوشش کرے گا اور نہ بچ سکے گا اور اس کی سخت خطرناک سزا کے خطرہ میں ہمیشہ رہے گا۔ دوم یہ کہ جب اس کو ان امور کا علم ہو گا اور اس کے ذریعہ سے منافقوں کو شناخت کر سکے گا اور اس کو بھی جانتا ہو گا کہ منافق ہونے اور ان کے ساتھ دینے اور ہمراہ ہونے کی کیا سزا ہے تو پھر ضرور ہی منافق اور مومن کو شناخت کر کے مومنوں کے ساتھ کو اختیار کرے گا اور منافقوں کے قریب سے ایسا بھاگے گا جیسا کہ ایک یہودی برص والے سے بھاگتا ہے یا ایک مسلمان خنزیر کے گوشت سے یا گائے پرست گائے کے گوشت سے نفرت کرتا ہے۔ سوم یہ کہ ان امور کے جاننے سے شیعہ اور سنیوں کے درمیان انسان خوب فیصلہ کر سکتا ہے۔

شیعوں کے نزدیک حضرت علیؓ نے تقیہ کیا:

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ شیعہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت علی اور ان کے دونوں صاحبزادوں اور دیگر چند اشخاص کے سوا (جو کہ ان کے طرف دار اور بہی خواہ تھے) اور ہزار ہا سب صحابہ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ[1]) منافق تھے۔ اور ابو بکر اور عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم اجمعین) رئیس المنافقین تھے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ) اور یہاں تک انہوں نے اس میں غلو کیا ہے کہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں بھی ان کا یہی اعتقاد ہے۔ جو کہ اور صحابہ کرام کی نسبت ہے اور ان کے اس گندے اعتقاد کی بنیاد ان کے من گھڑت قصوں اور انسانوں پر ہے جن کا ہر گز وہ کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔ اور ان کی معتبر کتابوں میں خود حضرت علی اور باقی اہل بیت کے ایسے اقوال موجود ہیں جو کہ اس گندے اعتقاد کی بیخ کنی کے لئے بالکل کافی تھے۔ لیکن ان دشمنان ایمان نے جب دیکھا کہ ان احادیث معتبرہ کے لحاظ سے ہمارے اس خود ساختہ عقیدہ کی بنیاد گر جاتی ہے تو اس کے بچانے کے لئے عذر گناہ بدتر از گناہ کے مطابق یہ عذر بنالیا کہ یہ اقوال اہل بیت نے بطور تقیہ بیان فرمائے ہیں۔ ورنہ ان کا اصل اعتقاد یہی تھا کہ ابو بکر و عمر اور ان کے ساتھ والے

[1]۔ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

سب صحابہ منافق اور رئیس المرتدین تھے۔ اور یہ نہ سوچا کہ ہم ابو بکر و عمر اور ان کے ساتھ والوں کو منافق بتاتے بتاتے خود حضرت علی اور باقی اہلِ بیت اور ان کے بہی خواہوں کو ہی منافق بنا رہے ہیں۔ کیونکہ شیعہ کے تقیہ اور نفاق میں بالکل فرق نہیں جیسا کہ میں نے پہلے مفصل بیان کیا ہے۔

تعجب ہے کہ ایک طرف شیعہ صاحبان کہتے ہیں کہ علی شیر خدا کو یہ قدرت حاصل تھی کہ ایک دم میں ان سب مخالفین کو ہلاک کر دیتے۔ اور اگر اپنی ذوالفقار کو ایک دفعہ ہاتھ میں لے کر ہلاتے تو دنیا میں ایک مخالف بھی زندہ نہ رہتا۔ بھلا جب یہ قدرت تھی تو پھر تقیہ کیوں کیا کون سی ضرورت پیش آئی۔ اور جب ابو بکر و عمر اور ان کے جان نثار صحابہ (نَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْہُ[1]) سب منافق تھے اور شیر خدا ان کی ہلاکت پر قادر بھی تھے اور قرآن مجید میں یہ حکم بھی موجود تھا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التوبۃ:73)(اے نبی کفار اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر تشدد کر) تو پھر کیوں شیر خدا نے قرآن مجید کے خلاف کیا اور ان کے ساتھ جہاد نہ کیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا یہ اعزاز کیا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی ان کے پیچھے نماز پڑھیں ان کی تعریفیں کیں۔ کیا جس کی نسبت خداوند کریم جہاد کا حکم دے اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا چاہئے۔ یہ سوال ایسا قوی ہے۔ کہ شیعہ کے مذکورہ بالا گندے ترین عقیدہ کی بیخ کنی کے لئے کافی ہے اور شیعہ لوگ اس کے جواب سے بالکل عاجز ہیں۔

اور نہایت درجہ کا عام فہم اور جاہل سے جاہل بھی اس امر کو سوچ سکتا ہے کہ حضرت علی ایک طرف تو اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے پر ایسے قادر ہوں کہ ذوالفقار کے ایک ہاتھ سے سب کا صفایہ اور کام تمام کر سکتے ہوں اور پھر ان کے مخالف منافق بلکہ رؤساؤ منافقین ہوں اور دوسری طرف منافقوں کے بارہ میں حکم خداوندی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ (اے نبی کفار اور منافقین سے جنگ کرو) ہو اور باوجود اس کے پھر شیر خدا اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ یہ روباہ بازی اور بزدلی دکھائیں کہ

[1]۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

ان کے ساتھ جہاد کرنے کے فرض مؤکد کا تارک ہونا تو درکنار بلکہ الٹی ان کی غلامی اور مداحی اور ثناخوانی اور خوش آمد شروع کر دیں اور عام مجالس میں ان رؤساء منافقین کو (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ[1]) امیر المومنین اور خلیفہ رسول اللہ کہیں اور برملا ان کی بیعت کریں۔ جس کا خلاصہ مفہوم یہ ہو کہ میں آپ کے سب احکام کی فرمانبرداری اور آپ پر جان نثاری کروں گا۔ حتیٰ کہ آپ کی تائید اور آپ کے مخالفوں کی تذلیل میں اپنی جان دے دوں گا۔ اور پھر ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ رکھیں جو کہ ایک مرید اپنے پیر و مرشد سے رکھتا ہے یا ایک سچا فرمانبردار مسلمان خلیفہ برحق اور امام برحق کے ساتھ رکھتا ہے۔

کیا نوحؑ نے اپنے مخالف کفار سے یہی برتاؤ کیا تھا کیا حضرت ابراہیم نے یہ کیا تھا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون وغیرہ سے یہ کارروائی کی تھی۔ یا کہ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ طریق تھا بلکہ جہاں تک تلاش کرو ایک نبی بھی ایسا نہ ملے گا جس نے اپنے مخالفوں کے ساتھ ایک منٹ کے لئے بھی یہ برتاؤ کیا ہو۔ کہ ان کی ایسی گندی اور بزدلانہ اور منافقانہ خوش آمد کی ہو یا ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہو یا ان کے پیچھے نمازیں پڑھی ہوں یا ان کو امیر المومنین اور خلفاء رسل کہا ہو۔ ہاں اگر علی علیہ السلام کے لئے سب انبیاء سے عموماً اور حضرت خاتم النبیین سے خصوصاً کوئی بالکل نرالی طرز کی شریعت اور کتاب خداوند کریم نے نازل فرمائی ہے تو پھر شیعہ صاحبان کو چاہئے کہ ان کا پبلک کے سامنے ثبوت دیں۔ اور اس انوکھی شریعت اور کتاب کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

لیکن یاد رہے کہ خداوند کریم نے تو لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (الاحزاب:63) (تم اللہ کے طریق کے لئے تبدیل نہ پاؤ گے) فرمایا ہوا ہے بلکہ قرآن مجید کو کھول کر دیکھو کہ یہ آیت وہاں پر ہی آئی ہے کہ جہاں پر انبیاءؑ کے مخالفوں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے نیز خداوند کریم نے قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:10) (کہہ دے کہ میں نئی طرز کا رسول نہیں ہوں) فرما کر بتا دیا ہے کہ سب انبیاء ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں تو پھر یہ غضب کہاں

[1]۔ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

سے آگیا کہ انبیاء کا ایک تابع شخص ایسی نرالی طرز کا بن جائے کہ انبیاء میں سے اور ان کے اتباع میں سے ایک بھی اس طرز کا نہ ہوا ہو۔

شیعہ حضرات کی منافقت:

پھر ان کی بناوٹ کا پتہ لگانا ہو تو ان سے سوال کرو کہ حضرت علیؓ نے ایسا کیوں کیا تو کہہ دیتے ہیں کہ آپ نے تقیہ کیا ہے اور تقیہ فرض ہے پھر ان سے دریافت کرو کہ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت کیوں نہ کی تو کہیں گے کہ وہ بدکار پلید انسان تھا۔ بھلا وہ کس طرح سے ایسے انسان کی بیعت کرتے تو اب یہاں پر آکر تقیہ کی فرضیت بالکل بھول جاتے ہیں ؟ الغرض کہ پہلے تو اس گندے عقیدہ کے ثابت کرنے کے لئے تقیہ کا قول کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کو منافق بنایا پھر اس تقیہ یا بلفظ دیگر نفاق کے اثبات کے لئے یہ کہا کہ سب انبیاء تقیہ باز ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تقیہ کے اثبات کے لئے کہا کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے ہیں۔ اور یہ نہ سوچا کہ خداوند کریم تو انبیاء کو صدیق کا خطاب دیتا ہے جس کے معنے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کا سچا اور راستباز تو خداوند کریم کے صدیق کہنے کا کچھ پاس نہ کیا اور کہہ دیا کہ ابراہیم نے جھوٹ بولا ہے۔

اور پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے جھوٹی حدیث بھی بنائی اور کیوں نہ بناتے جب کہ ان کی نظر میں سب انبیاء بھی جھوٹ بولتے رہے ہیں تو اب ان کو جھوٹ بولنے میں کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔ اور جب ان کے نزدیک سب اہل بیت اور خصوصاً حضرت علی شیر خدا تقیہ کے طور پر محض جھوٹی حدیثیں سناتے رہے ہیں تو پھر انکو ایسی من گھڑت حدیثیں بنانے میں کیا روک ہو سکتی ہے۔ اور یہ نہ سوچا کہ جب تقیہ یا بلفظ دیگر جھوٹ کا دروازہ حدیثوں اور اہلبیت کے اقوال میں بھی کھلا ہے اور کہ حضرت علی خود اپنے اعتقاد کے خلاف تقیہ کی فرضیت کی وجہ سے منافق کو مومن بلکہ رئیس المنافقین کو امیر المومنین اور خلیفۂ رسول اللہ کہتے ہیں اور ایسے اہم مسائل میں ایسا گندہ اور غلطی میں ڈالنے والا جھوٹ بولتے تھے۔ تو پھر ان کے باقی بیان کردہ مسائل کی صداقت اور حقانیت پر

کیونکر یقین ہو سکتا ہے کیونکہ ممکن بلکہ احتمال قوی ہے کہ باقی مسائل بھی انہوں نے محض جھوٹے بیان کر دیئے ہوں۔ کیونکہ ان کے نزدیک تقیہ فرض اور واجب لازم تھا اور یہ سب مصیبت اسی وجہ سے ان پر آئی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی قدر نہیں کی۔

ورنہ ایک صدیق کے لفظ سے یہ فیصلہ ہو جاتا تھا کہ کوئی نبی کاذب نہیں ہے یعنی تقیہ باز نہیں ہے اور چونکہ آنحضرت کو بھی یہ حکم تھا کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام:91) (پس ان کی ہدایت کی اقتداء کر) لہٰذا حضرت علی بھی تقیہ باز اور کاذب نہ تھے۔ پس تعجب ہے کہ جس عقیدہ کی بنیاد کے سہارا دینے کے لئے پہلے سب انبیاء ورسل کو کاذب دروغ گو بلکہ تقیہ بازی جیسے گندے نفاق کے مرتکب قرار دینا پڑا ہے اور پھر خود حضرت علی علیہ السلام اور دیگر اہلبیت اور ان کے دوست داروں کو دروغ گو خوشا آمدی، جھوٹے مداح اور اہل نفاق کے ثناخوان اور منافقوں کے ساتھ جنگ اور تشدد کرنے کے حکم خداوندی کے تارک اور اہل نفاق کو اپنا پیشوا اور امام بنانے والے۔ بلکہ خود بھی رات دن نفاق کو اپنا دستور العمل اور مذہب بنانے والے تجویز کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے مسلمان کہلا کر اور محبان علی اور جان نثارانِ اہلبیت ہونے کے مدعی ہو کر بھی اس مجمع الفسادات اور خود تراشیدہ عقیدہ کو ترک نہیں کیا اور صدہا سال سے اس پر اصرار کرتے چلے آتے ہیں اور نادان محبان علی کے عقل میں کبھی اس امر کا خیال تک نہیں آتا کہ ہم کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہماری اس صدہا سالہ کوشش سے ثابت کیا ہو رہا ہے۔

ثابت تو یہ کرنا چاہتے تھے کہ ابو بکر و عمر اور ان کے اصحاب سب منافق تھے اور یہ دونوں سب کے لئے رئیس تھے۔ اور پکے مومن حضرت علی اور ان کے ساتھی ہیں لیکن شیعہ کے مسلمات سے اگر ثابت ہوتا ہے تو اسی قدر اور بس۔ کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے ساتھی سب (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ[1]) منافق کذاب تھے اور کہ سالہا سال تک اپنے ہزارہا مخالفوں کے ساتھ جو بات کرتے تو منافقانہ کرتے اور جو معاملہ اور برتاؤ کرتے وہ بھی منافقانہ کرتے۔

[1]۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (از مرتب)

ایسے نادان دوستوں سے تو دشمن ہی بھلے ہیں جو کہ دوستی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو اور آپ کے اہل جماعت کو منافق کذاب اور فریبی اور بزدل اور خوشامدی بناتے ہیں۔ اور ان کے مذہب کی تائید تو کرنی چاہتے ہیں لیکن قرآن مجید کو بیاض عثمانی کہہ کر اور احادیث کو تقیہ کا نہایت گندہ اور بدنما داغ لگا کر دونوں کو نظر اعتبار سے ایسا گراتے ہیں کہ اہم اور ضروری مسائل تو درکنار کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مسئلہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا اور چونکہ مذہب کا سب دارو مدار قرآن مجید اور احادیث پر تھا اور یہ دونوں نظر اعتبار سے ایسے گرا دیئے گئے ہیں کہ مذہب کا کوئی مسئلہ بھی ان دو سے ثابت نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ مذہب بدوں ثبوت کے کچھ چیز ہی نہیں لہٰذا ان کی اس حرکت پر دوستانہ حرکت سے شیعہ مذہب کی بیخ کنی ہی ہوگئی پھر ان کے اس عقیدہ سے بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر بہت بھاری زد وارد ہوتی ہے جس سے آپ کی شان کی بہت تحقیر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ابو بکر و عمر اور باقی سب صحابہ (نَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْہُ) اسلام سے خارج ہوئے اور جو داخل اسلام ہیں ان کی تعداد ایسی کم ہے جو کہ ایک سو تک بھی نہیں پہنچتی۔

تو پھر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت نے باوجود خاتم الانبیاء سید الرسل فخر بنی آدم ہونے کے تیئس سال میں کیا تو یہی کہ مسلمان تو ایک سو تک بھی نہ بنا سکے اور منافق ہزارہا بنادئے اور منافق بھی وہ زور آور کہ زندگی بھر میں آپ کے ارادوں کی روک ہوتے رہے۔ اور بعد میں آپ کے حقیقی جانشینوں کو محروم کر کے خود خلافت دبا بیٹھے۔ تو کیا پھر عقل سلیم بلکہ مطلق عقل انسانی اس کو تسلیم کر سکتی ہے کہ آپ ہوں تو سید الرسل پر کام آپ کا یہ ہو ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو ظاہری نظر سے ہے لیکن جب حقیقت کو دیکھا جائے کہ جو چند معدودہ اشخاص بقول شیعہ مومن بنائے گئے ہیں اور شیعہ کے عقیدہ مذکورہ بالا کے لحاظ سے وہ بھی کذاب منافق ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا ہے پھر تو یہی لازم آئے گا (نَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْہُ) کہ آنحضرتؐ نے اپنی تیئس سالہ کوشش سے سب منافق ہی بنائے اور مومن ایک بھی نہ بنایا کیونکہ ابو بکر کی جماعت تو بقول شیعہ منافق ہوئی اور علی

کی جماعت کا منافق ہونا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْہُ) ان کے اس برتاؤ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کے شیعہ لوگ قائل ہیں تو پھر باقی کون سا رہا کہ جس کو آنحضرتؐ نے مومن مسلمان بنایا ہو تو اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تحقیر ہوتی ہے اس کا اندازہ ناظرین خود ہی کر سکتے ہیں یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ تو اس عقیدہ کے ثمرات وبرکات کا اجمالی نقشہ ہے۔

اور اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ منافقوں کے حالات معلوم کرنے سے عقیدہ مذکورہ کی نسبت کیونکر فیصلہ ہو جاتا ہے تو واضح ہو کہ اگر خداوند کریم سچے مومنوں اور منافقوں کے علامات اور حالات اور آثار نہ بیان فرماتا تب تو ایک سچے مومن کو منافق حقیقی منافق کو مومن کوئی کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب خداوند کریم نے مفصل طور پر بیان فرمادیا ہے کہ منافقوں کی یہ یہ علامتیں ہیں۔ اور وہ فلاں فلاں بات کہا کرتے اور فلاں فلاں کام کیا کرتے اور فلاں عقیدہ رکھتے اور فلاں فلاں خلق والے ہوتے ہیں اور کہ اللہ ضرور ان کو دنیا میں فلاں فلاں سزا دے گا۔ اور اسی طرح یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ مومنوں کی فلاں علامتیں ہیں اور ان کے یہ کام ہیں اور یہ اخلاق اور یہ عقائد ہیں اور کہ ہم ان کو دنیا میں یہ اجر دیں گے اور ضرور دیں گے تو اب ایسا کرنے کی بالکل گنجائش نہ رہی کہ مومن کو منافق اور منافق کو مومن قرار دیا جاوے۔ کیونکہ اب تو مومن اور منافق کی بعینہٖ پانی اور آگ کی سی مثال ہے۔

پس جیسا کہ پانی اور آگ کی پوری پوری شناخت کے بعد ممکن نہیں کہ پانی کو آگ اور آگ کو پانی قرار دیا جاوے یا کسی کو ان دونوں میں اشتباہ ہو سکے اسی طرح جب قرآن مجید نے مومنوں اور منافقوں کی علامتیں مفصل بیان کر دی ہیں۔ اور دونوں کے لئے دنیا میں جزاء اور سزا مقرر کر دی ہیں۔ اور قرآن مجید نے ان کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔ تو پھر ان کے جاننے کے بعد ممکن نہیں کہ مومن اور منافق میں کچھ اشتباہ باقی رہ جائے۔ یا کوئی دھوکہ باز اپنی چالاکی سے مومن کو منافق اور منافق کو مومن بنا سکے۔ مثلاً قرآن مجید نے صاف فرمادیا ہے کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (المؤمن:52) (بے شک ہم ضرور ہی اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کی بھی جو ایمان لاتے ہیں اسی

نزدیک زندگی (یعنی دنیا میں) جس سے صاف ثابت ہے کہ اللہ قدیر ضرور ہی مومن کی اسی دنیا میں مدد کرتا ہے اور صاف فرمایا اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرۃ:6) (دیکھو وہی عظیم الشان ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور دیکھو وہی پورے پورے ناکامی سے بچنے اور کامیاب ہونے والے ہیں) جس سے صاف ثابت ہے کہ مومن ناکام نہیں ہوتا بلکہ ضرور ہی کامیاب ہوتا ہے۔ اور منافقوں کے متعلق صاف فرمایا ہے۔ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا (النساء:146) (اور تم ہرگز ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہ پاؤ گے) جس سے صاف ثابت ہے کہ منافق کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوتا اور فرمایا وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (التوبۃ:74) (اور انہوں نے اس چیز کو چاہا جس کو نہ پاسکے) اور فرمایا حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (التوبۃ:69) (ان کے سب کام اکارت (برباد اور ضائع) گئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یاد رکھو وہی پورے پورے ناکام ہونے والے) یعنی منافق لوگوں نے جو جو کام اپنی کامیابی اور مومنوں کی تباہی اور ناکامی کے لئے کئے ہیں وہ سب کام برباد اور ضائع اور بے سود ہوگئے ہیں اور ان پر وہ ثمرات ہرگز مرتب نہ ہوں گے کہ جن کے لئے وہ کئے گئے تھے خواہ وہ ثمرات دنیا میں حاصل ہونے والے ہوں یا آخرت میں۔

بہرحال ان افعال واعمال پر دنیا میں وہ آثار اور نتائج مرتب نہ ہوں گے جو کہ ان افعال کی اصل غرض تھی اور یہ افعال محض ان کے لئے کئے گئے ہیں اور نہ آخرت میں وہ آثار ونتائج مرتب ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دونوں جہانوں دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال وافعال پر نتائج وآثار مرتب نہ ہوئے تو ضرور وہ دونوں جہانوں دنیا اور آخرت میں پُورے پورے ناکام اور سخت گھاٹا پانے والے ہوں گے تو جب قرآن مجید نے صاف لفظوں میں بیان فرمادیا ہے کہ مومن لوگوں کا خداوند قدیر خود مددگار اور ولی ہوتا ہے۔ اوراس امر میں مومنوں کو اپنے برگزیدہ رسولوں کے ساتھ ان کو بھی شریک کرتا ہے اور نیز بار بار بڑے پُرزور الفاظ میں خبر دے دی ہے کہ مومن لوگ ضرور ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے کامیاب وہی ہوتے ہیں اور وہ ناکام نہیں ہوتے اور منافقوں کی

نسبت صاف ترین الفاظ میں فرمادیا ہے۔ کہ ان کا نہ دنیا میں کوئی ولی اور مددگار ہوتا ہے نہ قیامت کو کوئی ہوگا۔ اور دنیا میں بھی ان کے سب کام اکارت جاتے ہیں اور قیامت میں بھی اور اسی وجہ سے وہ دنیا میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ اور قیامت کو بھی تو پھر قرآن مجید کے ماننے اور جاننے والے کے نزدیک کس طرح مومن اور منافق میں اشتباہ ہو سکتا ہے اور کس طرح وہ مومن کو منافق اور منافق کو مومن قرار دے سکتا ہے۔ بلکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت ان دونوں میں بین طور پر اور کھلا کھلا امتیاز کر سکتا ہے۔

پس ان آیات بینات کے بیان کردہ امتیاز کے مطابق اگر حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ اور ان کی جماعت اور حضرت علیؓ اور ان کی جماعت کے متعلق فیصلہ کیا جاوے کہ یہ مومن تھے یا (نعوذ باللہ منہ) منافق تھے۔ جیسا کہ شیعہ لوگ اعتقاد رکھتے ہیں۔ تو اس عظیم الشان اور صدہا سالہ نزاع کا چند منٹوں میں بخوبی فیصلہ ہو جاتا ہے اور نہ کوئی نزاع باقی رہتا ہے اور نہ کوئی اشتباہ رہ جاتا ہے۔ پس اگر اس امتیاز مذکور کے مطابق فیصلہ کرنا ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ پہلے حضرت ابو بکرؓ اور ان کی جماعت اور حضرت علیؓ اور ان کی جماعت کے ثابت شدہ اور یقینی حالات پر غور کی جاوے کہ وہ کیسے تھے۔ یعنی کون ان میں سے مظفر و منصور اور کامیاب تھا اور کون مخذول اور متروک اور ناکام تھا۔ تو جب یہ حالات معلوم ہو جاویں تو پھر اوپر کے بیان شدہ امتیاز کے موافق فیصلہ کیا جاوے کہ فلاں مومن اور فلاں منافق تھا۔ تو اب ہم اس طریق کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔

میں مناسب نہیں سمجھتا کہ حالات کے ثابت کرنے میں ہم شیعہ صاحبان کے ساتھ مخالفت کریں تاکہ احوال کے ثبوت میں کوئی کسر باقی رہ کر اصل فیصلہ میں نقص اور کمزوری کی موجب ہو بلکہ ہم بالکل شیعہ صاحبان کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور ایک نقطہ بھی اپنی طرف سے ایزاد کرنا حرام سمجھتے ہیں یعنی ان صاحبان کے حالات جس طرح شیعہ صاحبان نے اپنی معتبر کتابوں میں درج کئے ہوئے ہیں یا یوں کہو کہ جس طرح انہوں نے تسلیم کئے ہوئے ہیں ہم بالکل اسی کے مطابق لے کر فیصلہ کریں گے اور اپنی طرف سے ذرہ بھر بھی کوئی تغیر نہ کریں گے۔

پس واضح ہو کہ شیعہ صاحبان کی تسلیم کے مطابق ابو بکرؓ اور اس کی جماعت اور حضرت علیؓ اور اس کی جماعت کی حالت یہ ہے کہ شیعہ صاحبان کا اعتقاد ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں بڑے بھاری اہتمام کے ساتھ صحابہ میں کھڑے ہو کر یہ سنا دیا تھا کہ میرے بعد میرا جانشین اور میرا خلیفہ علیؓ ہے۔

اور پھر مرض موت میں آپ چاہتے تھے کہ علیؓ کے لئے اس مضمون کی ایک تحریر لکھ دیں کہ میرے بعد میرا خلیفہ اور جانشین علیؓ ہے لیکن ابو بکرؓ کی جماعت نے آنحضرتؐ کو اس ارادے پر بہت کچھ برا بھلا اور سخت سست کہا اور بڑی جرأت سے آپ کو روک دیا اور نہ لکھنے دیا اور آنحضرتؐ کو اس بات سے بہت صدمہ پہنچا لیکن مجبور تھے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ بستر مرگ پر تھے اور حضرت شیر خدا اسد اللہ الغالب نے بھی بجز صبر کے اور کچھ چارہ نہ دیکھا۔ اور صد آہ کہ یہ موقعہ خاندان نبوت کے ہاتھ سے چلا گیا اور جماعت ظالمین (نعوذ باللہ منہ) اپنے ارادوں میں کامیاب ہو کر خوشی منانے لگی اور مظلوم خاندان نبوت کی امیدوں اور ان کے حقوق پر پانی پھر گیا اور پھر کیا تھا جوں ہی آنحضرت نے راہ جنت اختیار کی تو خاندان نبوت پر ہر ایک طرف سے مصائب کے تیر برسنے لگے اور خلافت راشدہ جو کہ شیر خدا کا حق تھا وہ ابو بکرؓ نے دبا لیا اور شیر خدا نے بہت کچھ خون کے آنسو روئے اور اپنی مظلومی کا اظہار کیا لیکن غاصبوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ آپ کے حق خلافت کو ہضم کر گئے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ظلم ہوا کہ باغ فدک جو کہ حق بتول تھا وہ بھی ظالموں نے (نعوذ باللہ منہ) دبا لیا اور جب حضرت بتول نے دعویٰ کیا تو آپ کو لاتیں مار کر کچہری سے نکال دیا اور لات سے جو صدمہ جنابہ کو پہنچا اس کا رونا محبان اہل بیت نے ساری دنیا میں رویا ہوا ہے۔

لہٰذا حاجت بیان نہیں ہے اور حضرت بتول پر یہ صدمہ ایسا سخت گزرا کہ ایک زمانۂ دراز تک روز اپنے صاحبزادوں کو ساتھ لے کر مدینہ کے لوگوں کے گھروں میں جا جا کر روتی ہیں تا کہ لوگ ان کا ساتھ دے کر ظالموں کے ہاتھوں سے ان کو بچائیں لیکن افسوس کہ کسی نے ساتھ نہ دیا اور نہ امداد کا وعدہ دیا۔ الغرض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خاندان نبوت کے ساتھ وہ وہ ظلم کئے گئے جن کے ذکر سے مومنوں کے دل پاش پاش

ہو جاتے ہیں اور پھر اس پر خاتمہ نہ ہوا بلکہ ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ نے حق خلافت کو غصب کر لیا اور شیر خدا کی اور ان کے محبان کی کچھ پیش نہ گئی اور اس نے تو بڑھ بڑھ کر ظلم کئے۔

پھر اس کے بعد عثمانؓ نے خلافت کو غصب کر لیا۔ عثمانؓ کے بعد شیر خدا تخت خلافت پر رونق افروز ہوئے تو امیر معاویہ وغیرہ نے مخالفت کا علم کھڑا کر دیا تھا اور حضرت شیر خدا کو سخت بے چینی میں ڈال دیا اور آخر کار بڑا حصہ ملک کا امیر نے دبالیا اور ابھی ان دکھوں میں مبتلا ہی تھے کہ اُخروی سفر کا پیغام آگیا اور آپ کے بعد آپ کے بڑے فرزند سے پہلے سارا ملک چھین لیا پھر شہید کر دیا۔ پھر ان کے بعد سید الشہداء آپ کے چھوٹے فرزند سے جو کچھ ہوا۔ اس کو ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کو اپنے حق سے کس طرح پہلے محروم رکھا اور پھر کس بے رحمی سے آپ کے حلق پر (جو کہ پہلے ہی سے مہلک پیاس کے باعث خشک تھا) خنجر ظلم چلائی گئی اور ان کے کنبہ عصمت نشان سے کیسا بے رحمی کا سلوک کیا گیا اور یہی سنت ایک عرصہ دراز تک خاندان نبوت سے جاری رہی۔ شیعہ صاحبان کی تسلیم کے مطابق ابو بکرؓ و علی رضی اللہ عنہما اور ان کی جماعتوں کے حالات کا خلاصہ یہ ہے جو کہ اوپر بیان ہوا۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ من ذالک) حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ دونوں مد مقابل تھے اور ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ہاں دونوں میں فرق یہ تھا کہ ابو بکرؓ اور اس کی جماعت ہمیشہ اللہ سے مدد پانے والی اور مظفر و منصور اور کامیاب رہی اور حضرت علیؓ اور ان کی جماعت ہمیشہ (نعوذ باللہ منہ) خدا کی طرف سے مردود متروک مخذول اور ناکام رہے اور ان کی سب کوششیں اکارت اور برباد گئیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جب ان کے حالات بشرح صدر ہیں۔ تو قرآن مجید کا ابو بکرؓ اور ان کی جماعت کے متعلق کیا فتویٰ ہے اور حضرت علیؓ اور ان کی جماعت کی نسبت کیا فتویٰ ہے۔ تو جب قرآن مجید کا بیان کردہ امتیاز یہ ہے کہ مومن اللہ کی طرف مظفر و منصور اور کامیاب ہوتا ہے اور منافق مردود اور متروک و مخذول اور ناکام ہوتا ہے اور اس کی سب کوششیں برباد جاتی ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ بموجب فتویٰ قرآن مجید حضرت ابو بکرؓ اور ان کی جماعت اعلیٰ

درجے کے مومن تھے اور جو جاہل ان کی نسبت نفاق کا فتویٰ دیتا ہے وہ اللہ علیم کی بین ترین شہادت کے خلاف کہتا ہے۔ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا (الفتح:29) (اللہ کافی گواہ ہے) اور بموجب تسلیم شیعہ صاحبان حضرت علیؓ کی نسبت جو فتوئے قرآنی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو دانا خود سمجھ سکتے ہیں اس کا بیان کرنا نہ ہم مناسب سمجھتے ہیں اور نہ ہمارا قلم اس فتوے کو لکھ سکتا ہے۔

ایک عجیب بات تجربہ سے ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ کسی بندۂ خدا کی تعریف اور مدح میں بیجا غلو کرتے ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ نادان دوست ہیں ضرور ان سے یہ کارروائی ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تو اس قدر اس کی تعریف میں غلو کرتے ہیں کہ اس کو اپنے اصل منصب سے کوسوں آگے لے جاتے ہیں اور دوسری طرف ضرور ہی کسی عظیم الشان منقصت کو اپنے ممدوح کی نسبت روا رکھتے ہیں جس کے ساتھ اس کو اپنے اصل منصب سے کوسوں نیچے گرا دیتے ہیں۔ مثلاً عیسائی لوگوں نے حضرت مسیح کے حق میں بہت کچھ غلو کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا دیا ہے۔ پر دوسرے طرف ان کی شان میں اس قدر گستاخی کی کہ (نعوذ باللہ منہ) ان کو ملعون اور لعنتی قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ اکثر عیسائی کہا کرتے ہیں کہ ہم لعنتی مسیح کے مرید ہیں۔

اسی طرح ہمارے مسلمانوں نے اگرچہ اپنی زبان سے مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں کہا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح کے لئے ایسے ایسے صفات قائم کئے ہیں جن سے یقیناً ان کا خدا ہونا لازم آتا ہے اور باوجودیکہ انہوں نے پہلے پیشگوئی کے طور پر کہہ دیا تھا کہ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا (مریم:33) (خدا نے مجھے جبر کرنے والا بدبخت نہیں بنایا) لیکن پھر بھی انہوں نے یہ کہہ کر (کہ مسیح پھر دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور ہر ایک کو کہیں گے کہ اسلام لا ورنہ تجھے قتل کیا جاوے گا۔ پس اگر کوئی ایمان لے آیا تو خیر ورنہ ضرور ہی قتل کر دیں گے جو یقیناً جبر ہے) ان کو جبار اور شقی قرار دے دیا ہے اور جو حضرت مسیح نے پہلے ہی سے فرما دیا تھا (کہ خدا نے مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا) اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی اور جبار و شقی قرار دے کر ان کی سخت توہین کی ہے۔

اسی طرح شیعہ صاحبان نے ایک طرف تو حضرت علی اور حضرت امام حسین علیہما السلام

کی مدح میں اس قدر غلو کیا ہے کہ ان کو قادر مطلق اور عَالِمٌ مَا کَانَ وَمَا سَیَکُوْنُ[1] وغیرہ قرار دے کر ان کو خدا کا ہمسر جا بنایا ہے اور دوسری طرف ان کی شان میں یہ کہہ کر (کہ وہ ابو بکرؓ کے مخالف تھے اور خلافت ان کا حق تھی اور وہ اپنا حق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ نے زبردستی ان کا حق دبا لیا تھا اور کہ وہ تقیہ باز تھے اور تقیہ کی طور پر ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف کرتے اور ان کو امیر المومنین اور خلیفۂ رسول اللہ کہتے اور ان کی بیعت کرتے اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے) (نعوذ باللہ منہ) ان کو منافق بلکہ رئیس المنافقین قرار دیتے ہیں اور جس طرح عیسائیوں اور مسلمانوں نے حضرت مسیح کی تعریف کرتے کرتے آپ کو آسمان پر پہنچا کر پھر لعنت اور شقاوت کے سیاہ ترین اور اسفل السافلین گڑھے میں جا پہنچایا ہے۔ اسی طرح شیعہ صاحبان نے حضرت علیؓ کو پہلے تو شیر خدا اور قادر مطلق اور عالم الغیب خدا کا ہم سر بنایا ہے اور پھر تقیہ باز بنا کر نفاق جیسی گندی روبابازی اور پرلے درجہ کی بزدلی سے متصف اور خوشامدی اور مردود و مخذول اور ناکامی کا گھر قرار دیا ہے۔

اگرچہ دیکھنے اور سننے والے کو نہایت درجہ کا تعجب دامن گیر ہو گا کہ شیعہ صاحبان نے باوجود انسان ہونے کے حضرت علیؓ کو کس طرح مجمع الاضداد قرار دیا ہو گا کہ ایک طرف تو ان کو شیر خدا اور اَسَدُ اللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ[2] یقین کریں اور دوسری طرف ان کو ایسے بزدل بنائیں کہ منافقوں جیسے دل کے کمزوروں اور بزدلوں سے ایسے ڈر جاویں کہ ان کا فرزند تو ایک بے دین کی بیعت نہ کرے اور جان عزیز دے دے اور وہ (نعوذ باللہ منہ) ایک منافق کی نہیں بلکہ تین کی بیعت یکے بعد دیگرے کر لیویں اور سالہا سال تک پانچوں وقت ان کی امامت میں نماز پڑھتے رہیں اور ان کی تعریف اور خوشامد کرتے رہیں پھر ان کو قادر مطلق یقین کریں اور پھر بار بار منافقوں کے مقابلہ میں عاجز مطلق اور ناکام اور ذلیل بتاتے ہوں۔ پھر ان کو کامل متقی مومن یقین کریں اور نصرت الٰہیہ سے اور فلاح و کامیابی سے ان کو محروم رکھیں وغیر ذالک۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ

[1]۔ جو تھا اور جو ہو گا اسے جاننے والا یعنی ماضی اور مستقبل کا جاننے والا۔ (از مرتب)

[2]۔ شیر خدا ہر ایک غالب سے غالب۔ (از مرتب)

یہ سنت اللہ ہے کہ جو لوگ کسی انسان کی تعریف میں بے حد غلو اور اطراء کرتے ہیں دوسری طرف ضرور ہی اس کی نسبت کسی بڑی بھاری منقصت اور ذلت کے قائل ہوتے ہیں تاکہ ثابت ہو کہ حقیقت میں یہ شخص خدا یا خدا کا ہم سر نہیں بلکہ یہ سب کچھ نادان دوستوں کے ہاتھوں کا کرتب ہے، اور بس۔

پس شیعہ صاحبان خواہ انسان ہی ہوں۔ پر سنت اللہ کا مقابلہ تو وہ نہیں کرسکتے تھے اور چونکہ شیعہ صاحبان ایک شخص کی نسبت غلو اور اطراء کرنے اور پھر اس کی نسبت ایک بڑے بھاری منقصت کے قائل ہونے میں بالکل عیسائیوں جیسے تھے لہٰذا بعض اہل سنت والجماعت نے ان کو عیسائیوں کے چھوٹے بھائی کہا ہے اور یہ بالکل سچا اور صحیح اور مطابق واقعہ خطاب ہے۔

یہ جو کہ بیان ہوا ہے فقط نصرت اور فلاح کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کیا گیا ہے لیکن ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اہل ایمان اور اہل نفاق میں ایک یہی نصرت اور فلاح ہی مابہ الامتیاز نہیں بلکہ ان میں اور بھی بہت سے مابہ الامتیاز ہیں جو آیات بینات کے ساتھ پہلے بیان ہو چکے ہیں اور سب کے اور ایک ایک کے لحاظ سے یہی فیصلہ ہوتا ہے جو کہ نصرت وفلاح کے لحاظ سے ہوا ہے۔ مثلاً منجملہ ان کے ایک یہ مابہ الامتیاز ہے کہ مومن تو لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ (المائدۃ:55) (کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں) اور صادق ہوتے ہیں اور جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں اور منافق لوگ ڈرپوک اور جھوٹے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہر وقت یہی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ فریقین ہم سے راضی رہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں ان میں سے کوئی ناراض ہو جائے۔ تو ہم پر آفت نازل ہو جائے لہٰذا جب وہ مومنوں کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں آمَنَّا (ہم ایمان لائے) اور جب اپنے شیطانوں کی طرف جاتے ہیں تو کہتے ہیں اِنَّا مَعَكُمْ (بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں) اور اللہ کریم ان کی نسبت فرمایا ہے۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون:2) (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق لوگ ضرور جھوٹے ہیں)

تو اگر اس امتیاز کے لحاظ سے فیصلہ کیا جاوے تو بھی یہی فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ صاحبان اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت علیؓ شیر خدا ابو بکرؓ اور

اس کی جماعت کو اپنے یاروں میں منافق کہا کرتے تھے اور تقیہ کے طور پر ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی بیعت بھی کی تھی اور ان کے پیچھے نمازیں بھی پڑھا کرتے تھے اور ان کو امیر المومنین اور خلیفۂ رسول اللہ بھی کہتے تھے اور السلام علیکم بھی ان پر کہا کرتے اور ان کی تعریف بھی کیا کرتے تھے اور ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ ایسے بے لحاظ تھے کہ شیر خدا کی ذرہ پرواہ نہ کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت جنابہ بتول سے باغ فدک چھین کر ان کو لات بھی ماری اور سخت صدمہ پہنچایا اور شیر خدا سے ذرہ بھر بھی نہ ڈرے (نعوذ باللہ منہ) اور عمرؓ تو ایسا دلیر تھا کہ شیر خدا کے سامنے اس نے حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سے سخت باتیں کہیں اور گالیاں دیں اور شیر خدا سے بالکل نہ ڈرا۔

اور شیر خدا کا تو ماشاء اللہ وہ حوصلہ تھا کہ ان کے چچازاد بھائی اور خُسر اور رسول اللہ کو بستر مرگ پر پڑے ہوئے اور نہایت قابل رحم حالت پر پہنچے ہوئے ایک ان کا خیالی منافق سب وشتم دے اور ان کے جائز اختیارات کے لئے مانع ہو اور زبردستی مانع ہو اور یہ ایسی بات ہے کہ ایک روبا مزاج بے حمیت اور بے غیرت، بے درد انسان بھی اس کو مشاہدہ کرکے صبر نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک شیعہ صاحبان کا شیر خدا ہے یا ان کی عقل ہے کہ اپنے شیر خدا کے لئے یہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کی نہ رگ حمیت جنبش میں آتی ہے اور نہ اس کے کان پر جوں چلتی ہے اور بڑی متانت سے ان سخت سُست باتوں کو سنتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ تو اب اگر قرآن مجید کے اس بیان کردہ امتیاز کے لحاظ سے بھی فیصلہ کریں تو وہی فیصلہ ہوگا جو کہ پہلے امتیاز کے لحاظ سے ہوا ہے کیونکہ بزدلی اور دروغ گوئی منافقوں کے نشان قرار دی ہوئی ہیں۔ جو کہ بقول شیعہ صاحبان ان کے شیر خدا میں موجود ہیں اور بہادری اور سچائی مومنوں کے نشان ہیں جو کہ بقول شیعہ صاحبان حضرت ابو بکرؓ اور ان کی جماعت میں موجود ہیں لہٰذا قرآن مجید کا فتویٰ ابو بکرؓ اور آپ کی جماعت کی نسبت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مومن ہیں اور شیعہ صاحبان کی تحقیق اور تسلیم کے لحاظ سے حضرت علیؓ شیر خدا کی نسبت جو قرآنی فتویٰ برآمد ہوتا ہے۔

ناظرین اس کو خود سوچ لیں یا شیعہ صاحبان سے دریافت کرلیں بعض لوگوں میں

رواج ہوتا ہے کہ نام اور خطاب برعکس رکھتے ہیں مثلاً سکھ لوگ کانے یعنی یک چشم کو پنج آنکھ سنگ کہا کرتے ہیں اور کسی نے اسی مضمون کو اس مصرع میں ادا کیا ہے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور[1]۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ صاحبان نے بھی حضرت علیؓ کا نام شیر خدا اور اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ اسی وجہ سے رکھا ہے۔ ورنہ تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی بزدلی جو کہ شیعہ صاحبان کی تسلیم کے مطابق بیان ہوئی ہے کسی لومڑ میں بھی پائی جائے کہ شیر اور پھر شیر خدا اور پھر اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِبُ مِنْ کُلِّ غَالِبٍ میں ہو۔

یہ بزدلی تو ایسی ہے کہ مجھے بار بار حیرت میں ڈالتی ہے کیونکہ منافق تو خود بزدل بلکہ نہایت درجہ کا بزدل ہوتا ہے تو جب بقول شیعہ ان کے مقابل (نعوذ باللہ منہ) منافق تھے اور وہ نہایت بزدل ہوتے ہیں اور خداوند کریم نے منافقوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا ہوا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ شیر خدا ہو کر ان سے جہاد نہیں کرتے اور خداوند کریم کے حکم کے خلاف کرتے ہیں اور منافق بزدلوں کی ڈر کے مارے بیعت کرتے اور خوشامد کرتے اور حضور حضور اور امیر المومنین اور حضور خلیفۂ رسول اللہ کہتے ہیں۔ بزدلی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے اور جس طرح پہلے بیان ہوا ہے کہ شیعہ لوگوں نے ایک طرف تو حضرت علیؓ کی مدح سرائی میں بیجا غلو کیا ہے اور دوسرے طرف ان کی نہایت منقصت اختیار کی ہے اسی طرح یہاں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرات شیعہ نے حضرت علیؓ کی نہایت توہین کی ہے۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے کہ بے غیرت سے بے غیرت انسان بھی کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اس کے ایسے معزز اور معظم پیارے رشتہ دار کو ایسی نازک حالت میں ایسی بری طرح سے ستائے اور اس کے سامنے ستائے اور وہ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہے اور منع تک نہ کرے اور پھر وہ ہو بھی عرب کا رہنے والا اور ہاشمی خون اپنے اندر رکھنے والا۔ مجھے یاد ہے کہ میں چھوٹا تھا اور کچھ علم بھی نہ رکھتا تھا تو اس وقت میں نے حضرات شیعہ سے حضرت علیؓ کی نسبت تین امور سنے تھے۔ اور وہ یہ ہیں۔

[1] لوگ کیا الٹی بات کرتے ہیں کہ حبشی کا نام کافور رکھتے ہیں۔ (از مرتب)

حضرت علیؓ کی نسبت تین امور:

نمبر 1: یہ کہ عمرؓ نے جب سنا کہ حضرت رسول اکرمؐ نے کاغذ قلم ودوات طلب فرمائے ہیں تاکہ علیؓ کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کردیں تو اس نے آپ کو روک دیا۔ اور نہ لکھنے دیا اور حضرت رسول اکرمؐ کو برا بھلا بھی کہا لیکن حضرت علیؓ اور عباسؓ وغیرھما نے عمرؓ کو کچھ بھی نہ کہا۔

نمبر 2: یہ کہ جب حضرت بتول نے باغ فدک کا دعویٰ کیا تو خلیفہ وقت نے باغ نہ دیا اور حضرت بتول کو ایسی لات ماری کہ جس سے... اور علیؓ نے اس موقعہ پر بھی کچھ نہ کہا۔

نمبر 3: یہ کہ حضرت علیؓ خلفاء ثلاثہ اور ان کے ساتھ والوں کو منافق یقین کرتے اور اپنے لوگوں کے سامنے ان کو منافق کہا کرتے تھے لیکن تقیہ کے طور پر انہوں نے ان کے ساتھ ایسا ویسا برتاؤ رکھا ہوا تھا۔

تو جب میں نے یہ تین باتیں سنی تھیں تو باوجودیکہ حضرت علیؓ میرے جد امجد ہیں پر میری طبیعت نے اس وقت یہ فیصلہ کیا تھا کہ یا یہ قصے محض جھوٹ اور افتراء ہیں جو کہ حضرت علیؓ کے نادان دوستوں اور محبوں کے دہنے ہاتھ کے کرتب ہیں اور اگر یہ سچے ہیں تو پھر حضرت علیؓ کو مومن یا ایک شریف انسان کہنا بھی نہایت عظیم الشان ظلم ہے اور اس فیصلہ پر مجھے پختہ یقین تھا لیکن بار بار اس سے تعجب آتا تھا کہ خواہ حقیقت کچھ ہی ہو پر شیعہ لوگ تو ایک طرف ان قصوں کو ٹھیک اور سچا اور صحیح صداقت یقین کرتے ہیں اور پھر حضرت علیؓ کو مومن بلکہ کامل کیا اکمل ترین مومن اور اعلیٰ درجہ کا کامل الصفات مومن یقین کرتے ہیں اور اگر ان قصوں کا سچا ہونا اور حضرت علیؓ کا مومن اور شریف ہونا دونوں آپس میں ایسے متضاد امر ہوتے جو کہ ایک محل پر جمع نہ ہوسکتے تو پھر شیعہ صاحبان کس طرح ان کے اجتماع کے معتقد اور قائل ہوتے۔

پس ایک مدت دراز تک میری طبیعت فیصلہ مذکور پر قائم رہی اور شیعہ صاحبان کے اعتقاد اور قول پر نہایت حیرت زدہ بھی رہی یہاں تک کہ مجھے اس بات کا علم ہوگیا کہ عیسائی

لوگ ایک طرف تو حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیتے ہیں اور پھر بڑے زور و شور کے ساتھ اس امر کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مسیح ملعون ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کو دیکھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو بعض الٰہی صفات کے ساتھ متصف قرار دے کر ان کو خدائے قدوس کا ہمسر بناتے ہیں اور پھر ان کو جبار بنا کر شقی بھی ٹھہراتے ہیں تو پھر میری طبیعت نے مذکورہ بالا حیرانی سے نجات پائی اور فیصلہ مذکور پر اطمینان کامل ہو گیا بلکہ اس بات پر یقین کامل ہو گیا کہ حضرت علیؓ اور خلفائے ثلاثہ میں ہر گز ہر گز وہ خلاف ہوا ہی نہیں کہ جس کے شیعہ قائل ہیں بلکہ سب صحابہ کرام ایک ہی تھے اور جس طرح ابو بکرؓ کی کامیابی ان کے سب ساتھیوں کی کامیابی تھی۔ اسی طرح ان کی کامیابی علیؓ کی بھی کامیابی تھی اور جو قصے اس صحیح صداقت کے خلاف ہیں وہ سب نادان دوستوں کی مہربانیاں ہیں اور بس۔

اسی طرح مذکورہ بالا امتیازوں میں سے ایک امتیاز عزت بھی ہے۔

لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ وَ لِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَ لِرَسُوۡلِهٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (المنافقون:9) (اگر ہم مدینہ کی طرف واپس چلے گئے تو ضرور ہی عزت مند لوگ ذلیلوں کو اس سے نکال دیں گے۔ حالانکہ سب عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہی ہے لیکن منافق لوگ نہیں جانتے۔)

خلفاء کو خدا تعالیٰ کی تائید حاصل تھی:

لیکن جب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کے ان مذکورہ بالا حالات پر نظر کی جاوے جو کہ شیعہ صاحبان کے مسلمات میں سے ہیں تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور آپ کی جماعت کو خداوند کریم نے عظیم الشان عزت عطاء فرمائی ہے اور حضرت علیؓ کو (نعوذ باللہ منہ) نہایت ذلت دی ہے۔ پس عزت کے امتیاز کے لحاظ سے بھی قرآن مجید کا وہی فتویٰ ثابت ہوتا ہے جو کہ نصرت و فلاح اور بہادری اور صداقت کے لحاظ سے ہوا ہے۔

یہ فتاویٰ تو میں نے بطور نمونہ لکھ دیئے ہیں اور ناظرین اگر سب امتیازوں کے لحاظ سے قرآن مجید کا فتویٰ دریافت کریں گے تو یہی فتویٰ ثابت ہو گا جو کہ بیان ہو چکا ہے تعجب آتا

ہے کہ باوجود ان حالات اور ان مسلمات کے شیعہ صاحبان حضرت علیؓ کی شان میں کیوں ایسا غلو کرتے رہے ہیں حالانکہ اسلام اور اسلام کا خدا تو کسی امر کو بن ثبوت اور بے شہادت نہ بیان کرتے ہیں اور نہ قبول کرتے ہیں۔

دیکھو قرآن مجید نے صحابہ کی نسبت خبر دی تھی کہ ان کے لئے جنت ہے تو اس اخروی جنت کے ثبوت کے لئے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ دنیا میں بھی ان کو جنت ملے گی۔ اور پھر دنیا کا جنت دے کر ثابت کر دیا کہ بے شک ان کو اُخروی جنت بھی ملے گی اور مشرکین عرب کے لئے خبر دی تھی کہ ان کے لئے آخرت میں آگ ہے تو اس کے ثبوت کے لئے ساتھ ہی خبر دے دی کہ ان کے لئے دنیا میں بھی آگ ہے تو پھر ان کو دنیا ہی میں ذلت اور حسرت کی آگ میں ڈال کر ثابت کر دیا کہ ان کے لئے آخرت میں بھی ضرور ہی آگ ہے۔

اسی طرح جب خداوند کریم نے مومنوں کی نسبت خبر دی تھی کہ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ:6) (وہی ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں) اور ان کے مقابلوں کے لئے خبر دی تھی کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (المائدۃ:109) (اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا) تو اس کے ثبوت کے لئے دنیا میں ہی مومنوں کو کامیاب اور ان کے مقابلے والوں کو ناکام کر کے ثابت کر دیا کہ بے شک مومن لوگ ہدایت پر تھے یعنی ان کی سعی اور کوشش ٹھیک طور پر تھی کہ جس پر مطلوب نتیجہ اور مقصود غرض مرتب ہوتے ہیں اور ان کے مقابل ہدایت پر نہیں تھے یعنی ان کی سعی اور کوشش ٹھیک طور پر نہ تھی کہ اس پر مطلوب نتیجہ مرتب ہوتا۔

شیعہ صاحبان اور حضرت علیؓ کی خلافت:

پس شیعہ صاحبان جب حضرت علیؓ کو کامل مومن یقین کرتے تھے تو پھر ان کو عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ[1] (البقرۃ:6) بھی ثابت کرتے جو کہ مومنوں کا خاصہ ہے لیکن انہوں نے الٹا ان کا ناکام ہونا ثابت کیا ہے جس سے صاف اور کھلا کھلا ثابت ہوتا ہے کہ وہ مومنوں کی طرح عَلٰى

[1]۔ اس ہدایت پر (قائم) ہیں جو ان کے رب کی طرف سے (آئی) ہے۔ (تفسیر صغیر)

هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ نہ تھے بلکہ ان کے مقابلوں کی طرح وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي [1] الخ(البقرۃ:259) اور حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ [2] الخ(البقرۃ:218) کے مصداق تھے اور یہ ساری مصیبت اس سے آئی ہے کہ شیعہ صاحبان نے قرآن مجید کو پس پشت ڈال دیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جہاں جہاں پر شیعہ لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے یا بالفاظ دیگر جہاں جہاں انہوں نے اہل سنت والجماعت کا خلاف کیا ہے تو ان سب مواضع میں قرآن مجید کی بین ہدایت کا خلاف کیا گیا ہے اور ان سب مواضع میں اگر کچھ بھی وہ قرآن مجید کی بین ہدایت کی طرف توجہ کرتے تو ہرگز ایسی بُری ٹھوکر نہ کھاتے۔

شیعہ صاحبان اور خلافت:

مثلاً شیعہ صاحبان نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور آپ کی جماعت کی تکفیر کرنے میں اہل سنت والجماعت کا خلاف کیا ہے تو اس کا مفصل حال ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے جس میں خوب بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید نے خوب کھول کر بتادیا ہے کہ ابو بکرؓ اور ان کی جماعت اعلیٰ درجہ کے مومن ہیں اور کفر و نفاق اور فسق سے کوسوں دور اور پاک اور منزہ ہیں۔ اور پھر انہوں نے خلافت کے مسئلہ میں خلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل سنت تو کہتے ہیں کہ جس طرح واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ مسند خلافت پر بیٹھے تھے اسی طرح حقیقت میں بھی وہی خلیفہ برحق تھے اور اللہ کے نزدیک خلافت انہی کا حق تھی اور شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت حضرت علیؓ کا حق تھی اور آنحضرتؐ نے انہی کو اپنا جانشین بنایا تھا لیکن پہلے ابو بکرؓ نے خلافت غصب کرلی اور اس کے بعد عمرؓ نے اور پھر عثمانؓ نے اسی طرح بعض ازواج مطہرات کی شان میں انہوں نے اہل سنت والجماعت کا خلاف کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت تو سب ازواج مطہرات کو صالحات، قانتات، طیبات، مطہرات یقین کرتے ہیں اور فضائل اہل بیت میں جو کچھ آیا ہے اس کے ان کو حق دار تسلیم کرتے ہیں لیکن شیعہ صاحبان بعض ازواج مطہرات اور

[1] ۔ اللہ (کامیابی کی) راہ نہیں دکھاتا۔ (تفسیر صغیر)
[2] ۔ ایسے لوگوں کے اعمال۔۔۔ اکارت جائیں گے۔ (تفسیر صغیر)

خصوصاً حضرت عائشہ کو منافقات، فاسقات، خبیثات کہتے ہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ) اور قرآن مجید نے ان دونوں باتوں کا نہایت واضح اور کھلا کھلا فیصلہ کیا ہوا تھا لیکن شیعہ صاحبان نے جس طرح پہلے امر میں قرآن مجید کو پس پشت ڈال کر اس کھلے فیصلہ سے کام نہ لیا جو کہ قرآن مجید نے اس امر کے متعلق کیا تھا بلکہ یہود اور عیسائیوں کی مانند اپنی بناوٹ اور امانی سے کام لیا ہے۔

اسی طرح ان دو امور میں بھی قرآن مجید کو وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ[1] (البقرۃ:102) ڈال کر اس کے فیصلہ اور یقینی اور قطعی فیصلہ کو ملحوظ نہ رکھا بلکہ اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ[2] (البقرۃ:102) ہو کر اپنے زعم فاسد اور خیال ناقص سے کام لے کر اپنے دین اور عاقبت کو تباہ کیا اور چونکہ میرے خیال میں ان دونوں امور کے متعلق قرآن مجید کے بین فیصلہ کا بیان کر دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ لہٰذا پہلے میں خلافت کے متعلق قرآنی فیصلہ بیان کروں گا اور بعد ازاں ازواج مطہرات کے متعلق جو قرآن مجید نے کلی رنگ سے قطعی فیصلہ کیا ہوا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ خلافت کے متعلق قرآن مجید کی قطعی اور بین فیصلہ کا بیان یہ ہے کہ خدائی کتاب بدیہیات اور نظریات کی مُظہر اور موید ہوتی ہے نہ مخالف اور خلافت کا مسئلہ بھی ایسے ہی امور سے ہے۔

خلافت کی اصل:

اس میں شک نہیں کہ اصل اور خلیفہ میں اور اصالت اور خلافت میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ بہت سے امور میں یہ دونوں بالکل مساوی اور متحد ہوتے ہیں مثلاً جن وجوہات اور طریق سے اصالت حاصل ہوتی ہے انہی وجوہات اور طریق سے خلافت بھی حاصل ہوتی ہے اور بس اور جو شخص اصل کے تقرر کا اختیار رکھتا ہے وہی خلیفہ مقرر کرنے اور بنانے کا بھی اختیار رکھتا ہے اور بس اور جس کو اصل کے تقرر کا اختیار نہیں ہوتا وہ خلیفہ بھی مقرر نہیں کر سکتا۔ کمشنری اور تحصیلداری اگر وراثۃً حاصل ہوتی تو

[1] ۔ اپنی پیٹھوں کے پیچھے۔ (تفسیر صغیر)
[2] ۔ گویا کہ وہ (اسے) جانتے ہی نہیں۔ (تفسیر صغیر)

ڈپٹی کمشنر بننا اور نائب تحصیلدار ہونا بھی وراثتاً حاصل ہو گا اور اگر دونوں پہلے وراثت سے نہیں ملتے تو پھر اخیری دو بھی وراثت سے ہر گز ہر گز حاصل نہ ہوں گے اور اگر پہلے دونوں امر خرید و فروخت یا تجارت سے حاصل ہوتے ہیں تو اخیری دو بھی ضرور خرید و فروخت اور تجارت ہی سے حاصل ہوں گے اور اگر وہ اس سے حاصل نہیں ہوتے تو پھر یہ بھی اس سے ہر گز حاصل نہ ہوں گے اور اگر وہ کسی علمی اور عملی لیاقت سے یا وجاہت یا سفارش وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں تو یہ بھی ضرور اس سے حاصل ہوں گے وعلیٰ ہذا القیاس اسی طرح اگر گاؤں یا شہر کا چوہدری نمبر دار یا ملا امام مسجد کمشنر اور تحصیلدار مقرر کرنے کا اختیار رکھتا ہے تو ضرور وہ ڈپٹی کمشنر اور نائب تحصیلدار مقرر کرنے کا بھی اختیار رکھے گا اور اگر ان کے تقرر کا مجاز نہیں تو پھر ان کے تقرر کا بھی مجاز نہیں ہو گا۔ اور اگر ان کے تقرر کا اختیار گورنمنٹ یا گورنمنٹ کے کسی مجاز عہدہ دار کو حاصل ہے تو پھر ان کے تقرر کا اختیار بھی اس کو حاصل ہے۔ اسی طرح اگر کمشنر اور تحصیلدار کا باغی گورنمنٹ کی طرف سے مستوجب سزا ہے تو ڈپٹی کمشنر اور نائب تحصیلدار کا باغی بھی ضرور ہی مستوجب سزا ہو گا اور اگر اس کا باغی مستوجب سزا نہیں تو ان کا بھی نہ ہو گا۔ الغرض کہ بہت سے امور ایسے ہیں کہ جن میں اصل اور خلیفہ مساوات اور اتحاد رکھتے ہیں۔

رسالت و خلافت میں فرق:

اس عام نظر کے بعد ہم خاص رسالت اور خلافت رسالت اور رسول اور خلیفہ رسول پر نظر کرتے ہیں۔ اس میں تو ذرہ بھی شک نہیں کہ رسالت نبوت نہ ایسی چیز ہے کہ خرید و فروخت سے حاصل ہو اور نہ ترکۂ میت کی مانند اس میں سلسلۂ توریث جاری ہے اور نہ کسی کسب سے یہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ فضلی چیز ہے کہ خداوند کریم اپنے اعلیٰ درجہ کے مخلص بندے پر خاص فضل کر دیتا ہے چنانچہ جہاں پر خداوند کریم نے یہود کے اس قول فاسد کی تردید فرمائی ہے کہ بنی اسمٰعیل یا کسی اور قوم سے نبی نہیں آسکتا بلکہ ہمیشہ بنی اسرائیل سے ہی آسکتا ہے اور بس تو وہاں پر فرمایا ہے بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (البقرۃ:91)(اس لئے تاکہ سرکشی کریں اس سے کہ اللہ اپنے کسی

بندے پر اپنے فضل سے کچھ نازل فرمائے) یعنی نبوت موروثی چیز نہیں کہ اب بنی اسرائیل کے سوا دوسرا کوئی اس کو نہ لے سکے بلکہ یہ فضلی چیز ہے خداوند کریم جس کو چاہے دے سکتا ہے اور فضل کے جذب کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ عبودیت ہے نہ اسرائیلیت۔ پس چونکہ بنی اسرائیل میں سے اس وقت اعلیٰ درجہ کی عبودیت مفقود ہوگئی ہے اور بنی اسمٰعیل میں سے ایک برگزیدہ انسان میں اعلیٰ درجہ کی عبودیت موجود تھی لہٰذا خداوند علیم وحکیم نے یہ فضل اسی پر کر دیا تو اس آیت کریمہ اور اور بہت سی آیات بینات سے اور عقل اور تجربہ اور مشاہدہ اور سنت اللہ سے یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسالت نبوت فضلی چیز ہیں وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ (النمل:17)(سلیمان وارث بنا) وغیرہ آیات میں ارث کا ذکر ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرعون کے غرق کے بعد جب بنی اسرائیل کو بجائے زمین مصر کے زمین شام ملی تو خداوند کریم قرآن مجید میں اس ملنے کو وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الشعراء:60)(اور ہم نے وارث کیا بنی سرائیل کو ان جیسی چیزوں کا) کے ساتھ بیان فرمایا ہے وغیرہ ذالک۔ الغرض کہ اس سے یہاں پر فقط اسی قدر مراد ہے کہ ایک کے بعد دوسرے کو کوئی چیز خداوند کریم دے دے جیسی کہ حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤدؑ کے بعد نبوت ملی تھی۔

اور اسی طرح اس میں شک نہیں ہے کہ نبوت وہ چیز ہے کہ جس کے دینے کا اختیار بجز اللہ کریم کے اور کسی کو نہیں حتیٰ کہ کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں کہ وہ جس کو چاہے نبی بنادے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں ارسالِ رسل اور بعثت انبیاء کا ذکر آیا ہے تو خداوند کریم نے اس کو اپنے ہی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (مریم:50)(اور ہم نے ان سب کو نبی بنایا ہے) اور اسی طرح یہ بھی ثابت شدہ صداقت ہے کہ انبیاء کے مقابل یا تو کسی وقت ان کے اتباع میں داخل ہو جاتے ہیں یا ناکام اور ذلیل ہو کر دوسروں کی عبرت کے لئے چھوڑے جاتے ہیں یا ناکام اور ذلیل ہو کر ان کے سامنے غضبِ الٰہی سے تباہ اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں جس قدر انبیاء علیہم السلام اور ان کے مقابلوں کا بیان ہوا ہے اس

سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اور اور بھی بہت سی آیات بینات ہیں کہ جن سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے مثلاً ایک محل پر بعثتِ انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ الخ (العنکبوت:41) (پس ہر ایک کو اپنے اپنے گناہ کے باعث ہم نے پکڑ لیا) اور فرمایا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (الاعراف:95-96) (ہم نے کسی بستی میں کوئی بھی نبی بھیجا ہے تو ضرور ہم نے اس کے رہنے والوں کو محتاجی اور ضرر کے ساتھ پکڑا ہے تاکہ وہ تضرع کریں پھر ہم نے برائی کے مکان پر بھلائی بدل دی یہاں تک کہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادوں کو بھی دکھ اور راحت پہنچتے رہے ہیں۔ تب ہم نے دفعتاً ان کو پکڑ لیا ایسی حالت میں کہ ان کو آگاہی تک نہ ہوئی۔)

نبوت فضلی اور وہبی نعمت ہے:

تو جب عقل اور سنت اللہ اور کتاب اللہ اور تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نبوت فضلی چیز ہے بدون فضل کے یہ حاصل نہیں ہوتی اور اس کے دینے کا اختیار بجز اللہ کریم کے اور کسی کو نہیں ہے اور یہ کہ انبیاء کے مقابلہ پر ڈٹنے والے ضرور ہی ناکام اور ذلیل ہو کر اوروں کے لئے عبرت ہوتے ہیں یا ذلیل وخوار ہو کر ہلاک اور تباہ ہو جاتے ہیں تو بموجب قاعدہ اصالت اور خلافت اور اصل اور خلیفہ کے (جو کہ ابھی ہم نے لکھا ہے) یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ خلافتِ رسالت بھی فضلی چیز ہے اور یہ کہ اللہ کریم کے سوا اور کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی کو خلیفۂ رسول بنائے اور کہ خلیفہ برحق کی مخالفت پر ڈٹنے والے مخالف ضرور ذلیل وناکام ہو کر موجب عبرت ہوں گے یا ذلیل وخوار ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔

تو جب رسالت ایک فضلی چیز ہے اور وراثت وغیرہ ذرائع کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور اس کا دینے والا بھی خاص اللہ کریم ہے اور دوسرے کسی شخص کو اس کے دینے کا حق اور مطلق اختیار نہیں ہے اور رسول کے مخالف ذلیل وناکام ہوتے ہیں تو پھر بموجب قاعدہ اصالت اور خلافت کے اور اصل اور خلیفہ کے ضروری اور لازم ہے کہ خلافت بھی فضلی ہو

اور وراثت وغیرہ ذرائع کو اس میں کچھ بھی دخل نہ ہو اور خلیفہ بنانے کا اختیار بھی اللہ کے لئے ہو اور اس کے سوا اور کسی کو اس کا اختیار نہ ہو۔ اور خلیفہ کے مخالف ذلیل وناکام ہوں اور یہ نہیں کہ عقل، تجربہ، مشاہدہ سے ہی یہ باتیں ثابت ہیں اور بس بلکہ جیسا میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ کتاب الٰہی ایسے امور کی مخالف نہیں ہوتی بلکہ موید ہوتی ہے۔ اسی طرح ان امور کی بھی کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید مؤید ہے۔

پس یہ امور عقل، تجربہ، مشاہدہ کتاب اللہ کے ساتھ ثابت شدہ ہیں اور کتاب اللہ میں ان کی تائیدیوں ہوتی ہے کہ خداوند کریم نے سورہ نور میں فرمایا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور:56)(اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے جو کہ تم سے ایمان لائے اور اچھے اعمال کئے کہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا اور ان کو قدرت دے گا۔ اس دین کی جو اللہ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور ضرور ان کے لئے خوف کے بعد امن بدل دے گا۔ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد بھی نہ مانے گا۔ پس یاد رکھو وہی بد عہد اور حکم عدولی کرنے والے ہیں۔)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا تو عالم الغیب ہے وہ پہلے سے خوب جانتا تھا کہ رسول اللہ کے بعد کچھ لوگ وراثت کے دعویدار بھی ہوں گے اور کچھ ان کے طرفدار بھی ایسے پیدا ہو جاویں گے جو کہ مدعیان وراثت کی طرفداری میں آکر مدعیان وراثت کو حق بجانب یقین کریں گے اور جو آئمہ برحق ہوں گے ان کو غاصب اور ظالم قرار دیں گے لہٰذا اس عالم الغیب خدا نے اس پیدا ہونے والے نزاع کے فیصلہ کے لئے یہ آیات بینات نازل فرما کر اس عظیم الشان نزاع کا فیصلہ کر دیا تا کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (الانفال:43)(تا کہ جو ہلاک ہو وہ بھی کھلی کھلی شہادت سے ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ بھی کھلی کھلی شہادت سے زندہ ہو۔)

قرآن میں ہر قسم کے نزاع کا فیصلہ موجود ہے:

میں جب چھوٹا تھا اور کچھ علم نہ رکھتا تھا تو مجھے ہمیشہ اس بات کو سن کر تعجب آیا کرتا تھا کہ شیعہ سنیوں کے عظیم الشان نزاع خلافت کا قرآن مجید میں کوئی بین فیصلہ موجود نہیں ہے لہٰذا فریقین اس نزاع کے فیصلہ کے لئے حدیث کی طرف رخ کرتے ہیں اور تعجب اس وجہ سے آتا تھا کہ سب اہل اسلام قرآن مجید کو جامع کتاب مانتے ہیں اور حقیقت میں بھی یہ جامع کتاب ہے اور خصوصاً اہم مسائل میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس کا اس نے فیصلہ نہ کیا ہو۔ اسی وجہ سے اس کا دعویٰ ہے کہ میں تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل:90) (ہر ایک امر کو بیان کرنے والا) ہوں۔ اور یہ کہ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام:60) (جو تر اور خشک ہے سب ہی کھول کر بیان کرنے والی کتاب (قرآن) میں ہے) اور جب اس کا خود ہی جامع ہونے کا دعویٰ ہے اور اہل اسلام بھی اس کو جامع یقین کرتے ہیں اور تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی شہادت دیتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ جامع کتاب ہے۔

اور کوئی اہم امر ایسا نہیں جس کی امت محمدیہ کو ضرورت پیش آئی ہو اور اس کتاب نے اس کی نسبت فیصلہ نہ کیا ہو اور کوئی مفید ہدایت اس کی نسبت نہ دی ہو۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے عظیم الشان مسئلہ کی نسبت قرآن مجید بالکل خاموش رہے اور کچھ فیصلہ نہ کرے جس کے باعث لاکھوں انسان تباہ ہو رہے ہیں اور اسلامی دنیا میں جو اس سے خلاف پیدا ہوا ہے اور کسی مسئلہ سے ایسا ہرگز نہیں ہوا کیونکہ جو ابو بکرؓ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہیں وہ بھی لاکھوں ہیں اور جو علیؓ کو خلیفہ بلا فصل اور ابو بکرؓ کو غاصب ظالم کہتے ہیں وہ بھی لاکھوں ہیں اور ہر ایک فریق دوسرے کو گمراہ یقین کرتا ہے اور جس فریق کو قوت ملی ہے اس نے دوسرے کے ذبح کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ نصیر الشرک اور موید الکفر طوسی نے جو کچھ بغداد میں کرایا تھا۔ وہ دنیا پر پوشیدہ نہیں ہے کہ 17 لاکھ سنی کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کا سینہ سرد نہ ہوا تھا اور یہ 17 لاکھ وہی تھے جو کہ اس سرزمین نے بڑی محنت سے پیدا کئے تھے اور چن چن کر اہل علم کو ذبح کیا گیا تھا۔

پس جو مسئلہ اسلامی دنیا میں اس قدر فتنہ برپا کرنے والا ہو تعجب ہے کہ قرآن مجید جیسی

جامع کتاب اس سے بالکل خاموش رہے۔ اس مسئلہ نے اسلامی دنیا میں آگ لگادی ہوئی ہے یہی مسئلہ ہے کہ جس نے ایک اسلام کے مدعی گروہ سے آنحضرتؐ کی تیئیس سالہ محنت اور جان فشانی اور خونریزی پر پانی پھرادیا اور خاک ڈالوادی ہے کہ اس محنت سے جو جواہر حضور علیہ السلام کو ہاتھ لگے تھے اور جن کے حاصل کرنے کے لئے حضور علیہ السلام نے راتوں کی راتیں دعائیں مانگی تھیں اور قسم قسم کی مصیبتیں اٹھائیں اور اذیتیں سہی تھیں۔ یک قلم ان کو کافر منافق مرتد کہہ کر آپ کے ہاتھ سے چھین لیا گیا اور ان کی محنت پر خاک ڈالدی اور یہی وہ مسئلہ ہے جو کہ اسلام کے بانیوں پر اسلام کے مدعیوں سے لعنت کراتا اور ان کی شان رفیع میں تبرے کہلاتا ہے اور اسی نے اہل اسلام کے عظیم الشان دو گروہوں میں عظیم الشان جنگ کرائی ہے اور خون کی ندیاں بہائی ہیں اور اب بھی آئے دن بعض کو مجروح اور بعض کو محبوس کراتا رہتا ہے۔ پس اس سے بڑھ کر اور کون سی بات تعجب انگیز ہو سکتی ہے کہ ایسا مسئلہ ہو اور قرآن مجید اس سے بالکل خاموش رہے اور اس کے متعلق میں فیصلہ نہ کرے۔

پس سچی بات یہی ہے کہ عالم الغیب خدا نے سورہ نور کی آیات بینات اسی مسئلہ کے فیصلہ کے لئے نازل فرمائی ہیں اور اس کا بڑا بھاری قرینہ یہ بھی ہے کہ اس سورت میں خداوند کریم نے شیعہ سنیوں کے اور اہم مسائل کا بھی فیصلہ کیا ہے جیسا کہ عنقریب ناظرین ملاحظہ فرماویں گے پس چونکہ شیعہ سنیوں کے نزاع سے اس سورت کو خاص تعلق تھا لہٰذا خداوند کریم نے اس عظیم الشان نزاع کا فیصلہ بھی اسی سورت میں فرمادیا ہے۔ تاکہ علاوہ مناسبت اور وحدت کے ایک دوسرے کی طرف انتقال ذہن کا موجب ہو۔ غرض ان آیات بینات کا شان نزول یا بہ الفاظ دیگر اسباب النزول یہی ہے کہ خدائے عالم الغیب چونکہ جانتا تھا کہ اس ظالم اور محسن کش مسئلہ نے آئندہ نسلوں میں بہت کچھ تباہی ڈالنی ہے۔ لہٰذا اس عالم الغیب خدا نے یہ آیات بینات نازل فرما کر اس شر کے درخت کے کاٹنے کے لئے حق کے طالبوں کے ہاتھ میں ایک تبر دے دیا ہے۔ یا یوں کہو کہ اس ضلالت کے سمندر سے پار اترنے کے لئے ان کو کشتی دے دی ہے۔

ان آیات بینات میں پہلے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (النور:56)(اللہ نے تم (سب اور تمام اہل اسلام سے نہ خاص قریش سے یا بنی ہاشم سے یا علویوں سے یا بنی فاطمہ سے یا حسینوں سے) آپ کے ساتھ عہد کیا ہے جو ایمان لائے اور سنوار والے کام کئے کہ ضرور وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا) فرما کر ایک تو یہ بتایا کہ نبوت رسالت کی مانند خلافت بھی وراثت وغیرہ امور سے ہرگز حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ فضل ان پر ہوا کرتا ہے جو ایمان لاتے اور اچھے اعمال بجالاتے ہیں۔

ایسی بات کے بتانے کے لئے پہلے مِنْكُمْ فرمایا اور مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ وغیرہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ اگر بنی ہاشم وغیرہ کی تخصیص ہوتی تو پھر وراثت کا وہم ہو سکتا تھا لیکن جب مِنْكُمْ فرما کر تفہیم کر دی کہ عام اہل اسلام میں سے صالح مومنوں کو خلیفہ بنائے گا۔ خواہ وہ قوم کے کوئی ہوں اور اسی بات کے بتانے کے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو تم سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے) فرما دیا کیونکہ قواعدِ زبان کے لحاظ سے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وعدہ کرنے اور خلیفہ بنانے کی علت اور سبب اور باعث ایمان اور اعمال صالحہ ہیں نہ قریشیت اور نہ ہاشمیت اور نہ علویت اور نہ قرابت اور نہ اخوت اور نہ وراثت اور نہ کوئی اور چیز۔ پس مِنْكُمْ اور الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے ثابت ہے کہ یہ وعدہ اور خلیفہ بنانا کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام ہے اور نہ یہ وراثت کے باعث ہے بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے ہے اور بس۔

اور دوم لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فرما کر یہ بتایا کہ خلیفہ بنانے کا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کریم کے سوا نہ کسی انسان کے لیے یہ اختیار ہے خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں اور خواہ امتی ہو یا نبی ہو اور نہ کسی فرشتے کے لیے یہ اختیار حاصل ہے خواہ وہ زمینی فرشتہ ہو یا آسمانی ہو اور اس کا ثبوت بالکل واضح ہے کیونکہ خداوند کریم نے یہ فرمایا ہے کہ میرے سواء فلاں شخص یا فلاں فرشتہ خلیفہ بنائے گا اور نہ یہ فرمایا کہ وہ خلیفہ بنائے جاویں گے بلکہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فرمایا ہے جس کے معنے ہیں ضرور اللہ خود ان کو خلیفہ بنائے گا تو یہاں سے ثابت ہوا کہ جس طرح نبی اور رسول بنانے کا اختیار بھی بجز اللہ کریم کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔

خلیفہ بنانے کا اختیار صرف خدا کا ہے:

اسی طرح خلیفہ بنانے کا اختیار بھی بجز اللہ کریم کے اور کسی کو حاصل نہیں بلکہ بنانا تو بڑی چیز ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ(الانعام:125)(اللہ ہی جانتا ہے اس محل کو کہ جہاں پر وہ اپنی پیغامبری رکھتا ہے) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ:31)(میں ضرور بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ) اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:31)(میں وہ کچھ جانتا ہوں جو کہ تم نہیں جانتے) اور سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرۃ:33)(تو پاک ہے ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر کہ تو نے ہم کو سکھلایا ہے۔) ان سب سے یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جس طرح رسالت کے مناسب محل اور قابل انسان کو دوسرا کوئی نہیں جانتا اسی طرح خلافت کے محل کا جاننا بھی خدائے علیم کا خاصہ ہے اور دوسرا کوئی نہیں جانتا بلکہ انسان کیا ملائک بھی نہیں جانتے۔ قرآن مجید میں ایک محل پر اس مسئلہ پر (کہ رسول اور خلیفہ بنانے کا اختیار اللہ کریم کے سواء کسی دوسرے کو ہے یا نہیں) دلیل بھی پیش کی ہے جہاں پر فرمایا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ۔ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ الخ(الزخرف:33-32)(اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن کیوں ان بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نازل نہیں کیا گیا۔ کیا انہوں نے تیرے رب کی رحمت کو بانٹا ہے (نہیں بلکہ) ہم ہی نے اس کی معاش کو ان کے درمیان نزدیک زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ہم ہی نے بعض کے درجات کو بعض پر بلند کیا ہے الخ۔)

یعنی جب دنیوی مال وجاہ (جو کہ رسالت وخلافت سے بہت ہی ادنیٰ چیز ہیں) ان کے قبضہ میں نہیں تو پھر رسالت وخلافت جو ان سے بہت اعلیٰ درجے کی ہیں کب ان کے قبضۂ قدرت اور اختیار میں ہو سکتی ہیں۔ غرض کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے یہ دو امر بیان فرمائے ہیں کہ خلافت فضلی چیز ہے اور اس میں ارث ہرگز نہیں ہے اور یہ کہ اللہ ہی کے لئے خلیفہ بنانے کا اختیار ہے اور اس کے سوا دوسرے کسی کو نہیں اور ان کے بیان کے بعد پھر ان کو

استقراء سے مبرہن کیا اور فرمایا کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (جیسا کہ ان سے پہلوں کو خلیفہ بنایا ہے) یعنی جس طرح پہلے خلفاء وراثت کے ذریعہ سے خلیفہ نہیں بنے بلکہ میرے فضل سے بنے ہیں اور نہ خود بنے ہیں اور نہ میرے سواء کسی اور نے ان کو بنایا ہے بلکہ میں نے ہی ان کو بنایا ہے۔ پس اسی طرح مومنوں میں سے یہی میرے فضل ہی سے بنیں گے اور میں ہی ان کو بناؤں گا۔

خلافت کے متعلق شیعہ عقائد کا ردّ:

اس سے شیعہ کے خیال کی بہت ہی عمدہ بیخ کنی ہوتی ہے کیونکہ یہاں سے اس قدر تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو پہلوں کی طرح بنایا جاوے گا نہ کسی نئی طرز پر لیکن پہلوں میں چونکہ ایسا کوئی خلیفہ نہیں ہوا کہ جس کی خلافت پہلے غصب ہوتی رہی ہو اور پھر مدت کے بعد وہ خلیفہ بنا ہو چہ جائے کہ تین نے یکے بعد دیگرے خلافت غصب کی ہو اور خلیفہ برحق نے مجبور ہو کر یا محض ظالموں منافقوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی بیعت بھی کی ہو۔ پس جیسا کہ کَمَا اسْتَخْلَفَ سے پہلوں میں نظیر کا ہونا ضروری ثابت ہوتا ہے شیعہ صاحبان پر لازم ہے کہ غصب رسالت وغصب خلافت کے نظائر نہیں تو ایک ہی ایک نظیر پیش کریں۔ اگر تین والی نہیں تو ایک ہی والی سہی۔ پس چونکہ خداوند کریم کا وعدہ تھا کہ میں خود خلیفہ بناؤں گا اور اس کا کوئی ذکر نہ تھا کہ کوئی خلیفہ غاصب بھی ہو گا تو آنحضرتؐ کے بعد جو خلیفہ واقعہ میں ہو گا یقیناً ماننا پڑے گا کہ یہ خدا کا بنایا ہوا خلیفہ ہے اور غاصب نہیں۔ کیونکہ ایفاءِ وعدہ اور خداوند کریم کے قول اور فعل کی مطابقت ضروری ہیں اور یہ دونوں اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں اور بس۔

ورنہ تو علاوہ خلاف وعدہ اور قول وفعل کی مخالفت کے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابو بکرؓ خدائے عزوجل پر غالب آیا ہے اور کفر محض ہے اور حضرت علیؓ کو دنیا جانتی ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد خلیفہ نہیں ہوئے۔ اور اس کے بعد اپنے بنائے ہوئے خلیفہ کی علامتیں بیان فرمائی ہیں جو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کے لئے خدائے عزوجل کی فعلی شہادت ہیں اور اپنے رسولوں کے لئے بھی خداوند کریم نے بڑا بھاری ثبوت اپنی فعلی شہادت کو قرار دیا

ہوا ہے لہٰذا رسولوں کی رسالت کے اثبات کے مقامات پر بار بار کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا (النساء:80) (اللہ کی شہادت کافی اور بس ہے) فرمایا ہے۔ اور وہ علامات یا فعلی شہادتیں یہ ہیں۔

وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا (النور:56) (اور ان کے لئے ان کے اس دین کو ثابت کر دے گا جس کو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور خوف کے بعد ان کو امن بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے) یعنی ان کی ایک تو یہ علامت ہے کہ جو دین خداوند کریم نے ان کے لئے پسند فرمایا ہوا ہے اس کو دنیا میں پھیلانے اور مضبوط کرنے کی قدرت ان کو دے دے گا اور دوسری علامت یہ ہے کہ جس طرح انبیاء کے ساتھ لازم ہے کہ پہلے ان پر خوف کا زمانہ آتا ہے اور آخر پھر ان کے خوف کو امن کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے خلیفہ برحق کی بھی یہ علامت ہے۔ یہ دونوں علامتیں تو ایسی ہیں کہ انسان کی قدرت میں نہیں خداوند کریم کے قبضہ اقتدار میں ہیں چاہے تو کسی کے دین کو ثابت کرے چاہے تو اس کو صفحہ دنیا سے اٹھادے اور چاہے تو پہلے خوف وارد کر کے پھر اس کو امن سے بدل دے اور چاہے تو امن کی حالت کبھی لائے نہیں۔ اور تیسری علامت یہ ہے کہ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا یعنی اگرچہ دنیا کے بادشاہوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب امن کی حالت ملی تو معاً اپنے نفس اور اس کی ہوا کے بندے بنے اور اپنے رب کی عبادت کو جواب دیا لیکن جو خدا کے برگزیدہ اور اس کے بنائے ہوئے خلفاء ہوتے ہیں۔ اللہ کریم جونہی ان کو امن دیتا ہے تو وہ اس کی عبادت اور توحید اور شکر گزاری میں زیادہ ترقی کر جاتے ہیں۔

اس کے بعد خداوند کریم نے ان کی نافرمانوں کے سزا بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے۔ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (اس کے بعد (یعنی خدا کے بنائے ہوئے خلفاء کی جب تینوں علامتیں کسی خلیفہ میں پائی جاویں تو پھر اس کے بعد) جو لوگ انکار کریں گے پس وہ پکے حکم عدولی کرنے والے ہیں) تو چونکہ یہ تینوں علامتیں حضرت ابو بکرؓ میں موجود ہیں لہٰذا وہ تو بنائے ہوئے خلیفہ ہیں اور حضرت علیؓ جب خلیفہ بنے تو بقول شیعہ ایک سیکنڈ

کے لئے بھی انہوں نے امن کا منہ نہیں دیکھا اور نہ ان کے شیعہ مذہب کی تمکین ہوئی۔ اور یَعْبُدُونَنِیْ کا زمانہ تو امن کا تھا وہ نصیب ہی نہیں ہوا۔

رہا امر دوم یعنی بعض ازواج مطہرات کی نسبت اس کی بد گوئی۔ تو ان کی نسبت میں سورہ نور کی کچھ آیتیں لکھتا ہوں جو کہ اس امر کا فیصلہ کر دیتی ہیں اور وہ یہ ہیں اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ (النور:27)(گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ (یہ لوگ جو پاکیزہ مرد اور پاکیزہ عورتیں ہیں) بری ہیں اس سے جو لوگ کہتے ہیں یا کہیں گے) یہ آیت اس موقع پر ہے جہاں حضرت عائشہ صدیقہ پر افتراء کرنے کا ذکر ہے اور یہ آیت اس کی تردید کے لئے ہے اور اس کا خلاصہ مطلب (کہ جس میں کسی طرح کی بناوٹ اور کمی بیشی ہر گز نہیں ہے) یہ ہے کہ خداوند کریم نے ایک قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہوتے ہیں اور اسی طرح طیبات بھی۔ تو چونکہ سب اہل اسلام آنحضرتؐ کو سب طیبین کا سردار یقین کرتے ہیں تو قاعدہ مذکورہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی سب ازواج اعلیٰ مرتبہ کی طیبات ہیں۔ اور اس کے خلاف میں دو باتوں میں سے ایک ضرور لازم آوے گی اور وہ یہ ہیں کہ یا تو یہ اس قاعدہ کو جھوٹا کہہ کر خدا کو جھوٹا کہنا لازم آئے گا یا آنحضرتؐ کو طیبین سے خارج ماننا لازم آوے گا اور یہ دونوں صریح کفر ہیں۔

پس ضرور وہ نتیجہ ماننا پڑے گا جو قرآن مجید نے اس قاعدہ سے نکالا ہے اور وہ یہ ہے اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ (النور:27)(یہ لوگ بری اور پاک ہیں ان الزاموں سے جو یہ لوگ ان پر لگاتے ہیں یا لگائیں گے) اور چونکہ اس قاعدہ کے ہوتے ہوئے ازواج مطہرات پر افتراء کرنے سے یا تو لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ منہ خداوند تعالیٰ نے جھوٹ بولا ہے اور یا لازم آوے گا کہ نعوذ باللہ منہ خدائے پاک نے اپنا رسول اکرم ناپاک کو بنایا ہے اور یہ دونوں صریح کفر ہیں اور یہ ایمان والوں کی شان سے بعید ہیں اسی وجہ سے خداوند کریم

نے اسی حضرت عائشہ والے افتراء پر فرمایا ہے۔لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ(النور:13)(کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تو مومنوں اور مومن عورتوں نے خیال کیا ہوتا اپنے لوگوں پر بہتری کا اور کہا ہوتا کہ یہ کھلا افتراء ہے)وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (النور:17)(اور کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو کہہ دیتے ہمیں جائز نہیں کہ ہم یہ کہیں اے خدا تو پاک ہے۔ یہ بڑا بہتان ہے۔) یعنی اس قاعدہ کے مطابق تو مومنوں کی شان سے یہ تھا کہ محض سنتے ہی سواء کسی تحقیق کے کہہ دیتے کہ یہ محض بہتان عظیم ہے اور کھلا افتراء ہے۔

اور سُبْحَانَكَ بھی اسی وجہ سے یہاں پر فرمایا ہے کہ اس کے خلاف بدگمانی کرنے سے خدا پر یا تو جھوٹ کا الزام لازم آتا ہے یا یہ کہ اس نے ناپاک کو اپنا رسول بنایا لہٰذا فرمایا کہ مومنوں کو خدا کی سبوحیت قدوسیت کا خیال کرنا چاہئے تھا جو کہ افتراء کرنے والوں نے نہیں کیا۔ پس ان آیات سے صاف ثابت ہے کہ جو گندے الزام ایسے ہیں کہ ازواج مطہرات کو غیر مطہر اور غیر طیب قرار دیتے ہیں۔ ان سے سب ازواج مطہرات عموماً اور حضرت عائشہ صدیقہ خصوصاً پاک اور بری ہیں اور عالم الغیب کی شہادت سے بری ہیں جیسا فرمایا اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ اور ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ بھی اسی وجہ سے فرمایا ہے کہ عالم الغیب خدا جانتا تھا کہ یہ افتراء پردازی دہی لوگ کریں گے جو اپنا نام مومن رکھائیں گے حالانکہ یہ کام ان کا ایمان کے خلاف ہوگا۔

(رسالہ تعلیم الاسلام جلد 1 نمبر 10 بابت ماہ اپریل 1907ء صفحہ 364 تا 401)

آیت22-23: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ)

یا۔ حرف نداء ہے اور قریب بعید متوسط سب کو اس کے ساتھ پکارا جاسکتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس کے ساتھ بعید کو پکارا جاتا ہے اور اصل معنی اس کے یہی ہیں لیکن حق یہی ہے کہ یہ مطلق نداء کے لئے ہے اور قرب بُعد کی کوئی شرط نہیں ہے اور جنہوں نے اس کو نداء بعید کے لئے مخصوص کیا ہے جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں پر جن کو پکارا گیا ہے وہ بعید نہیں ہیں تو انہوں نے اس کے لانے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ کبھی نداء بعید کا لفظ قریب کے لئے بھی آجاتا ہے جب کہ پکارنے والا یا پکارے ہوئے کی عظمت اور بلندی اور رفعت شان کا اظہار مد نظر ہو یا منادی کی غفلت اور بے اعتنائی کا اظہار اور اس کا اکسانا منظور ہو اور یہاں پر چونکہ پکارنے والا اللہ عزوجل ہے لہٰذا اس کی رفعت شان کا اظہار بھی ہو سکتا ہے اور چونکہ منادی کفار وغیرہ غافل لوگ ہیں لہٰذا اظہار غفلت بھی مد نظر ہو سکتا ہے اور تعمیل ارشاد کی نسبت اکسانا بھی ہو سکتا ہے۔

اَیُّ۔ ایک لفظ ہے کہ جس جماعت پر یہ داخل ہوتا ہے اس کے ہر ایک بعض پر دلالت کرتا ہے جس کے معنے ہوتے ہیں جو کوئی مثلاً اَیُّ النَّاسِ، اَیُّ الرِّجَالِ کے معنے ہیں جو انسان جو مرد اور جب ایسے لفظ کو منادیٰ بنایا جاتا ہے کہ جس پر ال آیا ہو تو وہاں پر ضرور حرف نداء اور منادی کے درمیان اَیُّھَا بڑھا دیتے ہیں کیونکہ ال جس لفظ پر آتا ہے اس کو معرفہ (معین) کر دیتا ہے اور حرف نداء کا بھی یہی کام ہے اور جب ہر ایک کلمہ اثر ہے کہ جس لفظ پر آئے اس کو معرفہ اور معین کر دے تو پھر دونوں کا جمع کرنا موزوں نہ ہو گا کیونکہ ایک کا لغو ہونا لازم آئے گا لہٰذا جب دونوں جمع ہوتے ہیں تو لفظ اَیُّ کو درمیان میں لے آتے ہیں تاکہ حرف نداء اَیُّ پر آئے نہ ال پر اور اس کام کے لئے اَیُّ کو اسی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معنے

نہیں دیتا بلکہ ہر ایک منادیٰ کے ہر ایک فرد پر دلالت کرتا ہے پس گویا منادیٰ بھی وہی رہا اور حرف نداء ال پر بھی نہ آیا اور اَیُّ کے بعد ھَا کا لفظ اس لئے ایزاد کرتے ہیں تاکہ تنبیہ اور تاکید کا فائدہ دے نیز اَیُّ کے مضاف الیہ کا عوض ہو کیونکہ اَیُّ اکثر مضاف یعنی کسی دوسرے اسم کی طرف منسوب ہو کر مستعمل ہوتا ہے جیسا اَیُّھُمْ اور اَیُّکُمْ وغیرہ اور جو لفظ دوسرے لفظ کی طرف منسوب ہو کر مستعمل ہوتا ہے۔ تو جب دوسرے لفظ کو ذکر نہیں کرتے تو کوئی اور چیز اس کے عوض وہاں پر لے آیا کرتے ہیں اور یہاں پر بھی چونکہ اَیُّ کا مضاف الیہ مذکور نہیں ہے لہٰذا اس کے عوض ھَا یہاں پر لے آئے ہیں۔

نَاسُ۔ اسم جمع ہے، جس کے معنے ہیں آدمی، لوگ۔

اُعْبُدُوْا۔ عبادت سے ہے، جس کے معنے ہیں عبادت کرو اور عبادت توحید ہے اور اس کے تین اجزاء ہیں۔ توحیدِ ربوبیت اور توحید اسماء اور توحید افعال۔ اور عبادت نام ہے ان سب اعتقادوں اور قولوں اور فعلوں کا جن کو اللہ کریم پسند فرماتا ہے جیسا اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، رسولوں کتابوں اور تقدیر اور بعث بعد الموت پر ایمان لانا اور زبان سے اس کا اقرار اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، جہاد اور امانت کا ادا کرنا اور انسان کے پیدا کرنے کی اصل غرض اور غایت یہی عبادت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات:57) (ہم نے جن اور انسانوں کو محض اسی لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ عبادت کریں) اور دین بھی اسی کو کہتے ہیں اس لئے کہ دین کہتے ہیں عاجزی اور خشوع و خضوع کو اور عبادت کے معنے بھی یہی ہیں چنانچہ الطَّرِیْقُ الْمُعَبَّدُ اس راستہ کو کہتے ہیں جو کہ کثرت آمد و رفت سے خوب ذلیل ہو چکا ہو اور عبادت کے مفہوم میں محبت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے پس عبادت میں دو چیزیں ہیں ایک خشوع و خضوع دوم محبت تو جہاں خالی خشوع و خضوع ہو گا اور محبت نہ ہو گی جیسی کہ رعیت اپنے ظالم بادشاہوں کے ساتھ خشوع و خضوع رکھتی ہے پر محبت نہیں ہوتی تو اس کو عبادت نہیں کہا جاتا اور اگر محبت ہو اور خشوع و خضوع نہ ہو جیسی اور اور دوستوں کی محبت جو کہ خشوع و خضوع سے خالی ہوتی ہے تو یہ بھی عبادت نہیں ہو سکتی اور

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کے معنے وَحِّدُوْا رَبَّکُمْ کئے ہیں یعنی تم اپنے ربّ کو وحدہ لاشریک یقین کرو۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) حضرت ابن عباس کی مذکورہ بالا تفسیر کو عموماً مفسرین نے نہیں سمجھا اور چونکہ یہ افقہ الناس اور جلیل القدر صحابی کی تفسیر تھی لہٰذا اس کو رد بھی نہ کرسکتے تھے تو اس کو اعتبار کرکے اور غلط معنے کرکے کچھ اور کا اور ہی بنادیا عبادت کی تفسیر توحید کے ساتھ بھی اسی وجہ سے کی گئی ہے ورنہ تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ توحید اور عبادت ایک چیز نہیں اور نہ دونوں مساوی چیزیں ہیں بلکہ ان دونوں کا مفہوم جدا جدا ہے اور عبادت توحید سے عام ہے۔ پس جب ان دونوں کے مفہوم جدا جدا ہیں اور ایک عام اور دوسری خاص ہے تو پھر حضرت ابن عباسؓ کب یہ فرماسکتے ہیں کہ عبادت کے معنے توحید ہیں یا اُعْبُدُوْا کے معنے وَحِّدُوْا ہیں بلکہ ان کا اُعْبُدُوْا کی تفسیر میں وَحِّدُوْا کہنے سے سمجھانا منظور ہے کہ یہ امر مشرکین عرب کو ہے اور وہ عبادت اللہ کے منکر نہ تھے تاکہ ان کو حکم دیا جاتا کہ عبادت کرو بلکہ وہ شرک فی العبادت میں مبتلا تھے لہٰذا اس کے مناسب حال یہ حکم ہے کہ توحید فی العبادت اختیار کرو نہ یہ کہ عبادت کرو اور اُعْبُدُوْا سے بظاہر دوسرے معنے مفہوم ہوتے تھے۔

نہ اوّل تو انہوں نے وَحِّدُوْا کے ساتھ تفسیر کرکے یہ بتایا کہ اُعْبُدُوْا سے یہ مراد نہیں کہ عبادت کرو بلکہ یہ مراد ہے کہ خالص اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو اور اس مراد کے بیان کے لئے اصل عبارت تو وَحِّدُوْا تھی لیکن خداوند کریم نے اُعْبُدُوْا اس لئے فرمایا تاکہ ان کو یہ سمجھادے کہ جو عبادت تم اللہ کی مشرکانہ طور پر کرتے ہو وہ حقیقت میں ہرگز عبادت نہیں ہے کیونکہ جس عبادت میں خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جاتا ہے خدا اسے قبول نہیں کرتا ہے بلکہ ساری کی ساری شریک کو دے دیتا ہے۔ پس بجائے وَحِّدُوْا کے اُعْبُدُوْا کہنے سے علاوہ توحید فی العبادت کے حکم کے اس کی دلیل بھی بیان کردی ہے الغرض کہ حضرت ابن عباس نے وَحِّدُوْا کے ساتھ اُعْبُدُوْا کے معنے بیان نہیں کئے بلکہ یہ بتایا ہے کہ یہاں عبادت کا حکم نہیں بلکہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرنے کا

ارشاد ہے۔ پس وَحِّدُوْا کے یہ معنے نہیں کہ اللہ کو ایک مانو بلکہ یہ معنے ہیں کہ عبادت میں اللہ کو اکیلا رکھو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو مت شریک کرو۔

رَبّ (**حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ**) لفظ رَبّ (جو کہ بمعنے تربیت آتا ہے یا وہ تربیت سے اس طور پر بنا ہوا ہے کہ یاء کو باء سے بدل دیا ہوا ہے) وہ مصدر ہے اور جو بمعنے تربیت دینے اور پیدا کر کے بحسب استعداد آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانے والے کے آتا ہے اس کو بعض نے صفت مشبہ کہا ہے لیکن حق یہ ہے کہ وہ اسم فاعل ہے مبالغہ کے ساتھ یا بدوں مبالغہ کے اور رَبّ کا لفظ خالق، سردار، بادشاہ، منعم، مصلح، معبود، صاحب پر بولا جاتا ہے لیکن یہاں پر وہی پہلے معنے مراد ہیں کیونکہ خداوند کریم نے یہاں پر اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ الخ فرما کر رب کی یہی تفسیر کی ہے جیسا کہ اس کی تفسیر کے پڑھنے سے واضح طور پر ثابت ہو جاوے گا اور اس سے یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاوے گا کہ یہ معنے یہی نہیں کہ اہل لغت نے بیان کئے ہیں اور بس بلکہ خود قرآن مجید نے بھی یہی کئے ہیں اور سب تفسیروں سے اعلیٰ اور اقویٰ اور عمدہ ترین وہی ہوتی ہے جو کہ خود قرآن مجید ہی کر دے۔

اَلَّذِیْ۔ جس۔

خَلَقَ۔ خَلْقٌ سے ہے اور خلق کہتے ہیں اختراع یعنی سوائے کسی چیز کی مثل موجود ہونے کے ابتداءً پیدا کرنے کو اور ایجاد و تکوین کو اور ان معنوں کے لحاظ سے خلق اللہ کریم کا خاصہ ہے اور دوسرا کوئی خالق نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور اس کے معنے تقدیر یعنی انداز کرنے کے بھی ہوتے اور چونکہ تقدیر اور انداز اللہ کے سوا اور بھی کر سکتے ہیں لہٰذا ان معنوں کے رو سے یہ اللہ کریم کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا بلکہ اللہ کریم کے سوا اوروں کو بھی خالق کہا جاتا ہے۔ پس ان ہی دو معنوں کے فرق سے بعض مقام پر تو قرآن مجید فرماتا ہے۔ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (فاطر:4) (کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے) اور قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الرعد:17) (اللہ ہی سب چیزوں کا خالق ہے) وغیرہ ذالک جس سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کریم ہی خالق ہے اور اس کے سواء اور کوئی خالق نہیں ہے اور بعض محل پر فرمایا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون:15) (تو اللہ بہت ہی بابرکت ہے جو

کہ سب خالقوں سے بہت اچھا ہے) اور وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (المائدۃ:111) اور جب تو بناتا تھا کیچڑ سے پرندوں کی شکل کے مانند) اور وَ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (العنکبوت:18) (اور تم افتراء خلق کرتے ہو) وغیرہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کریم کے سوا اور بھی خالق ہیں جو خلق کرتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی متضاد اور مخالف ہیں حالانکہ قرآن مجید اپنی صداقت اور منجاب اللہ ہونے کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء:83) (اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کے پاس سے ہوتا تو اس میں (قرآن میں) بہت اختلاف پاتے) جس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ مجھ میں اختلاف نہیں اور اختلاف کا نہ ہونا میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا نشان ہے اور اگر خلق کے معنے ہر ایک محل پر ایک ہی لئے جاویں تو پھر ایسا اختلاف لازم آتا ہے جس سے بڑھ کر متصور نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح بعض جگہ پر قرآن مجید نے فرمایا ہے وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (الانعام:102) (اور اس نے ہر ایک چیز کو خلق کر دیا ہوا ہے) اور خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرۃ:30) (تمہارے لئے ان سب اشیاء کو پیدا کیا ہے جو کہ زمین میں ہیں) جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ پیدا کرنا تھا وہ سب کچھ پیدا کر دیا ہوا ہے اور نہ اب پیدا کرتا ہے اور نہ آئندہ پیدا کرے گا اور یہ مشاہدہ کے خلاف ہے پھر خداوند کریم کی صفات کے ازلی ابدی ہونے کے خلاف ہے اور پھر قرآن مجید کی ان سب آیات کریمہ کے خلاف ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب بھی پیدا کرتا ہے اور آئندہ بھی پیدا کرے گا۔ جیسا کہ فرمایا کہ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (الزمر:7) (پیدا کرتا ہے تم کو ماؤں کے پیٹوں میں) اور وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل:9) (اور پیدا کرے گا جو کہ تم نہیں جانتے) اور اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (یٰس:82) (کیا تم یہ کہتے ہو) اور (کیا) جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اس پر قادر نہیں کہ ان کی مانند پیدا کرے ہاں کیوں نہیں اور وہ تو بہت پیدا کرنے والا بہت علم والا ہے) پس ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے جس طرح پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح اب بھی کرتا

ہے اور آئندہ بھی کرے گا تو اگر خلق کے معنے ایک ہی لئے جاویں اور جن آیات میں یہ آیا ہے کہ سب اشیاء کو اللہ کریم نے خلق کر دیا ہوا ہے۔ ان میں خلق کے معنے تقدیر کے اور دوسریوں میں ایجاد و تکوین کے نہ لئے جاویں تو علاوہ اور نقصوں کے آیات قرآنیہ میں سخت اختلاف لازم آوے گا جس کی نفی کو اس نے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہوا ہے۔ اور اگر پہلی قسم کی آیتوں میں خلق کے معنے تقدیر کے لئے جاویں اور دوسری قسم کی آیتوں میں ایجاد و تکوین کے لئے جاویں تا کہ پہلی قسم کا یہ مطلب ہو جاوے کہ خداوند کریم نے پہلے سے سب اشیاء کو مقدر اور انداز والا بنایا ہے اور دوسری قسم کا یہ ہو جائے کہ خداوند کریم ہمیشہ اشیاء کو پیدا کرتا رہا ہے اور کرتا ہے اور کرے گا تو پھر نہ کوئی اختلاف لازم آتا ہے اور نہ کوئی اور نقص باقی رہتا ہے اور یہاں پر خلق کے دونوں معنے درست ہو سکتے ہیں۔

کُمْ۔ تم۔ وَ۔ اور۔ اَلَّذِیْنَ۔ جو۔ مِنْ۔ سے۔

قَبْل کے معنے ہیں پہلے اور اکثر تو یہ زمانے کے لئے آتا ہے اور کبھی مکان کے لئے بھی آجاتا ہے اور بہت کم مرتبہ کے لئے بھی آتا ہے یعنی پہلا زمانہ ہو یا مکان ہو یا مرتبہ ہو۔

کُمْ۔ تم۔ لَعَلَّ۔ اکثروں کے نزدیک یہ ایک ہی لفظ ہے اور یہ کسی ایسے امر میں توقع اور امید پیدا کرنے کے لئے آتا ہے کہ جس کے ہونے اور نہ ہونے میں تردّد واقع ہو اور یہ آکر اس کے ہونے کو ترجیح دے دیتا ہے اور اس کے ہونے کی امید دلا دیتا ہے اور اس صورت میں اردو میں اس کے معنے ہوں گے شاید اور وہ امید اور توقع گاہے متکلم کی طرف سے ہوتی ہے اور گاہے مخاطب کے لحاظ سے ہوتی ہے اور گاہے یوں بھی ہوتا ہے کہ امید کرنے والا تو کوئی نہیں ہوتا پر اس امر کو متحقق خیال کیا جاتا ہے اور بعض اہل زبان نے لکھا ہے کہ یہ بمعنے کیْ بھی آتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں ہوتا ہے تو کہ یعنی کسی امر کی علّت اور اس کا سبب اور باعث بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ پس اُس صورت میں جو چیز لَعَلَّ کے بعد ہو گی وہ ماقبل کے لئے سبب اور باعث ہو گی اور بعض کا قول ہے کہ لَعَلَّ کے معنے تعرض اور چھیڑنے کے ہوتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ لام جدا ہے اور عَلَّ جدا کلمہ ہے۔ پس لام

کے معنے تو تحقیق اور تاکید کے ہیں اور عَلَّ کے معنے مقرر کرنے کے ہیں اور اس صورت میں یہ بجائے امید کے یقین کا فائدہ دے گا۔ پس لَعَلَّ کے معنے ہوں گے ہو جانے کے۔

تَتَّقُوْنَ۔ تقویٰ سے ہے اور تقویٰ کہتے ہیں بچنے کو اور قرآن مجید نے متقی کی جو حقیقت بیان فرمائی ہے یا جو علامات اور آثار ذکر فرمائے ہیں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی تفسیر میں میں نے مفصل ذکر کر دیا ہے۔ پس اگر لغوی معنوں کا لحاظ کیا جائے تب تَتَّقُوْنَ کے معنے ہوں گے تم بچو گے یا بچتے ہو اور لَعَلَّ کے ملانے کے بعد ہوں گے شاید تا کہ تم بچو یا ہو جاؤ گے تم بچنے والے اور اگر تقویٰ کے شرعی معنے لئے جاویں تب لَعَلَّ کے سوا اس کے معنے ہوں گے تم متقی بن رہے ہو یا بنو گے اور لَعَلَّ کے ساتھ ہوں گے شاید (یا تا کہ) تم متقی بن جاؤ یا ہو جاؤ گے تم متقی۔

اَلَّذِیْ۔ جس۔ جَعَلَ۔ جَعْلٌ جس کے معنے ہیں بنانے کے تو جَعَلَ کے معنے ہوئے بنایا اس نے اور الَّذِیْ کے ساتھ سے لگنے سے اس کے معنے ہوں گے جس نے بنایا۔

ال۔ اس۔ اَرْضٌ۔ اسم جمع ہے یا اسم جنس ہے اور اس کے معنے ہیں زمین اور ہر ایک چیز کا نچلا حصہ جیسا کہ اَرْضُ النَّعْلِ جوتی کے نیچے کی طرف کو کہتے ہیں اور سَمَآءُ النَّعْلِ اس کے اوپر کی طرف کو کہتے ہیں اور چارپائیوں کی ٹانگیں اور اصل معنے اس کے گھومنے اور ہلنے کے ہیں جیسا حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے اَزُلْزِلَتِ الْاَرْضُ اَمْ بِیْ اَرْضٌ (کیا زمین ہل رہی ہے یا کہ میرا سر گھوم رہا ہے) اور ارض سر کے گھومنے کو کہتے ہیں جو کہ دودھ پینے سے ہو جاتا ہے اور ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے اور ماروض اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کا سر گھوما کرتا ہے اور اس سے زمین کی حرکت کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے اور کچھ لفظ ارض ہی پر یہ منحصر نہیں بلکہ عربی زبان کے اسماء میں عموماً یہی پایا جاتا ہے کہ اس لفظ ہی میں ان اہم اور گہری باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو کہ دنیا کو بڑی بڑی تحقیقات کے بعد معلوم ہوتی ہیں اور انہی باتوں سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان کا واضع کوئی انسان نہیں بلکہ وہ خدا ہے جو کہ عالم الغیب اور خالق کائنات اور اپنی مخلوق کی باریک در باریک حکمتوں کو جاننے والا ہے۔

فِرَاشٌ کہتے ہیں ، فرش، بستر، قرار گاہ، مکان، محل، زراعت اور پرندوں کے

گھونسلہ کو اور قرآن مجید میں لفظ فِرَاشٌ بمعنے بستر آیا ہے جہاں فرمایا جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (نوح:20)(بنایا اس نے زمین کو تمہارے لئے بسترہ۔)

وَ۔ اور۔ سَمَآء۔ سُمُوًّا سے ہے جو بمعنے عُلُوًّا اور سَمَاء وہ چیز ہے جو علو والی ہو یعنی اوپر ہو اسی وجہ سے سَمَآءُ الْبَيْتِ مکان کی چھت کو کہتے ہیں اور سَمَآءُ النَّعْلِ جوتی کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) اور اسی وجہ سے بادل کو بھی سماء کہتے ہیں جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً(ق:10)(اور اتارا ہم نے بلندی یا بادل سے پانی) اور جو لوگ یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ اتارا ہم نے آسمان سے پانی وہ واقعہ اور قرآن مجید کے خلاف کرتے ہیں واقعہ کی تو اس لئے کہ یہ ثابت شدہ صداقت ہے کہ بارش بادل سے اترتی ہے نہ آسمان سے اور قرآن مجید سے اس لئے کہ قرآن مجید میں صاف طور پر آیا ہے کہ بارش بادلوں سے نازل ہوتی ہے چنانچہ فرمایا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ(الروم:49)(اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ اٹھاتی ہیں بادلوں کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو بلندی میں جس طرح چاہتا ہے اور بنا دیتا ہے اس کو تہہ بہ تہہ پھر تم دیکھتے ہو بوندوں کو کہ اس کے (بادل کے) درمیان سے نکلتی ہیں) پس یہ آیت کریمہ صاف دکھاتی ہے کہ بارش بادلوں کے درمیان سے برستی ہے لیکن باوجود اس کے افسوس یہ ہے کہ اکثر مترجمین نے پہلی آیت کے یہی معنے کئے ہیں کہ ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں ہاں ایک اور معنی مِنَ السَّمَآءِ کے مفسرین نے بعض اور مقامات پر کئے ہیں مثلاً رزق وغیرہ کے آسمان سے اترنے کے معنے انہوں نے یہ بیان کئے ہیں کہ رزق کو اس لئے مِنَ السَّمَآءِ فرمایا ہے کہ وہ آسمانی احکام اور تاثیرات واسباب سے پیدا ہوتا اور ملتا ہے لہٰذا اس کو مِنَ السَّمَآءِ وغیرہ کہا گیا ہے تو اگر اس آیت کریمہ میں وہ معنے لئے جاویں تو یوں ترجمہ ہوگا اور اتارا ہم نے پانی آسمانی اسباب سے۔

بِنَآءٌ اس کے اصل معنے تو ہیں رہائش کا مکان وغیرہ بنانا لیکن اب اس کے معنے بنائے

ہوئے مکان اور خیمہ وغیرہ کے ہیں جس میں رہائش کی جاتی ہے اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں آسمان کے لئے سقف کہا گیا ہے جس کے معنے چھت کے ہیں چنانچہ فرمایا ہے۔ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء: 33) (اور ہم نے بنایا اس آسمان کو محفوظ چھت) پس اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ بِنَاءٌ کے معنے چھت کے ہیں۔

وَ۔ اور۔ اَنْزَلَ۔ اِنْزَالٌ سے ہے جس کے معنے اتارنے کے ہیں۔ پس اَنْزَلَ کے معنے ہوئے اتارا اُس نے۔

مِنْ۔ سے۔ سَمَآءٌ۔ بلندی یا بادل۔ مَآءٌ۔ پانی۔

فَ۔ پھر، پس۔ اَخْرَجَ۔ اِخْرَاجٌ سے ہے، نکالا اس نے۔

بِ۔ ساتھ، ذریعہ، سبب۔ ہٖ۔ اس۔

مِنْ۔ سے، اس مِنْ کو تبعیضیہ کہتے ہیں اور جس پر یہ داخل ہوتی ہے اس کے بعض اور اس کے کچھ حصہ پر دلالت کیا کرتی ہے۔

ثَمَرَاتٌ۔ ثَمَرَۃٌ کی جمع ہے اور ثَمَرَۃٌ کہتے ہیں پھل کو۔

رِزْقٌ۔ رزق کو کہتے ہیں۔

فَ۔ لہٰذا اس لئے۔ لَا۔ نہ، مت۔

تَجْعَلُوْا۔ جَعْلٌ سے ہے جس کے معنے بنانے کے ہیں۔ پس لَا تَجْعَلُوْا کے معنے ہوئے تم نہ بناؤ۔ لِ۔ لئے، واسطے۔

اَللّٰہُ۔ کے معنے ہیں وہ ذات جو سب نقصوں سے پاک اور سب صفات کمال کے لئے جامع ہو۔

اَنْدَادًا۔ نِدٌّ کی جمع ہے اور نِدٌّ کے معنے کبھی مثل کے ہوتے ہیں اور کبھی ضد کے اور ابن اثیر نے کہا ہے کہ نِدٌّ اس مثل کو کہتے ہیں جو ضد ہو۔

وَ۔ بمعنے حال یا بمعنے اور۔

اَنْتُمْ۔ تم۔ تَعْلَمُوْنَ۔ عِلْمٌ سے ہے اور اس کے معنے ہیں، جانتے ہو۔

سب کا ترجمہ یہ ہے اے لوگو تم خاص عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تا کہ (یا شاید کہ) تم بچو (یا متقی بنو) جس نے بنایا تمہارے لئے

اس زمین کو فرش (بستر) اور آسمان کو چھت اور اتارا اس نے بلندی (یا بادل) سے پانی پھر نکالا اس نے اس کے ساتھ (ذریعہ سے) پھلوں سے کچھ تمہارے رزق کے لئے لہٰذا تم مت بناؤ پاک اور مستجمع جمیع صفات کمال کے لئے بہت ہمسر حالانکہ تم جانتے ہو۔

ان آیات کریمہ کے اظہار مطالب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ میں کن لوگوں کو خطاب ہے اور ناس سے کون کون لوگ مراد ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے عام طور پر فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ آیا ہے اس سے اہل مکہ مراد ہوتے ہیں اور یہ خطاب خاص اہل مکہ کو ہے اور بس اور ابن کثیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہاں پر خطاب کفار اور منافقین کو ہے۔

اور **حضرت مولانا حکیم الامت رضی اللہ عنہ** نے فرمایا ہے کہ یہاں پر اَلنَّاس سے وہی لوگ مراد ہیں جو کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرۃ:9) (بعض وہ لوگ ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ اور آخری دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں) مراد ہیں اور فرمایا کہ وہ یہودی منافق ہیں جو کہ وہاں پر اور یہاں پر مراد ہیں اور یہ اس لئے کہ دونوں محل پر النَّاس فرمایا ہے اور پھر وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ الخ میں منافقوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد متصل یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ الخ آیا ہے۔

لیکن میرا اپنا خیال کچھ اور ہے جو کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے جہاں پر کہ میں نے ترتیب بیان کی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الخ میں پہلے خداوند کریم نے ان کو بیان فرمایا ہے جن کو ہدایت ہوگی خواہ وہ عرب اور بنی اسماعیل ہوں یا وہ بنی اسرائیل ہوں اور جن کو ہدایت سے فائدہ نہ ہوگا یا ہوگا چونکہ حقیقت میں دو قسم کے تھے ایک کتاب والے اور دوسرے وہ جن کے پاس کوئی کتاب نہ تھی اور ان دونوں کے حالات بھی بالکل جدا جدا تھے مثلاً اہل کتاب تو کتاب میں تحریف کرتے تھے پر جن کے پاس کوئی کتاب ہی نہ تھی وہ کس طرح تحریف کرسکتے تھے اور دلائل بھی ہر ایک کے لئے جدا جدا چاہئے

کیونکہ اہل کتاب کے لئے تو بڑی بھاری اور قوی تر وہی دلیل ہو سکتی تھی جو کہ ان کی کتاب سے اور ان کے مسلّمات سے پیش کی جائے لیکن جو اہل کتاب نہیں ان کے نزدیک تو وہ دلیل کس کام کی ہو سکتی ہے جو کہ اہل کتاب کے مسلّمات سے بنائی گئی ہو یا ان کی مسلّم کتاب سے پیش کی گئی ہو۔ پس ان امور پر نظر کر کے قرآن مجید نے ان لوگوں کو دو حصے کر دیا کہ جن کی دعوت کے لئے قرآن مجید نازل ہوا تھا اور پہلے ان کا بیان شروع کیا جو کہ اہل کتاب نہیں اور ان کے بعد پھر ان کی طرف رخ کیا ہے جو کہ اہل کتاب ہیں تو غیر اہل کتاب کے بیان میں پہلے ان کو بیان کیا کہ جن کو ہدایت ہو گی۔

اور ان کے بعد ان کو ذکر کیا ہے جن کو ہدایت نہ ہو گی اور بتایا کہ وہ بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو ضدی اور عنادی کافر جن کو اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا الخ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور دوم منافق لوگ جن کو وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ضدی کافروں میں تو لَا یُؤۡمِنُوۡنَ فرما کر بتایا کہ لوگ ہدایت سے محروم رہیں گے اور منافقوں میں صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ[1] (البقرۃ:19) فرما کر ان کی محرومی کو ظاہر کیا ہے اس کے بعد پھر یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا الخ کے ساتھ ان کو اخلاص فی العبادت کا حکم دے کر اس کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور ان کے بعد بطور نتیجہ شرک کی نفی بیان کی ہے اس کے بعد اس کتاب کا منجانب اللہ ہونا اعجازی نشانوں کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ جس میں ان کو توحید فی العبادت اور نفی شرک کا ارشاد کیا گیا ہے اس کے بعد پھر اہل کتاب کا ذکر شروع کیا ہے اور ان کے ایمان نہ لانے والے گروہوں کا ذکر کر کے فرمایا اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ الخ (البقرۃ:76) (کیا تم طمع کرتے ہو کہ وہ تمہارے لئے ایمان لے آئیں گے ہر گز یہ طمع نہ کرنا چاہئے) اس کے بعد پھر ان کو دعوت الی الحق کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل ان کی کتابوں سے بتانے کے لئے وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ الخ[2] (البقرۃ:128) فرمایا تو اب اس تحقیق کے مطابق یہ خطاب غیر

[1]۔ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ لوٹیں گے نہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہا تھا اور (اس کے ساتھ) اسمٰعیل بھی۔ (تفسیر صغیر)

اہل کتاب کی طرف ہے خواہ وہ کوئی ہوں اور اس امر کے بہت سے قرائن ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ یہاں پر جو اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ کہ اگر تمہیں اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک ہے تو تم اس کی کسی ایک سورت کی مانند بنا کر لاؤ اور اپنے مددگاروں اور منصفوں کو بھی بلالو پس اگر نہ بنا سکو تو اس کی مخالفت ضرور ہی ترک کر دو اور یاد رکھو کہ تم ہرگز نہ بنا سکو گے۔ تو اس دلیل ان کی مسلمہ کتابوں سے نہ ہونا اور پھر اس کا ایسا ہونا جس کا دارومدار کلام کے حسن وقبح پر ہے اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ اہل کتاب کے مقابل نہیں نیز فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (البقرۃ:23) (نہ بناؤ اللہ کے لئے بہت سے ہمسر) بھی دکھاتا ہے کہ یہ ایسے لوگوں کو خطاب ہے جو کہ اللہ کے لئے بہت سے شریک بناتے ہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے قرائن ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ میں مشرکین عرب کو خطاب ہے۔ عام اس سے کہ وہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں یا ضدی کافروں اور منافقوں سے ہوں جو کہ ہدایت قبول نہ کریں گے اور اگر کسی ایسے فرقہ کو بالخصوص اس کا مخاطب بنایا جاوے جو کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہدایت قبول کرنے والا نہ ہو تو پھر بجز اتمام حجت کے اور کوئی فائدہ نہیں رہتا اور اگر مخاطب عام مشرکین عرب ہوں تو پھر علاوہ اتمام حجت کے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرۃ:27) (بہتوں کو اس کے ساتھ ہدایت کرتا ہے) اس پر صادق آسکتا ہے اور منافقوں کے لئے مِنَ النَّاسِ کا آنا اس امر کے لئے دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہاں پر بھی یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ سے وہی منافق مراد ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بہت ہی جگہ پر آیا ہے اور کبھی اس سے منافق مراد ہوئے ہیں اور کبھی کافر اور مومن مثلاً اِذَا جَآءَ میں آیا ہے۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر:3) (اور تم دیکھو لوگوں کو کہ اللہ کے دین فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں) وہ لوگ مراد ہیں جو کہ اسلام میں داخل ہوئے اور اسی طرح ایک امر کے بعد دوسرے کا آنا بھی اس کو نہیں چاہتا کہ دونوں سے ایک ہی مراد ہے۔

رہا یہ کہ سب عنوانوں میں سے خاص ناس کے عنوان سے یہاں پر کیوں خطاب کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان عرب میں یہ ایک خاص امر ہے کہ جب کوئی حکم کسی کو

دیتے ہیں یا کسی کو کچھ کہتے ہیں تو اس وقت اس شخص کو اس عنوان اور خطاب سے ذکر کرتے ہیں جس کو کہ اس حکم میں خصوصیت کے ساتھ داخل ہوتا ہے یعنی وہ عنوان یا تو اس حکم اور بات کی علّت پر دلالت کرتا ہے یا کم از کم اس حکم کی تعمیل پر اکسانے والا ہوتا ہے اور سلیم الفطرت انسان کو اس کی تعمیل کا شوق دلاتا ہے یا کم از کم اس کو شرم دلا کر تعمیل پر آمادہ کر دیتا ہے مثلاً جب کوئی شخص کسی بچہ کو کوئی کام کہتا ہے تو پہلے سے اس کو بیٹا کر کے پکارتا ہے اور پھر کام کہتا ہے اور اگر کسی ہم عمر کو کام کے لئے بلاتا ہے تو بھائی کہہ کر بلاتا ہے اور اس میں اس کو یہ سمجھانا مد نظر ہوتا ہے کہ تیرا میرے ساتھ وہ تعلق ہے جو کہ بیٹے کا باپ سے یا بھائی کو بھائی سے ہوتا ہے اور عرف اور شرح اور فطرت انسانیہ یہ سب یہی حکم دیتے ہیں کہ بیٹے اور بھائی کو اپنے باپ اور بھائی کے کام آنا چاہئے تو جب مخاطب اس عنوان کو سنتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی فطرت بیدار ہو کر اپنے مقتضی کے مطابق اثر کر کے اس کو کام کے کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے اسی طرح جب انسان اپنے کسی دوست یا نوکر یا رشتہ دار پر ناراض ہو کر اس کو وفاداری اور فرمانبرداری اور حق شناسی کی طرف بلاتا ہے اور ان امور کے متعلق کوئی امر اس کو کہتا ہے تو اس کو کہتا ہے او بے وفا، یا او نافرمان یا او ظالم تو یہ سب عنوان اپنے مامور کے امر میں ایک قسم کا ضرور ہی دخل رکھا کرتے اور ہر ایک ملک اور طبقہ اور عمر کے لوگ کم و بیش اس امر کو جانتے بلکہ اپنے اپنے محاورات میں روز مرہ برتتے ہیں۔

لیکن عربی میں عموماً اور قرآن مجید میں خصوصاً ایسے امور کا لحاظ کیا جاتا ہے مثلاً جہاں پر خداوند کریم کوئی ارشاد فرماتا ہے تو گاہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کے عنوان سے پکارتا ہے تاکہ ان کی فطرت کو مختلف وجوہات سے تعمیل ارشاد پر آمادہ کر دے کیونکہ ایمان تو کہتے ہیں یقین اور تسلیم کو تو جب ایک شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ میں خدا پر اور اس کی کتاب اور رسول پر ایمان لایا ہوں تو بالفاظ دیگر اس نے یہ کہا کہ میں خدا اور رسول اور اس کی کتاب کی سب باتوں پر یقین رکھنے کے علاوہ ان کو تسلیم کرتا ہوں اور دعوے بدوں شہادت کے ثابت نہیں ہوتا بلکہ جب دعوے کے خلاف شہادت ہو تو پھر یقیناً وہ دعویٰ جھوٹا ہوتا ہے اور اس کا مدعی شرمندہ اور ذلیل ہوتا ہے اور سب جہان اس کو کاذب بلکہ

کذّاب یقین کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کے عقائد اور خیالات اور سب اندرونی اور قلبی باتوں کی شہادت اس کے اعمال اور ہاتھ پاؤں سے ملتی ہے مثلاً جب ایک شخص کسی چیز کو مضر یقین کرتا ہے تو اس کی سچی شہادت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے بچتا رہتا ہے اور اگر مفید یقین کرتا ہے تو اس کی شہادت یہ ہے کہ اس کے حصول اور قرب کو چاہتا اور اس کے لئے کوشش کرتا رہتا ہے مثلاً کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں سم الفار کو نہایت اعلیٰ درجہ کی مفید اور مقوی مفرح اور تریاق یقین کرتا ہوں اور جب اس کو کھانے کے لئے دی جاوے تو وہ اسے نہ کھائے تو اس کا اس سے بچنا اس بات کی بڑی قوی دلیل ہے کہ وہ اپنے دعوے میں کاذب ہے۔

پس اسی طرح دعوئے ایمان کی شہادت بھی انسان کے اعمال سے ملتی ہے۔ پس گویا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرما کر خداوند کریم ان کو کہتا ہے۔ اے تعمیل ارشادات کے مدعیو، اب اپنے دعوے کو سچا کر دکھاؤ۔ نیز قرآن مجید میں خداوند کریم نے بتایا ہوا ہے کہ مومن کون ہوتے ہیں چنانچہ اس نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ: 111) (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اس کے عوض کہ ان کے لئے جنت ہے) تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مومن ہونے کا دعویٰ کرنا گویا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ میں وہ شخص ہوں کہ جس نے اپنا مال و جان خدا کو دیدیا ہوا ہے اور میرا اس میں کچھ حق نہیں اور اب خداوند کریم جہاں ان کو لگانا اور استعمال کرنا چاہے میں اس کے خلاف کا مجاز نہیں تو جب مومن کہلانا یہ اقرار کرنا ہے تو پھر کہاں گنجائش رہ جاتی ہے کہ ایک شخص مومن ہونے کا دعوے کرے اور پھر تعمیل ارشاد میں مضائقہ کرے اور مال و جان کو اللہ کی راہ میں لگانے سے دریغ کرے۔

پھر قرآن مجید میں خداوند کریم نے یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ:166) (اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ مضبوط محبت رکھتے ہیں) پس ایمان کا مدعی گویا اس بات کا مدعی ہے کہ سب سے بڑھ کر میں اللہ سے

محبت رکھتا ہوں اور ظاہر ہے کہ ایک عاشق اپنے محبوب کی کب اور کس طرح نافرمانی یا تعمیل ارشاد میں کاہلی اور تساہل کر سکتا ہے پس جس طرح یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا عنوان بے وجہ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ بڑے عظیم الشان فوائد کے لئے اختیار کیا گیا ہے اسی طرح یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کا عنوان بھی بے وجہ نہیں بلکہ بہت بھاری فائدہ کے لئے اختیار کیا ہے اور اس فائدہ کا سمجھنا لفظ انسان کی اس تشریح پر موقوف ہے جو کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے لفظ انسان کی اصلیت بتانے کے لئے بہت کچھ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ انسان نسیان سے ہے اور بعضوں نے کچھ اور اور کہا ہے لیکن حق وہی ہے جو کہ حضرت امام ہمام علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ انسان اُنس سے بنا ہوا ہے اور یہ اصل میں اُنسان تھا جو کہ اُنس کا تثنیہ ہے اور اس کے معنے ہیں دو اُنس یعنی دو محبتیں یا دو محبتوں کا مجموعہ یا دو محبتوں والا اور وہ دو محبتیں یہ ہیں ایک تو بندہ کی اللہ کے ساتھ محبت ہے دوم اللہ کی بندہ کے ساتھ ہے۔

پس اس عنوان میں خداوند کریم نے ان کو یہ سمجھایا ہے کہ اے دو محبتوں والو تمہیں تو اپنے محبوب کی قدر کرنی چاہئے جیسے کہ سب محب اپنے اپنے محبوب کی قدر کیا کرتے ہیں دیکھو ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جو لوگ ان کے محبوبوں سے برابر بلکہ افضل ہوتے ہیں ان کو بھی اپنے محبوبوں کے برابر نہیں خیال کرتے اور تمہارا محبوب باوجودیکہ سب صفات وافعال میں یکتا ہے اور کوئی بھی اس کا ہم پلہ نہیں اور ہرگز نہیں لیکن پھر بھی تم ان دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہو جو کہ اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے ہو کہ اس سے ہمارے لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ[1] (الشوریٰ:12) اور سب نقصوں سے پاک اور سب صفات کاملہ کے جامع وحدہ لاشریک محبوب کی بے قدری ہوتی ہے کیونکہ اس بے مثل محبوب کا فی الحقیقت تو کوئی ہمسر نہیں ہے بلکہ سب اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں تو جب تم ان کو اس کے ساتھ مساوی قرار دیتے ہو تو دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو جو کم درجہ ہیں ان کو بڑا بنا کر خدا کے مساوی بنایا جاوے یہ تو ہو سکتا نہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے امور کی

[1]۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ (تفسیر صغیر)

نسبت جب تم سے دریافت کیا جاتا ہے کہ کیا یہ اللہ کے سوا کسی دوسرے میں بھی ہیں تو تم صاف کہہ دیتے ہو کہ نہیں یہ خاص اللہ ہی میں ہیں اور یا یہ کہ اللہ کو اپنے مرتبہ سے کم قرار دے کر ان ادنیٰ اشیاء کے برابر قرار دیا جاوے تو اس میں تمہارے محبوب وحدہٗ لاشریک اور لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ کی بے قدری لازم آتی ہے۔

پس جس طرح تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم انسان ہیں یعنی دو محبتوں والے ہیں اگر یہ سچ ہے تو پھر تم کو میری ہی عبادت کرنی چاہئے اور میرا کسی کو ہمسر نہ بنانا چاہئے جیسا کہ میں نے اپنی محبت کے باعث تم کو ایسا اشرف المخلوقات بنایا ہے کہ کسی دوسرے کو تمہارا ہمسر نہیں بنایا۔ پس اس عنوان کے اختیار کرنے میں یہ سِر تھا جو کہ اوپر بیان ہوا ہے اور یہ محض شاعرانہ بات نہیں بلکہ ایک حقیقت واقعیہ ہے اور اس میں ذرہ بھی شک نہیں کہ قرآن مجید میں یہ بھی موجود ہے کہ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرۃ:166) (اور ایمان والے خداوند کریم سے سخت ترین محبت رکھتے ہیں) اور پھر شریک اور ہمسر بنانے کے بارہ میں صاف طور پر یہ بھی آیا ہے کہ اس میں انہوں نے اللہ کی بے قدری کی ہے۔ چنانچہ فرمایا قُلۡ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ تَاۡمُرُوۡٓنِّیۡۤ اَعۡبُدُ اَیُّہَا الۡجٰہِلُوۡنَ۔ وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ..... وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ (الزمر:65 تا 68) (کہہ دے کیا پس اللہ کے سوا اوروں کا مجھے کہتے ہو اے جاہلو کہ میں ان کی عبادت کروں حالانکہ تیرے اور تجھ سے پہلوں کی طرف وحی کی گئی ہے کہ اگر تو شرک کرے گا تو تمہارے عمل باطل ہو جائیں گے اور تم خسارہ پانے والوں سے ہو جاؤ گے اور انہوں نے اللہ کی پوری پوری قدر نہیں کی۔)

یعنی جب یہ شرک کے مجوز ہوئے تو پھر انہوں نے اللہ کی سخت بے قدری کی کہ اس کو اپنی شان ارفع سے اتار کر نہایت ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے برابر کر دیا ہے جس سے اس کی سخت بے قدری کی گئی ہے تو جب یہ دونوں امر قرآن مجید سے ثابت ہیں کہ خدا کو ماننے والے اس سے سخت ترین محبت رکھا کرتے ہیں اور یہ کہ شرک میں خدائے ذوالجلال اور لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ اور وحدہ لاشریک کی سخت بے قدری لازم آتی ہے تو پھر جو کچھ عنوان

مذکور کے اختیار کرنے کی وجہ میں بیان کیا ہے بالکل صحیح اور درست ہے اور امر واقعی ہے اور شاعرانہ گپ اور دل خوش کن لطیفہ نہیں ہے۔

اُعْبُدُوْا کی تفسیر:

اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اُعْبُدُوْا کی وَحِّدُوْا کے ساتھ تعبیر کرکے یہ بتایا ہے کہ چونکہ مشرک لوگ اللہ کریم کی عبادت تو کرتے تھے لیکن وہ خالص اللہ کے لئے نہ کرتے تھے بلکہ اور بھی بہت سے شریک بنائے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے مناسب حال یہی حکم تھا کہ عبادت خالص اللہ کے لئے کرو نہ یہ کہ عبادت کرو کیونکہ حکم تو وہ کیا جاتا ہے جو کہ پہلے سے نہ کرتے ہوں نہ وہ جو کہ پہلے بھی کرتے ہوں۔ پس چونکہ مطلق عبادت تو وہ کرتے تھے لہٰذا مطلق عبادت کا حکم تو ہو نہیں سکتا ہاں وہ خالص اللہ کے لئے عبادت نہ کرتے تھے لہٰذا ضروری تھا کہ ان کو یہ حکم کیا جاتا کہ خالص اللہ کی عبادت کرو اور نیز عبادت کے حکم کے بعد صاف آیا ہے کہ لہٰذا تم اللہ کے لئے کوئی ہمسر نہ بناؤ اور یہ صاف بتاتا ہے کہ یہاں مطلق عبادت کا حکم کرنا مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم اللہ ہی کے لئے خاص عبادت کرو اور کسی دوسرے کو اس میں اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ تو چونکہ یہ دونوں امر اس بات کو چاہتے ہیں کہ یہاں پر یہ حکم ہو کہ تم خالص اللہ ہی کے لئے عبادت کرو لہٰذا اُعْبُدُوْا کے یہ معنے کرنے چاہئے کہ تم خالص اللہ ہی کی عبادت کرو نہ یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو کیونکہ یہ معنے کفار کی شان کے اور نیز اس مقام کے بالکل خلاف ہیں۔

اور پھر میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو معنے یہاں پر مطلوب ہیں ان کے مطابق یہ عبارت نہ چاہئے تھی بلکہ یہ عبارت ان معنوں کے مطابق ہے جو کہ یہاں پر مقصود نہیں تو پھر یہ عبارت یہاں پر کیوں اختیار کی گئی تو میں نے اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ یہ عبارت اس لئے اختیار کی گئی ہے تاکہ علاوہ ان دلائل کے جو کہ اُعْبُدُوْا کے بعد بیان کئے گئے ہیں۔ نفس اُعْبُدُوْا میں بھی خالص اللہ کے لئے عبادت کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا جائے اور وہ اس طور پر ہے کہ اُعْبُدُوْا کے حکم سے جو کہ قطع نظر کفار کے حال کے اور بدوں لحاظ اس

مقام کے مطلق عبادت پر دلالت کرتا ہے نہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرنے پر اور ظاہر ہے کہ مطلق عبادت کا حکم تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ کفار وہ بھی نہ کرتے ہوں حالانکہ وہ اگرچہ خالصاً للہ تو نہ کرتے تھے پر مطلق عبادت تو کرتے تھے پس اُعْبُدُوْا کہنے نے بتایا کہ جو عبادت کفار اب کر رہے ہیں وہ اگرچہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں پر فی الحقیقت وہ اپنے رب کی بالکل عبادت نہیں کرتے کیونکہ خداوند کریم نے صاف بتادیا ہوا ہے کہ میں سب شریکوں سے زیادہ غنی ہوں اور غنی شخص کا قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی غریب آدمی اس کے ساتھ کسی تجارت وغیرہ میں شریک ہوا کرتا ہے تو وہ غنی شخص اپنا حصہ بھی اپنے غریب اور مسکین شریک کو دے دیتا ہے لہٰذا میں بھی اپنا حصہ اپنے شریک کو دے دیتا ہوں۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ جو عبادت اللہ کے لئے شراکت کے طور پر کی جاتی ہے وہ اللہ کے لئے بالکل نہیں ہوتی۔ پس خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ اُعْبُدُوْا فرما کر بتادیا کہ جو مشرکانہ عبادت تم اب میری کر رہے ہو وہ بالکل میری عبادت نہیں لہٰذا تم کو چاہئے کہ تم وہ عبادت کرو جو کہ میرے لئے ہو۔

میں نے ابھی بتایا ہے کہ عربی زبان میں عموماً اور قرآن مجید میں خصوصاً یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کے لئے بہت سے صفات اور اسماء ہوں اور کسی مقام میں ان سے خاص کوئی ایک صفت یا اسم اس چیز کے لئے عنوان بتایا جائے تو ضرور اس مقام میں اس خاص عنوان کا اختیار کرنا محض اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ جو بات اس مقام پر ہوتی ہے اس میں اس عنوان یعنی صفت اور اسم کو دخل ہوتا ہے جیسا کہ ابھی میں نے بہت سی مثالوں میں اور خصوصاً یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کے عنوان میں مفصل طور پر دکھایا ہے۔

یہاں پر بھی اللہ کریم کے بہت سے اسماء اور صفات سے خاص لفظ رب کو محض اسی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ اُعْبُدُوْا کے حکم میں اس کو دخل ہے یعنی اللہ کی عبادت کرنی اسی وجہ سے ضروری اور لازم ہے کہ وہ رب ہے اور یہ بالکل صحیح ہے اس لئے کہ میں نے بار بار بیان کیا ہے کہ عبادت کہتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تعظیم کر اور تعظیم دو ہی وجہ سے کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ سچی اور حقیقی تعظیم جو کہ دلی ارادہ اور صمیم قلب سے پیدا ہوتی ہے اس کے

مقتضی اور باعث دو ہی امر ہیں اوّل حسن جو کہ عبارت ہے ایسی خوبی اور کمال سے جو کہ خوبی اور کمال والی چیز ہی تک محدود ہوتی ہے اور اس سے تجاوز کر کے اوروں تک نہیں پہنچتی جیسے حسن صورت وغیرہ۔ دوم احسان اور یہ اس خوبی اور کمال کا نام ہے جو کہ خوبی والے سے تجاوز کر کے اور کی طرف متعدی ہوتی ہے جیسی سخاوت وغیرہ اور خداوند کریم کے اسم ذات (یعنی اللہ) کے علاوہ سواء رب کے اور کوئی ایسا اسم نہیں جو کہ سب حسنوں اور احسانوں کے لئے جامع ہو یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں عبادت اور تعظیم کا حکم یا ذکر ہوتا ہے تو اسم ذات یا لفظ رب کی طرف اس کو نسبت کیا جاتا ہے۔

مثلاً ابتداء سے یہاں تک تین جگہ تعریف و تعظیم کا ذکر آیا ہے۔ اوّل تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ[1] (الفاتحہ:02) میں کہ یہاں پر تعریف و ثناء کا ذکر ہے تو پہلے اللہ کی طرف نسبت کیا ہے جو کہ مجمل طور پر سب حسنوں اور احسانوں پر دال ہے پھر اس کے بعد رب کی طرف نسبت کیا ہے جو کہ سب حسنوں اور احسانوں پر اگرچہ پوری پوری تفصیل سے دلالت نہیں کرتا پر اسم ذات کی نسبت سب حسنوں اور احسانوں پر تفصیلاً دلالت کرتا ہے بعد ازاں پھر اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں عبادت کا ذکر آیا ہے اور یہاں پر اگرچہ بظاہر اِيَّاكَ کی طرف منسوب ہے جو کہ خطاب کی ضمیر ہے اور اسماء الٰہیہ سے نہیں ہے لیکن چونکہ خداوند کریم محسوس چیز تو ہے نہیں کہ اس کا جسم متکلم کے آگے حاضر ہو بلکہ اس کا حضور صفات کے ساتھ ہوتا ہے اور یہاں پر جن صفات کے ساتھ اس کا حضور ہوا ہے۔ وہ وہی ہو سکتی ہیں جو کہ اس سے پہلے مذکور ہیں اور وہ یہی اللہ اور رب ہیں یا بعد کے صفات جو کہ اللہ اور رب کی تشریح اور توضیح کے لئے ہیں۔ پس یہاں پر بھی فی الحقیقت اللہ اور رب ہی کی طرف عبادت منسوب ہے نہ کسی اور چیز کی طرف اور سوم یہاں پر عبادت کا ذکر ہوا ہے تو یہاں پر بھی کھلے طور رپر رب کی طرف منسوب ہے۔ پس خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہاں پر اُعْبُدُوْا کے بعد رب کو سب اسماء الٰہیہ میں سے بالخصوص اس لئے لایا گیا ہے تا کہ ارشاد عبادت کی تعمیل پر آمادہ کرنے کا ویسا ہی فائدہ دے جیسا کہ اَلنَّاس نے فائدہ دیا ہے اور اس ارشاد کی تعمیل کی ضرورت

[1]۔ ہر (قسم کی) تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے (جو) تمام جہانوں کا رب (ہے)۔ (تفسیر صغیر)

مخاطبین کے ذہن میں ڈال دے کیونکہ عبادت دوہی وجہ سے لازم ہوتی ہے اور رب ان دونوں پر حاوی اور جامع ہے۔

اب رہا یہ کہ رب کے بعد اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وغیرہ کو کیوں ایزاد کیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ ہے تو رب کی تفصیل اور تفصیل شئے میں کبھی ایسے اشیاء ذکر کئے جاتے ہیں جو کہ اس چیز کی حقیقت میں داخل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے زائد صفات ہوتی ہیں مثلاً کوئی یہ کہے کہ آج وہ زید آیا ہے جس نے عمرو کو قرضہ دیا تھا تو ظاہر ہے کہ قرضہ دینا اور خصوصاً عمرو کو دینا اس کے مفہوم سے ایک زائد اور بیرونی امر ہے اور بعض اوقات داخل ہوتی ہیں اور یہاں پر جو امور ذکر کئے گئے ہیں وہ رب کے مفہوم میں داخل ہیں یعنی یہ امور رب کی زائد صفات نہیں بلکہ اس کے مفہوم میں داخل اور اس کے اجزاء ہیں اور ظاہر ہے کہ بیرونی امور کا ایزاد کرنا تو کسی زائد امر کا مفید ہو سکتا ہے لیکن جو امور داخل ہیں ان کے ایزاد سے بجز اجمال کی تفصیل کے کوئی زائد امر حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہی فائدہ جو کہ پہلے لفظ سے حاصل ہوتا ہے اس کی تفصیل سے بھی وہی حاصل ہوتا ہے ہاں اس قدر فرق ضرور ہوتا ہے کہ اصل لفظ سے مجمل اور پوشیدہ طور پر حاصل ہوتا تھا اور اسی وجہ سے بہتوں پر مخفی رہ سکتا تھا اور تفصیل سے مفصل طور پر اور وضاحت کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اور عام طور پر لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لہٰذا یہاں پر بھی جو فائدہ لفظ رب کے ذکر کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے وہی اس کی تفصیل سے بھی حاصل ہوتا ہے لیکن اوّل سے مجمل طور پر اور دوم سے مفصل طور پر اور جو کچھ رب کی تفصیل میں مذکور ہوا ہے وہ یہ ہے اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (البقرۃ:22) الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ اور اس کے بعد جو فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:23) یہ اس کا نتیجہ ہے یعنی جب تمہارے رب میں یہ یہ کمال اور احسان ہیں جو کہ کسی دوسرے میں ہرگز نہیں تو پھر تمہیں چاہئے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو ہمسر نہ بناؤ اور چونکہ نتیجہ بعد میں آیا کرتا ہے لہٰذا فَلَا تَجْعَلُوْا الخ (تو اپنے محل پر ہے لیکن خداوند کریم کا یہ ارشاد کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کا ثمرہ اور فائدہ ہے اور اس کا بھی یہی حق ہے کہ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کے بعد آئے پر اس

میں ایک اور مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو یا تو رَبَّکُمْ کے بعد متصل لایا جاتا اور یا رَبَّکُمْ کی ساری تفصیل کے ختم ہونے بعد لایا جاتا لیکن یہاں پر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ رَبَّکُمْ کی تفصیل کے درمیان آیا جو کہ اس کا ہر گز موقع نہیں ہے اور موقع مناسب پر یہ تب ہی ہوتا کہ رَبَّکُمْ اور الَّذِیْ خَلَقَکُمْ کے درمیان آتا اور یا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کے بعد آتا لیکن یہ ان دونوں میں سے کسی پر بھی نہیں آیا پس واضح ہو کہ جو لفظ یا فقرہ جب اپنے محل سے ادھر ادھر رکھا جاتا ہے۔ ایک فصیح و بلیغ متکلم بے وجہ اس کو وہاں پر نہیں رکھا کرتا بلکہ ضرور اس کے لئے کوئی معقول وجہ ہوتی ہے اور پھر حکیم مطلق خدا کے ایسے فعل کے لئے تو ضرور ہی وجہ ہوتی ہے اور یہاں پر بھی اس تبدیل محل کے لئے خاص اور معقول وجہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کا خطاب مشرکین عرب کے لئے ہے اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ مشرکین عرب قیامت سے اور خصوصاً دوبارہ زندہ ہونے سے منکر تھے بلکہ قیامت سے اسی وجہ سے انکار کرتے تھے کہ ان کی عقلیں اس امر کو تسلیم نہ کر سکتی تھیں کہ مر کر جب ہمارے اجسام گل سڑ جاویں گے اور ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو کر مٹی ہو جاویں گی تو پھر ہم کس طرح اور کیونکر دوبارہ پیدا اور زندہ کئے جاویں گے جیسا کہ خداوند کریم فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ۔ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰس:78 تا80) (کیا یہ خیال کرتا ہے اور دیکھتا نہیں انسان کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا یا ہے پھر معاً وہ کھلا کھلا جھگڑنے والا ہے اور ہمارے لئے مثال بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھولتا ہے کہتا ہے کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوں گی کہو ان کو وہ خدا زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔)

اور پھر اس کے بعد فرماتا ہے: اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ۔ (یٰس:82) (کیا یہ کہتا ہے اور نہیں (جانتا کہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان کی مانند کے پیدا کرنے پر قادر ہے ہاں (ضرور قادر ہے) اور وہ بہت پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔)

اور اس سے بھی بڑھ کر اور اور آیتوں میں ان کے اس عقیدہ کی تفصیل اور تردید

موجود ہے اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اُخروی عذاب تب ہی ہو سکتا یا متصور ہو سکتا ہے کہ پہلے اُخروی زندگی ہو ورنہ تو پھر اُخروی عذاب ہو سکتا ہی نہیں اور اُخروی زندگی کو کفار محال جانتے ہیں اور اس کی تردید اور اس کے امکان کا اثبات عموماً خداوند کریم نے پہلی زندگی اور پہلی پیدائش کے ساتھ لی ہے چنانچہ آیات مذکورہ صدر میں بھی ایسا ہی ہے تو چونکہ عذاب سے بچنے کی کوشش کوئی تب ہی کرتا ہے کہ پہلے اس کے وقوع کا امکان اور اندیشہ ہو اور اس کا دارومدار اُخروی زندگی کے امکان پر ہے اور اس کا امکان پہلی زندگی اور پہلی پیدائش پر ہے لہٰذا خداوند کریم نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کو خَلَقَكُمْ الخ کے بعد متصل رکھا ہے تاکہ اس پہلے خلق سے اُخروی خلق کا امکان یقین کر کے عذاب اخروی کے امکان کا یقین کر لیں اور جب اس کے امکان کا یقین کر لیں گے تو ضرور اس سے بچنے کی فکر کریں گے اور جب ایک طرف وہ اس سے بچنے کی فکر میں ہوں گے۔

اور دوسرے طرف قرآن مجید نے اس سے بچنے کی ایک راہ بتائی (اور وہ ہے (اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ) تو پھر امید ہو سکے گی کہ شاید وہ اس راہ کو اختیار کر لیں اور اگر پہلی خلق اور زندگی کو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ سے پہلے ذکر نہ کیا جاتا تو اخروی زندگی کا امکان ثابت نہ ہوتا اور اخروی زندگی کا امکان ثابت نہ ہوتا تو عذاب اخروی کا امکان بھی ثابت نہ ہوتا اور وہ اس کو محال ہی یقین کرتے جیسا کہ ان کا پہلے سے یہ خیال تھا اور جب تک وہ عذاب اخروی کو ناممکن اور محال یقین کرتے رہتے۔ تب تک وہ کبھی بھی عذاب الٰہی سے بچنے کی کوشش نہ کرتے اور نہ ان میں اس سے بچنے کی خواہش پیدا ہوتی اور جب اس سے بچنے کی خواہش بھی نہ ہوتی تو اس صورت میں اگر خداوند کریم یا اس کا کوئی بندہ عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل اور راہ بتاتا تو وہ اس کی طرف کبھی بھی توجہ نہ کرتے اور اس صورت میں بلحاظ دیگر عذاب سے بچنے کی راہ بتانی بھی لغو اور بے فائدہ ہوتی کیونکہ نہ وہ اس عذاب کے امکان کے قائل ہیں اور نہ اس کا خطرہ اور اندیشہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تاکہ اس سے بچنے کی کوشش کریں پس جب ان کو نہ کچھ خطرہ ہے اور نہ اندیشہ تو پھر وہ اس عذاب سے بچنے کی طرف کیونکر متوجہ ہوں یا کس طرح کسی کے کہنے سے اس سے بچنے کے لئے کوئی طریق اختیار کریں۔

پس اس لئے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کو اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ کے بعد لایا گیا ہے۔ تاکہ اس سے اُخروی زندگی کا ثبوت مل کر وہ عذاب اخروی کے امکان کے قائل ہو کر اس سے بچنے کا خیال ان میں پیدا ہو جائے اور جب ان کو اس سے بچنے کا ایک طریق بتایا جائے تو وہ اس کے لینے کے لئے تیار ہو سکیں۔ پس یہ وجہ ہے کہ جس کے لئے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کو اس موقع پر رکھا ہے دوم اس وجہ سے اس موقع پر اس کو رکھا گیا ہے کہ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا الخ رَبَّكُمْ کی تفسیر ہونے کے علاوہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے ساتھ بھی مل سکے تاکہ اس کے ساتھ ملنے سے یہ معنے بن سکیں تاکہ تم اس خدا کے غضب اور عذاب سے بچو جس نے اس زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا ہے الخ تاکہ ایک ہی عبادت سے دو معنے بر آمد ہو سکیں اور میں نے پہلے ایک نمبر میں اس بات کو بہت مفصل بیان کیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے چونکہ ضروری تھا کہ باوجود مختصر ہونے کے جامع اور مدلل ہو اور ایسا ہونا اس بات کو چاہتا تھا کہ اس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں اور یہ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ ایک تو الفاظ جامع اختیار کئے جاویں اور دوم یہ کہ بجائے جزئیات کے کلیات کو اختیار کیا جاوے اور سوم یہ کہ ایسے الفاظ اور ایسے فقرات وجملات لائے جاویں جو کہ ذوالمعانی اور کم از کم ذو معنیین ہوں یعنی ان کے بہت معانی ہو سکتے ہوں یا کم از کم دو معنے ہو سکتے ہوں تاکہ ایک معنوں کے لحاظ سے ایک مقصد حاصل ہو اور دوسرے معنوں کے اعتبار سے دوسرا اور تیسرے کے خیال سے تیسرا حاصل ہو اور یہی وجہ ہے کہ صحیح حدیثوں میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ہر ایک آیت کے لئے ایک ظہر ہے اور ایک بطن ہے اور ہر ایک بطن کے لئے سات بطن ہیں۔

(المعجم الکبیر للطبرانی جلد10 صفحہ106 باب من روی عن ابن مسعود انہ لم یکن... حدیث10107 داراحیاء التراث2002ء)

تو یہاں پر اسی کے مطابق کیا گیا ہے کیونکہ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا الخ ایسا کلام ہے اور ایسے محل پر واقع ہے کہ رَبَّكُمْ کی تفسیر کا جزو بھی بن سکتا ہے اور لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے ساتھ بھی متعلق ہو سکتا ہے تو اگر تفسیر کی جزو ہو اتب تو یہ معنے ہوں گے اے لوگو تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو جو تم سے پہلے ہوئے ہیں اور جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا ہے الخ اور اگر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے ساتھ متعلق ہو تو پھر معنے

ہوں گے شاید (یا تاکہ) تم بچو اس سے (یعنی اس کے غضب اور عذاب سے) جس نے اس زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا ہے الخ اور اس کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ اگر یہ خالص تفسیر رب کی جزوی ہوتی تب یا تو ایک اَلَّذِیْ ہوتا جو کہ خَلَقَکُمْ سے پہلے ہے اور دوسرا (جو کہ جَعَلَ کے پہلے ہے) نہ لایا جاتا اور اگر لایا جاتا تو پھر اس پر وَ لائی جاتی اور بجائے اَلَّذِیْ جَعَلَ کے وَالَّذِیْ جَعَلَ ہوتا۔ پس اَلَّذِیْ کا لانا اور وَاؤ کا نہ لانا یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ جس طرح اَلَّذِیْ جَعَلَ تفسیر رب کی جزو ہے اسی طرح اس میں لَعَلَّکُمْ کے ساتھ متعلق ہونے کا بھی احتمال رکھا گیا ہے تاکہ ایک عبارت سے دو مقصد بر آمد ہو جاویں۔

رہی یہ بات کہ زمین کو فرش بنانے والے الخ سے بچنے کا ذکر کیا گیا اور پیدا کرنے والے کے غضب سے بچنا نہ کہا گیا یعنی لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، اَلَّذِیْ جَعَلَ کے پہلے متصل لا کر یہ بتایا کہ شاید تم زمین کو فرش بنانے والے کے غضب وعذاب سے بچو اور اس کو اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ سے پہلے لا کر یہ نہ بتایا کہ تم اپنے اور اپنے آباء واجداد کے پیدا کرنے والے کے غضب سے بچو۔

تو اس کا باعث وہی ہے جو میں نے بار بار ذکر کیا ہے کہ عربی زبان میں کسی چیز کے بیان کے لئے جو عنوان اختیار کیا جاتا ہے اس کو ضرور اس امر میں کچھ دخل ہوتا ہے تو یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کیونکہ پیدا کرنے والا اور زمین کو فرش بنانے والا حقیقت میں تو ایک ہی وحدہ لاشریک ہے کوئی جدا جدا دو شخص نہیں ہیں لیکن اس کے غضب اور عذاب سے بچنے میں اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ کے عنوان کو یعنی خالق ہونے کو نہ دخل ہے اور نہ یہ کہ عنوان اس کے مناسب ہے۔ بخلاف اَلَّذِیْ جَعَلَ الخ کے عنوان کے یعنی زمین کو فرش بنانے کے عنوان کو۔ اس کو اس میں دخل بھی ہے اور یہ اس کے ساتھ مناسبت بھی رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ سارے قرآن مجید میں یہ نہیں آیا کہ اپنے خالق کے عذاب سے ڈرو یا بچو یا میں ڈرتا ہوں تا تم ڈرتے ہو لیکن اَلرَّحْمٰن کے عذاب سے ڈرنے کا ذکر بار بار آیا ہے جیسا کہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں قرآن مجید نے ذکر کیا ہے کہ یٰٓاَبَتِ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَکُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا۔ (مریم:46)

(اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے الرَّحْمٰنِ کی طرف سے کوئی بڑا عذاب نہ آپکڑے اور پھر تو شیطان کا دوست ہو جاوے گا) اور زمین کو فرش بنانے والا اور آسمان کو چھت ٹھہرانے والا اور بادلوں سے پانی برسانے والا اور پھلوں کو پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا یہ سب اَلرَّحْمٰنِ کی تفسیر ہے اور اَلرَّحْمٰنِ ان سب کا اجمال اور مجموعہ ہے گویا اَلَّذِیْ جَعَلَ کیا کہا ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ کہا ہے کیونکہ اَلرَّحْمٰنِ کے معنے یہ ہیں کہ بن مانگے اور سواء کسی خدمت وغیرہ کے معاوضہ کے دینے والا ہے اور اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ جو کچھ دینے کا ذکر کیا ہے وہ سب اشیاء بن مانگے اور سواء کسی معاوضہ کے دی گئی ہیں لہٰذا اَلَّذِیْ جَعَلَ الخ اور اَلرَّحْمٰنِ دونوں ایک ہی ہیں یا یوں کہو کہ پہلا دوسرے کی تفسیر اور تشریح ہے۔ اور عذاب سے ڈرنے اور بچنے کے ساتھ اَلرَّحْمٰنِ کے عنوان کو یہ تعلق ہے کہ رحمٰن ہی تو انسان کو سب آسائش کے اسباب خود بخود دیتا ہے۔

پس جب وہ بندہ پر ناراض ہوا اور اس کی آسائش کے ہزارہا اسباب میں سے کسی ایک کو بند کر دیا تو انسان پر آفت آجاتی ہے مثلاً منجملہ اسباب آسائش کے پھل اور غلہ وغیرہ کھانے کی اشیاء ہیں جو کہ رحمٰن مفت میں دیتا ہے تو اگر کسی شخص یا قوم سے ان کو روک دے تو سخت مصیبت اس پر آجاتی ہے بخلاف خالق کے کہ اس میں یہ بات متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ خالق کے وصف کے نیچے بجز پیدا کرنے کے اور کوئی امر نہیں اور اس کے نہ ہونے سے چیز معدوم ہوتی ہے اور معدوم کا معذب ہونا متصور نہیں ہو سکتا پس خالق کے وصف کے نیچے جبکہ عذاب متصور ہو سکتا ہی نہیں تو پھر اس سے بچنے یا ڈرنے کا ذکر ہی کیا ہے اور رحمٰن کے نیچے جب متصور بلکہ عموماً واقع ہوتا ہے لہٰذا رحمٰن کے غضب اور عذاب سے ڈرنے اور بچنے کا بیان کرنا درست اور صحیح ہے اور دوسری مناسبت رحمٰن کے نام کو اس مقام سے یہ ہے کہ رحمٰن کو ذکر کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ رحمٰن تو وہ مہربان خدا ہے جو کہ بن مانگے اور بے معاوضہ دینے والا ہے۔

پس اس سے متصور ہو سکتا ہی نہیں کہ ایک بدخو کینہ ور مشتعل انسان کی مانند بیوجہ طیش میں آکر کسی بندے کو دکھ دے بلکہ اس کا غضب میں آنا اور سزا دینا اور عذاب نازل

کرنا ہی صاف پتہ دیتا ہے کہ اس بندے نے کوئی نہایت شدید جرم کیا ہے کہ جس کے باعث الرَّحْمٰنِ خدا بجائے رحم کے اس کو عذاب دیتا ہے ورنہ الرَّحْمٰنِ کو عذاب اور پھر عذاب شدید سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے اور خالق میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی پس یہ دو وجہ ہیں جن کے باعث لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِیْ جَعَلَ کو ملایا ہے جو کہ الرَّحْمٰنِ کی تفصیل ہے اور الَّذِیْ خَلَقَكُمْ کو نہیں ملایا جس کا اختصار اور خلاصہ اَلْخَالِقُ ہے۔

اور قرآن مجید میں بہت سی چیزوں کی نسبت اتقاء یعنی بچنے کا ذکر یا حکم آیا ہے گاہے تو خداوند کریم کی نسبت آیا ہے مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور بچو اللہ سے) اور آگ کی نسبت بھی آیا ہے۔ جیسا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (البقرۃ:25) (پس بچو اس آگ سے کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) اور کبھی عذاب کی نسبت آیا ہے جیسا آیا ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرۃ:202) (اور بچا ہم کو آگ کے عذاب سے) اور گاہے آخری دن کی نسبت آیا ہے جیسا وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ (البقرۃ:49) (اور بچو اس دن سے کہ کوئی نفس کسی نفس سے اس میں کفایت نہ کرے گا) اور کبھی فتنہ کی طرف منسوب ہو کر آیا ہے۔ مثلاً آیا ہے وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال:26) (اور بچو اس فتنہ سے جو کہ خصوصاً ظالموں ہی کو نہ پہنچے گا) اور گاہے بدیوں کی نسبت آیا ہے جیسا وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ (المومن:10) (اور ان کو بچا بدیوں سے) اور خاص خاص بدیوں کی نسبت بھی آیا ہے مثل بخل وغیرہ کے جیسا بخل کی نسبت فرمایا ہے۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر:10) (اور جو بچایا جائے اپنے نفس کے بخل سے پس وہی لوگ نقص سے بچنے والے اور مظفر و منصور ہونے والے ہیں) وغیرہ ذالک اور لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں میں نے بتادیا ہے کہ بظاہر یہاں پر کوئی چیز ذکر نہیں کی گئی کہ شاید تم فلاں چیز سے بچو ہاں اس کے بعد اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ الخ مذکور ہے جو کہ بظاہر رَبَّكُمْ کی تفصیل اور تفسیر کی جزو ہے ہاں اس پر وَ کے نہ ہونے سے اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے بچنا ہو اور یہ معنے ہوں شاید کہ تم اس خدا سے (یعنی اس کے غضب اور عذاب سے) بچو جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا ہے۔ الخ) پس اگر اس کو اعتبار کیا

جاوے تو بہتر ورنہ تو پھر یہاں پر چونکہ کوئی اور چیز مذکور نہیں ہے لہٰذا اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ جس طرح عبارت میں تَتَّقُوْنَ کو عام رکھا گیا ہے اسی طرح اس کے معنوں کو بھی عام رکھا جائے اور یہ نہ کہا جائے تا کہ تم فلاں خاص چیز سے بچو اور حضرت مولانا حکیم الامت نے بھی اسی امر کو پسند کیا ہے کہ تَتَّقُوْنَ کو عام رکھا جاوے اور یہ نہ کہا جاوے کہ فلاں خاص چیز سے تم بچو۔

لیکن بعض نے جب دیکھا کہ یہاں پر شرک سے بچانا منظور ہے جیسا کہ آگے فرمایا ہے کہ لہٰذا تم اللہ کے لئے ہمسر مت بناؤ تو انہوں نے کہا ہے کہ اگرچہ یہاں پر تَتَّقُوْنَ کو عام ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مقام شرک سے بچنے کا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ شرک کی نسبت کہا گیا ہے لہٰذا انہوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ شاید (یا تا کہ) تم شرک سے بچو اور حضرت عبد اللہ بن عباس نے بھی یہی فرمایا ہے اور ضحاک نے جب دیکھا کہ شرک سے بچنے کا بھی اسی لئے حکم ہے تا کہ انسان آگ سے بچیں اور اللہ کے غضب کا منتہیٰ بھی آگ ہی ہے تو اس نے اس کے یہ معنے کئے ہیں تا کہ تم آگ سے بچو اور میرے نزدیک بہتر یہی ہے کہ یا اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا سے اس کو مقیّد کیا جائے جیسا کہ ظاہر عبارت سے پایا جاتا ہے اور یا اس کو مطلق رکھا جائے ہاں احتمال ان سب کا ہے جن سے بچنے کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔

لَعَلَّ کے معنے بیان کرتے ہوئے میں نے بتایا ہے کہ اصل معنے اس کے شاید کے ہیں جو کہ تردّد کا کلمہ ہے لہٰذا اس پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ اللہ کریم تو عالم الغیب ہے جس کی نسبت کسی امر میں متردّد ہونا محال ہے جس کا دارومدار علم یقینی اور قطعی کے نہ ہونے پر ہے۔ عام طور پر اس اشکال کا حل دو طور پر کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ لَعَلَّ کے معنے جس طرح شاید کے ہوتے ہیں اسی طرح کَیْ بمعنے تا کہ) کے بھی آتا ہے اور چونکہ پہلے معنے اللہ عالم الغیب کی شان کے مناسب نہیں ہیں لہٰذا اس کے لئے دوسرے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے نہ پہلوں میں۔

دوم یہ کہ لَعَلَّ کے پہلے معنوں میں جو تردّد ہوتا ہے کبھی تو وہ تردّد بلحاظ متکلم کے ہوتا

ہے اور کبھی بلحاظ مخاطب کے اور یہاں پر چونکہ متکلم اللہ علیم ہے جو کہ عالم الغیب ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی اور تردّد کا باعث بے علمی یا کم علمی ہوتی ہے لہٰذا متکلم یعنی اللہ علیم کے لحاظ سے تردّد نہیں ہو سکتا ہے بلکہ یہاں پر تردّد مخاطب کے لحاظ سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام سیبویہ نے اس کے معنوں میں یہ فرمایا ہے کہ اُعْبُدُوْا عَلَی الرَّجَاءِ مِنْکُمْ (تم اللہ کریم کی اس حالت میں عبادت کرو کہ تم تقویٰ کی امید رکھنے والے ہو) لیکن اصل جواب وہی ہے جو کہ حضرت امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس محل پر بیان فرمایا ہے اور وہ ہے بھی ایسا کہ جہاں جہاں پر یہ اشکال ہو سکتا ہے وہاں پر یہ جواب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں بالکل شک نہیں ہے کہ ہر ایک طبقہ کی زبان جدا طرز رکھتی ہے جو کہ دوسرے میں ہرگز نہیں اور خصوصاً بادشاہوں اور عام لوگوں کے کلام میں بہت بھاری فرق ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح بادشاہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو بار بار حضور عالی اور سرکار عالی وغیرہ القابِ عظمت سے ذکر کرتے ہیں اور عوام الناس نہ تو کبھی ایسا کرتے ہیں اور نہ ان سے ایسا کرنا زیبا ہوتا ہے۔

اسی طرح بادشاہوں اور امیروں کی منجملہ اور خاص اداؤں سے ایک یہ بھی ہے کہ بڑے پختہ اور یقینی اور حتمی وعدوں کے موقع پر عموماً وہ لَعَلَّ (شاید) عَسَی (امید ہے قریب ہے) کی مانند وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو کہ تردّد اور شک اور احتمال وامید پر دلالت کرتے ہیں اور گاہے خالی رمز اور اشارہ ہی سے کام لیتے ہیں اور کبھی تبسم اور میٹھی نظر سے بڑے بڑے بھاری اور حتمی وعدوں کو ادا کر دیتے ہیں۔ اور ناواقف لوگ خواہ ان کی ایسی باتوں سے کچھ بھی نہ سمجھیں یا محض شکی اور احتمالی وعدہ خیال کریں لیکن جو لوگ ان کے طرز ادا کے خوب واقف ہوتے ہیں وہ ان سب سے یقینی اور حتمی پختہ وعدے یقین کرتے ہیں اور ان کو ان وعدوں کی نسبت ایک ذرہ بھر بھی تردّد نہیں ہوتا۔ پس خداوند کریم بھی جہاں کہیں ایسا کلام نازل فرماتا ہے۔ اگرچہ عوام الناس اس سے کچھ بھی نہ سمجھیں یا خالی تردّد اور شک اور ظن ہی ان کے خیال میں آئے پر جو لوگ احکم الحاکمین اور بادشاہوں کے بادشاہ کے طرز اداء اور طریق کلام سے بخوبی واقف وماہر ہوتے ہیں ان کو اس میں بھی شک نہیں ہوتا۔ کہ یہ اس مالک حقیقی کی

طرف سے پختہ اور حقیقی وعدے ہوتے ہیں جن میں ایک ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں ہوتا اور جو لوگ کلام الملوک کے طرز اداء سے واقف ہیں ان کو ہمارے اس بیان میں بالکل شک وشبہ نہیں ہو سکتا ہاں جو واقف نہیں ہیں یا اسلام کے عنید ہیں تو وہ معذور ہیں۔

خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا ہے اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور بلندی یا بادل سے پانی اتارا ہے اگر مفسرین کی مانند ظاہر ہی پر اکتفاء ہو تب تو ان کا مطلب بالکل ظاہر ہے کہ زمین کو خداوند کریم نے ایسا نہیں بنایا جو کہ رہائش کے قابل نہ ہو بلکہ ایسا بنایا ہے کہ جس پر سب اشیاء اپنی رہائش بخوبی کر سکتی ہیں اور آسمان سب کے اوپر ایک چھت ہے اور بادلوں سے پانی بھی نازل ہوا کرتا ہے اور یہ سب ہی بڑے بھاری احسان ہیں اور نہایت ضروری تربیت ہے لیکن اگر اسی قدر بیان کرنا منظور ہوتا تو پھر نہ تو یہ ضرورت تھی کہ بناء کے ساتھ سماء کا بھی ذکر کیا جائے اور نہ یہ کہ فراش کے ساتھ ارض کو ذکر کیا جائے اور نہ یہ کہ ماء کے ساتھ سماء سے نازل کرنے کو بیان کیا جائے پھر تو اسی قدر کہنا کافی تھا کہ جس نے تمہارے لئے فرش بنایا ہے اور چھت بنائی ہے اور پانی دیا ہے اور ارض وسماء اور اِنْزَالٌ مِّنَ السَّمَآءِ[1] کی خصوصیت کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے حالانکہ خداوند کریم نے اس خصوصیت کو ملحوظ رکھا ہے تب ہی تو ان اشیاء کو ذکر فرمایا ہے اور قرآن مجید کے طرز کو جاننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جہاں کہیں کسی خصوصیت کو اصل بیان میں دخل نہیں ہوتا تو خداوند کریم اس کو ہرگز ذکر نہیں فرماتا آدمؑ کو جس شجرہ کے قرب سے منع فرمایا تھا اگرچہ اب دنیا اس کے معلوم کرنے کے لئے بہت کچھ خوض وفکر کرتی اور اہل علم سے دریافت کرتی رہتی ہے اور مفسرین نے اس کی تعیین کے لئے بہت بہت صفحے سیاہ کئے ہیں لیکن چونکہ اصل مقصد میں اس خصوصیت کو کچھ دخل نہ تھا تو خدائے علیم نے اس کو ہرگز ذکر نہیں فرمایا اور منافقوں کو اٰمَنُوْا الخ اور لَا تُفْسِدُوْا الخ کہنے والے کی خصوصیت کو دخل نہ تھا تو اس کو ذکر نہیں فرمایا خواہ طبائع میں ان کے معلوم کرنے کا بہت ہی کچھ شوق کیوں نہ ہو وعلیٰ ہذا القیاس۔

پس اگر ان خصوصیات کو بھی کچھ دخل نہ ہوتا تو ان کو ہرگز ذکر نہ کیا جاتا اور مفسرین

[1]۔ آسمان سے اتارنا۔ (از مرتب)

نے اگرچہ ان خصوصیات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی لیکن تاہم جو کچھ میرے خیال میں ملحوظ ہے وہ ذکر کر دیتا ہوں فرش اور چھت اور پانی کی ضرورت اور اشد ضرورت سے کسی عقلمند کو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فرش کے سوا انسان زندگی بسر کر سکتا تھا۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ ہوا اور سورج وغیرہ اوپر کی ضروری اشیاء کے سوا انسان اپنی زندگی آرام سے بسر کر سکتا ہے یا پانی کی اس کو ضرورت نہیں ہے لیکن انہی ضروری اشیاء کو اگر موجودہ پر حکمت انداز کے خلاف بنایا جاتا تو بجائے مفید ہونے کے سخت مضر ثابت ہوتیں مثلاً سماء کے لفظ میں جو بلندی پائی جاتی ہے اگر اس چھت میں یہ بلندی نہ ہوتی اور یہ چھت اپنے اندر کی سب اشیاء اور انسانوں کے سر کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی یا انسانی چھتوں کے انداز پر بنائی جاتی تو ہوا کے بند ہو کر گندہ ہو جانے اور سورج کی شدید تر حرارت سے جو کچھ مخلوق کو تکلیف مالایطاق ہوتی وہ کسی عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔

اسی طرح ارض کے لفظ سے جو ہلنا اور دور کرنا مفہوم ہوتا ہے اگر وہ اس فرش میں نہ ہوتا تو ایک جگہ پر ٹھہرے رہنے سے جو کچھ صدمہ مخلوق کو پہنچتا وہ بھی کسی پر مخفی نہیں رہ سکتا اسی طرح پانی اگر زمین پر ہی ٹھہرا رہتا اور خداوند کریم نے جو کچھ اس کی صفائی کا طریق اب جاری کیا ہوا ہے اس کے ساتھ اور اوپر جانے اور پھر اتر آنے سے مصفیٰ نہ ہوتا تو اس سے بھی جو کچھ نقص عائد ہوتا وہ پوشیدہ نہیں ہے پس ان خصوصیات میں گویا خداوند کریم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے اس بلند اور نہایت بلند کو چھت بنایا ہے اور اس تیز حرکت اور دور کرنے والی کو فرش بنایا ہے اور مصفیٰ اور مقطر پانی تم کو دیا ہے۔ پس ان خصوصیات میں یہ فوائد تھے جن کے لئے خدائے حکیم نے یہاں پر ان کو ذکر کیا ہے۔

(ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز اردو جلد 6 نمبر 5 صفحہ 1 تا 20 سن 1907ء)

اَلَّذِیْ کے متعلق اعتراض اور اس کے جواب:

ان آیات کریمہ کے متعلق بھی نادانی کے باعث دو تین اعتراض کئے گئے ہیں اوّل یہ کہ اَلَّذِیْ وغیرہ کے بعد جو جملہ آیا کرتا ہے (جس کو اہل علم کی اصطلاح میں صلہ کہا کرتے ہیں) ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسا جملہ ہو کہ جس کو سامعین جانتے ہوں کیونکہ اَلَّذِیْ اور

اس کے بعد کا جملہ یعنی موصول اور صلہ کے لانے کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ کسی غیر معروف شخص یا چیز کی کسی پہلی معلوم صفت کے ذریعہ سے سامع کو اس کی شناخت کرائی جائے مثلاً ہمارے سامع کو اس قدر تو معلوم ہوا ہے کہ ابھی کوئی آیا ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کون ہے اور حقیقت میں یہ وہی شخص ہے جو کہ کل ہمارے سامع کے پاس آیا تھا تو ہم کہیں گے وہ شخص آیا ہے جو کہ کل آیا تھا تو (جو کل آیا تھا) یہ صلہ موصول ہیں اور یہ دونوں اس نامعلوم آنے والے شخص کی شناخت کا ذریعہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر اس کا کل آنا سامع کو معلوم نہ ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ سامع کے لئے یہ شناخت کا ذریعہ ہر گز نہ ہو سکتا تھا اور ان آیتوں میں اَلَّذِیْ کے بعد جو جملے آئے ہیں وہ یہ ہیں خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرۃ :22) جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (البقرۃ:23) اور ظاہر ہے کہ مشرک لوگ اگر ان باتوں کو جانتے تو پھر وہ خداوند کریم کے لئے انداد کیوں بناتے اور جب وہ ان باتوں کو نہ جانتے تھے تو ان کا اَلَّذِیْ کے بعد لانا یعنی ان کا صلہ بنانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہم مانتے نہیں کہ اَلَّذِیْ کے بعد کے جملہ یعنی صلہ کے لئے ضروری ہے کہ سامع پہلے سے اس کو جانتا ہو بلکہ بعض وقت محض کسی چیز کی عظمت یا حقارت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی ایسی بات ذکر کر دی جاتی ہے جس کا مخاطب کو پہلے سے ہر گز علم نہیں ہوتا اور ایسا کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اگر تسلیم کیا جائے کہ پہلے سے سامع کو اس کا علم ہونا ضروری ہے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کو مشرکین نہ جانتے تھے بلکہ قرآن مجید میں ہی اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ ان باتوں کو بخوبی جانتے تھے اگرچہ جو نتیجہ ان پر نظر کرنے سے لازم آتا ہے اس کے خلاف اعتقاد اور عمل رکھتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان:26) (اور اگر تم ان سے دریافت کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے) وعلیٰ ہذا القیاس اور بہت سے آیات ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ پہلے سے ان سب امور کو جانتے تھے جو کہ یہاں پر مذکور ہوئے ہیں۔

آسمان سے متعلق قرآنی نظریہ پر اعتراض کا جواب:

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید آسمان کا قائل ہے حالانکہ آج کل کی دوربینوں کا مشاہدہ (جو کہ سب مشاہدوں سے قوی تر ہے) اس کے وجود کی نفی پر گواہ ہے۔

اس سوال کا جواب ہم یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ اسی قدر دے دیتے ہیں کہ دوربین مرئی چیز کی نسبت شاہد ہو سکتی ہے نہ غیر مرئی کے لئے کیا دوربین اگر انسانی روح کو نہیں دکھا سکتی یا ہوا اگر اس سے نظر نہیں آتی یا وہ لطیف مادہ جو کہ ہواء سے بھی زیادہ لطیف ہے اور اس فضا میں موجود ہے اگر دوربین اس کو نہیں دکھاتی تو عقلمندوں نے اس سے انکار کر دیا ہے اور ان سب اشیاء کو لاشئ محض قرار دے دیا ہے؟ ہرگز نہیں اور قرآن مجید نے نہ یہاں پر اور نہ کسی اور مقام پر یہ بیان فرمایا ہے کہ آسمان مرئی چیز ہے قرآن مجید نے تو دو لفظ اس کی نسبت ذکر فرمائے ہیں۔ ایک سماء جس کے معنے ہیں بلند کے اور بس اور جو فضا کے زمین کے اوپر ہے اگر ہوا سے پُر ہے تو بھی یہ بلند ہی ہے اور اگر ہوا سے بھی لطیف تر کوئی مادہ ہے تو بھی اوپر ہے اور تجربہ شاہد ہے اور عام مشاہدہ صاف دکھاتا ہے کہ کوئی فضاء خلاء محض نہیں بلکہ قدرت نے کوئی چیز اس فضاء کے پُر کرنے والی بھی ضرور ہی پیدا کی ہوئی ہے جو اس کو ہمیشہ پُر رکھتی ہے۔ پر بفرض محال اگر زمین کے اوپر کا بڑا فضا خالی اور محض خلاء ہے تو بھی اس کے اوپر اور بلند ہونے میں کسی کو ذرہ کلام نہیں ہے اور دوسرا لفظ قرآن مجید نے فلک کا رکھا ہے اور فلک اس دائرہ کو کہتے ہیں کہ جس پر کوئی شے گھومتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا ہے كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (الانبیاء:34) (سب (ستارے) ایک ایک مدار پر تیر رہے ہیں) پس یہ لفظ مخالف کیا بلکہ یہ تو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم نے جس آسمان کا ذکر کیا ہے وہ کوئی کثیف جسم نہیں ہے اور اگر فرض محال کے طور پر معترض صاحب کے اس غلط خیال کو تسلیم بھی کیا جائے کہ یہ فضاء خلاء محض ہے تو بھی اس لفظ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے

اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ آسمان یا فلک وہ چیز ہے جس میں ستارے تیر رہے ہیں اور بفرض محال اگر یہ خلاء محض بھی ہو تو بھی اس میں تیرنا نہ واقعہ میں محال ہے نہ معترض صاحب اس سے انکار کر سکتے ہیں۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کے جب یہ معنے ہوئے کہ تم جانتے ہو کہ خداوند کریم کا کوئی شریک نہیں ہے یا یہ کہ تم جانتے ہو کہ شرک بری چیز ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ شرک کی برائی کو اور اس کو کہ فی الحقیقت اللہ کریم کا کوئی شریک نہیں ہے بخوبی جانتے تھے تو پھر باوجود اس کے وہ شرک کس طرح کر سکتے تھے اور کیونکر اللہ عزوجل کے لئے بہت سے شریک قرار دے سکتے تھے کیونکہ یہ دونوں متضاد امر ہیں لیکن واقعہ میں وہ مشرک تو تھے پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ بات درست نہیں کہ وہ شرک کی برائی کو جانتے تھے یا اس امر کو جانتے تھے کہ اللہ عزوجل کا کوئی شریک نہیں یا نہیں ہو سکتا اس کا جواب یہ ہے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض باتوں کو جانتا اور مانتا ہوتا ہے۔ لیکن ان سے جو نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ بباعث جہالت اور غفلت اور فکر و توجہ سے غور نہ کرنے کے اس کے ذہن میں ایک زمانہ دراز تک نہیں آتا اور اس نتیجہ کے خلاف اعتقاد رکھتا اور عمل کرتا ہے۔

پس ضرورت پڑتی ہے کہ کوئی شخص ان امور مسلمہ کو ترتیب دے کر سامنے پیش کر کے بتائے کہ ان پر فلاں نتیجہ مرتب ہوتا ہے جس کے خلاف تمہارا اعتقاد اور عملدر آمد ہے اور جو دلائل مسلمات سے مرکب ہوتے ہیں وہ سب کے سب اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ جن امور سے وہ دلائل مرکب ہوتے ہیں ان کو ایک شخص تسلیم کرتا ہے لیکن پھر بھی ان سے جو نتیجہ بر آمد ہوتا ہے اس کے خلاف اس کا اعتقاد اور عمل ہوتا ہے لہٰذا دوسرا شخص ان مسلمات کو ترتیب دے کر وہ نتیجہ اس کے ذہن نشین کرتا ہے تب وہ اس نتیجہ کو جانتا اور مانتا ہے یا کم از م ملزم ہوتا ہے پس اس تمہید کے موافق خلاصہ جواب یہ ہوا کہ مشرک لوگ ان سب امور کو مانتے تھے جو کہ ان آیات کریمہ میں مذکور ہیں جیسا کہ اللہ

کریم نے اور مقامات پر بیان فرمایا ہے اور ہم بھی پہلے ذکر کر چکے ہیں لیکن ان سے وہ نتیجہ اخذ نہ کرتے تھے جو کہ خداوند کریم نے یہاں پر بیان فرمایا ہے۔ پس یہ بعینہٖ اس دلیل کی مانند ہے جو کہ امور مسلمہ سے مرکب ہوتی ہے اور اس صورت میں فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:23) کے یہ معنے ہوں گے کہ پس تم اللہ کے لئے ہمسر مت بناؤ حالانکہ (جن امور سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے ان کو) تم جانتے ہو۔

اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک امر کو جانتا ہے اور خوب جانتا ہے لیکن کسی باعث سے اس کے خلاف عمل کرتا ہے یا اس کے خلاف اپنا اعتقاد ظاہر کرتا ہے مثلاً بار بار میں نے اس آیت کریمہ کو لکھا ہے جو کہ خداوند کریم نے فرعونیوں کے حق میں نازل فرمائی ہے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل:15) (اور ظلم اور تکبر سے انہوں نے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کی جانیں ان پر یقین رکھتی تھیں۔)

اسی طرح جو آنحضرتؐ کے مخالفوں کے حق میں آئی ہے کہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:147) (اس کو جانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں) پس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ شرک کی برائی کو جانتے ہوں اور پھر بھی اس کے خلاف کرتے ہوں تب فَلَا تَجْعَلُوْا الخ کا یہ مطلب ہو گا کہ تم اللہ کے ہمسر مت بناؤ حالانکہ اس کی برائی کو تم خوب جانتے ہو بلکہ تم کو چاہئے کہ اپنے علم کے مطابق عملدرآمد رکھو پس اس صورت سے یہ اعتراض بالکل رفع ہو جاتا ہے۔

اب میں ان آیات کی تفسیر کو ختم کر کے وَاِنْ كُنْتُمْ الخ کی تفسیر شروع کرتا ہوں لیکن شروع سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان آیات کے بعد متصل وَاِنْ كُنْتُمْ الخ کو کیوں لایا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ الخ میں جو غیر اہل کتاب مخاطب ہیں ان کی اصل حالت یہ تھی کہ قرآن مجید کا منجانب اللہ ہونا ان پر خوب منکشف ہو چکا ہوا تھا اور ان میں سے جو لوگ قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کا بڑے زور سے انکار کرتے تھے وہ بھی وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل:15) (اور انہوں نے ظلم اور تکبر سے ان کا انکار کیا

حالانکہ ان کے دل ان پر یقین رکھتے تھے) کے مطابق اس کے کلام اللہ ہونے کا یقین رکھتے تھے جس کی ایک مقام پر خداوند کریم نے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:147)(وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) فرما کر اس بات کی تصریح کر دی ہے اوران آیات کے بعد وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا الخ (البقرۃ:24)(اگر تم اس سے شک میں ہو جو کہ ہم نے اتارا ہے اپنے بندے پر الخ) فرما کر بھی اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ حقیقت میں ان کو قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے میں بالکل شک نہ تھا اور یہ لفظ اِنْ سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اِنْ (جس کے معنے اگر کئے جاتے ہیں) شک اور فرض کرنے کے لئے آتا ہے اور اِذَا یقین اور تحقّق کے لئے ہوتا ہے۔

یہاں پر اِنْ لایا گیا ہے نہ اِذَا پس اس کا خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ اوّل تو تم کو قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے میں بالکل شک نہیں ہے اور بفرض محال اگر ہے تو پھر اس کے رفع دفع کرنے کا یہ طریق ہے۔ پس اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ان کو قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے میں ہر گز شک نہ تھا اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن مجید کو منجانب اللہ اور کلام اللہ جانتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی تعلیم پر اپنا عملدرآمد رکھے (جس کا خلاصہ لب لباب شرک کی نفی اور اخلاص فی العبادت ہے) تاکہ متقی بن کر اس اعلیٰ ترین مقصد کو حاصل کرے جو کہ قرآن مجید کے نازل فرمانے کی اصل غرض ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا خداوند کریم سے ایسا گہرا تعلق ہو جاوے کہ ہر ایک دینی و دنیوی مطلب اور مقصد میں خدا تعالیٰ اپنے خاص فضل کے ساتھ اس کو نہایت سیدھی اور اسہل ترین راہ بتاتا رہے اور نقائص اور نامرادیوں اور محاسن اور کامیابیوں سے بہرہ ور اور متمتع کرتا رہے اور فرشتے نازل ہو کر اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم السجدۃ:31) (مت ڈرو یا رنج کرو اور تم کو بشارت ہو اس جنت کی جس کا تم کو وعدہ دیا گیا تھا) کے ساتھ تسلی بخشیں اور نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدۃ:32)(ہم تمہارے دوست اور حامی و مددگار ہیں نزدیک زندگی میں اور پیچھے آنے والی میں) کے ساتھ ہمیشہ ان کی ہمت اور طاقت و عزم کو مضبوط اور قوی کریں اور جب ایسے لوگوں کے لئے قرآن مجید کی تعلیم پر

کاربند ہونا ضروری تھا لہٰذا خداوند کریم نے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا الخ میں پہلے ان کو اخلاص فی العبادت اور نفی شرک کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی اس کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔

اور پھر اس کے بعد وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ الخ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ حقیقت میں تو تم کو منجانب اللہ ہونے میں بالکل شک نہیں ہے ہاں بے شک تم کہتے ہو کہ ہمیں اس میں شک ہے پس اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ ہمیں اس میں شک ہے تب اس کے فیصلہ کا یہ طریق ہے الخ۔

نیز چونکہ خداوند کریم نے عبادت کا حکم دیا ہے اور اپنی ربوبیت اور احسان کے رنگارنگ اطوار کو بیان فرما کر احسان اور تربیت کے مقابلہ میں فطرت انسانی کیا بلکہ عام طور پر فطرت حیوانی کا جو دائمی اور کلی مستمر اقتضاء و تقاضہ ہے اس سے عبادت کا وجوب ولزوم ثابت کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اپنے ہم جنس محسن اور مربی کی رضامندی کی راہیں بھی انسان اپنی اٹکل سے معلوم نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ محسن اور مربی خود ہی اپنی رضامندی کی راہوں کو بیان کرے تاکہ احسان مند اور تربیت یافتہ انسان علی وجہ البصیرت ان راہوں پر چل کر اپنے محسن اور مربی کی رضامندی حاصل کر سکے لہٰذا ضروری ہوا کہ خداوند کریم رب العالمین معبود برحق کی کوئی کتاب ہو جس میں اُس کی رضامندی کی راہوں کا بیان ہو پھر براہین قاطعہ کے ساتھ اس کتاب کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہو۔ تاکہ اس یقین سے ان راہوں کا یقین حاصل ہو اور ان کے یقین سے انسان علی وجہ البصیرت اور عزم جزم کے ساتھ ان راہوں پر وفاداری سے قدم مار کر اپنے سچے اور حقیقی محسن اور رب کی رضامندی کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سعادت دارین کے تخت معلیٰ پر رونق افروز ہو سکے۔

پس اس لحاظ سے بھی ضروری ہوا کہ عبادت کے امر اور اس کے لزوم کے براہین کے بعد کتاب اللہ کا بیان کیا جائے اور اس کا منجانب اللہ ہونا براہین قاطعہ کیساتھ ثابت کیا جائے نیز چونکہ ان آیات کریمہ میں تربیت جسمانی کے عجیب در عجیب طور اور طریق بیان کئے گئے ہیں جن سے سوچ والے دل اور دماغ کو بخوبی اس امر کا پتہ لگ سکتا ہے کہ جس

خدائے رحیم وکریم اور ذوالفضل العظیم نے انسان کے جسم کی تربیت کے طرف اسقدر توجہ فرمائی ہے حالانکہ جسم وہ چیز ہے کہ جس کو لباس کی طرح بہت تھوڑے عرصہ میں انسان بالکل تبدیل کر دیتا ہے جس کی میعاد تین سال تک بتائی جاتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ انسان کے لیے ادنیٰ ترین جزو ہے تو وہ کریم رحیم خدا انسان کی روح کی تربیت کے طرف کس قدر توجہ فرمائے گا پس اس لحاظ سے بھی بہتر اور مناسب بلکہ انسب تر ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا الخ کے بعد کتاب اللہ اور اس کے منجانب باللہ ہونے کے ثبوت کا ذکر ہو لہٰذا خداوند کریم نے اس کے بعد فرمایا ہے۔

آیت 24 تا 25: وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ. فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ.

اِنۡ۔ اگر

(حضرت حکیم الامتؒ) اِنۡ۔ توبیخ کے لئے ہے یعنی شک کرنے میں ان کو جھڑکی دینے کے لئے لایا گیا ہے اور یہ شک کے مقام پر آیا کرتا ہے اور جن کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے ان میں سے بعض شک میں تھے اور بعض نہ تھے لہٰذا ان کا شک میں ہونا اور نہ ہونا قطعی نہ رہا جس کے باعث اِنۡ لایا گیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں پر محض فرض کے لئے لایا گیا ہو۔ یعنی بفرض محال اگر تم شک میں ہو اور یہ اگرچہ بظاہر درست نہیں ہو سکتا کیونکہ فرض تو وہاں پر کیا جاتا ہے جہاں پر حقیقت میں نہ ہو اور ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ مخاطبین میں سے بعض شک میں تھے اور بعض نہ تھے تو جب بعض شک میں ہوئے تو فی الواقع شک ہوا تو اب بالفرض کہنا درست نہیں ہو سکتا لیکن یہ کنایہ ہے اس سے کہ یہاں پر رفع شک کے لئے اسقدر دلائل اور قرائن اور شواہد ہیں کہ ان پر نظر کر کے پھر کسی عقلمند کی شان سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے منجانب اللہ ہونے میں کسی طرح کا شک وشبہ کرے لہٰذا یہاں پر شک والوں کے شک کو کالعدم قرار دیکر کہا گیا ہے کہ اگر فرض کیا جائے کہ تمہیں اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے الخ۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) اصل بات یہ ہے کہ خواہ کیسی کھلی اور ظاہر چیز ہو جس میں مشاہدہ یا غور و فکر کے بعد بالکل شک نہ رہ سکتا ہو اس پر بھی اگر کوئی شخص توجہ نہ کرے گا اور نہ اس کو دیکھے گا تو ضرور ہی وہ شک میں پڑے گا مثلاً سورج کا وجود اور طلوع نہایت ہی کھلی اور واضح چیز ہے یہاں تک کہ وضاحت میں یہ ضرب المثل ہے لیکن اس کی وضاحت اسی وجہ سے ہے کہ انسان اس کو اور اس کے نور کو مشاہدہ کرتا ہے لیکن جب ایک انسان

اندھیری کوٹنی کے اندر دروازے بند کر کے بیٹھا یا لیٹا ہوا ہو اور سورج اور اس کی روشنی کو مشاہدہ نہ کرے تو اس کو سورج کے طلوع میں بھی شک ہو سکتا ہے۔ پس جب لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ سورج کے طلوع کے بعد اس کے طلوع میں کسی کو ہر گز شک نہیں ہوتا تو اس کے یہ معنے ہر گز نہیں ہوتے کہ خواہ کوئی اندھیرے مکان میں ہو تو بھی اس کو شک نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جب سورج کا طلوع ہوتا ہے اور صحیح الحواس انسان اس کے آثار کو مشاہدہ کر لیتے ہیں تو بوجہ وضوع آثار کے اس کے طلوع میں وہ شک نہیں کر سکتے بخلاف ان اشیاء کے جو خفی الاثار ہوتی ہیں کہ ان کے آثار کے مشاہدہ کرنے کے بعد ان کے وجود میں شک پڑ سکتا ہے۔

پس اس اصل سے لَا رَیْبَ فِیْهِ کے معنے خوب کھل جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے آثار و شواہد اور دلائل اور قرآئن اس قدر کثرت اور وضاحت کیساتھ ہیں کہ ان کے مشاہدہ اور ان کی طرف توجہ کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ کسی کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہو سکے نہ یہ کہ جو لوگ اس کے شواہد و آثار اور دلائل و قرآئن سے بالکل غافل اور بے خبر ہوں ان کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مقابلوں کے حق میں قرآن مجید نے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ[1] (البقرۃ:147) فرمایا ہے کیونکہ اہل لسان ہونے کے علاوہ ان کو بعض وجوہات سے ان آثار و شواہد پر قدرت نے نظر کرادی تھی یا انہوں نے خود ارادۃً کی تھی اور خداوند کریم کے ذمہ تو اسی قدر ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے لئے نہایت قوی اور واضح ترین آثار و شواہد قرار دے اور لوگوں کو وہ حواس و قویٰ دے جن کے ساتھ وہ ان کو مشاہدہ کر سکیں اور موقعہ بھی دے اور یہ لوگوں کا فرض ہے کہ خداداد قویٰ سے ان آثار کو مشاہدہ کریں اور اگر وہ نہ کرینگے تو یہ ان کا نہایت سخت اور مضر تر قصور ہے تو جب لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ قرآن مجید میں اور اس کے منجانب اللہ ہونے کے شواہد میں غور و فکر کریں اور خداوند کریم کا یہ کام ہے کہ اسکے شواہد ایسے قوی اور واضح ترین بنائے کہ ان

[1] ۔ وہ اس (سچائی) کو (اسی طرح) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

پر غور کرنے کے بعد کسی طرح کا ریب وشک اس کے منجانب اللہ ہونے میں نہ رہے اور خداوند کریم نے حقیقت میں ایسا کیا ہوا بھی ہے۔

تو جب اس کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت ریب عدم ریب کا ذکر ہو گا تو ان دونوں فرضوں کو اداء شدہ ملحوظ رکھ کر بات کی جاوے گی اور یہ بالکل سچا اور عام قاعدہ ہے مثلاً جب کسی نسخۂ طبی کی عمدگی کے متعلق یہ بحث ہو گی کہ اس کے عمدہ ہونے میں کچھ شک نہیں تو ضروری ہو گا کہ اس کی عمدگی کے لَا رَیْبَ فِیْہِ ہونے میں بیمار کے فرض کو اداء شدہ قرار دیا جاوے اور وہ ہے اس نسخہ کا استعمال کرنا اور اس کے مطابق پرہیز رکھنا تو جب یہ کہیں گے کہ اس کا مفید ہونا لَا رَیْبَ فِیْہِ ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ بیمار جب اس کو استعمال کرتا ہے تو ضرور یہ مفید پڑتا ہے نہ یہ کہ استعمال اور پرہیز کے سوا ہی اس کا مفید ہونا لَا رَیْبَ فِیْہِ ہے۔ تو اس سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن مجید کے لَا رَیْبَ فِیْہِ ہونے میں بھی لوگوں کے فرض (یعنی آثار وشواہد پر غور وفکر کرنے کو اداء شدہ قرار دیا جاوے گا۔ پس اس صورت میں وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا الخ کے یہ معنے ہونگے کہ قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے آثار وشواہد کو سوچنے اور جانچ پڑتال کرنیکے بعد تو اسکے منجانب اللہ ہونے میں ذرہ بھر بھی کسی کو شک وشبہ نہیں ہو سکتا اور غور وفکر کرنا تو تمہارا فرض ہے جو اگر تم نے ادا کیا ہے تو پھر تم کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے اور بفرض محال اگر تم میں کسی قسم کا شک ہو تو الخ الغرض چونکہ غور وتوجہ ہو جانا یہاں پر مدِّ نظر رکھا گیا ہے اور اس کے بعد شک نہیں ہو سکتا لہٰذا یہاں پر اِنْ لایا گیا ہے جو کہ فرض کے لئے آتا ہے اور اِنْ اصل میں شک کے لئے آتا ہے۔

اور جن مفسرین نے یہاں پر اس کو شک کا موقع بتایا ہے تو انہوں نے اس کی یہی وجہ بیان کی ہے کہ بعض تو شک میں تھے اور بعض نہ تھے پس ان کا شک اور عدم شک دونوں یقینی نہ رہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ اِنْ تو اس موقع پر شک کے لئے ہوتا ہے جہاں پر کہ متکلم کو شک ہو اور ظاہر ہے کہ متکلم وہ عالم الغیب خدا ہے جس کو ہرگز کبھی بھی کسی امر میں کسی طرح شک اور تردّد نہیں ہو سکتا۔ پس اگر شک

سے متکلم کا شک مراد ہے تب تو بعض کے شک اور بعض کے عدم شک سے شک اور عدم شک دونوں غیر یقینی اس کی نسبت نہیں ہو سکتے اور اگر متکلم کا مراد نہ ہو بلکہ انسانوں کا شک مراد ہو کیونکہ اگرچہ اصل متکلم تو خداوند علیم ہی ہے لیکن خداوند کریم نے خود تو اوروں کو خطاب نہیں کرنا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ کے خدام نے اوروں کو یہ کلام سنانا ہے یہی وجہ ہے کہ عموماً ایسے مقامات میں جہاں پر اوروں کو کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو خداوند کریم وہاں پر آنحضرتؐ اور آپ کے خدام کو قُلْ یاقُوْلُوْا (اے رسول یا اے مخاطب تم کہو) فرماتا ہے پس اس لحاظ سے کہ وہ کلام اصل میں خداوند کریم کا نازل کیا ہوا اور بولا ہوا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے متکلم خداوند کریم ہے اور چونکہ دوسرے لوگوں کو وہ بات کہنے اور سنانے والا کوئی انسان ہوتا ہے۔

یہاں پر متکلم انسان ہے یا خداوند کریم

پس اس لحاظ سے متکلم انسان ہے نہ خداوند کریم اور وہ کلام اگرچہ کلام خداوندی ہے لیکن اس لحاظ سے اس کلام کو انسانی کلام کے قالب میں لایا جاتا ہے تو جب اس لحاظ سے وَاِنْ کُنْتُمْ الخ کو انسانی کلام کے قالب میں اعتبار کیا گیا تو پھر شک اور تردّد کے لئے تاویل مذکور کی ہرگز ضرورت نہیں رہتی اس لئے کہ خواہ حقیقت میں بعض کو شک ہو اور بعض کو نہ ہو لیکن دوسرے انسانوں کو تو ان کے دل کا حال معلوم نہیں پھر خصوصاً جبکہ قرآن مجید کی حالت ایسی ہے کہ اس پر نظر کرنے سے ضرور اس کے منجانب اللہ ہونے پر یقین ہو جاتا ہے لیکن ایک شخص مخالف کہتا ہے کہ مجھے تو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے تو اس حالت میں ضروری ہے کہ قرآن مجید کو ماننے اور جاننے والے کے دل میں شک پڑے اور اس کے حلفیہ بیان کو (کہ مجھے باوجود غور وخوض کرنے کے قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے میں شک اور تردّد ہے) تسلیم نہ کرے۔ پس جب متکلم انسان کو قرار دیا اور ظاہر ہے کہ وہ دوسرے کے دل کی حالت کو جان نہیں سکتا اور دوسرا شخص بات بھی وہ کہتا ہے جو کہ تجربہ اور شواہد و قرائن قویہ اور واضحہ کے بالکل صریح مخالف ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کو ہزارہا قسموں سے مؤکد بھی کرتا ہے تو اس حالت میں انسان کو ہرگز کسی طرف یقین نہیں

ہو سکتا بلکہ ضرور ہی شک رہتا ہے۔ پس اصل بات یہی ہے کہ قرآن مجید میں دونوں قسم کے کلام موجود ہیں اوّل وہ کہ خداوند کریم نے اپنی ذات بابرکات کو متکلم قرار دے کر اس میں اپنی شان ارفع کو ملحوظ رکھا ہے اور دوم وہ کہ جس میں خداوند کریم نے اس کے پہنچانے والوں کی حالت کو ملحوظ رکھا ہے گویا اس کو یوں قرار دیا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام یا ان کے خدام وہ بات کہہ رہے ہیں اور اس قسم کو کَلَامُ عَلٰی لِسَانِ التَّرْجُمَانِ[1] کہتے ہیں اور پہلے قسم کے کلام کو کَلَامُ عَلٰی لِسَانِ الْمُتَکَلِّمْ[2] بولتے ہیں۔

پس وَاِنْ کُنْتُمْ الخ کَلَامُ عَلٰی لِسَانِ الْمُتَکَلِّمْ ہے تو پھر یہ اِنْ ہرگز شک کے لئے نہیں ہے کیونکہ خداوند کریم کی ذات پاک شک اور تردّد سے پاک اور منزہ ہے۔ پس اس صورت میں یہ محض توبیخ کے لئے ہے یعنی تنبیہ اور جھڑکنے لئے یا محض فرض کے لئے ہے اور اگر یہ کلام علی لسان الترجمان ہے تب یہ اِنْ شک کے لئے ہے کیونکہ قرآن مجید کی ذات ہی اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے کافی سے بڑھ کر ہے اور اس کی حالت ہی ایسی ہے کہ نیک نیتی سے اس پر غور کرنے والوں کو ہرگز اس کے منجانب اللہ میں تردّد نہیں ہو سکتا اور اس کا منکر کہتا ہے کہ مجھے اس میں تردّد ہے۔ پس باوجود اس حالت کے ایک مسلمان اس کی بات کو مانے تو کیونکر بلکہ ضروری ہے کہ اس کو اس کی بات اور حالت میں تردّد ہو۔

کُنْتُمْ۔ کَوْنٌ سے ہے جو بمعنے ہونے کے ہے۔ پس اس کے معنے ہوئے تم تھے اور کَانَ اور اس کے باقی صیغے دوسری چیز کو زمانہ گذشتہ کے ساتھ متعلق کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں اور اِنْ جس کی بحث ابھی کی گئی ہے آئندہ زمانہ کے ساتھ متعلق کرنے کے لئے آتا ہے اب ظاہر ہے کہ اِنْ اور کُنْتُمْ کی اقتضاء اور اثر میں منافات اور تضاد ہے ایک چاہتا ہے کہ اپنے مابعد کو زمانہ استقبال سے متعلق کر دے اور دوسرا چاہتا ہے کہ زمانہ ماضی سے اس کا تعلق ہو۔

اب یہ منافات اور تضاد رفع ہو تو کیونکر اس کی رفع کی بظاہر دو ہی صورتیں ممکن ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ان کو اپنے اصل پر قائم رکھا جائے اور کُنْتُمْ کو اپنے تقاضا سے خالی کیا جائے

[1]۔ ترجمان کی زبانی کلام۔ (از مرتب)
[2]۔ متکلم کی زبانی کلام۔ (از مرتب)

جیسی سب ماضیاں زمانہ ماضی کو چاہتی ہیں لیکن جب ان پر اِنْ وغیرہ وہ چیزیں آجاتی ہیں جو کہ زمانہ استقبال کو چاہتی ہیں تو اس وقت وہ ماضیاں بمعنے استقبال ہو جاتی ہیں اور یا کُنْتُمْ کو اپنے اصل پر رکھا جائے اور ان کو اپنے اپنے اقتضاء سے خالی قرار دیا جائے اور بعض اوقات ایسا ہوا بھی کرتا ہے کہ پہلے لفظ کو اپنے مقتضاء سے خالی کیا جاتا ہے اور دوسرے لفظ کو اپنے مقتضاء پر قائم رکھا جاتا ہے اور ان دونوں کے اقتضاؤں میں تضاد ہوتا ہے۔

مثلاً اَلَ جب فعل مضارع پر آتا ہے تو اس کو خاص بمعنے حال کر دیتا ہے اور سَوْفَ کا لفظ جب مضارع پر آتا ہے تو اس کو خاص بمعنے مستقبل کر دیتا ہے لیکن کبھی دونوں جمع ہو جاتے ہیں جیسا قرآن مجید میں آیا ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ الخ (الضحیٰ:6) (اور ضرور تیرا رب تجھے دے گا) تو ایسی صورت میں سَوْفَ کو تو اپنے اصل پر رکھتے ہیں اور اَلَ کو اپنے مقتضاء سے خالی کر کے محض تاکید کے لئے قرار دے دیتے ہیں اور (حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے فرمایا ہے کہ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے کہ اِنْ کُنْتُمْ میں اِنْ آئندہ زمانہ کے لئے ہے اور کُنْتُمْ ویسا ہی بمعنے آئندہ ہے کہ جیسی اور ماضیاں اِنْ کے بعد بمعنے استقبال ہوتی ہیں اور امام فرّا کا یہ مذہب ہے کہ کُنْتُمْ بمعنے ماضی ہے اور اِنْ یہاں پر بمعنے استقبال نہیں ہے۔ پس جمہور کے مذہب کے مطابق وَاِنْ کُنْتُمْ کے یہ معنے ہوئے اور اگر تم کسی قسم کے شک میں ہو اور فرّا کی مذہب کی رو سے اس کے معنے ہوں گے اور اگر تم شک میں تھے یا اور اگر تم شک میں رہے ہو۔

پس اگر یہ جیسا ظاہر بصورت ماضی ہے ایسا ہی معنے کے لحاظ سے بھی ماضی ہے جیسا کہ فرّا کا مذہب ہے تب تو کچھ مضائقہ نہیں ہے لیکن جمہور کے خیال کے مطابق اگر یہ بمعنے مستقبل ہے تو پھر اس کے بصورت ماضی لانے کی کوئی وجہ ضرور ہی ہونی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ جب مخالف لوگ لَا رَيْبَ فِيهِ اور يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:147) وغیرھما سنا کرتے تھے۔ تو کہا کرتے تھے کہ ہمیں اس میں شک ہے اور سواء اس کے یوں بھی بعض کہہ دیا کرتے تھے کہ ہمیں تو اگر اس کی منجانب اللہ ہونے کا ثبوت مل جاتا تو ہم کبھی مخالفت نہ کرتے اور نہ کبھی اس کا انکار کرتے لیکن کریں کیا کہ ہمیں اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے حالانکہ وہ ایسا کہنے میں جھوٹے ہوتے تھے جیسا کہ اس کے آگے اِنْ کُنْتُمْ

صٰدِقِیۡنَ (البقرۃ:24)(اگر تم صادق ہو) فرمانے سے صاف صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ ایسا کہا کرتے تھے اور یہ کہ وہ ایسا کہنے میں کاذب ہوا کرتے تھے تو ان کے اس قول کی تردید اور جواب کے لئے خداوند کریم نے یہ آیات کریمہ نازل فرمائی ہیں اور چونکہ ان کا ایسا کہنا گذشتہ زمانہ میں تھا اور اس کے بعد یہ جواب نازل فرمایا ہے۔

پس اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ جواب ہے تمہارے اس پہلے قول کا کُنۡتُمۡ کو بلفظ ماضی رکھا گیا ہے اور اسی وجہ سے اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ میں بھی ماضی لائی گئی ہے ورنہ پہلے شک کی تردید ٹھیک نہیں ہو سکتی کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو پہلے شک ہو اور اب موجودہ زمانہ میں اس کو شک نہ رہا ہو۔ پس اس صورت میں معنے تو اس کے مستقبل کے ہیں لیکن ان کے پہلے قول کی تردید اور اس میں کاذب ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ میں اور اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ میں فعل ماضی اختیار کیا گیا بلکہ اسی کے ظاہر کرنے کے لئے اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ کہا گیا ہے۔ ورنہ اگر محض استقبال کی بات ہوتی تو پھر اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ کے لانے کے لئے کوئی وجہ ہی نہ ہو سکتی اس میں تو شک نہیں کہ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ الخ کا بمعنے ماضی ہونا یا بمعنے مستقبل ہونا بہت باریک امر ہے اس لئے کہ جیسے بعض وجوہات اس کے بمعنے ماضی ہونے کے کو چاہتے ہیں۔ ایسی ہی اس کے بمعنے مستقبل ہونے کو بھی بعض وجوہات چاہتے ہیں اور جس طرح بعض وجوہات اس کے ماضی ہونے کے خلاف ہیں اسی طرح بعض اس کے بمعنے مستقبل ہونے کے بھی خلاف ہیں۔

کُنۡتُمۡ کی صورت ماضی کی ہونی اور اس کے بعد اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ کا آنا اگر اس کے ماضی ہونے کے مقتضی ہیں تو اِنۡ کا آنا اس کے مستقبل ہونے کا مقتضی ہے اور اس بات کا ممکن ہونا کہ پہلے کسی کو شک ہو اور زمانہ حال میں نہ رہے (جس سے اس کلام کے معنے غلط ہو جاتے ہیں) اگر اس کے بمعنے ماضی ہونے کے خلاف ہے تو اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ اس کے بمعنے مستقبل ہونے کے منافی ہے لہٰذا سرسری نظر سے اس کو ماضی یا مستقبل کہنا ٹھیک نہیں اور میرے خیال میں یہاں پر اگر اس کو بمعنے ماضی استمراری لیا جاوے یعنی اگر اب تک تم شک میں ہوا لخ تو پھر بمعنے ماضی لینے میں کوئی اعتراض نہیں رہتا۔

فِیْ۔ بیچ، میں۔

رَیْبٌ۔ (حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) رَیْبٌ بمعنے شک ہے اور ان کو نکرہ یعنی سوائے ال داخل کرنے کے اس لئے لایا گیا ہے کہ ریب کی حقارت پر دلالت کرے کیونکہ کبھی نکرہ محض اظہار حقارت کے لئے لایا جاتا ہے یعنی قوی ریب تو ہو سکتا ہی نہیں لیکن اگر کوئی ضعیف اور حقیر سا ریب بھی بفرض محال ہے تو الخ یہاں پر شک کرنے والوں کو مظروف اور ریب کو ظرف بنایا گیا ہے جس طرح پانی مظروف اور مٹکہ ظرف ہوتا ہے حالانکہ حقیقت میں بالعکس ہے کیونکہ ریب ان کے دلوں میں تھا پس حق یہ تھا کہ یوں کہا جاتا کہ اگر تمہارے میں (یعنی تمہارے دلوں میں) ریب ہے لیکن یہاں اس کے خلاف یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم ریب میں ہو۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ وارضاہ عنہ) نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ چونکہ ریب ہمیشہ ان کے شامل حال تھا اس لئے مجازاً اس کو ظرف بنادیا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ وجہ اس کے ظرف بنانے کو جائز تو کر سکتی ہے لیکن ریب کی مظروفیت پر اس کی ظرفیت کو ترجیح دینے میں اس کو بالکل دخل نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ جو چیز کسی چیز کے ہمیشہ شامل حال رہتی ہے تو ضرور اس چیز کو ظرف ہی بنایا جاتا ہے نہ مظروف پس اصل وجہ اس کے ظرف بنانے کی یہ ہے کہ چونکہ ظرف اپنے مظروف پر محیط ہوتی ہے اور مظروف اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتا گویا اس میں ایسا ہی مقید اور محبوس ہوتا ہے جیسا کہ ایک قیدی شخص مضبوط قلعہ میں مقید ہوتا ہے اور اس سے رہائی اور مخلصی نہیں پا سکتا لہٰذا خاوند کریم نے یہاں پر ان لوگوں کو مظروف اور ریب کو ظرف بنا کر قاعدہ مذکورہ کے توسط اور ذریعہ سے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اوّل تو قرآن مجید کی حالت ایسی ہے کہ اس پر توجہ اور غور کرنے کے بعد اس کے منجانب اللہ ہونے میں ذرہ کے برابر بھی شک وریب ہر گز نہیں ہو سکتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم کو بالکل اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے۔

لیکن اگر فرض کیا جائے کہ کوئی نہایت حقیر اور نہایت ہی ضعیف جیسا ریب ہے تو پھر چاہئے کہ وہ تمہارے لئے روک نہ ہو سکتا لیکن اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ وہ نہایت حقیر اور ضعیف سا شک بھی تمہارے لئے ایسا روک بنا ہوا ہے جیسی کہ ظرف اپنے مظروف کے لئے روک اور مانع ہوتی ہے اور اس پر ایسی محیط ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس سے مخلصی نہیں پا سکتا تو پھر الخ پس اس اشارہ کے لئے اپنے اصل سے پھیر کر ریب کو بجائے مظروف ہونے کے ظرف بنایا گیا ہے۔ مِنْ سے اور یہ رَیْبٌ کے ساتھ متعلق ہے جس کو اہل علم کی اصطلاح میں صلہ کہا جاتا ہے یعنی یہ رَیْبٌ کے ساتھ متصل ہے۔

مَا۔ **(حضرت حکیم الامتؒ)** یہ مَا موصولہ ہے جس کے معنے جو کے ہوتے ہیں یا یہ موصوفہ ہے جس کے معنے شئے کے ہوا کرتے ہیں اور خواہ بمعنے جو ہو یا بمعنے شئے ہو بہر حال مراد اس سے کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) پس موصولہ ہونے کی صورت میں مِمَّا کے معنے ہوئے اس سے جو اور موصوفہ ہونے کی صورت میں ہوئے شئے یا کتاب سے اصل تو یہ ہے کہ جس چیز کی نسبت شک اور ریب ہوا کرتا ہے اس چیز پر فِیْ لا کر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز میں شک یا ریب ہے لیکن یہاں پر بجائے فِیْ کے مِنْ لا کر یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم شک میں ہو کتاب سے پس اس تبدیلی کی کوئی وجہ ضرور ہونی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ فِیْ تو ظرفیت کے لئے آتا ہے یعنی ایک چیز دوسری چیز میں ہے لیکن مِنْ جس طرح کسی امر اور چیز کی ابتداء بیان کرنے کے لئے آیا کرتا ہے اسی طرح سبب کے لئے بھی آتا ہے یعنی یہ ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے کہ جس چیز پر مِنْ آیا ہوا ہے وہ ماقبل کے لئے سبب ہے اور قرآن مجید وہ کتاب ہے جو کہ اسلامی سب عقائد سے ریب و شک رفع دفع کرنے کا نہایت اعلیٰ درجہ کا ذریعہ اور سبب ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ کی رسالت اور نبوت کے دلائل قرآن مجید کے باہر بھی ہیں اور قرآن مجید میں بھی بکثرت موجود ہیں پس اگر بیرونی دلائل سے مثل آپ کی عملی اور اخلاقی زندگی اور معجزات و خوارق اور تائیدات و تاثیرات کے کسی کا شک رفع نہ ہو۔ تو پھر قرآن مجید اس کے شک کو رفع کرنے کے لئے بڑا بھاری ذریعہ ہے لیکن جو مخالف اور عنید تھے وہ

بجائے اس کے دافع الشک وقاطع الریب [1] ہونے کے الٹا اس کو باعث شک اور موجب ریب ظاہر کرتے تھے مثلاً وہ عنید نامراد اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر شاعر، ساحر، مفتری وغیرہ کا الزام لگاتے تھے تو قرآن مجید ہی کے باعث لگاتے تھے پس بجائے رفع شک کے ان کے لئے بد ظنی کا موجب ٹھہرا اور وہ اپنے اقوال وافعال سے ایسا ہی ظاہر بھی کرتے تھے تو بجائے فِیْ کے مِنْ لا کر خداوند کریم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ قرآن مجید تو رفع شک اور دفع ریب کا اعلیٰ ذریعہ ہے۔

لیکن اگر فرض کیا جائے کہ اس نے رفع شک نہیں کیا تو یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس میں ہی خود شک ہو جائے اور اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ یہ قرآن بجائے دافع الریب ہونے کے تم کو خود اسی ہی کی ذات میں ریب ہو گیا ہے لیکن وہ ریب کبھی بھی ایسا قوی نہیں ہو سکتا کہ اس پر ایمان لانے سے روک دے پر اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ اس میں ایسا ریب ہے جو کہ ایمان سے روکتا ہے پر یہ تو ہر گز نہیں ہو سکتا کہ یہ بجائے رافع الشک ہونے کے خود شک کا موجب اور باعث اور سبب ہو جائے لیکن تمہارے خیال اور اظہار کے مطابق اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ یہ بجائے رفع شک کے خود شک کا موجب ہو گیا ہے تو پھر تم کو چاہئے کہ اس کے کسی ٹکڑے کی مثل لاؤ الخ۔

الغرض کہ مِنْ لا کر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید جیسی کتاب کو بجائے رافع الشک ہونے کے باعث شک ظاہر کرتے ہیں جس سے ان کی جہالت یا عناد اور جھوٹ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی جھوٹ کو اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فرما کر ظاہر کیا ہے۔

نَزَّلْنَا۔ تَنْزِیْلٌ سے بنایا ہوا ہے جس کے معنے ہیں اتارنے کے اور تَنْزِیْلٌ نزول سے نکلا ہوا ہے جس کے معنے اترنے کے ہیں پس نَزَّلْنَا کے معنے ہوئے اتاری ہم نے۔

(حضرت مولانا حکیم الامتؒ) بہت سے مفسرین نے اِنْزَالٌ اور تَنْزِیْلٌ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تَنْزِیْلٌ کہتے ہیں کسی شئے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرنے کو لیکن یہ درست نہیں کیونکہ قرآن کا استعمال صراحۃً اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید

[1] ۔ شک وشبہ کو دور کرنے والا۔ (از مرتب)

میں صاف آیا ہے کہ لَوۡ لَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان:33)(کیوں اس پر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل نہیں کیا گیا) اور آیا ہے لَنَزَّلۡنَا عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوۡلًا (بنی اسرائیل:96)(ضرور ہم ان پر فرشتہ رسول اتارتے) اور آیا ہے لَوۡ لَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ (الانعام:38)(اس پر کیوں کوئی آیت نہیں اتاری گئی) ان آیات کریمہ میں نُزِّلَ آیا ہے جو کہ تنزیل سے بنایا ہوا ہے حالانکہ ان مقامات پر ٹکڑے ٹکڑے اتارنے کے کچھ ہی معنے نہیں بن سکتے لہٰذا ان سے صاف ثابت ہے کہ تنزیل ٹکڑے ٹکڑے ہی اتارنے کو نہیں کہتے بلکہ بعض دفعہ دفعۃً اتارنے کو بھی تنزیل کہہ دیتے ہیں نیز اس موقع پر بھی دوسری قرأت میں اَنۡزَلۡنَا آیا ہے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) مِمَّا نَزَّلۡنَا سے مراد تو کتاب یعنی قرآن مجید ہے پس اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے یہاں پر مِمَّا نَزَّلۡنَا فرمایا ہے اور مِنَ الۡكِتَابِ یا مِنَ الۡقُرۡاٰنِ کیوں نہیں فرمایا حالانکہ مِمَّا نَزَّلۡنَا سے بھی مراد تو کتاب اور قرآن مجید ہی ہے تو میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ مِمَّا نَزَّلۡنَا محض اظہار عظمت کے لئے اور اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ یہ کتاب ریب سے بالکل پاک اور بعید تر ہے اظہارِ عظمت تو بالکل ظاہر ہے اس لئے کہ ہر ایک جانتا ہے کہ کتاب کہنے یا قرآن کہنے سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا ہے کہ یہ احکم الحاکمین اور قادر مطلق اور حکیم و علیم خدا کی کتاب ہے اور نہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح خداوند کریم کے اور سب کام اپنے نہایت پر حکمت وغیرہ ہونے سے اپنے اندر بین اور روشن ترین نشان اس امر کے رکھتے ہیں کہ یہ خدائے حکیم کے ہیں اسی طرح اس میں بھی ضرور ہی ایسے امور ہوں گے جو اس کے منجانب اللہ ہونے کے لئے بین اور روشن ترین نشانات ہوں تاکہ پہلے امر سے اس کتاب کی عظمت کا اظہار ہو کر اس کے پس پشت ڈالنے میں سہل انگاری کا معیوب ترین ہونا ظاہر ہوتا اور امر دوم سے اس کتاب کا شک اور ریب سے بالکل پاک وصاف اور بہت بعید ہونا ثابت ہوتا۔ لیکن بخلاف مِمَّا نَزَّلۡنَا کے اس سے کم از کم اس کتاب کی یہ عظمت تو ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب اس خدائے علیم و حکیم اور قار مطلق احکم الحاکمین کی ہے جو کہ سب نقصوں سے پاک

اور سب صفات کاملہ کا جامع ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی اور اشیاء کی مانند یہ کتاب بھی ایسے امور پر ضرور ہی مشتمل ہوگی جو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کے واضح نشان ہوں گی۔ پس یہ وجہ ہے جس کے باعث بجائے کتاب یا قرآن فرمانے کے مِمَّا نَزَّلْنَا فرمایا گیا ہے۔

عَلٰی۔ اوپر، پر۔ عَبْدٌ۔ بندہ، غلام۔

(حضرت مولٰنا حکیم الامتؒ) عَبْدٌ۔ انسان کو کہتے ہیں خواہ نر ہو یا مادہ شریف اور آزاد ہو یا زر خرید ہو کیونکہ انسان خدا کے ہاتھ سے پرورش یافتہ ہے اور یہاں پر اس سے مراد ہمارے رسول حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) نَا کے معنے ہوتے ہیں ہمارے اور ان تینوں کے ملنے کے بعد معنے ہوں گے ہمارے بندے پر۔ یہاں پر یہ بات دریافت طلب ہے کہ عَلٰی عَبْدِنَا کو کیوں ایزاد کیا ہے کیونکہ اگر عَلٰی عَبْدِنَا نہ ذکر کیا جاتا تو بھی جو بات یہاں پر بیان کی گئی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے پس اس صورت میں اس کو کیوں ایزاد کیا۔ دوم یہ بھی دریافت طلب ہے کہ عَلٰی یہاں پر کیوں لایا گیا ہے حالانکہ انزال و تنزیل کے بعد اِلٰی اکثر لایا جاتا ہے۔ پس کیا وجہ ہے اِلٰی پر عَلٰی کو یہاں پر ترجیح دی گئی ہے۔

سوم یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ اگر نَزَّلْنَا کے بعد اس امر کا ذکر کرنا ضروری تھا کہ جس پر وہ اتاری گئی ہے وہ حضرت محمد رسول اللہؐ ہیں لیکن یہ بات تو عَلٰی مُحَمَّدٍ کہنے سے بھی پوری ہو جاتی تھی۔ پھر نَا بڑھانے کی کیا ضرورت پڑی تھی اور اگر مانا جائے کہ نَا کا ذکر کرنا ضروری تھا تو پھر بجائے عَبْدِنَا کے رَسُوْلِنَا یا نَبِیِّنَا کہنے سے بھی یہ بات ادا ہو جاتی تھی خصوصیت سے عَبْدِنَا کیوں فرمایا گیا ہے۔ پس ان سب سوالوں کے جواب یہ ہیں کہ عَلٰی عَبْدِنَا کو ایزاد تو اس وجہ سے کیا ہے تاکہ ان کی مخالفت کے منشا کا اظہار کیا جائے اور بتایا جائے کہ باوجود ریب نہ ہونے کے مخالفت کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہ تھی جس کے باعث وہ معذور ہو سکتے۔

بلکہ ان کی مخالفت کی وجہ فقط اسی قدر ہے کہ اللہ کریم نے اس کتاب کو ایک بندے

پر کیوں اتارا ہے اور عَبْدٌ کا لفظ بھی اسی وجہ سے اختیار کیا ہے کہ اس میں ان کی تردید ہے اور وہ یہ ہے کہ کتاب کا نازل کرنا تو ایک فضل ہے اور ورثہ نہیں اور فضل فضل کرنے والے کے منشاء پر مبنی ہوتا ہے ہاں فضل کے لئے کوئی جاذب چاہے اور وہ عرف عام کے مطابق عبودیت ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب دنیا اگر کسی کو انعام دیتی ہے تو محض عبودیت سے دیتی ہے نہ اور چیز سے۔ پس اگر خداوند کریم نے اپنے ایک خاص بندے پر اس کی اعلیٰ درجہ کی عبودیت کے باعث یہ عظیم الشان فضل کر دیا کہ اس کو کتاب دے دی تو اس میں حرج کیا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر خداوند کریم نے اسی بات کی تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (البقرۃ:91) (یعنی اس بات سے سرکشی کرنے کے لیے کہ خدا کیوں اتارے اپنا کچھ فضل جس بندہ پر کہ چاہے) اور اِلٰی پر عَلٰی کو اس مقام پر اس لئے ترجیح دی گئی ہے کہ عَلٰی جب انزال سے بعد آیا کرتا ہے تو یہ اتاری ہوئی چیز کی عظمت اور بزرگی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کسی چیز کا دوسری چیز پر ہونا خصوصاً جبکہ دوسری چیز اپنی عظمت میں مشہور اور مسلم ہو پہلی چیز کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا جب انزال کے بعد عَلٰی آئے گا تو وہ مُنَزَّل چیز کی عظمت پر آگاہ کرے گا بخلاف اِلٰی کے کہ وہ عظمت پر دلالت نہیں کرتا اور چونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ مقام چاہتا ہے کہ کتاب کی عظمت ظاہر کی جائے جو کہ مُنَزَّل ہے لہٰذا عَلٰی لایا گیا ہے نہ اِلٰی اور نَزَّلْتُ عَلٰی عَبْدِیْ کے ساتھ بھی یہی مضمون اداء ہو سکتا تھا یعنی اگر بجائے جمع کے مفرد لایا جاتا تو بھی یہ مضمون اداء ہو جاتا تھا لیکن اظہار عظمت ہی کے لئے یہاں پر جمع لایا گیا ہے جو کہ مفرد میں تعظیم کے لئے آیا کرتا ہے اور قاعدہ کلیہ کی طرح اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں وحدہٗ لاشریک خدا کے لئے جمع کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو وہ دو ہی طریق پر استعمال ہوتا ہے اوّل یہ کہ جس کام میں فرشتوں یا اور مخلوق کو خداوند کریم بطور آلات واوزار کے دخل دیتا ہے تو اس میں فعل کو بصورت جمع لاکر یہ ظاہر فرماتا ہے کہ اس میں اوروں کو بھی دخل ہے مثلاً هَدَيْنَاهُمْ (ہم نے ان کو سیدھی راہ بتائی) کیونکہ خداوند کریم

نے شریعت کو بذریعہ فرشتہ اتارا کرتا ہے اور پھر بذریعہ نبی اور اس کے مخلص خدام کے اس کی تبلیغ کرتا ہے اسی طرح خَلَقْنَاکُمْ (ہم نے تم کو بنایا) کیونکہ انسانوں کے پیدا کرنے میں والدین اور فرشتوں کو ایک قسم کا دخل ہوتا ہے۔

خواہ بہت خفیف اور ضعیف ہی کیوں نہ ہو پس چونکہ ہدایت یعنی سیدھی راہ دکھانے میں اور انسانوں کے بنانے میں اور چیزوں کے لئے بھی کسی قدر ایک قسم کا دخل تھا لہٰذا اس کے اظہار کے لئے بصورت جمع ذکر فرمایا ہے دوم محض تعظیم کے لئے بھی گاہے کسی لفظ کو بصورت جمع لایا جاتا ہے اور یہ اس موقع پر ہوتا ہے کہ اس کام یا چیز میں خداوند کریم کے ساتھ دوسرا کوئی شریک نہ ہو جیسا یَاعِبَادِیْ (اے میرے بندو) کیونکہ بندے تو خاص اللہ ہی کے لئے ہیں نہ کسی دوسرے کے لئے لہٰذا یہاں پر مفرد لایا گیا ہے لیکن جہاں پر اس کے لئے جمع آئی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (الکہف:66) (تو انہوں نے ہمارے بندوں سے ایک بندہ پایا) یہاں پر بجائے عِبَادِیْ کے عِبَادِنَا محض تعظیم کے لئے آیا ہے پس اس اصل اور قاعدہ کے مطابق نَزَّلْنَا میں تو جمع اس لئے بھی ہو سکتی ہے کہ اتارنے میں فرشتوں کا بھی دخل ہے لیکن عَبْدِنَا میں بجز تعظیم کے اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

غرض کہ عَبْدِنَا میں تو یقیناً جمع اظہار عظمت کے لئے ہے اور یہ مقام بھی اظہار عظمت کو چاہتا ہے گویا خداوند کریم نے یہ فرمایا ہے کہ کیا تم جانتے نہیں کہ جس کتاب کی مخالفت تم دیدہ و دانستہ کر رہے ہو وہ اس جلیل القدر اور عظیم الشان اور سخت پکڑنے والے احکم الحاکمین خدا کی اتاری ہوئی ہے جس کی پکڑ سے بہت ڈرنا چاہئے اور مقام کے لحاظ سے نَزَّلْنَا میں بھی اگر تعظیم کے لئے قرار دیا جائے تو یہ ہو تو سکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جمع تو تعظیم کے لیے تو وہاں پر لیا جاتا ہے کہ جہاں پر خود جمع نہ ہو سکتی ہو پر ہم بتا چکے ہیں کہ نَزَّلْنَا میں جمع ہو سکتی ہے کیونکہ کتاب کے نازل کرنے میں خداوند کریم کے ساتھ فرشتوں کا بھی شمول ہے اور علاوہ حضرت جبرائیلؑ کے اور نگاہبان فرشتے بھی ہوتے ہیں اور سورۂ جن میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے جہاں پر یہ فرمایا ہے) کہ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا الخ (الجن:9) (تو ہم نے پایا اس کو کہ بڑے سخت نگاہبانوں سے پُر کیا گیا ہوا ہے۔)

پس جب نَزَّلْنَا میں جمع درست ہو سکتی ہے تو پھر اس کو جمع سے نکال کر محض تعظیم کے لئے نہیں بنالیا جاسکتا ہاں رہی یہ بات کہ یہ مقام اس بات کے اظہار کو چاہتا ہے کہ قرآن مجید کے انزال میں اوروں کے لئے بھی دخل ہے تاکہ اس بات کے اظہار کے لئے جمع کا لانا صحیح ہو سکے تو واضح ہو کہ بے شک مقام ضرور چاہتا ہے کہ اس بات کا اظہار کیا جائے کہ قرآن مجید کے اتارنے میں اوروں کو بھی دخل ہے کیونکہ اوروں کا دخل اگر ہے یا ہو سکتا ہے تو خاص پہنچانے کے اندر حفاظت اور نگہبانی میں چنانچہ خدا کے ہاں سے فرشتوں کی حراست میں حضرت جبرئیل نے آنحضرتؐ تک پہنچایا ہے تو جمع لاکر اوروں کا ساتھ ہونا اسی لئے ظاہر کیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ خداوند کریم کے پاس یہ قرآن مجید بڑی حفاظت کے ساتھ آنحضرتؐ تک پہنچا ہے اور یہ مقام اس بات کے اظہار کو بے شک چاہتا ہے۔

پس گویا نَزَّلْنَا کو جمع لاکر خداوند کریم نے یہ بتایا ہے کہ اس کتاب میں تو کسی طرح شک ہو سکتا ہی نہیں مضامین کے لحاظ سے تو اس لئے کہ یہ کتاب ہماری اتاری ہوئی ہے اور ہم وہ علیم وحکیم ہیں کہ ہم پر نہ کوئی بات مخفی رہ سکتی ہے تاکہ غلطی ہو اور نہ ہم غیر حکیم ہیں کہ کوئی بات خلاف حکمت ہو کر موجب ریب ہو اور نہ ہمارے پاس سے محمد رسول اللہؐ تک پہنچنے میں کوئی شک کی گنجائش ہو سکتی ہے کیونکہ ہم نے جبرئیل امین کے ہاتھ فرشتوں کی حفاظت میں اپنے سامنے اتارا ہے جیسا کہ مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا (الجن:9)(سخت پہروں سے پُر پایا ہے) اور فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (الجن:28)(پس بے شک وہ چلتا ہے آگے پیچھے نگہبانی کے لئے) وغیرہما سے ثابت ہے اور جس طرح پہلی بات تنزیل کے خدا کی طرف نسبت کرنے سے مفہوم ہوتی ہے اسی طرح یہ نَزَّلْنَا کے جمع لانے سے پائی جاتی ہے۔

اور نہ محمد رسول اللہؐ کی وجہ سے کسی قسم کا شک ہو سکتا ہے کیونکہ محمد تو ہمارا بندہ ہے اور ہماری سنت یہی ہے کہ ہم اپنے ایسے بندوں کے لئے خاص امتیازی نشان مقرر کر دیا کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ کسی پر مشتبہ نہیں رہ سکتے جیسے کہ دنیوی حکام کے ملازم اپنے خاص نشانوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور کسی پر مشتبہ نہیں ہوتے اور ہماری رضامندی کے آثار ان پر نمایاں ہوتے ہیں اور وہ ہرگز ہماری مرضی کے خلاف نہیں کرتے چہ جائیکہ ہم پر افتراء

کرنے کے عظیم الشان جرم کا ارتکاب کریں ہماری اس تقریر سے نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا اور نَا اور عَبْدٌ کے ذکر فرمانے کی ایک اور وجہ بھی ثابت ہوگئی ہے۔

فَ۔ پس، لہٰذا، تو۔ تو پھر

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) یہ فَاء جوابیہ یعنی جزائیہ ہے جو کہ شرط کی جزاء پر آیا کرتی ہے پس اس کتاب کی نسبت شک میں ہونا شرط ہے اور اس کی مثل ایک ٹکڑا لانا جزاء ہے اور اس پر جو لفظ فَ آیا ہے وہ جزائیہ ہے۔

اِئْتُوْا۔ اِتْیَانٌ سے ہے جو بمعنے آنے کے ہیں اور جب اس کے بعد بَاء آجائے تو اس کے معنے بجائے آنے کے لانے کے ہو جاتے ہیں اور جو فعل اِتْیَانٌ کی مانند اپنے فاعل یعنی کرنے والے ہی تک بند رہے تو اس کے بعد بَاء آنے سے ایسا ہی تغیر ہوتا ہے جیسا کہ یہاں پر ہوا ہے جیسا کہ ہم نے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں بتایا ہے کہ ذَهَبَ اللّٰهُ کے معنے ہیں اللہ گیا لیکن اس کے بعد چونکہ بَاء آئی ہوئی ہے لہٰذا اس کے یہاں پر یہ معنی ہیں کہ اللہ لے گیا تو اِئْتُوْا کے معنی ہوئے تم آؤ لیکن چونکہ اس کے بعد باء آئی ہوئی ہے اس وجہ سے اس کے معنے ہوئے تم لاؤ۔

(حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ) نے فرمایا ہے کہ اِتْیَانٌ خیر اور شر اور ذات اور صفات میں عام طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن اب بمعنے مطلق کام کرنے کے آتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى (التوبۃ:54) اور نماز نہیں پڑھتے لیکن اس حالت میں کہ وہ سُست ہوتے ہیں) کیونکہ یہاں پر یَاْتُوْنَ معنے مطلق نماز پڑھنے کے آیا ہے نہ بمعنے آنے یا لانے کے جیسا کہ دراصل اِتْیَانٌ آنے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن یہاں پر فَأْتُوْا اصلی معنوں میں نہیں بلکہ بمعنی لانے کے آیا ہے۔ اسی طرح ب بمعنی ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن یہاں پر اس کا بھی فائدہ ہے کہ اِئْتُوْا جس کے معنے تھے آؤ اب بمعنے لاؤ کے ہو گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ قرین قیاس ہے کہ یہاں پر بھی ب کے معنے ساتھ ہی کے ہوں اور اِئْتُوْا کے اصلی معنوں میں بھی کوئی تغیر نہ کیا جائے بلکہ اس کے معنے بھی آؤ کئے جاویں تو پھر سب کے یہ معنے ہوں گے تو آؤ تم ساتھ

کسی سورت کے اور ظاہر ہے کہ کسی سورت کے ساتھ آنے کے بلفظ دیگر یہی معنے ہوتے کہ تم لے آؤ کوئی سورت۔

پس خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ بَاء کو خواہ اپنے اصلی معنوں میں لیں یا اس کو اصلی معنوں سے خالی قرار دے کر محض پہلے فعل کے معنے بدلانے کا ذریعہ قرار دیں بہر حال دونوں کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے اور یہاں پر دونوں صورتوں میں معنے یہی ہوں گے کہ تم لاؤ کوئی سورت الخ اور سورت کو ال سے اس لئے بھی خالی لایا گیا ہے تاکہ عموم پر دلالت کرے یعنی کوئی سورت لاؤ خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

مِنْ۔ سے۔

(حضرت مولانا حکیم الامتؒ) یہ مِنْ تبعیض کے لئے ہے یعنی جو شئے اس کے بعد ہے اس کے کچھ حصہ پر دلالت کرتا ہے اور یا یہ مِنْ بیانیہ ہے جو کہ بمعنے اَلَّذِیْ هُوَ (جو کہ) کے آتا ہے۔

مِثْلٌ مشابہ کو کہتے ہیں اور مِثْلِهٖ میں جو ہٖ ہے اس کے معنے اس ہیں۔ اور مَا کی طرف پھرتی ہے جو کہ مِمَّا میں ہے اور جس سے مراد کتاب ہے۔ پس بلفظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ہٖ کتاب کی طرف پھرتی ہے اور بعض مفسرین اس کو عبد کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

(محمد سرور) پس اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ تو لاؤ کوئی سورت ہمارے بندے کی مثل سے یعنی محمدؐ جیسے سے جو کہ امی ہے اور اگر ہٖ کو مَا کی طرف پھیرا تو پھر مِنْ یا تبعیض کے لئے ہو گی یا بیان کے لئے پہلی صورت میں معنے یہ ہوں گے تو لاؤ تم کوئی ٹکڑہ جو کہ اس کتاب کی مثل میں سے ہو اور دوسری صورت میں یہ ہوں گے تو لاؤ کوئی ٹکڑہ جو کہ اس کتاب کی مثل ہو اب رہا یہ فیصلہ کہ ہٖ کا مَا یعنی کتاب کی طرف پھیرنا ٹھیک ہے یا کہ عبد کی طرف اور دوسرا یہ فیصلہ کہ مِنْ بعضیہ ٹھیک ہے یا بیانیہ۔ پس واضح ہو کہ یہ دونوں فیصلے قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ کر دیئے ہوئے ہیں۔

لیکن باوجود قرآن مجید کے بیّن فیصلہ کے پھر بھی مفسرین میں اس وجہ سے نزاع پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید سے قرآن مجید کی تفسیر تلاش نہیں کرتے اور محض اپنے خیال

سے احتمالات ایجاد کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور پھر ہر ایک ایسا نیا احتمال ان کے نزدیک مایۂ ناز ہوتا ہے ہ کے کتاب یا آنحضرتؐ کے طرف پھرنے میں جو نزاع ہے اس کے فیصلہ کے لئے چند آیات لکھتا ہوں قرآن مجید کی مکی اور مدنی سورتوں میں یہی مضمون بار بار بیان کیا گیا ہے۔ سورہ یونس میں آیا ہے۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ (یونس:39) (کیا کہتے ہیں اس نے یہ افتراء کی ہے کہہ دے پس تم لاؤ کوئی سورت اس کی مثل) اور سورہ ہود میں آیا ہے اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ (ھود:14) (کیا کہتے ہیں کہ اس نے یہ افتراء کی ہے پس تم لے آؤ اس کی مثل افتراء کی ہوئی دس سورتیں) اور سورۂ طور میں آیا ہے فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖ (الطور:35) (پس لائیں اس کی مثل کوئی بات) اور سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ الخ (بنی اسرائیل:89) (کہہ دے اگر سب انسان اور جن اس بات پر جمع ہوں کہ اس قرآن مجید کی مثل لائیں تو اس کی مثل ہرگز نہ لا سکیں گے الخ۔)

اب ہر ایک عقلمند غور کر سکتا ہے کہ ان سب آیات میں بجز اس کے اور کچھ معنے بن سکتے ہی نہیں کہ ان سے قرآن مجید کی مثل ایک یا زیادہ سورتیں مانگی گئی ہیں اور ان میں ہرگز ہرگز یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت محمد رسول اللہ کی مثل سے ایسی سورت یا سورتیں یا بات یا کتاب لاؤ بلکہ بعض میں تو صاف صاف بِمِثۡلِ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنِ فرما دیا ہے پھر اس کے علاوہ ان آیات میں سے بعض میں اس بات کا اظہار کرنا کہ اگر سب انسان اور جنّ اتفاق کر کے ایسی سورت یا کتاب لانی چاہیں تو کبھی نہ لا سکیں گے اور بعض میں یہ کہنا کہ ایسی کتاب لانے کے لئے تم اللہ کے سواء اپنے سب مددگار بھی بلالو یا ان کے مشابہ اور ایسی باتیں فرمانا جن سے ایسی کتاب کے لانے والوں کا دائرہ وسیع کرتی ہیں۔

یہ سب باتیں اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ کوئی سورت یا سورتیں لانے میں ان کو ہرگز اس شرط سے مقید نہیں کیا گیا کہ ایسے شخص سے لائیں جو محمد رسول اللہؐ جیسا ہو بلکہ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے ان کے لئے اس امر میں میدان وسیع کر دیا ہے کہ خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں یا سب ہوں جاہل ہوں یا عالم ہوں مرید ہوں یا پیر ہوں

عجم ہوں یا عرب ہوں پھر ہر ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ جس شخص سے وہ سورت لاویں وہ ہر ایک بات میں حضرت محمد رسول اللہؐ جیسا ہو اور اگر تخصیص کی جاوے جیسی کہ ان مفسروں نے کی ہے کہ اُمّی ہونے میں آنحضرتؐ کی مانند ہو تو اوّل تو یہ اپنے پاس سے تخصیص کرنی پڑتی ہے حالانکہ قرآن مجید تعمیم کر رہا ہے۔

اور دوم یہ کہ اس تخصیص سے حجت اور دلیل کی شان بالکل کم ہو جاتی ہے کیونکہ ایک بچہ بھی سوچ سکتا ہے کہ یہ کہنا کس قوت اور پایہ کی بات ہے کہ تم اس کی مثل ایک سورت لاؤ اور جہاں تک تم سے ہو سکتا ہے اپنے مدد گاروں کو بھی مدد کے لئے بلالو اور یہ کہنا کس پایہ اور مرتبہ کی بات ہے کہ تم ایک سورت لاؤ پر شرط یہ ہے کہ وہ سورت بنانے والا پڑھا ہوا ہر گز نہ ہو بلکہ وہ بالکل امی محض اور ناخواندہ ہو۔

پس عقلمند غور کر سکتے ہیں کہ ناخواندہ ہونے کی شرط سے یہ دلیل کیسی کمزور ہو جاتی ہے بلکہ یہ دلیل اس صورت میں اگر پوری ہو بھی جائے تو بھی اس سے یہ بات ہر گز ثابت نہ ہو گی کہ یہ خدا کا کلام ہے بلکہ اسی قدر ثابت ہو گا کہ یہ ایک ایسے ناخواندہ کی کتاب ہے جو کہ سب ناخواندوں سے بڑھ کر ہے بخلاف پہلی صورت کے کہ اس سے یہ ثابت ہو گا کہ یہ خدا کا کلام ہے کیونکہ جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بے مثل ذات کے صفات اور افعال بھی بے مثل ہوتے ہیں اور ذی مثل چیز کے صفات اور افعال بھی ذی مثل ہوتے ہیں اور یہ ثابت شدہ بات ہے کہ اس کتاب کی مثل نہیں ہے تو یقیناً اس سے ثابت ہو گا کہ پھر یہ اس ذات کا کلام ہے جس کی ذات اور صفات وافعال بے مثل ہیں نہ اس کا کلام ہے جو اپنی ذات اور صفات وافعال میں مثل رکھتا ہے غرض کہ اس کا بے مثل ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

غرض کہ ہٖ عبد کی طرف ہر گز نہیں پھر سکتی بلکہ ان سب دلائل سے بخوبی ثابت ہے کہ ہٖ مَا یعنی کتاب کے طرف پھرتی ہے اور بس۔ اب رہا دوسرا فیصلہ کہ مِنۡ مِّثۡلِہٖ میں جو مِنۡ ہے یہ بیانیہ ہے یا بعضیہ ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ مِنۡ میں اسی قدر خلاف نہیں ہے جو کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بلکہ بعض کا قول ہے کہ یہاں پر یہ مِنۡ ابتدائیہ ہے جیسا اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ (النمل:31)(بے شک وہ سلیمان کی

جانب سے ہے) میں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مِنْ زائد ہے اور امام اخفش کا بھی یہی خیال ہے اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ دوسری ایک آیت میں آیا ہے فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (یونس:39) (پس لاؤ تم کوئی ٹکڑہ جو اس کی مانند ہو) اور آیا ہے فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ (ھود:14) (تو لے آؤ اس کی مانند دس سورتیں) اور ان دونوں میں مِنْ موجود نہیں ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پر جو مِنْ آیا ہے یہ ضرور زائد ہے پس سب مل کر چار قول اس مِنْ میں ہو گئے اوّل یہ کہ بعضیہ ہے دوم یہ کہ بیانیہ ہے سوم یہ کہ ابتدائیہ ہے چہارم یہ کہ زائد ہے۔

جو آیات کریمہ کہ پہلے فیصلہ میں ہم نے لکھی ہیں وہی اس دوسرے نزاع کو بھی فیصلہ کر دیتی ہیں اس طرح پر کہ ان سب آیات میں بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ یا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖ یا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰن آیا ہے اور ان سب کے یہی معنے ہیں کہ تم ایسی سورت یا بات یا کتاب لاؤ جو کہ قرآن مجید کی مثل ہو تو جب ان سب آیتوں میں بالاتفاق یہ مضمون ادا ہوا ہے کہ وہ سورت وہ بات وہ کتاب قرآن کی مثل ہو تو اب اس سے ہر ایک عقلمند فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اقوال میں سے جس قول میں آیت مذکورہ کے معنے ان آیات کے مذکورہ بالا معنوں کے مطابق ہوتے ہوں وہ قول یقیناً درست ہے۔ اور جس میں اس کے معنے ان کے معنوں کے موافق نہ ہوتے ہوں وہ قول یقیناً غلط اور خطاء ہے خواہ اس کا قائل کسے باشد۔ اب میں چاروں قولوں کے بترتیب مذکورہ معنے بیان کر دیتا ہوں مِنْ بعضیہ ہونے کی صورت میں معنے یہ ہوں گے۔

پس لاؤ تم ایک سورت جو کہ قرآن مجید کی مثل کتاب میں سے بعض اور کچھ حصہ ہو یعنی کوئی کتاب ہو جو کہ قرآن مجید کی مثل ہو اور اس کی بہت سی سورتوں میں سے کوئی ایک سورت وہ لائیں اور اگر مِنْ بیانیہ ہو تب یہ معنے ہوں گے پس لاؤ کوئی سورت جو کہ اس کی (یعنی قرآن مجید کی) مثل ہو اور اگر ابتدائیہ ہو تب یہ معنے ہوں گے پس لاؤ کوئی سورت اس کی طرف اور پاس سے اور زائد ہونے کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے پس لاؤ کوئی سورت اس کی مثل۔

پس ان چاروں قولوں پر اس کے معنے یہ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دوسرے اور چوتھے قولوں کے مطابق جو معنے کئے گئے ہیں وہ آیات مذکورہ بالا کے معنوں کے مطابق ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت یہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ سورت یا بات یا سورتیں یا کتاب قرآن مجید کی مثل ہو اور یہاں پر بھی بعینہٖ یہی مطلب ہوتا ہے اور پہلے اور تیسرے قول کے مطابق جو معنے کئے گئے ہیں وہ یقیناً آیات مذکورۃ الصدر کے معانی کے مخالف ہیں اوّل تو اس وجہ سے کہ آیات مذکورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی سورت وغیرہ ایسی لاؤ جو کہ قرآن مجید کی مثل ہو اور پہلے قول کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی سورت لاؤ پر وہ سورت کسی ایسی کتاب کی جزو اور حصہ ہو جو کہ قرآن مجید کی مثل ہو۔

پس آیات مذکورہ سے تو ایسی سورت وغیرہ کا لانا کافی معلوم ہوتا ہے جو کہ قرآن مجید کی مثل ہو اور اس کے علاوہ گھر پر کسی ایسی کتاب کا ہونا ضروری نہیں معلوم ہوتا جو کہ قرآن مجید کی مثل ہونے کے علاوہ ایسی بھی ضرور ہو کہ پیش کردہ سورت وغیرہ اس کی جزو ہو اور وہ اس کے لئے کل ہو اور پہلے قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی سورت لانے سے علاوہ گھر پر کسی ایسی کتاب کا ہونا بھی ضروری اور لازم ہے جو کہ علاوہ قرآن مجید کی مثل ہونے کے اس سورت وغیرہ کے لئے کل ہو جو پیش کی گئی ہے اور تیسرا اس لئے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سورت کسی اور کتاب یا شخص کی طرف سے ہو جو کہ قرآن مجید یا محمد رسول اللہؐ کی مثل ہو اور آیات مذکورہ میں اس بات کے طرف اشارہ تک نہیں ہے ہاں چوتھے قول کی نسبت دو باتیں ملحوظ رہیں اوّل یہ کہ زائد کے اگر یہ معنے ہیں کہ بالکل بے معنے اور بے فائدہ ہے تب تو چونکہ ایسا ہونا قرآن کریم اور خدائے حکیم کی شان سے بالکل بعید ہے کہ اس میں یا اس سے ایسا عبث امر ہو لہٰذا اگر زائد کے یہ معنے ہوں تب تو یہ قول عبث لازم آنے کے باعث ناجائز ہے۔

اور اگر زائد کے یہ معنے ہیں کہ جو اصل معنے ہیں ان سے خالی ہے اگرچہ اور کسی مفید فائدہ پر مشتمل ہے تب اس میں کوئی حرج نہیں ہاں اب یہ دیکھنا ہوگا کہ یہاں پر مِنْ کا کیا فائدہ ہے تو واضح ہو کہ مِنْ زائد آتا ہے اور بہت آتا ہے اور نفی کے بعد کثرت سے آیا کرتا ہے یہاں

تک کہ اکثر کا یہ قول ہے کہ نفی کے سواء یہ زائد آتا ہی نہیں اور جہاں کہیں زائد ہوتا ہے وہاں پر لازماً اس کا فائدہ تعمیم ہوتا ہے جیسا قرآن مجید میں ہے مَامِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ (آل عمران:63) (اللہ کے سوائے کوئی ایک بھی معبود نہیں) تو جب یہ ثابت ہے کہ جہاں پر یہ زائد ہوتا ہے وہاں پر ضرور تعمیم کا فائدہ دیتا ہے تو پھر یہاں پر بھی اس کا فائدہ تعمیم ہی ہونا چاہئے۔

اور جو کہتے ہیں کہ نفی کے بعد اس کا فائدہ تعمیم ہے اس کی بناء اس پر ہے کہ تعمیم کا فائدہ یہ تب دیتا ہے کہ زائد ہو اور ان کے نزدیک زائد تب ہی ہوتا ہے کہ نفی کے بعد ہو لہٰذا مِنْ زائد تعمیم کا فائدہ یہی ان کے نزدیک تب ہی دے گا کہ نفی کے بعد ہو لیکن جو اثبات میں بھی اس کو زائد مانتے ہیں ان کے نزدیک اثبات میں بھی یہ تعمیم کا فائدہ دے سکے گا۔ پس یہاں پر معنے یہ ہوں گے پس لاؤ کوئی سورت جو کسی قسم کی اس کے ساتھ مماثلت رکھتی ہو یعنی سب کمالات میں اس کے ساتھ پوری مماثلت رکھنے والی نہ سہی ناقص مماثلت ہی والی لے آؤ۔

وَ۔ اور۔ اُدْعُوْا۔ دُعَاءٌ سے ہے، جس کے معنے پکارنے کے ہیں۔ پس اُدْعُوْا کے معنے ہوئے تم بلاؤ۔

شُھَدَاءُ۔ **(حضرت حکیم الامتؒ)** نے فرمایا ہے کہ شُھَدَاءُ۔ شَھِیْدٌ کی جمع ہے اور شہید اس کو کہتے ہیں جس کا حاضر ہونا معتدبہ اور قابل اعتبار ہو۔ پس اس صورت میں اس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو کہ معاملات کے حل وعقد میں دخیل ہوں اور بمعنے حاضر اور قائم بالشہادت (یعنی شہادت ادا کرنے والے اور ناصر وامام کو بھی کہتے ہیں۔)

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) کُمْ۔ تمہارے۔

اور یہاں پر شُھَدَاءُ کے یہ سب معنے درست ہوسکتے ہیں اور اُدْعُوْا شُھَدَاءَ کُمْ کے معنے ہوئے تم بلاؤ اپنے شہداء کو۔ پس اگر شہداء بمعنے اوّل ہو اتب اس سے مراد ان کے وہ بڑے اور عظیم الشان لوگ ہوں گے جو کہ بڑے کاموں کے انصرام میں دخل رکھتے ہوں اور اگر بمعنے حاضر ہو اتب اس سے یہ مراد ہو گی کہ جو لوگ تمہاری مجلسوں میں حاضر ہوتے یا ہوسکتے ہیں ان سب کو تم اس فیصلہ کے لئے بلالو اور اگر بمعنے قائم بالشہادت ہو تب اس سے

مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کو تم اپنے لئے گواہ خیال کر سکتے ہو۔ ان سب کو بلالو۔ اور اگر بمعنے ناصر ہو تب تو اس کی مراد ظاہر ہے کہ تم اپنے مدد گار بلالو۔ اور اگر بمعنے امام ہے تب اس سے مراد یہ ہے کہ اس فیصلہ کے لئے تم اپنے میں ہی سے کسی کو حکم اور امام بنا کر اس کو بلالو اور میں نے پہلے بارہا بتایا ہے کہ قرآن مجید بعض وقت ایسا لفظ اختیار فرماتا ہے کہ جس کے بہت سے معانی ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک وہاں پر مراد ہو سکتا ہے تا کہ ایک لفظ کے ساتھ بہت سے معانی ادا کر کے بہت سے امور کو ایک لفظ کے ساتھ بیان فرمادے اور اسی اصل کے مطابق یہاں پر بھی کیا گیا ہے تا کہ اس اتمام حجت کے لئے اور اس کی طاقت اور قوت کے لئے جن جن لوگوں کے بلانے اور ان سے مدد لینے کی ضرورت ہو سکتی تھی ان سب کو ایک ہی لفظ کے ساتھ ذکر کر دے خصوصاً مدد گاروں اور اپنے میں سے حکم اور منصف کے بلانے کا ان کو اختیار دینا اس دلیل کی طاقت کو لا انتہاء درجہ تک پہنچاتا ہے۔

مِنْ۔ سے۔ دُوْنَ۔ پاس، قریب، مکان جس میں کسی قدر پستی ہو۔ پس مِنْ دُوْنَ کے معنے ہوئے قریب سے، پاس سے، نزدیک سے۔

اللہ۔ اسم ذات ہے جس کے معنے بیان ہو چکے ہیں۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اللہ کے پاس سے، یعنی اللہ سے ورے ورے جو اور شہداء تمہارے ہیں ان سب کو بلاؤ چونکہ مِنْ دُوْنِ کا حاصل مطلب یہ ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے لہٰذا عام طور پر اس کا بامحاورہ ترجمہ ماسواء۔ یا سوائے کرتے ہیں۔ پس اس کے مطابق اس کے معنے ہوں گے اللہ کے سواء۔

اِنْ۔ اگر۔ کُنْتُمْ۔ تم تھے۔ اس کی تشریح بھی گذر چکی ہے۔

صٰدِقِیْنَ۔ صادق کی جمع ہے، جس کے معنے ہیں سچا، مضبوط، قوی، اور صالح، قابل اور یہاں پر پہلے معنے ہیں۔ سب کے معنے ہوئے اگر تم سچے تھے یا اگر تم سچے ہو۔ رہی یہ بات کہ کس امر میں سچے ہو تو ما قبل کے بیان سے صاف ثابت ہے کہ یہ کہنے میں کہ ہم شک میں ہیں یعنی اگر تم یہ کہنے میں سچے ہو کہ ہم شک میں ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ما قبل سے ظاہر ہے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر کیا کرو کیونکہ ما قبل سے ظاہر ہے کہ وہ یہ ہے کہ اگر تم

یہ کہنے میں سچے ہو کہ ہم اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے سے شک میں ہیں تو پھر ضرور اس کی مثل کوئی سورت لاؤ۔

سب کا ترجمہ یہ ہوا اور اگر تم شک میں تھے (یا ہو یا رہتے ہو) اس سے (یا کتاب سے) جو اتاری ہے ہم نے اپنے بندے پر تو پھر لاؤ کوئی سورت (یا کوئی ایک سورت بھی) اس کی مثل اگر تم سچے تھے (یا ہو۔)

(ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز اردو جلد 6 نمبر 6 صفحہ 21 تا 40 سن 1907ء)

وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ الخ کے الفاظ کی تشریح اور ترجمہ بسط کیساتھ ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے اور تشریح الفاظ کے ضمن میں اس کے مضامین کا اہم حصہ بیان ہو چکا ہے اور بہت سے سوالات کے جواب بھی درج ہو گئے ہیں اور اس کا خلاصہ مضمون یہ ہے۔ میں نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ ہر ایک سورۃ کا ایک امر اصل مدعا اور دعویٰ ہوتا ہے اور باقی کچھ تمہید اور کچھ دلائل اور کچھ اعتراضوں کے جوابات اور کچھ اس مدعا کے حاصل کرنے کے ذرائع اور طریق اور موانع اور اس کے متعلقہ امور بیان کئے جاتے ہیں اور کہ اس سورۃ کا اصل دعویٰ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ (البقرۃ:3) ہے اور اس کے بعد اس کی غرض اور فائدہ کا اور اس کے متعلقہ چند امور کا بیان ہے۔ اور یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا الخ (البقرۃ:22) میں اس کے حاصل کرنے کا طریق کا بیان ہوا ہے اور وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ الخ (البقرۃ:24) سے دو مقصد پورے کئے ہیں مقام کے لحاظ سے تو یہ ان کے ایک عذر رکیک کا رفع ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم نے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا الخ (البقرۃ:22) میں اصل مدعا کے حاصل کرنے کا جو طریق عنایت فرمایا ہے اس کی نسبت وہ یہ عذر بیان کرتے تھے کہ جب تک انسان کو اس امر کا یقین حاصل نہیں ہوتا کہ جو طریق فلاں امر یا غرض کے حاصل کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے فی الحقیقت اس سے یہ مقصد ضرور ہی حاصل ہو جاوے گا تو تب تک وہ نہ اس طریق کو استعمال کرتا ہے اور نہ ارادت سے اس کے اختیار کرنے کے لئے اس کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

اور جو طریق یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ میں بیان ہوا ہے اس کے مفید ہونے کا یقین تب ہو کہ پہلے

اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کا ہمیں یقین حاصل ہو جو کہ اب تک نہیں ہے بلکہ ہم اب تک اس کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت شک میں ہیں اور اگرچہ ان کا یہ عذر محض بناوٹی اور جھوٹ تھا اور کوئی قابل اعتبار شک ان کے دل میں نہ تھا جو کہ حقیقۃً اس کتاب پر ایمان لانے سے صحیح طور پر مانع ہو سکتا ہو اور اصل بات یہ تھی کہ محض اس ضد سے نہ مانتے تھے کہ محمدؐ پر یہ کتاب کیوں نازل ہوئی جیسا کہ خداوند کریم نے بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (البقرۃ:91) (اس امر سے سرکشی کرنے کے لئے کہ خداوند تعالیٰ جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے کچھ اپنا فضل اتار دے) یعنی اس ضد سے (کہ اللہ عزوجل نے محمدؐ پر یہ کتاب کیوں نازل فرمائی ہے) وہ قرآن مجید پر ایمان نہ لاتے تھے اور یہ جھوٹا عذر پیش کرتے تھے کہ ہمیں اس میں شک ہے حالانکہ حقیقت میں وہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:147) کے بے شک بے شک مصداق تھے اور اپنے سچے مشبہ بھم فرعون اور فرعونیوں کے مطابق وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا[1] (النمل:15) ان کی واقعی حالت کا صحیح نقشہ تھا لیکن خدائے حکیم نے نہ پسند کیا کہ ان کا کوئی جھوٹا اور بناوٹی رکیک سے رکیک عذر بھی باقی رہے لہٰذا خداوند حکیم نے وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ کے ساتھ اس جھوٹے عذر کا قلع قمع کر دیا یعنی اگر تم اس بات میں صادق ہو کہ تم اس کتاب کی نسبت شک میں ہو جو کہ ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو پھر تم اس کی مثل کوئی سورۃ لاؤ۔

پس اصل میں تو یہ ان کے مذکورہ بالا عذر کے رفع کرنے کے لئے ہے لیکن جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ معانی کثیرہ والا لفظ لے کر قرآن مجید بہت سے امور ایک لفظ کے ساتھ مختلف معانی کے ذریعہ سے بیان کرتا ہے اسی طرح بعض مقام پر ایک بات ذکر فرماتا ہے۔ جو کہ بہت سے کام دے سکتی ہے تو اس کو مناسب موقع پر ذکر کر کے اس سے بہت سے کام لے لیتا ہے۔ اور پھر طرفہ یہ کہ جو جو کام اس بات سے لیتا ہے ان میں سے ہر ایک کے لئے اشارہ اور قرینہ رکھ دیتا ہے تاکہ اس اشارہ یا قرینہ سے ان میں سے ہر ایک کا پتہ چل جائے۔

---

[1]۔ اور انہوں نے اصرار سے ظلم اور تکبر کرتے ہوئے ان (نشانوں) کا انکار کیا' حالانکہ ان کے دل ان پر یقین لا چکے تھے۔ (تفسیر صغیر)

چنانچہ یہاں پر بھی وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ الخ سے دو کام لئے ہیں اوّل تو ان کے عذر مذکور کا رفع کرنا اور اس کی تصریح وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ اور اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ کے ساتھ فرمائی ہے۔ دوم یہ کہ اس سورۃ کا جو اصل دعویٰ اور مدعا ہے اور وہ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ ہے اس کے ثابت کرنے کے لئے یہ پہلی وہ دلیل ہے جو کہ بظاہر تو غیر اہل کتاب کے لئے بیان ہوئی ہے لیکن حقیقت میں دونوں فریق کے لئے حجت ملزمہ ہے۔ بخلاف اس دلیل کے جو کہ اس کے بعد اہل کتاب کے لئے بیان ہوئی ہے کیوں کہ وہ اہل کتاب کی مسلمہ کتب سے پیش کی گئی ہے اور غیر اہل کتاب اس کے قائل نہ تھے لیکن یہ دلیل چونکہ عقلی ہے اور مسلمات پر مبنی نہیں لہٰذا اس کو کسی قوم سے خصوصیت بھی نہیں ہے اور اصل دعوے کی دلیل ہونے کی طرف فِیۡ رَیۡبٍ میں اشارہ ہے کیونکہ جب انسان اصل دعوے میں لَا رَیۡبَ پر اور یہاں پر فِیۡ رَیۡبٍ پر نظر کرے گا اور وَاِنۡ کُنۡتُمۡ الخ کی صورت سے اس کے ذہن میں یہ بات بھی ضرور آچکی ہوگی کہ یہ کلام کسی امر اور دعوے کی دلیل ہے تو لَا رَیۡبَ ضرور ہی اس کے ذہن میں یہ بات جانشین ہو جاوے گی کہ لَا رَیۡبَ والا کلام دعویٰ ہے اور فِیۡ رَیۡبٍ والا دلیل ہے۔

اور یہ دلیل علاوہ ایک عظیم الشان دائمی معجزہ ہونے کے ایسے کلی اور نہایت اعلیٰ درجہ کے قوی اور یقینی اصول پر مبنی ہے کہ جن کے باعث یہ قرآن مجید کے منکروں کے لئے ایسی حجت ملزمہ ہے کہ اس کے آگے کچھ چوں وچرا نہیں کر سکتے۔ دائمی معجزہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے کیونکہ انبیاءؑ کے سب معجزات ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ ہی وہ بھی اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے ہیں اور یا یوں کہو کہ ان کے ساتھ ہی وہ مدفون ہو گئے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا عصا اور ید بیضا بڑے عظیم الشان معجزے تھے لیکن آپ کے انتقال کے ساتھ ہی وہ بھی اس جہان سے انتقال کر گئے۔ لیکن آنحضرتؐ کا یہ معجزہ ایسا ہے کہ قیامت تک اس کے لئے فنا نہیں ہے بلکہ جس قدر زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی عظمت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ناظرین غور تو کریں کہ آج سے 1324 سال پہلے جبکہ عرب کی ساری ہمت حسن کلام اور جودت بیان کی طرف مصروف تھی ایک ایسے شخص نے خدا کے نام پر ایک کتاب ان

کے آگے پیش کی کہ جس پر مخالفوں نے رنگارنگ کے افتراء کئے ہیں پر کسی نے آپ پر شاہ گردی اور تلمیزی کا اتہام تک بھی نہیں لگایا یعنی کسی نے یہ نہیں کیا کہ وہ فلاں مجلس مشاعرہ یا فلاں محفل شعر و سخن میں کبھی شریک ہوئے تھے تو جب قوم نے اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں اپنے شک کا اظہار کیا تو اس نے ان کو علیٰ رؤس الاشہاد پکار کر یہ کہہ دیا کہ تم جھوٹ کہتے ہو پر اگر تم سچے ہو تو پھر کوئی سورۃ اس کی مثل لاؤ اور اس کام میں مدد لینے کے لئے اپنے سب مددگار بلالو اور یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ جو سورۃ تم لائے ہو وہ بے شک قرآن کی مانند ہے تم اپنے ہی آدمیوں میں سے کسی کو منصف بنالو۔ پھر اس نے اپنے صدق وکذب کا سارا دارومدار اسی فیصلہ پر رکھ دیا۔

پھر ناظرین غور کرسکتے ہیں کہ عربوں جیسی غیور قوم کو ایسے امر میں اپنے مقابلہ پر للکارا ہے کہ جس میں ان کو دعویٰ اور ناز ہے پھر اس للکارنے والے کے مقابلہ پر بھی وہ اس قدر افروختہ ہوئے ہوئے ہیں کہ اس کی تباہی اس کی تکذیب کے لئے وہ اپنے اقارب اپنی اولاد اپنی جانیں دینے پر تیار ہی نہیں بلکہ بہت سے دے چکے اور باقی دے رہے تھے اور جس غرض کے لئے وہ یہ کچھ دے رہے تھے وہ غرض ایک چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کے پیش کرنے سے حاصل ہوتی ہے پر کوئی پیش نہیں کرتا اور جب شرمندہ کیا جاتا ہے تو عذر گناہ بدتر از گناہ کے مطابق یہ جواب دیتے ہیں کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (الانفال:32)(اگر ہم چاہتے تو اس کی مثل کہہ دیتے) اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر مخاطب نے ہم سے یہ سوال کیا کہ پھر تم کیوں نہیں چاہتے تو اس وقت ہمارا ناطقہ ضرور ہی بند ہو جاوے گا کیونکہ ہم وہی ہیں جو کہ مال وجان اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے خرچ کررہے ہیں جو کہ اس بات سے بآسانی حاصل ہوسکتی ہے۔

پھر یہ مطالبہ اس وقت سے لے کر آج تک بدستور چلا آیا ہے اور اس کتاب کی مخالفت پر بڑی بڑی طاقتور قومیں پانی کی طرح اپنے مال اور خون بہاتی رہی ہیں لیکن کسی نے بھی کسی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کے برابر بھی کوئی عبارت پیش نہ کی کہ لو ہم نے فلاں سورۃ کی مثل ایک سورۃ بنا کر پیش کردی ہے ہمارے زمانہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جائے تو سب قوموں نے

عموماً اور عیسائی قوموں نے خصوصاً قرآن مجید کی کس قدر مخالفت کی ہے یہاں تک کہ اس کے برباد کرنے کے لئے کروڑوں روپے خاک کی مانند اڑادیئے ہیں اور اب بھی اڑا رہی ہیں۔ اس کی تردید کے لئے انبار در انبار کتابیں اور رسالے شائع کئے گئے ہیں اور کئے جاتے ہیں اور ان میں لاکھوں ایسے ہیں کہ ان کی مادری زبان عربی ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو شخص ساری دنیا میں عربی زبان کا امام تسلیم کیا گیا ہے وہ ایک عیسائی ہے اور عیسائیوں نے علاوہ اور علوم وفنون کے زبان عربی پر بھی بڑی بڑی ضخیم اور لطیف کتابیں لکھی ہیں لیکن باوجود اس عناد اور اس تبحر علمی اور کمال اور بے حد کوشش کے کسی نے کسی ایسی چھوٹی سورۃ کی مثل بھی شائع نہیں کی کہ جس کے آہستہ پڑھنے پر بھی آدھ منٹ خرچ نہیں ہوتا۔

مخالفین مثل لانے سے عاجز ہیں:

عیسائیوں نے بِسۡمِ اللّٰہِ سے لے کر وَالنَّاسِ تک بالالتزام اعتراض لکھے ہیں اور کسی سورۃ کی مثل بنانے سے اس پر بہت وقت صرف ہوتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اعتراض ایک ایسی چیز ہوتی ہیں کہ ہر ایک مذہب والے دوسرے مذہب پر کیا کرتے ہیں اور اس کے پیروان کا جواب بھی ضرور ہی دے دیا کرتے ہیں اور یہ بھی کہ اس سے نہ وہ مذہب تباہ ہوتا ہے نہ مرتا ہے اور نہ اس پر کوئی اور معتد بہا فائدہ مرتب ہوتا ہے لیکن قرآن مجید کی کسی سورۃ کی مثل پیش کرنے میں نہ دقت ہوتی ہے اور نہ زیادہ وقت صرف ہو سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے اور پھر بات ایسی زبردست ہے کہ اس کے بعد یہ مذہب کبھی سر اٹھا سکتا ہی نہیں اور بالکل مر جاتا ہے اور اس کے پیروکار ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بھی نہیں کہ وہ اس کو جانتے نہیں۔ خوب جانتے ہیں اور اہل اسلام ہمیشہ اس زندہ معجزہ کو پیش کر کے ان کی رگ حمیت اور خون غیرت کو جوش بھی دلاتے رہے ہیں لیکن اب تک کسی نے ادنیٰ سی ادنیٰ سورۃ کی مثل بھی پیش نہیں کی چہ جائیکہ ان کے منصف اس کے مثل ہونیکا فیصلہ دیں۔ پس یہ ہے اس کا ہمیشہ کے لیے زندہ معجزہ ہونا۔

رہا اس کا اعلیٰ درجہ کے قوی اور یقینی اصول پر مبنی ہونا تو اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس دلیل کی بنیاد دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ خداوند تعالیٰ چونکہ اپنی ذات میں بے مثل ہے لہٰذا

وہ اپنے صفات وافعال میں بھی بیمثل کیا ممتنع المثل ہے۔ اور انسان چونکہ اپنی ذات میں بے مثل نہیں ہے بلکہ اس کی ضرور مثل ہے لہٰذا اس کی صفات اور افعال میں بھی مثل ہونی چاہیے بلکہ ضرور ہی ہے۔ پھر ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان اور خداوند کریم کے افعال میں تماثل اور تشابہ نہیں ہے یعنی جو بندہ کرتا ہے وہ خدا نہیں کرتا اور جو خداوند تعالیٰ کرتا ہے وہ بندہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً انسان کپڑے بناتا ہے تو خداوند تعالیٰ وہ نہیں بناتا اور خداوند تعالیٰ روئی بناتا ہے تو انسان ہر گز وہ نہیں بنا سکتا۔ انسان روٹی پکاتا ہے تو خدائے عزوجل کبھی روٹی نہیں بناتا۔ اور خداوند تعالیٰ گیہوں بناتا ہے جس کو انسان کبھی نہیں بنا سکتا۔ تو چونکہ افعال صفات کے آثار ہوتے ہیں اور صفات ذات کے آثار ہوتے ہیں لہٰذا مذکورہ بالا مشاہدہ سے ثابت ہوا کہ انسان کے صفات اور ذات خداتعالیٰ کے صفات اور ذات کی مانند نہیں اور خدائے عزوجل کے صفات اور ذات انسان کے صفات اور ذات جیسے نہیں ہیں۔ اور جہاں کہیں بظاہر صفات میں اس کے خلاف کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ وہاں پر جب بجائے سرسری نظر کے کسی قدر نظر کو گہرا کر دو تو یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔ اور دونوں میں بین امتیاز نظر آجاتا ہے مثلاً انسان عالم ہے اور خدائے عزوجل بھی عالم ہے لیکن خداوند تعالیٰ تو عالم غیب السماوات والارض ہے اور انسان بیچارہ اپنے جسم کے اندر کی چیزوں کو بھی نہیں جانتا۔

اسی طرح انسان بھی سننے والا ہے اور خداوند تعالیٰ بھی سننے والا ہے پر دونوں میں بین امتیاز ہے۔ تو جب ہمارے ہاتھ میں نہایت سچے اور واضح اور بڑے پکّے یہ تین اصول ہیں تو اب اگر کسی امر کی نسبت یہ اشتباہ واقع ہو گا کہ یہ کس کا ہے تو ان تین اصول کی معرفت ہم بہت جلد اور نہایت عمدگی سے صحیح طور پر فیصلہ کر لیویں گے اور وہ فیصلہ یوں ہو گا کہ ہم دیکھیں گے کہ اس امر کی مثل کسی اور انسان میں ملتی ہے یا نہیں اگر مل گئی یا مل سکی تو ہم یقین کر لیں گے اور ہمارا یہ یقین بالکل صحیح ہو گا کہ وہ امر خدائے عزوجل کا نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہے اور اگر نہ ملی اور نہ مل سکتی ہو تو پھر یقین کر لیویں گے اور علیٰ وجہ البصیرت کہیں گے کہ یہ امر خدائے عزوجل کا ہے۔ اسی طرح تیسرے قاعدہ کے مطابق جب دیکھنا ہو تو بھی یونہی دیکھا جاوے گا کہ اس کی مثل انسان کر سکتا ہے یا اس میں ہے تب تو یقیناً وہ امر انسان کا ہے ورنہ تو پھر ضرور

اور یقیناً خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے۔ اور یہ دلیل جس کو ہم بیان کر رہے ہیں انہی اصول پر مبنی کی گئی ہے جو کہ بالکل سچے اور یقینی ہیں یعنی اگر تمہیں اس کتاب کی نسبت شک ہے کہ یہ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ہے یا کہ محمدؐ کی ہے جو کہ خود پکار پکار کر کہتا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:111)(میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں) تو اوّل تو بات ہی درست نہیں کہ تمہیں اس میں شک ہے کیونکہ جس طرح خدائے یکتا کے اور امور میں شک نہیں ہو سکتا کہ یہ خدا کے ہیں یا کسی انسان کے ہیں کیونکہ ان امور میں خود ایسے امور موجود ہیں جو کہ اس بات کی بین شہادت دیتے ہیں کہ یہ خدائے حکیم و قدیر کے ہیں نہ انسان عاجز کے لیکن اگر فرض کیا جائے کہ تم کو اشتباہ ہو گیا ہے تو ان اصول کے ذریعہ سے تم فیصلہ کر لو کہ خدا اپنی ذات وصفات اور افعال میں بے مثل ہے لہٰذا اس کے ان تینوں امروں میں سے کسی ایک کی بھی کبھی کوئی مثل نہیں لا سکتا۔ اور انسان اپنی ذات وصفات اور افعال میں مثل رکھتا ہے لہٰذا اس کے ہر سہ امور میں سے ہر ایک کی مثل کثرت سے لا سکتے ہیں اور یہ کہ خداوند کریم جو کرتا ہے وہ انسان نہیں کر سکتا اور جو انسان کرتا ہے وہ خداوند تعالیٰ نہیں کرتا۔

امتیاز اور شناخت کا معیار:

پس ان سب اصول کے مطابق جو امتیاز اور شناخت کا معیار ہے وہ اس کی مثل کا لانا اور نہ لانا ہے۔ پس تم سب کی یا کسی ایک سورۃ کی مثل لاؤ اور اس میں اپنے سب مددگاروں سے مدد بھی لو اور منصف بھی کوئی اپنا ہی بلا لو۔ پس اگر تم اس کی مثل نہ لا سکو تو یقیناً سمجھ لو کہ یہ اسی خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا کلام ہے جو اپنی ذات وصفات اور افعال میں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (زمین و آسمان میں اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے) اور کیا معجزہ ہونے کے لحاظ سے اور کیا دلیل ہونے کے لحاظ سے اس کا جواب اور اس کی تردید فقط ایک ہی طریق سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی یا اس کی کسی سورۃ کی مثل لے آویں اور بس اور اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے اور ساری دنیا گواہ ہے کہ چودھویں صدی تک کے اربوں مخالفوں نے اپنے عجز کے ہاتھوں سے اس معجزہ اور اس دلیل کی صداقت اور قرآن مجید کے منجانب اللہ اور لَا رَيْبَ فِيْهِ ہونے پر دستخط کر دیئے ہیں لیکن ان لوگوں کے دل و دماغ اور ایمان

وانصاف پر سخت افسوس ہے کہ ایسے معجزہ اور ایسی دلیل اور برہان قاطع کے موجود ہوتے ہوئے بھی قرآن مجید سے منکر اور وید اور انجیل جیسی کتابوں کے قائل ہیں۔

رہا یہ کہ وہ سورۃ کس امر میں قرآن مجید کی مثل ہو تو اس میں سے بہت سے اقوال ہیں اوّل یہ کہ یہ قصص ماضیہ پر مشتمل ہے حالانکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ دوم یہ کہ اپنے مطیعوں کے لئے وعدوں اور بشارتوں پر اور اپنے نافرمانوں کے لئے وعیدوں اور انذاروں پر مشتمل ہے اور وہ وعدے اور وعید انسانی طاقت بالاتر ہیں سوم یہ کہ یہ کتب الٰہیہ سابقہ کے مطالب عالیہ پر مشتمل ہے حالانکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ چہارم یہ کہ یہ جوامع الکلم پر مشتمل ہے۔ پنجم یہ کہ یہ اخبار غیب پر مشتمل ہے۔ ششم یہ کہ یہ تاثیر بلیغ رکھتی ہے جو کہ انسانی کلام میں کیا کسی دوسری آسمانی کتاب میں بھی نہیں ہے۔ ہفتم یہ کہ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی فصاحت وبلاغت پر مشتمل ہے جو کہ انسانی قدرت سے باہر ہے ہشتم یہ کہ ایسا نہیں کہ ہر ایک سورۃ میں کوئی ایسی بات ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی مثل انسان نہیں بنا سکتا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ خداوند کریم نے لوگوں کی ہمت اس کی کسی سورۃ کی مثل لانے سے پھیر دی ہے اور یہ ایک عظیم الشان اعجاز ہے کہ مثل لانی تو انسانی اقتدار میں ہے پر کوئی لائے گا نہیں۔ لیکن پہلے پانچ اقوال پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ امور سب کی سب سورتوں میں نہیں ہیں اور یہ تحدی مکہ میں بھی کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں تاثیر بلیغ کا نام ونشان تک نہ تھا اور ساتویں قول پر یوں اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید نے مثل کو عام اور مطلق رکھا ہے کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا اور فصاحت وبلاغت میں مثل مانگنا ان دو سے از خود مقید کرنا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

(حضرت مولٰنا حکیم الامتؒ) مثل اس کو کہتے ہیں جو کہ کسی معتد بہ امر میں یا بہت سے ایسے امور میں دوسری چیز کے ساتھ شریک اور ہمرنگ ہو اور قرآن مجید نے نہ یہاں پر اور نہ کسی اور مقام پر اس امر یا امور کی تصریح کی ہے اور نہ کسی اور مقام پر اس کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے اور نہ نبی کریمؐ نے ایسے امر یا امور کی کبھی تعیین فرمائی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مثل عین تو ہوتی ہی نہیں بلکہ جیسی دونوں مثلیں کسی امر میں شریک ہوتی ہیں اسی طرح

بعض امور میں علیحدہ بھی ہوتی ہیں۔ پس یہاں پر مثل سے مراد وہ کلام ہے جو کہ کسی معتد بہ امر میں قرآن مجید کی طرح ہو عام اس سے کہ وہ عربی فصیح بلیغ ہو یا بالکل عربی ہی نہ ہو بلکہ کوئی اور ہی زبان ہو تو اگر کوئی شخص کسی زبان کا کوئی کلام پیش کر دے جو کہ کسی ایک سورۃ کے برابر ہو اور کسی امر میں قرآن مجید جیسا ہو تو ضرور اس پر صادق آئے گا کہ وہ ایک سورۃ قرآن مجید کی مثل لایا ہے اور اس نے قرآن مجید کی شرط کو پورا کر کے قرآن مجید کے لَارَیْبَ فِیْہِ ہونے کی اس قطعی دلیل اور حجت کو توڑ دیا ہے جو کہ وَاِنْ کُنْتُمْ الخ میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن اعجاز یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے گا وہ تباہ ہو جاوے گا۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ جس قدر ان اقوال میں امور آئے ہیں جیسا فصیح و بلیغ ہونا۔ تاثیر بلیغ اور اخبار غیب اور جوامع الکلم وغیرہ پر مشتمل ہونا یہ سب قرآن مجید کے منجملہ کمالات میں سے ہیں اور ان کے علاوہ اور بہت سے ہیں اور ایسا تو نہیں ہے کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورۃ میں وہ سب کے سب کمالات جمع کئے گئے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی سورۃ ان کے معتد بہ مجموعہ سے خالی ہو بلکہ ہر ایک سورۃ میں ان کمالات سے اس قدر ضرور جمع ہوتے ہیں کہ انسانی طاقت سے باہر ہے اور ہر گز اس کی وسعت میں نہیں ہے کہ وہ اپنے کلام میں اس مقدار اور کیفیت کے وہ کمالات نبھا سکے اور قرآن مجید کی بہت سی آیات سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ذات میں کوئی ایسے کمالات ہیں کہ جن کی مثل انسان اپنے کلام میں لانے سے بالکل عاجز ہے نہ یہ کہ اس کی مثل کا لانا اس کی قدرت میں تو ہے اور وہ لا سکتا ہے لیکن خداوند کریم اس کو یونہی روک دیتا ہے اور اس کی ہمت کو پھیر دیتا ہے یا ارادہ کرتے ہی اس کو ہلاک کر دیتا ہے یا انسان جانتا ہے کہ اگر میں نے اس کی مثل بنائی تو ضرور تباہ ہو جاؤں گا۔

پس اس خوف سے اس کی مثل بنانے کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ جیسا کہ سورۂ یونس میں فرمایا ہے۔ وَ مَا کَانَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ لٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَ تَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْہِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (یونس:38) (اور قرآن مجید کی شان سے نہیں ہے کہ وہ افتراء کیا جائے اللہ کے غیر سے ولیکن وہ

تصدیق ہے اس کی جو اس سے پہلے ہے اور اس کتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں شک نہیں یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔)

پس آیت کریمہ میں صاف بتادیا ہے کہ دوسرا کوئی قرآن بناسکتا ہی نہیں نہ یہ کہ بنا تو وہ سکتا ہے لیکن ہم نہ بنانے دیں گے یا بنا تو وہ سکتا ہے پر اس کا ارادہ کرتے ہی ہم اس کو تباہ کردیں گے پھر آگے بعض ان کمالات کا بھی اظہار کیا ہے کہ جن کے باعث دوسرا نہیں بناسکتا اور وہ یہ بتائے ہیں کہ یہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کردیتا ہے اور پھر مفصل الکتاب ہے، پھر ربوبیت عامہ کے آثار اس قدر اس میں موجود ہیں جن کے باعث اس کے منجانب رب العالمین ہونے میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے۔

پھر سورۂ ہود میں فرمایا ہے۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۔ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۔ (ھود:15-14)(کیا کہتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ افترا کیا ہے کہہ دو پس لاؤ تم دس سورتیں اس کی مثل افترا کی ہوئیں اور اللہ کے سوا جس کو پکار سکتے ہو پکار لو اگر تم سچے ہو تو اگر وہ تمہاری نہ مانیں تو پھر جان لو کہ سوائے اس کے نہیں کہ یہ قرآن مجید اللہ عزوجل کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اور یہ کہ وہی معبود ہے۔)

یہاں سے بھی صاف یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے امور ہیں جن کے انسانی طاقت سے بالا ہونے کے باعث کوئی انسان اس کی مثل نہیں لاسکتا جیسا کہ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ [1](ھود:15) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کے سب مددگار اس کی مثل لانے سے بالکل عاجز ہیں اور اس عجز کی یہ وجہ ہے کہ قرآن مجید میں علوم الٰہیہ کے انواع واقسام بھرے پڑے ہیں اور چونکہ انسانوں کا علم خدا کے علم کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتا لہٰذا کوئی انسان اس کتاب کی مثل بھی نہیں بناسکتا جو کہ علوم الٰہیہ پر مشتمل ہو۔ پس خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے ایسے امور ہیں

[1]۔ پس اگر وہ تمہاری (یہ) بات قبول نہ کریں۔ تو جان لو کہ جو (کلام) تم پر اتار گیا ہے اللہ کے (خاص) علم پر مشتمل ہے۔ (تفسیر صغیر)

کہ سب کے سب کو کوئی انسان اپنے کلام میں نہیں لا سکتا اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان میں سے ایک کو بھی کوئی انسان اپنے کلام میں نہیں لا سکتا جیسے اخبار غیب اور قدرت مطلقہ اور لوازم ربوبیت وغیرہ اور کچھ ایسے ہیں کہ ایک حد تک تو انسان ان کو اپنی تقریر و تحریر میں لا سکتا ہے لیکن اس سے آگے ان کے وہ مراتب بھی ہیں کہ عادۃً انسان کی طاقت سے بالا ہوتے ہیں اور بعض اگرچہ اکیلے اکیلے تو انسان کی مقدرت میں ہوتے ہیں لیکن جب ان میں سے چند مل جاتے ہیں تو پھر انسان کی مقدرت سے برتر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن مجید میں یہ سب اقسام موجود ہیں لہٰذا اس کی ہر ایک سورۃ کی مثل لانے سے انسان عاجز ہے اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے مجھے قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ملی جس سے اس بات کا اشارہ تک بھی نکلتا ہو کہ انسان قرآن مجید کی مثل یا کسی سورۃ کی مثل تو بنا سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کی ہمت پھیر دے گا تاکہ وہ نہ بنائیں یا یہ کہ بنانے کا ارادہ کرتے ہی ان کو ہلاک کر دے گا یا مثل بنانے کے بعد ان کو ہلاک کر دے گا۔ بلکہ جہاں پایا ہے تو یہی کہ قرآن مجید کی مثل بنانا کسی انسان کی مقدرت اور طاقت میں ہے ہی نہیں۔ رہا یہ کہ کیوں نہیں تو اس کا جواب بھی قرآن مجید سے جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے پہلے عرض کر چکا ہوں جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید چونکہ علوم الٰہیہ اور لوازم ربوبیت عامہ اور آثار قدرت مطلقہ پر مشتمل ہونے کے باعث بہت سی ایسی خصوصیات کا جامع ہے کہ بعض ان میں سے اکیلی اکیلی اور بعض دوسریوں کے ساتھ مل کر انسان کی مقدرت سے باہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے کلام میں لا سکے لہٰذا کوئی اس کی مثل نہیں لا سکتا۔

اور چونکہ قرآن مجید کی ہر ایک سورۃ کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ انسانی قدرت سے باہر ہوتی ہیں لہٰذا کسی سورۃ کی مثل بھی نہیں بن سکتی۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ اگر خداوند کریم رفع اشتباہ اور اس عظیم الشان اعجاز اور برہان کو التباس سے پاک رکھنے کے لئے اس بدنیت اور بدباطن کو ہلاک کر دیتا ہو یا اس کی ہمت کو پھیر دیتا ہو جو کہ باوجود اس بات پر یقین رکھنے کے میں اس کی مثل نہیں بنا سکتا پھر بھی اس خیال سے مثل کے نام سے کوئی کلام

پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ اصل دلیل میں اس کارروائی کے ساتھ اشتباہ ڈال دے۔ لیکن جہاں جہاں پر ان سے مثل مانگی گئی ہے وہاں پر اس بات کا ہرگز ذکر نہیں اور بالکل نہیں ہے۔

یہ دلیل حقیقت میں بہت عظیم الشان اور بڑا بھاری معجزہ ہے کہ چودھویں صدی جارہی ہے اور اس طول وطویل عرصہ میں بڑی بڑی طاقت والی اور سخت سے سخت عناد اور بغض رکھنے والی قومیں گذری ہیں اور ہیں اور انہوں نے اسلام کی تباہی کے لئے کوئی تدبیر اور کوئی حیلہ اور کوئی داؤ اور کوئی کوشش پیچھے نہیں چھوڑی اور اپنے پیارے مال اور عزیز جانیں اس کی تباہی کے لئے تباہ کردی ہیں لیکن باوجود اس کثرت اور اس طاقت اور اس کوشش اور اس عناد اور بغض اور اس عرصہ دراز کے اب تک کوئی بھی کسی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کی مثل نہیں لایا حالانکہ قرآن مجید نے اپنے صدق وکذب کا سارا دارومدار مثل کے لانے نہ لانے پر رکھ دیا تھا لیکن عناد بھی ایسا سخت مرض ہے کہ خواہ کیسے ہی روشن اور قوی ترین دلائل اور نشان بتاؤ کچھ بھی اثر نہیں ہوتا اور اپنے انکار پر جمے رہتے ہیں اور ان دلائل کے ٹالنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش ہی لیتے ہیں خواہ وہ عذر کیسا ہی رکیک کیوں نہ ہو اور وہ دلائل کیسے ہی لاجواب کیوں نہ ہوں اس برہان قاطع اور اعجاز ساطع کے ساتھ بھی (کہ جس کی تردید کی کوئی سبیل بجز اس کے متصور ہوسکتی ہی نہیں کہ وہ کسی سورۃ کی مثل بناکر پیش کردیں اور چودھویں صدی گذر رہی ہے اور اب تک کروڑہا سخت سے سخت اور قوی سے قوی مخالفوں میں سے کوئی بھی کسی ایک سورۃ کی مثل نہیں لاسکا) انہوں نے یہی کارروائی کی ہے۔ اس وقت کے عنیدوں نے تو یہ جواب دیا تھا کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (الانفال:32) (اگر ہم چاہتے تو ہم بھی ایسا کہہ دیتے) اور یہ خیال نہ کیا کہ اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے گا کہ جب تم قرآن مجید اور محمد رسول اللہؐ کی تکذیب چاہتے ہو اور اس کے لئے ہر ایک منصوبہ ہر ایک تدبیر ہر ایک حیلہ کررہے ہو اور رات دن اسی کوشش میں لگے رہتے ہو اور اپنے آرام کو بے آرامی سے بدل دیا ہوا ہے اور اپنے پیارے مالوں کو اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے خاک کی طرح اور اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کے ہزارہا گراں مایہ خونوں کو پانی کی مانند بہارہے ہو اور دنیا میں کوئی ایسا مقصد نہیں کہ جس کے لئے تم میں سے کوئی

فرداً فرداً بھی اس قدر کوشش کرتا یا مالی اور جانی نقصان یا تکلیف برداشت کرتا ہو جس قدر کہ تم بحیثیت مجموعی اس مقصد کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہو۔

اور پھر قرآن جیسا کلام بولنا نہ مذہب کے لحاظ سے تمہارے نزدیک ناجائز ہے اور نہ عرف کے لحاظ سے اور نہ ایسا بولنے سے تمہاری عزت و شرافت میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ کوئی نقص لازم آتا ہے جو اس کے بولنے سے مانع ہو سکتا ہو۔ بلکہ ظاہر ہے کہ جو شخص ایسا کلام پیش کر کے قرآن مجید کے اس برہان واعجاز کو توڑ کر قوم کے متفق علیہ اور اہم اور اعظم ترین مقاصد کو حاصل کر دے گا کہ جس کے حاصل کرنے سے قوم کے سردار قوم کے بہادر قوم کے دانا قوم کے مالدار بلکہ ساری کی ساری قوم عاجز تھی اور قوم کو ان سب مشقتوں اور تکلیفوں اور نقصوں اور پریشانیوں سے نجات دے دے گا کہ جن میں وہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں مبتلا تھی۔ تو اس میں ذرہ بھی شک نہیں کہ وہ ساری کی ساری قوم کے نزدیک سب سے زیادہ بہادر اور دانا اور لائق فائق اور نامی و گرامی اور سب کی نظروں میں سے سب سے زیادہ کامل اور محسن قوم ہو جاوے گا۔ غرض کہ اس کے ساتھ وہ ایسا عظیم الشان اور عزیز الوجود انسان ہو جاوے گا کہ اور کسی طریق کے ساتھ ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا اور ظاہر ہے کہ ایسے امر کو ہر ایک چاہتا ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ تم نہیں چاہتے اور ان کے بعد کے معاندوں نے اسی جواب کو ایک اور رنگ میں پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ دنیا میں بہت سی کتابیں ہیں اور ان کے مصنفین نے ان پر ناز بھی کیا ہے اور پھر بھی لوگوں نے ان کی مثل نہیں بنائی بلکہ شیخ سعدی نے تو اپنے شعروں کی نسبت یہ بھی کہا ہوا ہے کہ

شاعران بسیار گفتہ شعر ہائے پر نمک
کس نہ گفتہ شعر ہمچون سین و عین و دال و یے [1]

اور پھر بھی کسی نے اب تک اس کے شعروں کی مثل نہ بنائی ہے اور اس کی طرف توجہ کی ہے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ کتابیں یا شیخ سعدی کے شعر خدا کا کلام ہیں

[1] ۔شاعروں نے بہت سے شعر نمک پر کہے ہیں مگر کسی نے سین اور عین اور دال اور یے پر شعر نہیں کہے۔(از مرتب)

یا یہ کہ حقیقت میں ان کی مثل بن سکتی ہی نہیں اور خداوند تعالیٰ کی چیزوں کی مانند یہ بھی بے مثل ہیں ہر گز نہیں۔ پس اسی طرح قرآن نے اگر یہ دعویٰ کیا اور ایک عرصہ دراز تک کسی نے اس کی مثل نہ بنائی اور نہ بنانے کا ارادہ کیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ خدا کا کلام ہے اور یہ خدا کی چیزوں کی مانند بے مثل ہے اور اس کی مثل بنانے سے سب دنیا عاجز ہے۔ یہ جواب بھی بعینہٖ پہلا ہی جواب ہے۔ فقط۔ اس میں شیخ سعدی وغیرہ کی مثال بیان کر دی ہے۔ پس چونکہ اس کا مطلب اور مضمون وہی ہے۔ جو پہلے کا ہے۔ لہٰذا اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے کا ہے۔ ہاں اس میں مثال ایزاد کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے بتایا ہے کہ اصل مضمون غلط ہے۔ اسی طرح ہم بتاتے ہیں کہ یہ مثال بھی بالکل غلط ہے بلکہ اس کے پیش کرنے والے کی جہالت اور نادانی ثابت کرنے کے لئے یہی مثال کافی کیا کافی سے بھی زائد ہے کیونکہ جاہل بھی جانتا ہے کہ اوّل تو ان مصنفین نے ایسا عظیم الشان دعویٰ ہی نہیں کیا کہ خدا کا کلام ہے اور نہ کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میری کتاب کی ایک جزو کی مثل بھی کوئی نہیں لا یا لاؤ اور اپنے مددگاروں کو بھی بلالو اور شیخ سعدی نے اگر کہا ہے تو یہ کہا کہ کس نہ گفتہ جس کے یہ معنے ہیں کہ گذشتہ زمانہ کے شاعروں میں سے کسی نے میرے شعروں جیسے شعر نہیں کہے اور یہ اس کی ایک بڑہ ہے گذشتہ شاعر گئے گذر چکے اور اگر اس وقت ہوتے بھی تو پہلے کہے ہوئے شعروں کو ثابت کرتے کہ یہ سعدی کے شعروں جیسے ہیں نئے شعر تو وہ بھی نہ کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ شیخ سعدی نے تو ان کے پہلے کہے ہوئے شعروں کی نسبت کہا ہے کہ وہ میرے شعروں جیسے نہیں ہیں نہ یہ کہ کوئی شاعر میرے شعروں جیسے شعر بنا لائے اور کہ وہ ہر گز نہ بنا سکے گا۔ پھر ان کی یا شیخ سعدی کی مخالفت پر کس نے اپنا مال وجان صرف کیا اور پھر ان کا یا شیخ صاحب کا کون سا مرتبہ تھا کہ جس کا سارا دار ومدار انہوں نے مثل کے لانے اور نہ لانے پر رکھ دیا تھا اور لوگوں کو محمد رسول اللہ کی رسالت کی طرح ان کا وہ مرتبہ ناپسند اور مضر معلوم ہوتا تھا تاکہ لوگ اس مرتبہ سے گرانے کے لئے ان کے کلام کی مثل لا کر ان کے مرتبہ کی اس بنیاد کو اکھاڑ دیتے جس پر کہ اس کا سہارا تھا۔

پھر ان معاندوں کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ان کے کلام کی مثل کوئی نہیں لایا بلکہ ضرور لایا اور مثل کیا اس سے بڑھ کر لاتے رہے ہیں پہلے زمانہ کا ایک مصنف یا منشی یا شاعر یا کاری گر ہوتا ہے جو بڑا لائق وفائق اور بے عدیل وبے مثیل خیال کیا جاتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد اور آجاتا ہے جس کو لوگ اس سے بھی زیادہ لائق ماننے لگتے ہیں۔ پرانے فلاسفر اپنے اپنے زمانہ میں خود بھی شیخ سعدی کی مانند اپنے آپ کو ہم بھی کچھ ہیں کیا بلکہ جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں خیال کرتے تھے اور لوگ بھی ان کو بے مثل وبے بدل یقین کرتے تھے لیکن جب نئے فلسفہ کا زمانہ آیا تو اب لوگ پہلے فلاسفروں اور ان کے فلسفہ کو اس کے مقابلہ میں لاشئ محض اور قابل شرم غلطیوں کا طومار یقین کرتے ہیں اسی طرح مصنفین کا حال بھی ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ بعض تصنیفیں زیادہ شہرت اور رواج پکڑ جاتی ہیں اور جو ان سے ہزارہا درجہ بہتر ہوتی ہیں ان کو عام لوگ جانتے تک بھی نہیں یہ سب باتیں بالکل واضح ہیں لیکن عناد اور تعصب کا کیا علاج ہو میں اس سے بڑھ کر سناتا ہوں۔ جب خداوند کریم نے اپنے پیارے خاتم الانبیاءؐ کے معجزات اور برکات کو دوبارہ دنیا میں تازہ کرنا چاہا تا کہ آپ کی صداقت کی دنیا پر از سر نو حجت پوری کرے تو خداوند کریم نے اس زمانہ میں اپنے ایک پیارے برگزیدہ بندے کو مسیح موعود اور مہدی معہود اور بروز محمدی بنا کر دنیا میں مبعوث فرمایا اور علاوہ اور معجزات ونشانات کے ایک معجزہ یہ بھی آپ کو عنایت کیا کہ آپ نے بہت سی کتابیں عربی زبان میں پر از حقائق ومعارف قرآنیہ لکھیں اور بڑی تحدی سے ان میں سے ہر ایک کی مثل عرب وعجم سے طلب کی اور قرآن مطاع کی مانند ان کو اختیار دیا کہ اپنے سب مددگاروں کو بلالیں اور پھر ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کر دی کہ ہرگز کوئی ان کی مثل نہ لاسکے گا چنانچہ ان کتابوں کے شائع ہوئے سالہا سال گذر چکے اور عرب وعجم ان میں سے ایک کی بھی مثال نہ لاسکے اور حالانکہ مخالفت کی کوئی حد نہیں اور آپ کی تکذیب کے لئے کوئی نکتہ فروگذاشت نہیں کیا اور ہزارہا مخالف ہیں کہ ان کا رات دن میں بجز اس کے اور کوئی شغل ہی نہیں اور طوماروں کے طومار اور انباروں کے انبار آپ کی تردید میں شائع کر چکے ہیں جس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان کی مثل کا لانا بہت ہی مفید امر تھا کیونکہ آپ نے اپنے صدق و کذب کا سارا دارومدار مثل کے لانے نہ لانے پر رکھ دیا تھا لیکن اب تک کوئی بھی نہیں لایا تو ایک دفعہ جبکہ میں کشمیر گیا ہوا تھا تو پنجاب کے ایک مشہور ذی علم خاندان کے ایک مولوی سے آپ کے مسیح موعود اور منجانب اللہ ہونے کے متعلق میری گفتگو ہوئی تو جب میں نے آپ کی ایسی کتابیں آپ کی منجانب اللہ ہونے پر بطور شہادت اور ثبوت کے پیش کیں تو اس مولوی صاحب نے شیخ سعدی صاحب کا مذکورہ بالا شعر پڑھ کر بعینہٖ یہی مذکورہ بالا جواب دے دیا جس سے مجھے سخت حیرانی ہوئی کیونکہ وہ مولوی صاحب بظاہر قرآن مجید کے قائل تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید نے بھی اپنے منجانب اللہ ہونے کا یہ ثبوت دیا ہے کہ میری یا میری کسی سورت کی مثل لاؤ اور خواہ وہ مولوی صاحب یہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں کہ عیسائیوں وغیرہ نے قرآن مجید کی اس دلیل کی اسی شعر کو پڑھ کر اسی طریق سے تردید کی ہے لیکن یہ تو خوب جانتے تھے کہ یہ میرا اعتراض جیسا مسیح موعود کی صداقت کی اس دلیل پر وارد ہوتا ہے۔

ویسا ہی قرآن مجید کی صداقت کی اس زبردست دلیل پر بھی وارد ہوتا ہے جس کی قوت پر ہمارے سارے اہل اسلام ناز کرتے ہیں اور میں بھی خود مخالفوں کے سامنے اس کو پیش کرتا رہا ہوں ناظرین خیال تو فرمائیں کہ ان مولوی صاحبان کی مخالفت خدائے ذوالجلال کے فرستادہ کے ساتھ کس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جب آپ کے منجانب اللہ ہونے پر وہی دلیل پیش کی جاتی ہے جو کہ خود قرآن مجید نے اپنے اور آنحضرتؐ کے منجانب اللہ ہونے پر پیش کی ہے اور اس دلیل سے انہوں نے قرآن مجید اور آنحضرتؐ کا منجانب اللہ ہونا تسلیم کیا ہے۔ بلکہ قرآن مجید اور آنحضرتؐ کے منوانے کے لئے یہی دلیل لوگوں کے سامنے پیش بھی کرتے ہیں لیکن جب خدا کے فرستادہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منجانب اللہ ہونے کے لئے یہی خدا کی قائم کردہ دلیل بعینہٖ پیش کی جاتی ہے تو بجائے آپ کے منجانب اللہ ہونے کے ماننے کے اس مسلمہ دلیل پر وہی اعتراض کر دیتے ہیں جو کہ قرآن مجید اور آنحضرتؐ کے مخالفوں نے اس دلیل پر کیا ہوا ہے اور نہ خدائے علیم سے ڈرتے ہیں اور نہ شرم کرتے ہیں۔

اور اگر فرض کیا جاوے کہ ان کو یہ علم نہیں کہ عیسائیوں وغیرہم نے قرآن مجید کی

دلیل مذکور پر یہ اعتراض کیا ہوا ہے لیکن اس میں تو ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ ان کو اس بات کا ضرور ہی علم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ اعتراض براہ راست فرقان حمید پر وارد ہوتا ہے پر خدا کے فرستادہ کی عناد و مخالفت پر اس قدر ڈٹے ہوئے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کی اور اس کے اتارنے والے اور اس کی کہ جس پر یہ اتارا گیا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے اور ایک یہی اعتراض نہیں بلکہ جو اعتراض خدا کے فرستادہ پر کرتے ہیں وہ ضرور ہی ایسا ہوتا ہے کہ براہ راست قرآن مجید یا آنحضرتؐ یا کسی اور مسلم راست باز پر وارد ہونے والا ہوتا ہے عام اس سے کہ پہلے کسی نے وہ پیش کیا ہو یا نہ ہو اور بارہا ہم نے ان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یہ شرط کی ہے کہ کوئی ایسا اعتراض نہ کریں جو کہ ان کی اور ہماری مسلم کتاب یا مسلم راست باز پر وارد ہو سکتا ہو لیکن باوجود اس کے پھر بھی جو اعتراض کیا وہ ضرور ہی مسلم کتاب یا مسلم راست باز پر وارد ہونے والا نکلا۔

صداقت کا معیار:

لاہور میں میرے ایک استاد تھے۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ اس بارہ میں گفتگو ہوئی تو میں نے ان کو کہا اگر آپ دو باتیں کریں جو کہ حقیقت میں بہت ضروری ہیں تو چند منٹوں میں فیصلہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ آپ نے اگر کوئی راست باز مانا ہوا ہے تو اس کے ماننے کے لئے جو معیار آپ نے اختیار کیا ہوا ہے وہ مجھے بتائیں اور میرے ذمہ یہ ہو گا کہ وہی معیار سوائے کسی ہیر پھیر کے حضرت مرزا صاحب سلمہ اللہ میں آپ کو ثابت کر دوں گا۔ اس پر اگر آپ کو کوئی اعتراض کرنا ہو تو ضرور کریں پر شرط یہ ہے کہ وہ آپ کے کسی مسلم راست باز پر وارد نہ ہوتا ہو۔ اس کے بعد میں نے ان سے وہ معیار دریافت کیا تو چونکہ عموماً مولوی صاحبان نے کبھی اپنے مسلمات کے دلائل اور معیاروں پر مطلق توجہ نہیں کی ہوتی لہٰذا باوجود سخت اصرار کے مولوی صاحب نے کچھ بھی نہ بتایا اور کہا میرا ایک اعتراض ہے اس کا جواب دو میں نے کہا بہت اچھا لیکن وہ شرط مذکور کے ماتحت ہو۔ کہا بہت اچھا۔ اس کے بعد اعتراض یہ کیا کہ (نعوذ باللہ منہ) مولوی عبد الکریم اور مولوی نورالدین دونوں دہریے معلوم ہوتے ہیں اور یہ پہلے بھی پیشوا بننا چاہتے تھے لیکن تجربہ سے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ

ہم خود تو نہیں بن سکتے اور مرزا بھی اسی قسم کا آدمی تھا پر ان سے زیادہ ہوشیار اور جرأت والا تھا لہٰذا اس نے دعویٰ رسالت کر دیا تو ان دونوں نے کہا چلو اگر آپ نہیں بن سکتے تو اس کے ساتھ ہی مل کر بطور کمیٹی روٹی کمانے کا ڈھنگ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ڈالیں چنانچہ اس خیال سے مرزا کے ساتھ مل گئے ہیں اس پر میں نے کہا مولوی صاحب اگر کوئی مخالف اسلام یہی تقریر آنحضرتؐ کی نسبت کرے اور بجائے مرزا کے محمدؐ اور مولوی نورالدینؓ اور مولوی عبدالکریمؓ کے بجائے ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کہہ دے تو کیا اس کا یہ اعتراض نہ ہو سکے گا یا آپ اس کا کچھ جواب دے سکیں گے تو یہ سن کر مولوی صاحب نے ہنس دیا اور کچھ بھی جواب نہ دیا۔ یہ میں نے ایک مثال بتائی ہے کہ کس طرح یہ لوگ ایسا اعتراض کر دیتے ہیں جو براہ راست ان کے مسلم راست بازوں پر بلکہ سب راست بازوں کے سردار پر وارد ہوتا ہے لیکن اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

اپنی بے وقوفی کا ثبوت دینے کے لئے ان مولوی صاحبان نے ایک اور جواب بھی دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں فلاں فلاں عبارت قواعد کے خلاف ہے اور فلاں فلاں فقرہ دوسری کتابوں سے لیا ہوا ہے اور یہاں پر بھی نہ تو یہ خیال کیا کہ ہمارا یہ اعتراض براہ راست قرآن مجید پر وارد ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی عبارتوں پر یہ کہا گیا ہے کہ علم قواعد کے فلاں قاعدہ کے یہ خلاف ہے اور اس کی بعض عبارتیں بعینہٖ امرأ القیس وغیرہ کے قصائد میں موجود ہیں اور جو جواب ہم وہاں دیا کرتے ہیں احمدیوں کا حق ہے کہ وہی جواب ہمارے اس اعتراض کا دے دیں اور نہ یہ خیال کیا کہ ہماری اس تقریر سے اصل دلیل کا کیا نقصان ہوا ہے کیونکہ مانگی تو مثل ہے پس اگر اصل کتاب کی عبارت بعض مقامات پر بفرض محال غلط ہے اور کچھ فقرات دوسروں کے کلام سے لئے ہوئے ہیں تو اس سے کیا حرج ہے کوئی یہ مثل لانے سے روکتا تو نہیں بلکہ مثل لانے والوں کے لئے اور آسانی ہو گئی کہ قواعد کے لحاظ کی بھی چنداں ضرورت نہ رہی اور نہ از خود عمدہ عمدہ فقرات بنانے کی مصیبت رہی بلکہ اب تو راستہ کھل گیا کہ عمدہ عمدہ کتابیں کھول کر آگے رکھ دیں اور ان سے فقرات چنتے گئے اور جھٹ پٹ مثل بنائی اور شائع کر دی۔ یہ ہے ہمارے مولوی

صاحبان کی عقل اور حیا۔ یہاں سے ناظرین کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہوگی کہ ہمارے مولوی صاحبان اگرچہ زبان سے خداوند تعالیٰ کے علم کو سب کے علوم سے وسیع اور بالاتر کہتے ہیں پر عملاً نحو میر، ہدایۃ النحو، شافیہ، کافیہ وغیرہ کے مصنفوں کے علموں سے علیم وحکیم خدا کے علم کو کم قرار دیتے ہیں بلکہ خدا پر لازم اور فرض قرار دیتے ہیں کہ وہ ان مصنفین کے بیان کردہ قواعد کے ماتحت چلے اور اگر وہ اپنی خدائی کے لحاظ سے کوئی عبارت یا کوئی لفظ ان کے مقرر کردہ قواعد کے خلاف بولے گا تو اس کا وہ کلام ضرور غلط قرار دیں گے۔ یہ ہیں ہمارے مولوی صاحب جو کہ لوگوں کے سامنے خدا کی عظمت بیان کیا کرتے ہیں۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ جن مقامات میں خدا پر غلطی کا الزام لگاتے ہیں حقیقت میں فصحاء وبلغاء کے کلام میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہوتے ہیں اور جن علماء نے زبان عرب کا استقراء کرکے قواعد بنائے ہیں انہوں نے اس کلام کی صحت کی تصریح کی ہوئی ہوتی ہے لیکن حضرات تو عموماً ان کی کتابوں کی زیارت سے بھی محروم ہیں اور اگر کسی کے پاس کوئی کتاب ہو بھی تو ان کا سارا اعتماد اور سہارا متاخرین میں سے ہمت ہارے ہوئے لوگوں کے خلاصہ در خلاصہ در خلاصہ پر ہوتا ہے جو کہ

صیقل چناں زدند کہ آئینہ ہم نماند [1]

کے مصداق ہیں اور یہ وہی نحو میر، صرف میر وغیرہ ہیں افسوس ہی آتا ہے کہ نام مولوی صاحب اور کام یہ کہ خدائے ذوالجلال کو زید و بکر کی ناقص عقل کی ناقص استقراء واستنباط کے خلاصہ در خلاصہ کے تابع کرنا:

اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ [2]۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ۔ [3] (المومنون:119)

---

[1] اتنی صفائی کی گئی کہ آئینہ بھی اصل صورت دکھانے سے قاصر رہا۔ (از مرتب)

[2] ۔ اللہ ہمیں اس سے بچائے۔ (از مرتب)

[3] ۔ اے میرے رب! معاف کر، اور رحم کر اور تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔ (تفسیر صغیر)

آیت25: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَ قُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ۔

(حضرت مولانا حکیم الامتؒ) فَ۔ پس، تو۔ فَ کبھی پہلی بات کے نتیجہ یا اس کی تفصیل کے لئے آیا کرتی ہے اور چونکہ جو بات اب بیان ہو گی وہ پہلی بات کا نتیجہ ہے بلکہ اس کی تفصیل لہٰذا یہاں پر فَ لائی گئی ہے۔

اِنۡ۔ اگر۔ اِنۡ شک کے مقام پر آیا کرتا ہے اور اِذَا یقین کے مقام پر لیکن یہاں پر جو بات بیان کی گئی ہے وہ یقینی ہے اور وہ ہے مثل کا نہ لانا اور خود خداوند کریم نے یہاں پر فرمادیا ہے وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا (اور ہر گز تم نہ کروگے) یعنی کسی سورۃ کی مثل نہ لاؤ گے۔ پس مقام تو چاہتا تھا کہ بجائے فَاِنۡ کے فَاِذَا ہوتا لیکن کلام کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی خاص امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اقتضاء مقام کے خلاف لے آتے ہیں۔ تو یہاں پر بھی تہکم یعنی ان کی تحقیر و تذلیل اور ان کی حماقت کے اظہار کے لئے اِذَا کی بجائے اِنۡ لایا گیا یعنی یہ لوگ ایسے احمق ہیں کہ ایک کھلی اور یقینی بات بھی ان کو شکی معلوم ہوتی ہے اور جو کام یہ کبھی بھی نہ کر سکیں گے اس کی نسبت خیال رکھتے ہیں کہ ہم کر لیں گے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) اور اِنۡ جیسا شک کو چاہتا ہے اسی طرح یہ استقبال کو بھی چاہتا ہے لیکن اس کے بعد جو لفظ لَمۡ ہے اس کے معنے تو نفی کے ہیں پر جس فعل مستقبل پر آتا ہے اس کو ایک تو منفی کر دیتا ہے دوم اس کو بمعنے ماضی بنا دیتا ہے مثلاً یہاں پر اس کے بعد تَفۡعَلُوۡا ہے جس کے معنے سوائے لَمۡ کے ہوتے ہیں تم کرتے ہو یا کروگے اور لَمۡ کے آنے سے اس کے معنے ہوں گے تم نے نہیں کیا یا نہیں کیا تھا لہٰذا اِنۡ اور لَمۡ دونوں کے معنوں میں تضاد اور منافات ہے اور اس کے رفع کرنے کی ایک ہی سبیل ہے کہ اِنۡ اور لَمۡ میں سے ایک کی اقتضاء کو قائم رکھا جائے اور دوسرے کو اپنی اقتضاء سے خالی کیا جائے۔

پس اگر ان کو اپنی اقتضاء سے خالی کیا گیا تب تو یہ فعل بمعنے ماضی ہو گا اور اگر لَمۡ کو خالی کیا گیا تب یہ فعل جب بمعنے مستقبل ہو گا لیکن تفسیر روح المعانی کے بیان سے جو بات پائی

جاتی ہے حق وہی ہے جس کی تائید عقل اور نقل کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ لَمْ تو ایسے لفظ پر داخل ہوا ہے جو کہ بمعنے ماضی ہونے کے قابل ہے اور انکار نہیں کرتا وہ ہے تَفْعَلُوْا کا لفظ لہٰذا لَمْ تو اپنے اثر اور اقتضاء پر قائم ہے لیکن اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کے مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور یہ مجموعہ لَمْ کے باعث بمعنے مستقبل ہونے کے قابل نہیں اور صاف صاف انکار کرتا ہے اور اِنْ کا کام یہ تھا کہ کھینچ کر ماضی سے استقبال کی طرف لے جاتا یہاں تک کہ اس کو استقبال بنا دیتا پر چونکہ یہاں پر مانع آگیا ہے لہٰذا یہاں پر محض استقبال تو نہ بنائے گا لیکن کھینچ کر حال تک لے آئے گا اور جو ماضی حال تک کھینچی ہوئی ہو وہ ماضی استمراری ہوتی ہے۔ پس یوں کہنا چاہئے کہ اِنْ یہاں پر محض استمرار کا فائدہ دیتا ہے اور لَمْ ماضی بناتا ہے اور فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کے معنے اب یہ ہوں گے تو اگر تم اب تک نہیں کر سکے۔

یہاں پر ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کام کرنے کا ان کو کہا گیا ہے وہ تو ہی اتیان مثل۔ جیسا کہ فَأْتُوْا الخ سے ثابت ہے پس یہاں پر بجائے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کے فَاِنْ لَّمْ تَأْتُوْا بِهَا ہونا چاہئے تھا پس اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کہا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ کے پورا نہ ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ وہ اپنے خیال میں کسی سورۃ کی مثل کوئی کلام بنا کر لے آئیں پر منصف لوگ ان کے خیال کے خلاف فیصلہ دے کر یہ ثابت کر دیں کہ وہ کلام اس سورۃ کی مثل نہیں ہے۔ دوم یہ کہ سرے سے وہ کوئی ایسا کلام لائیں ہی نہیں اور ظاہر ہے کہ دوسری سورۃ اس حجت کے بے شبہ پورا ہونے کے لئے بہت مناسب ہے کیونکہ پہلی صورت میں وہ منصفوں اور ان کے فیصلہ پر حرف رکھ کر کہہ سکتے تھے کہ ہم مثل لے آئے ہیں بخلاف دوسری صورت کے کہ اس میں کوئی ایسی حجت بازی نہیں کر سکتے تو خداوند کریم نے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فرما کر یہ بات ظاہر کی ہے کہ سرے سے وہ ایسا کوئی کلام لائے ہی نہیں۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔ وَ۔ اور، اس واؤ کو عام طور پر مفسرین نے اعتراضیہ کہا ہے اور یہ وہ ہوتی ہے کہ جس کے بعد جملہ معترضہ آیا کرتا ہے اور جملہ معترضہ اس کو کہتے ہیں جو کلام اور ایسے لفظوں کے درمیان آجاتا ہے کہ وہ آپس میں تعلق رکھتے ہیں اور یہاں پر شرط اور

جزاء کے درمیان آیا ہے کیونکہ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا شرط ہے اور فَاتَّقُوْا الخ جزاء ہے۔

لَنْ۔ نہ، نہیں۔

(حضرت حکیم الامتؒ) لَنْ۔ نفی مستقبل کے لئے آتا ہے اور ہمیشہ فعل مضارع پر آتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ تاکید اور تابید یعنی ہمیشہ کے لئے آیا کرتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ تابید و تاکید کے لئے ہوتا تو فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (مریم:27) (پس نہ بات کروں گی آج دن کسی انسان سے) کہنا جائز نہ ہوتا کیونکہ یہاں پر تابید نہیں بلکہ یوم سے مقید ہے اور اگر تاکید کے لئے ہوتا تو پھر وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (البقرۃ:96) (اور وہ کبھی بھی اس کی آرزو نہ کریں گے) میں تکرار لازم آتا۔ اور کبھی دعا کے لئے آتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (القصص:18) (تو میں بھی مجرموں کا مددگار نہ ہوں۔)

(محمد سرور) لیکن میرے خیال میں مذکورہ بالا تقریر میں اس کا تاکید کے لئے نہ آنا بخوبی ثابت نہیں ہوا کیونکہ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا[1] (البقرۃ:96) میں اوّل تو ابد زمانہ کے استمرار کے لئے ہے اور لَنْ تاکید فعل کے لئے اور یہ دونوں جدا امر ہیں لہٰذا تکرار نہیں ہے اور ثانیاً یہ کہ اگر تابید اور تاکید کو ایک شے بھی فرض کیا جائے تو دو تاکیدوں کا جمع ہونا کلام عرب اور خصوصاً فرقان حمید میں بکثرت پایا جاتا ہے جیسا لَيَقُوْلَنَّ (ضرور ضرور وہ کہے گا) میں لام بھی تاکید کے لئے ہے اور نون مشدد بھی تاکید کے لئے ہے۔

تَفْعَلُوْا۔ فِعْلٌ سے ہے جس کے معنے کرنے کے ہیں پس لَنْ تَفْعَلُوْا کے معنے ہوئے، تم نہ کروگے۔

اور لَنْ مفید تاکید ہوا تب اس کے معنے ہوں گے۔ ضرور تم نہ کروگے اور دنیا پر روشن ہے کہ وَلَنْ تَفْعَلُوْا میں جو آئندہ زمانہ کی نسبت پیشگوئی کی تھی اور غیب کی خبر دی تھی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی اور جس طرح اس میں صاف صاف خبر دی تھی (کہ اسلام کے سب مخالف خواہ بہت ہی کثیر التعداد شدید العناد وسیع العلم نہایت طاقتور اور بڑے

[1]۔ وہ کبھی بھی اس (قسم کی موت) کی تمنا نہیں کریں گے۔ (تفسیر صغیر)

مالدار، صاحب سلطنت ودولت اور باعزت ووقار ذی اقتدار ہوں اور خواہ وہ سب کے سب مل کر بالاتفاق قرآن مجید کی تکذیب پر ایسے تلے ہوئے ہوں کہ یہ امر ان کے لئے اہم المطالب ہو اور وہ اس کے لئے اپنے خون اور مال کو پانی کی طرح بہاتے ہوں تو بھی اس کی کسی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کی مانند بھی نہ لاسکیں گے) چودھویں صدی تک ویسا ہی ثابت ہوا اور پایا گیا ہے کہ باوجود کثرت تعداد، شدت عناد، وسعت علم، عظمت، طاقت وسلطنت ودولت ومال ووفور عزت واقتدار کے سب نے اسلام کی تکذیب میں بالاتفاق ناخنوں تک زور لگایا ہے اور اس غرض کے پورا کرنے میں اپنے مال وجان کو خاک کی طرح اڑایا ہے لیکن اب تک وہ کسی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کی مانند بھی نہیں لاسکے جو کہ نصف منٹ بھی اپنے پڑھنے پر وقت صرف نہیں کراتی۔

پس یہاں پر قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کا ایک اعجازی نشان ہی نہیں بیان ہوا بلکہ اس زبردست لاجواب کے علاوہ اخبار بالغیب کے ساتھ دوسری قوی بلکہ اقویٰ دلیل بھی بیان فرمادی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک انسان اپنی اور اپنے ہم جنس انسانوں کی فطرت پر نظر کرکے یقین کرسکتا ہے کہ علم غیب انسانی طاقت سے باہر ہے بلکہ یہ خاص خداوند کریم کے لئے ہے اور سب آسمانی کتابیں اس بات پر متفق ہیں اور واقعات حقہ اس کے شاہد ہیں اور قرآن مجید نے یہاں پر اس غیب کی خبر دی ہے جس کا کسی اٹکل سے ہرگز علم نہیں حاصل ہوسکتا اور واقعات صحیحہ نے ثابت کردیا ہے کہ قرآن مجید کی یہ اخبار بالغیب بالکل صحیح اور درست ہے کیونکہ جیسا قرآن مجید نے فرمایا تھا کہ کوئی بھی اس کی مثل نہ لائے گا اسی طرح یہ ثابت شدہ صداقت ہے کہ تیرہ صدیوں میں کوئی بھی کسی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کی مثل بھی نہیں لایا تو جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ اخبار بالغیب صحیح اور درست ہے اور اللہ کریم کے سواء دوسرا کوئی اخبار بالغیب صحیح طور پر نہیں دے سکتا تو اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید جو کہ اخبار بالغیب پر مشتمل ہے خدائے علیم کا کلام ہے۔

پس ناظرین خوب یاد رکھیں کہ یہاں پر لَا رَیْبَ فِیْهِ کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں نہ

ایک اور ان دونوں قوی ترین براہین کے جواب میں یہ کہہ دینا ہر گز قابل سماعت نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے کسی نے کسی سورۃ کی مثل بنائی ہو اور اس کا مثل ہونا ثابت بھی ہو گیا ہو لیکن ہمارے تک اس کی روایت نہ پہنچی ہو اور یہ مسلم قاعدہ ہے کہ عدم علم کسی شے کے عدم کی دلیل نہیں ہوتا لہٰذا ایسی مثل کے عدم علم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ واقعہ میں ایسی مثل کوئی نہیں لایا اور یہ قابل سماعت اس لئے نہیں ہے کہ جس طرح یہ قاعدہ ہے کہ عدم علم سے عدم شے ثابت نہیں ہوتا اسی طرح یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب کسی امر کی روایت اور بیان اور شہرت کو بہت سے امور یا ایک ہی امر بڑے زور سے چاہتا ہو اور پھر بھی اس کی نسبت کوئی روایت اور بیان اور شہرت نہ ہو تو یہ اس کے عدم اور نہ ہونے کی دلیل ہے تو چونکہ اسلام کے مخالفین کی کثرت اور شدت عناد اور ان کے مستمر حملے اور اس کی بیخ کنی کے لئے ان کی مستمرہ شاق سے شاق تکلیفیں اور کوششیں اس امر کے بہت ہی مقتضی ہیں کہ اگر اسلام کی تکذیب کے لئے کوئی امر مثل اتیان مثل قرآن یا مثل سورۃ کے ان کے ہاتھ میں آتا تو ضرور ہی وہ زبان زد خلائق اور شہرہ آفاق ہو جاتا اور ہر ایک زمانہ میں اس کی روایت ضرور ہی تواتر کے درجہ تک پہنچتی۔ چہ جائیکہ دنیا میں اس کا نام ونشان بھی نہ ہوتا تو چونکہ اس امر کا نام ونشان تک نہیں کہ فلاں سورۃ کی مثل مخالفین لائے تھے یا پیش کی تھی یا کم از کم مخالفین نے اگرچہ پیش نہیں کی مگر خود انہوں نے بالاتفاق اس کو مثل مان لیا تھا۔ لہٰذا قاعدہ مذکورہ کی وساطت سے ثابت ہے کہ ایسی مثل یقیناً کوئی بھی ہر گز ہر گز نہیں لایا اور مسیلمہ کذاب کے چند فقرات مضحکہ ساز جو کہ بعض روایات میں آئے ہیں ان کی نسبت نہ اس کا یہ دعویٰ ہے اور نہ یہ کہ کسی طرح سے ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ اس نے فلاں سورۃ کے کلمات طیبات کی مثل بنائی تھی یا مثل کے طور پر پیش کی تھی بلکہ ان کی نسبت اسی قدر آیا ہے کہ اس نے ان کو اپنی وحی قرار دیا تھا اور وحی ہی کے طور پر سنایا تھا اور بس۔

الغرض کہ یہ اعجاز بھی ثابت ہے کہ قرآن کی مثل کوئی نہیں لا سکتا اور یہ پیشگوئی اور اخبار بالغیب بھی ثابت ہے کہ آئندہ بھی کوئی نہ لائے گا لیکن صد افسوس کہ ظالموں نے نہ

اس اعجاز کے ثبوت اور پیشگوئی کی صداقت سے فائدہ اٹھایا اور نہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعینہٖ اس اعجاز کے ثبوت اور اس پیشگوئی کے صدق سے کچھ فائدہ اٹھایا بلکہ جس طرح وہاں پر لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا [1](الانفال:32) کہتے رہے اسی طرح یہاں پر بھی کہنے لگے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔ [2](البقرۃ:25)

ف۔ بمعنے پس۔ لہٰذا ہے اور اس کو فَاء جزائیہ کہتے ہیں۔

اِتَّقُوا۔ تقوی سے ہے جس کے معنی بچنے کے ہیں۔ پس اِتَّقُوا کے معنے ہوئے تم بچو۔

ال۔ وہ چونکہ قیامت یعنی دوزخ کی آگ کا سورۂ تحریم وغیرہ میں پہلے بیان ہو چکا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان کر دیا تھا لہٰذا یہاں پر ال کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا تا کہ پہلے ہی سے اس کے پُر خوف اور ہیبت ناک وغیرہ ہونے کی طرف اجمالی طور پر توجہ دلائی جائے۔

نَارٌ۔ آگ۔

اَلَّتِی۔ جو، جس۔

وَقُوْدٌ۔ یہ لفظ اگر واو کی زبر کے ساتھ ہو تب بمعنے بالن اور ایندھن کے ہوتا ہے اور اگر پیش کے ساتھ ہو تب بمعنے آگ جلانے کے ہوا کرتا ہے اور بعض نے برعکس بھی کہا ہے لیکن صحیح اوّل ہی ہے۔

هَا۔ اس۔ یعنی آگ۔

آل۔ وہ۔ نَاسٌ۔ انسان اور اس کی تشریح وَمِنَ النَّاسِ الخ اور یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ الخ میں گذر چکی ہے اور یہاں پر وہ انسان مراد ہیں جن کے دخول نار کے استحقاق کا ذکر اس سے پہلے اور سورتوں میں بیان ہو چکا ہے۔

وَ۔ اور۔ ال۔ وہ۔

حِجَارَةٌ۔ حَجَرٌ کی اسم جمع یا جمع ہے، جس کے معنے پتھر کے ہیں۔

---

[1]۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس قسم کا کلام بنا (کر پیش کر) سکتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ (تفسیر صغیر)

(حضرت مولٰنا حکیم الامتؒ) بعض کا قول ہے کہ اَلنَّاسُ سے مراد یہود ہیں اور الْحِجَارَۃُ سے مراد ان کے سوا اور کفار ہیں اور بعض کے نزدیک اَلنَّاسُ سے عام اہل نار مراد ہیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد سیاہ گندھک ہے اور مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس سے نہایت بدبودار گندھک مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بُت ہیں جو کہ عام پتھر یا اس کی قسم سونا چاندی سے بنائے جاتے ہیں۔ جیسا قرآن مجید میں آیا ہے۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء:99)(بے شک تم اور جن کی کہ تم اللہ کریم کے سوا پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو) اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے سونا اور چاندی مراد ہیں اور کتب لغت عرب میں سونے اور چاندی کو حَجَرَیْنِ کہا جاتا ہے۔

(محمد سرور) حق یہ ہے کہ جب تک قرآن مجید یا حدیث مرفوع یا قراین قویہ کسی عام مفہوم کی تخصیص نہ کریں تب تک اس کی تخصیص درست ہوتی اور نہ یہ کہنا درست ہوتا ہے کہ اس سے فلاں امر مراد ہے جب تک کہ ان تینوں میں سے کوئی یہ نہ بتائے کہ ہاں بے شک اس سے یہ مراد ہے اور ظاہر ہے کہ نَاسٌ مطلق انسانوں کو کہتے ہیں اور حِجَارَۃٌ مطلق پتھر کو پس جب تک قرآن مجید یا حدیث یا قرآن قویہ اس بات کی خبر نہ دیں کہ نَاسٌ اور حِجَارَۃٌ سے سوا انسان اور پتھر کے کوئی اور چیز مراد ہے یا یہ کہ انسان اور پتھر کی فلاں قسم یہاں پر مراد ہے تب تک ایسا کہنا قابل سماعت نہیں ہو سکتا اور جہاں تک مجھے علم ہے قرآن مجید اور احادیث مرفوعہ اور قرائن قویہ نہ اس بات کے شاہد ہیں کہ اَلنَّاسُ سے یہود مراد ہیں اور نہ اس کے کہ حِجَارَۃٌ سے کفار یا فلاں قسم کی گندھک یا سونا چاندی یا بت وغیرہ ہیں ہم مانتے ہیں کہ سونے چاندی کو حَجَرَیْنِ کہتے ہیں لیکن اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں پر حَجَر کے یہی معنے مراد ہیں تفسیروں میں یہ استدلال کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ لغت میں اس کے فلاں معنے بھی آئے ہیں لہٰذا یہاں پر یہ مراد ہیں حالانکہ لغت میں جیسے یہ معنے آئے ہیں ایسے ہی اور بھی بہت سے معنے آئے ہیں۔

پس اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ یہاں پر یہی مراد ہیں یہ نہایت غلط استدلال ہے پر بہت ہی مشہور ہے اور حَجَرٌ سے مراد یہود کے سوا اور کفار کا ہونا کسی آیت یا حدیث مرفوع سے ثابت نہیں اور نہ لغت اور قرائن سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس سے گندھک کا مراد ہونا بھی ایسا ہی ہے اور سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ[1] (ابراہیم:51) وغیرہ سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جہنم کی آگ کا ایندھن گندھک ہے چہ جائیکہ وہ سیاہ گندھک ہو یا بدبودار ہو بلکہ محض خیال ہے جس کی بناء خالص اس پر ہے کہ اس کو جلد آگ لگتی ہے اور نیز اس کی آگ تیز ہوتی ہے اور بس۔

رہا بتوں کا مراد ہونا تو اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ[2] (الانبیاء:99) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بت جہنم کا ایندھن ہوں گے بلکہ اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ وہ جہنم میں ڈالے جاویں گے چنانچہ اس کے بعد یوں آیا ہے اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ۔ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا (الانبیاء:99-100) (تم اس میں وارد (داخل) ہوگے اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں وارد نہ ہوتے) نیز دوسرے مقام پر آیا ہے اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا۔ لَّعَنَهُ اللّٰهُ (النساء:118-119) (نہیں پکارتے اللہ کو چھوڑ کر[3] مگر عورتوں کو اور نہیں پکارتے مگر دھتکارے ہوئے شیطان کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے) تو اگر وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا کو پہلے کی تفسیر اور واو کو حرف تفسیر قرار دیا تب تو مَا تَعْبُدُوْنَ یا یَدْعُوْنَ فی الحقیقت ایک شیطان ہی ثابت ہو گا نہ کوئی اور اگر اس کو تفسیر نہ بنایا بلکہ عطف بنایا تب بت اور شیطان دونوں مَا تَعْبُدُوْنَ اور یَدْعُوْنَ کا مصداق ہوں گے بلکہ واقعات گواہ ہیں کہ ان کے سوا گائے، سورج، آگ، پانی وغیرہ اور بہت سے معبود ہیں جن کو حَجَر اور پتھر نہیں کہا جاتا تو پھر مَا تَعْبُدُوْنَ میں یہ سب اشیاء داخل ہیں اور اَلْحِجَارَةُ میں

---

[1]۔ ان کے کرتے (گویا) تارکول کے بنے ہوئے (کالے سیاہ) ہوں گے۔ (تفسیر صغیر)

[2]۔ (اس وقت کہا جائے گا کہ) تم بھی اور جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے سب کی سب جہنم کا ایندھن بنیں گی۔ (تفسیر صغیر)

[3]۔ رسالے کے اندر آیت کے الفاظ مِنْ دُوْنِهٖ نہیں لکھے تھے، اسی طرح ان کا ترجمہ بھی نہیں تھا۔ الفاظ اور اس کا ترجمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ (از مرتب)

خاص وہی بت آسکتے ہیں جو کہ از قسم پتھر ہوں اور بس۔ پس پتھر کی یہاں پر تخصیص کرنی بے وجہ ہے۔

غرض کہ نہ حِجَارَۃٌ سے عام معبود مراد ہوسکتے ہیں اور نہ معبودوں میں سے خاص پتھر کے معبود آگ میں ڈالے جانے کے ساتھ مخصوص ہوسکتے ہیں تو جب مذکورہ بالا سب معانی کا یہ حال ہے تو ضرور اس کے کچھ اور معنے ہونے چاہئے۔ ایک معنے خداوند کریم نے میرے دل میں بھی ڈالے ہیں اور وہ قرآن مجید کے الفاظ کے بالکل مطابق ہیں نیز نہ تو کوئی لفظ اپنے اصلی معنوں سے پھیرا جاتا ہے اور نہ کسی عام لفظ کی تخصیص کی جاتی ہے اور قرآن مجید کی عام تعلیم کے موافق اور حضرت امام ہمام علیہ السلام کے سچے اصول پر مبنی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی کی تحریر یا تقریر میں مَیں نے اب تک نہ وہ دیکھے ہیں اور نہ سنے ہیں اور یہ کوئی نقص کی بات نہیں ہے اور وہ یہ ہیں کہ اَلنَّاسُ سے تو عام وہ بدکار لئے جاویں جو کہ قرآن مجید کی اور آیتوں میں بصراحت مذکور ہیں مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الجن:16) (ولیکن بے انصاف لوگ پس جہنم کی لکڑیاں ہیں۔)

پس یہاں پر جن کو وہاں پر بصراحت تامہ حَطَبُ جَهَنَّمَ قرار دیا ہے یہاں پر اَلنَّاسُ سے یقیناً وہی لوگ مراد ہیں اور حِجَارَۃٌ سے وہ عام پتھر مراد ہیں جن کو ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ آگ کا ایندھن ہوتے ہیں جیسے پتھر کے کوئلے آتش فشاں پہاڑ اور گندھک وغیرہ یا ان کا کسی کو علم تک بھی نہیں ہے لیکن حقیقت میں وہ اس صفت کے ہیں اور اس بات میں بھی مجھے اور مفسرین سے اتفاق نہیں ہے کہ یہاں پر جو آگ ذکر کی ہے وہ ایک ہی آگ ہے کہ ایک ہی حالت میں جس کا ایندھن دو چیزیں ہیں انسان اور پتھر کیونکہ یہ مفسرین اور عام اہل اسلام کے مذہب کے مطابق بھی درست نہیں ہوسکتا اس لئے کہ آخرت کی آگ میں دو مذہب ہیں اوّل یہ کہ وہ آگ پہلے سے مخلوق ہے اور قیامت کو لوگ اس میں ڈالے جاویں گے۔ دوم یہ کہ وہ پہلے سے مخلوق نہیں ہے بلکہ ہر ایک انسان کے وہ برے اعمال قیامت میں جسمانی رنگ پکڑ کر آگ ہو جاویں گے جو کہ انسان کے ساتھ ہیں بلکہ بہت سی ایسی بدیاں ہیں جن کا تعلق دل سے ہے عام اہل اسلام اور مفسرین کا پہلا مذہب ہے اور دوسرے

مذہب کی انہوں نے تردید کی ہے اور ظاہر ہے کہ پہلے مذہب کے مطابق اس آگ کا ایندھن وہی چیز ہے کہ انسان کے دخل ہونے سے پہلے جس کے ساتھ وہ آگ قائم ہے اور انسان اس کا ایندھن ہر گز نہیں ہے بلکہ اس میں ایسا داخل ہے جیسا کہ لوہا یا پتھر یا مٹی جلتے ہوئے کولوں یا لکڑیوں میں ڈال دیں۔

پس اس صورت میں جس طرح آگ کا ایندھن کولے یا لکڑیاں ہیں اور لوہا پتھر مٹی ہر گز ایندھن نہیں ہیں ہاں اس میں داخل ہیں اسی طرح یہاں پر ایندھن تو وہ چیز ہے جس کے ساتھ انسان کے داخل ہونے سے پہلے وہ آگ قائم تھی اور انسان ایندھن نہیں بلکہ اس میں وارد داخل وغیرہ ہے۔

پس جن مفسروں کا یہ مذہب ہے ان کے نزدیک اس آگ کا ایندھن انسان نہیں بن سکتا لیکن کہتے وہ یہی ہیں کہ اسی ایک آگ کا ایندھن پتھر اور انسان ہیں اور ہمارے نزدیک مذہب ثانی ہی حق ہے اور اس آگ کو خواہ دو قسم کہو ایک روحانی اور دوسری جسمانی ہے یا یہ کہو کہ وہ آگ پہلے روحانی رنگ میں ہوتی ہے اور آخر میں پھر وہی آگ جسمانی ہو جاتی ہے اور وہ روحانی آگ انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود انسان ہی اس کا ایندھن ہوتا ہے اور دوسری کوئی چیز ہر گز ہر گز اس کا ایندھن نہیں ہوتی اور جسمانی آگ اس کے جسم کے باہر اس کے جسم کے سواء اور ایندھن سے جلائی جاتی ہے اور وہ ایندھن جلنے والے پتھر ہوتے ہیں جن کے اندر ہی اندر سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آگ والے اور آگ سے جلنے والے پتھر انسان کے اپنے اعمال ہی ہوتے ہیں نہ اور۔ چونکہ یہ جسمانی آگ حقیقت میں وہی پہلی آگ ایک دوسرے رنگ میں ہے جس کا مرکز دل ہے یا یوں کہو کہ یہ جلتے ہوئے پتھر حقیقت میں اس کے اعمال میں جن کا منبع قلب ہے لہٰذا یہ جسمانی آگ ہی انسان کے دل پر چڑھ آتی ہے جیسا قرآن مجید میں آیا ہے لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۔ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۔ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (الھمزۃ: 5 تا 8) (ضرور پھینکا جائے گا حُطَمَۃ میں اور تجھے کس نے بتایا ہو گا کہ حُطَمَۃ کیا چیز ہے (وہ) اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چڑھے گی) پس

قرآن مجید نے جہاں پر النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (البقرۃ:25) فرمایا ہے۔ جیسا کہ یہاں پر ہے یانَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (التحریم:7) فرمایا ہے جیسا سورۂ تحریم میں آیا ہے تو وہاں پر انہی دو آگوں یا آگ کی دو حالتوں کی طرف (یعنی روحانی اور جسمانی آگ کی طرف) اشارہ کرنے کے لئے وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ فرمایا ہے اور مفسروں کا خیال یہ ہے کہ اس آگ کے دو ایندھن اس لئے خداوند تعالیٰ نے بتائے ہیں تاکہ لوگوں کو اس سے خوف لاحق ہو کہ ایسی سخت آگ ہے کہ بجائے لکڑی کے پتھر اور انسان اس کا ایندھن ہیں۔

لیکن میرے نزدیک یہ ہے کہ دو قسم کی آگ یا آگ کی دو حالتیں بیان کرنا منظور ہے اور اس سے عذاب اُخروی کی فلاسفی ہاتھ لگتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ آگ کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ انسان کے اندر ہی وہ پیدا ہوتی ہے اور وہی اس کا ایندھن ہوتا ہے اگرچہ اخیر میں وہ ترقی کر کے جب جسمانی رنگ پکڑتی ہے تو پھر اس سے باہر بھی اس کا وجود ہوتا ہے اور پتھر اس کا ایندھن ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اَلنَّاسُ کو الْحِجَارَۃُ پر مقدم کیا گیا ہے اور کہیں وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ کے بجائے وَقُوْدُھَا الْحِجَارَۃُ وَالنَّاسُ نہیں آیا کیونکہ اس آگ کا مبداء اور پہلا اور اصلی ایندھن خود انسان ہی ہے نہ پتھر۔

اُعِدَّتْ۔ اِعْدَادٌ سے ہے، جس کے معنے تیار کرنے کے ہیں۔ پس اُعِدَّتْ کے معنے ہوئے وہ تیار کی گئی ہے۔

لِ۔ لئے، واسطے۔ اَلْکَافِرِیْنَ میں ال بمعنے اَلَّذِیْنَ ہے جس کے معنے ہیں جو، جن۔ اور کَافِرِیْنَ۔ کُفْرٌ سے ہے، جس کے معنے مفصل طور پر پہلے رکوع میں زیر آیت کریمہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ بیان ہو چکے ہیں اور کَافِرِیْنَ کے اصل معنے ہیں کفر کرنے والے اور یہاں پر ال بمعنے اَلَّذِیْنَ کے بعد آنے کے باعث اس کے معنے ہوں گے کفر کیا انہوں نے اور اُعِدَّتْ کے ساتھ ملا کر معنے ہوئے جو تیار کی گئی ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا۔ یہاں پر مفسرین نے لکھا ہے اُعِدَّتْ الخ۔

(ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز اردو جلد 6 نمبر 7 صفحہ 41 تا 60 سن 1907ء)

کے ما قبل پر نظر کرنے سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اُعِدَّتْ کے وَاُعِدَّتْ ہوتا تاکہ وَقُوْدُهَا النَّاسُ الخ پر عطف ہو کر پہلے کلام کے ساتھ متصل ہو جاتا اور واو نہ لانے سے یہ بالکل علیحدہ کلام ہو گیا ہے جس کا ما قبل سے کچھ تعلق نہیں ہے حالانکہ معنے کے لحاظ سے اس کا تعلق ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں مفسرین نے علم ادب کے ایک قاعدہ سے مدد لی ہے اور وہ یہ ہے کہ کبھی کسی شے کی عظمت شان کے اظہار کے لئے پہلے کلام سے اس کو علیحدہ کر کے جدا اور مستقل کلام بنا دیتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ پہلے سے متصل ہوتی ہے اور یہاں پر بھی آگ کے تیار کرنے کی عظمت کے ظاہر کرنے کے لئے ما قبل سے علیحدہ کر دیا ہے۔

لیکن میرے نزدیک ایسے جواب محض تکلفات ہوتے ہیں اور ان کی بناء عموماً حقیقت سے ناواقف ہونے پر ہوا کرتی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ یہاں پر ما قبل ہر گز نہیں چاہتا کہ اُعِدَّتْ اس کے ساتھ متصل ہو اور اس کے ظاہر کرنے کے لئے بجائے اُعِدَّتْ کے وَاُعِدَّتْ ہو بلکہ ما قبل پر گہری نظر کرنے سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ اُعِدَّتْ کا ما قبل با آواز بلند بتاتا ہے کہ اُعِدَّتْ میرے ساتھ متصل نہیں ہے بلکہ ضرور علیحدہ ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ اَلَّذِیْ اَلَّتِیْ وغیرہ کے بعد جو جملہ آتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ سامعین کو اس کا پہلے سے علم ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اس کو پہچانیں جو کہ اَلَّذِیْ وغیرہ سے مراد ہے مثلاً مَاتَ الرَّجُلُ الَّذِیْ لَقِیْتَهُ اَمْسَ (وہ آدمی مر گیا ہے جس کو تو کل ملا تھا) لَقِیْتَهُ اَمْسَ وہ جملہ ہے جس کو مخاطب پہلے سے جانتا ہے اور اب اس کے ذریعہ سے متکلم مخاطب کو اس شخص کی شناخت کراتا ہے جس کے مرنے کی اب اس کو خبر دیتا ہے۔

اسی طرح یہاں پر اَلَّتِیْ کے بعد وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) وہ جملہ ہے جس کو مخاطب لوگ پہلے سے جانتے ہیں کیونکہ روحانی آگ (جس کا ایندھن انسان ہوتا ہے) اور جسمانی آگ (جس کا ایندھن پتھر ہوتے ہیں) سب پہلے سے جانتے تھے لیکن اس کے بعد جو اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ آیا ہے یہ وہ جملہ ہے جس کا مخاطبین کو پہلے ہر گز ہر گز علم نہ تھا اور یہ بالکل ظاہر ہے اور یہ بھی مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو کلمہ یا کلام کسی پر

عطف کیا جاتا ہے تو وہ اسی ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔ تو چونکہ اَلَّذِیْ اَلَّتِیْ کے متذکرہ بالا قاعدہ کے لحاظ سے ضروری ٹھہرتا ہے کہ اَلَّتِیْ کے بعد کا جملہ جو کہ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ہے مخاطبین کو ضرور ہی پہلے سے معلوم ہو اور حقیقت میں وہ پہلے سے معلوم ہے بھی اور عطف کا قاعدہ چاہتا ہے کہ جو جملہ وَقُوْدُھَا الخ پر عطف کیا جاوے وہ ضرور اس کے حکم میں ہو لہٰذا ثابت ہوا کہ جس طرح اس کے پہلے کا معلوم ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کا بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ حقیقت میں اُعِدَّتْ الخ مخاطبین کو ہرگز معلوم نہیں ہے تو جب عطف سے معلوم ہونا ضروری لازم آتا ہے اور حقیقت میں وہ معلوم نہیں ہے۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ عطف ہو سکتا ہی نہیں چہ جائیکہ اس کا عطف کرنا ضروری ہو اور جب عطف کرنا جائز ہی نہیں تو اب اس پر یہ اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہی کہ عطف کیوں نہیں کیا اور نہ اس بات کی ضرورت رہی کہ عطف نہ کرنے کے لئے مثل اظہار عظمت وغیرہ کے کوئی وجہ تلاش کی جاوے غرضکہ یہاں پر یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ اس کے جواب کی ضرورت پڑے۔

یہ بات بھی قابل یاد رکھنے کے ہے کہ عموماً اہل سنت والجماعت کا مذہب یہی ہے کہ جہنم کی آگ پہلے سے پیدا کی ہوئی ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔ اور ان کا بڑا بھاری استدلال اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم نے یہاں پر اس کو تیار شدہ بتایا ہے جس سے صاف صاف ثابت ہے کہ وہ پہلے سے پیدا کی ہوئی ہے اور معتزلہ کے نزدیک وہ ابھی مخلوق نہیں ہوئی بلکہ آئندہ ہوگی اور انہوں نے اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کا یہ جواب دیا ہے کہ قرآن مجید میں اعداد کا ذکر اور محل پر بھی بصورت ماضی آیا ہوا ہے اور وہاں پر بھی معنے تیار کرنے کے ہی ہیں اور پھر بھی وہاں پر بالاتفاق وہ شے موجود نہیں مانی گئی جس کی طرف اعداد منسوب ہے مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (الاحزاب:36) (ان کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے) کیونکہ یہاں پر تیار کرنے کا یہی مطلب لیا گیا ہے کہ مغفرت اور اجر عظیم کے وہ مستحق ہو گئے ہیں اور اللہ کریم نے ان دونوں کے اسباب وذرائع

ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں۔ جن سے عنقریب یہ دونوں ان کو حاصل ہو جاویں گے نہ یہ کہ یہ دونوں موجود ہو گئے ہیں اور ان کو مل چکے ہیں کیونکہ اجر عظیم اور مغفرت کا وجود بجز اس کے اور نہیں کہ ان کو یہ دونوں مل جاویں اور ظاہر ہے کہ نزول آیت کے وقت صحابہ کرامؓ کو یہ دونوں کے دونوں ملے نہ تھے اور اگر مان لیا جاوے کہ شے کے اعداد سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ موجود ہو جاوے تو پھر اس کا یہ جواب ہے کہ قیامت کے حالات کے لئے قرآن مجید نے عموماً فعل ماضی کو اختیار کیا ہے حالانکہ وہ سب احوال آئندہ ہونے والے ہیں جیسا آیا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ (الکہف:100)(اور صور میں پھونکا گیا) اور آیا ہے قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ (الزمر:73)(کہا گیا جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔)

پس ان دونوں آیتوں میں اگرچہ فعل ماضی لایا گیا ہے لیکن بمعنے مستقبل ہے اور علمائے کرام نے لکھا ہے کہ یہاں پر فعل ماضی اس لئے لایا گیا ہے تاکہ فعل کے تحقق اور یقینی ہونے پر دلالت کرے گویا یہ فرمایا ہے کہ یہ بات ایسی یقینی ہے گویا کہ یہ ہو ہی چکی ہے تو جب احوال قیامت میں بکثرت ایسا کیا گیا ہے اور علماء کرام اس کو تسلیم کرتے ہیں اور اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ میں بھی احوال قیامت کا بیان ہے تو پھر کیا یہاں پر فعل کو ماضی ہی رکھا جاوے اور احوال قیامت کی اور ماضیوں کی مانند اس ماضی کو بمعنے مستقبل نہ بنایا جائے اور کہا جائے کہ یہ مستقبل ہے جیسی کہ احوال قیامت کی سب ماضیاں بمعنے مستقبل مانی گئی ہیں اور ماضی محض اس لئے لائی گئی ہے تاکہ تحقق اور یقینی ہونے پر دلالت کرے۔

آگ سے کیا مراد ہے:

اور اہل کشف کا یہ مذہب ہے کہ وہ آگ مخلوق تو ہے لیکن غیر تام اور ناقص ہے یہاں تک کہ اس وقت اس کی آگ گرم ہوا کے رنگ میں ہے اور اَهْلُ النَّارِ اس میں داخل ہوں گے تو پھر وہ آگ کی شکل پکڑے گی اور دکھ دینے والی آگ بنے گی اور انہوں نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ خیال تھا کہ یہی سمندر آخر آگ ہو جاویں گے چنانچہ مروی ہے کہ جب وہ سمندر کو دیکھا کرتے تھے تو

فرماتے تھے یَا بَحْرُ مَتٰی تَعُوْدُ نَارًا (اے سمندر تو کب آگ ہو جاوے گا) اور یہی وجہ تھی کہ آپ سمندر کے پانی سے وضو نہ کرتے تھے بلکہ اس کے پانی سے وضو کرنے پر تیمم کو اختیار کرتے تھے۔

اور میں نے پہلے بتادیا ہے کہ ہمارا یہی مذہب ہے کہ انسان کے اعمال ہی آگ یا جنت بن کر جسمانی رنگ میں آخرت میں ظاہر ہوں گے اور آخرت سے پہلے ایک حد تک وہ روحانی آگ ہوتے ہیں اور قرآن مجید اس کی کھلی کھلی شہادت دیتا ہے کہ انسان کے اعمال ہی جنت اور دوزخ ہیں اور جنت اور دوزخ کا اربہا سال لوگوں کے داخل ہونے سے پہلے بنا رکھنا جیسا انسانی عقل اور شان ایزدی کے خلاف اور نامناسب ہے ایسا ہی یہ ان آیات کریمہ کے بھی مخالف ہے جو کہ یہ شہادت دیتی ہیں کہ انسان کے اعمال ہی جنت اور دوزخ بنتے ہیں اور ان کے سوا کوئی چیز یہ دونوں نہیں بنتی بلکہ بعض آیات سے تو جیسا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت دوزخ انسان کے اعمال ہی مجسم ہو کر بنیں گے ایسا ہی ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے اعمال باعث نعمت و مسرت اور موجب عذاب والم ہونے میں ترقی کرتے جاویں گے یعنی جس طرح وہ اعمال ابتداء میں روحانی جنت اور دوزخ تھے اور آخرت میں ترقی کر کے جسمانی جنت اور دوزخ ہو جاویں گے اسی طرح جسمانی بننے کے بعد بھی ایک ہی حالت پر قائم نہ رہیں گے بلکہ جسمانی جنت اور جسمانی دوزخ ہونے میں بعد ازاں بھی ترقی کرتے رہیں گے یعنی مجسم جنت بننے کے وقت اگر کوئی عمل جنت اور نعمت اور موجب مسرت ہونے کے لحاظ سے ایک نمبر پر تھا تو رفتہ رفتہ وہی دو نمبر اور تین نمبر وغیرہ ہوتا جاوے گا۔

تفجیر سے کیا مراد ہے:

مثلاً قرآن مجید نے ایک محل پر فرمایا ہے عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (الدھر:7) (وہ ایک چشمہ ہو گا جس سے اللہ کے بندے پئیں گے بہت کچھ چیرتے جاویں گے اس کو) اِنْفِجَارٌ کہتے ہیں چشمہ پھوٹنے کو یعنی زمین پھٹ کر پانی نکلنے کو اِنْفِجَارٌ بولتے ہیں پس تَفْجِيْرٌ کے معنے ہوئے زمین کو پھاڑ کر پانی نکالنا اور ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ

میں اس کام کو عباداللہ کی طرف نسبت کیا ہے اور فعل بھی مستقبل لایا گیا ہے اور اس سے پہلے اس چشمہ سے پینے کا بھی ذکر ہے تو یہ وہ امور ہیں جن پر نظر کرنے سے ایک تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ چشمہ کوئی اور چیز نہیں بلکہ عباداللہ کے بعض اعمال ہی چشمہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ اعمال چشمہ بن کر پھر اسی مقدار پر نہ رہے گا بلکہ ترقی کرتا جاوے گا علیٰ ہذا القیاس اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس امر کی مثبت ہیں۔

اُعِدَّتْ کے معنے:

تو جب یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اعمال ہی جنت دوزخ بنیں گے اور جنت دوزخ کا ارب ہا سال پہلے سے پیدا شدہ ہونا اس کے خلاف ہے اور ارب ہا سال پہلے سے بے کار و بے فائدہ ایسے بڑے دو عالموں کا بنا رکھنا شان الٰہی کے خلاف ہے اور پھر جس اُعِدَّتْ اور اَعَدَّ سے ان دونوں کا پہلے سے مخلوق ہونا ثابت کیا جاتا ہے ان کا حال وہ ہے جو کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اوّل تو اِعْدَادٌ یعنی تیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شے بنائی گئی ہے جس کی طرف وہ منسوب ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ چیز دوسری چیز کے لئے موزوں اور مناسب قرار دی گئی ہے اور وہ دوسری چیز اس کی مستحق قرار دی گئی ہے اور کہ اس کے اسباب مہیا ہوئے ہیں لہٰذا عنقریب وہ حاصل ہو جاوے گی اور اگر مانا بھی جاوے کہ تیار کرنے کے یہی معنے ہیں کہ وہ چیز پیدا کی گئی ہے تو پھر جس طرح قیامت کے متعلق اور ماضیان بمعنے مستقبل ہوا کرتی ہیں اسی طرح اُعِدَّتْ بھی بمعنے مستقبل ہو سکتا ہی نہیں بلکہ ضرور ہے تو پھر باوجود ان سب باتوں کے کس طرح اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ اور اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ[1] الخ (التوبۃ:89) سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جنت اور دوزخ دونوں لکھو کھا سال سے پیدا شدہ ہیں۔

اور اہل کشف اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خصوصیات سے اگر قطع نظر کی جاوے تو ان دونوں مذہبوں کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ دوزخ کا اصل بیج تو موجود ہے لیکن کامل درخت آخرت میں جا کر بنے گا اور یہ بالکل ہمارے مذہب کے مطابق ہے ہاں فرق یہ ہے

[1]۔ اللہ نے ان کے لئے... جنتیں تیار کی ہیں۔ (تفسیر صغیر)

کہ ایک مذہب میں وہ تخم سمندر رہے اور دوسرے میں وہ گرم ہوا ہے اور ہمارے نزدیک وہ انسانوں کے برے عقائد برے اخلاق بُرے اعمال ہیں جو کہ ابتداء ہیں روحانی دوزخ ہوتے ہیں اور آخر پھر جسمانی جہنم ہو جاویں گے الغرض اگر اِعْدَادٌ سے پیدا اور ٹھیک ٹھاک کرنا مراد ہے تب تو اُعِدَّتْ بمعنے مستقبل ہے جس طرح کہ وہ ماضیان بمعنے مستقبل ہیں جو کہ قیامت کی نسبت آئی ہیں اور اگر اِعْدَادٌ کے وہ معنے ہیں جو کہ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا[1] (الاحزاب:36) میں بیان کئے ہیں یا بمعنے تجویز کرنے اور مقرر کرنے کے ہے تب اُعِدَّتْ بمعنے ماضی ہے جیسا کہ اس کا اصل مقتضٰی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ دونوں صورتوں میں اُعِدَّتْ کے معنے تیار کرنے کے ہیں ہاں تیار کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

چونکہ فَأْتُوْا اور شُھَدَاءَ کُمْ اور اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں مخاطب کی ضمیریں لائی ہیں لہٰذا اس مقام کے مناسب یہ تھا کہ بجائے اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کے اُعِدَّتْ لَکُمْ فرمایا جاتا پس کیا وجہ ہے کہ کُمْ ضمیر کے بجائے کَافِرِیْنَ لایا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ بے شک مقام ضمیر کو چاہتا تھا لیکن اگر ضمیر لائی جاتی تو اس عبارت میں سے یہ امر ہرگز نہ ظاہر ہوتا کہ جن لوگوں کو یہاں پر مخاطب کیا ہے ان کے لئے آگ کیوں تیار کی گئی ہے بخلاف اَلْکَافِرِیْنَ کے کہ وہ اس وجہ کو ظاہر کر دیتا ہے لہٰذا اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ پس لِلْکٰفِرِیْنَ فرما کر خداوند کریم نے یہ بتایا ہے کہ یہاں پر جو لوگ مخاطب کئے گئے ہیں۔ ان کے لئے آگ اس لئے تیار کی گئی ہے یا تیار کی جاوے گی کہ انہوں نے کفر کیا ہے گویا خداوند کریم نے فرمایا ہے اے مخاطبو! تمہارے لئے اس لئے آگ تیار کی گئی ہے کہ تم کفر کر رہے ہو لہٰذا تم کو چاہئے کہ اس آگ سے بچنے کے لئے کوشش کرو اور جس کلام میں تم کو اس بات کی خبر دی گئی ہے اگر تم کو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے تو اس کی مثل لے آؤ اور اگر نہ لا سکو اور ضرور نہ لا سکو گے تو پھر یقین کر لو کہ یہ خدا کا کلام ہے اور جو کچھ اس میں خبر دی گئی ہے وہ بالکل سچ ہے اور جس آگ

[1]۔ ان سب کے لئے اللہ نے بخشش کا سامان اور بڑا انعام تیار کر رکھا ہے۔ (تفسیر صغیر)

سے اس میں ڈرایا گیا ہے اس سے بچنے کی کوشش کرو اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں بیان ہوا ہے اس کو مان کر اس پر عمل درآمد رکھو۔ اور یہ توجیہ بالکل درست ہے کیونکہ اگر ضمیر لائی جاتی تو معنے یہ ہوتے بچو اس آگ سے جو تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جو آگ خاص ان کی ذات کے لئے تیار کی گئی ہو۔ اس سے وہ کیونکر بچ سکتے ہیں اس لئے کہ جو عذاب کسی فعل کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے ترک کرنے کے ساتھ انسان اس عذاب سے بچ سکتا ہے تو جب اس کو اس عذاب سے بچنے کا حکم دیا جاوے گا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ اس کام کو چھوڑ دے اور جو عذاب محض ذات کے باعث سے ہو اس عذاب سے تب ہی انسان بچ سکتا ہے کہ اپنی ذات کو ترک کر دے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہی نہیں تو پھر اس سے بچنے کا حکم دینا ہی صحیح نہیں ہو سکتا لیکن اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ میں چونکہ عذاب مذکور کا باعث کفر بتایا گیا ہے لہٰذا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تم کفر کو چھوڑ دو تا کہ عذاب نار سے بچ جاؤ۔

پس چونکہ ضمیر کے لانے سے یہ مفہوم ہوتا تھا کہ یہ عذاب خالص ان کی ذات کے باعث سے ہے اور ایسے عذاب سے بچنے کا حکم درست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ضمیر نہ لائی گئی اور لِلۡکٰفِرِیۡنَ سے چونکہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس عذاب کا باعث کفر ہے اور بس اور عذاب سے بچنے کے یہ معنے ہوتے تھے کہ تم کفر کو ترک کر دو تا کہ اس عذاب سے بچ جاؤ لہٰذا بجائے اُعِدَّتۡ لَکُمۡ کے اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ فرمایا ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ کے معنی:

ہم نے اس عذاب سے بچنے (یعنی فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ) کے جو معنے یہاں پر بیان کئے ہیں ان سے ایک اور سوال بھی حل ہو جاتا ہے جو کہ یہاں پر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا شرط ہے اور فَاتَّقُوا النَّارَ الخ جزا ہے پس معنے یہ ہوں گے کہ اگر تم مثل نہ لاؤ یا نہ لا سکو تو پھر ایسی آگ سے بچو جس سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ آگ سے بچنے کا حکم یا آگ سے بچنے کا ضروری ہونا اسی صورت میں ہے کہ وہ مثل نہ لا سکیں یا نہ لائیں اور لانے یا لا سکنے کی صورت میں آگ سے بچنے

کا حکم نہیں یا وہ ضروری نہیں۔ حالانکہ آگ سے بچنا ہمیشہ ہی ضروری ہے اور یہ حکم بھی ہمیشہ کے لئے ہے اور مذکورہ بالا معنوں سے یہ سوال اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ فَاتَّقُوا النَّارَ الخ کا مفہوم جب یہ ہے کہ تم کفر کو ترک کر دو تا کہ اس آگ سے بچ جاؤ جو کہ محض کفر کی وجہ سے تمہارے لئے تیار ہو گئی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ کفر سے یہاں پر اسی شے کا انکار مراد ہے جس کا یہاں پر ذکر ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا منجانب اللہ ہونا۔

پس یہاں پر کفر کے معنے ہیں قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کرنا اور کفر کے ترک کرنے کے معنے یہ ہیں کہ قرآن کا منجانب اللہ ہونا تسلیم کر لینا تو اب فَاتَّقُوا النَّارَ الخ کے یہ معنے ہوئے کہ تم اس کتاب کو اللہ کی کتاب مان لو تا کہ اس آگ سے بچ جاؤ جو کہ اس کو اللہ کی کتاب نہ ماننے والوں کے لئے تیار کی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معنے شرط مذکور کی جزا بن سکتے ہیں چنانچہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا اور فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کو ملانے پر یہ معنے ہوں گے تو اگر تم نہ کر سکو (یعنی قرآن مجید کی کسی سورۃ کی مثل نہ لا سکو) پس اس کو اللہ کا کلام مان لو تا کہ اس عذاب سے بچو جو کہ اس کو اللہ کریم کا کلام نہ ماننے والوں کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی کسی سورۃ کی مثل نہ لا سکنے میں اور قرآن مجید کو کلام الٰہی مان لینے میں شرط اور جزاء کا تعلق کھلا کھلا پایا جاتا ہے۔

سب کا ترجمہ یہ ہوا تو اگر تم نہ کرو (یا اگر تم نے نہیں کیا) اور یقیناً نہ کرو گے تو پھر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے ان کے لئے وہ تیار کی گئی ہے (یا تیار کی جاوے گی۔)

آیت 26: وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ۔

وَ۔ اور۔

(حضرت مولٰنا حکیم الامت رضی اللہ عنہ) یہ واو عطف کے لئے ہے اور عطف یاإِنۡ کُنۡتُمۡ الخ پر ہے یاإِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا پر ہے یافَاتَّقُوۡا پر ہے۔

اور بِشَارَۃٌ کسرہ اور ضمّہ کے ساتھ اس خبر کو کہتے ہیں جو کہ انسان کے منہ کے جلد پر رنج اور سرور کے طور پر اثر کرے۔

اور صَالِحَاتٌ۔ صَالِحَۃٌ کی جمع ہے جو کہ ضد ہے فَاسِدَۃٌ کی اور فَاسِدَۃٌ کے تو معنی ہیں خرابی اور بگاڑ والی چیز تو صَالِحَۃٌ کے معنے ہوئے سنوار والی چیز اور صَالِحَاتٌ سنوار والی چیزیں اور یہ وہ اشیاء ہیں جن کو شریعت نے جائز اور اچھا قرار دیا ہے۔

وَبَشِّرْ کا عطف کس پر ہے:

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) حضرت مولٰنا صاحب نے تو یہاں پر عطف میں تین ہی احتمال بیان فرمائے ہیں یہ کہ اِنۡ کُنۡتُمۡ پر عطف ہے یافَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا پر یافَاتَّقُوۡا پر لیکن بعض کا یہ بھی قول ہے کہ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا کی جزاء اگرچہ بظاہر فَاتَّقُوۡا ہے لیکن حقیقت میں جزاء فَاٰمِنُوۡا ہے جیسا کہ میں نے بھی فَاتَّقُوۡا کی تفسیر میں مفصل طور پر بیان کر دیا ہے اور وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اس اٰمَنُوۡا پر عطف ہے جو کہ اصل جزاء ہے اور معنے یہ ہوں گے اور اگر تم نہ کر سکو پس ایمان لاؤ اور بشارت دو ان کو جو ایمان لاویں اور صاحب الایضاح نے کہا ہے کہ اُعِدَّتۡ کے بعد اَنۡذِرۡ مقدر ہے اور اس کا عطف اس پر ہے اور بعض کا قول ہے کہ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا یاأَیُّهَا النَّاسُ الخ کے پہلے لفظ قُلۡ (کہہ دے اے نبی) مقدر ہے اور بَشِّرۡ کا اس پر عطف ہے اس کے عطف میں یہ اقوال ہیں لیکن یہ بڑی مشکل ہوتی ہے کہ باتیں بہت سی ہو جاتی ہیں اور مفسرین کسی ایک کو ترجیح نہیں دیتے اور ناظرین کو ایک گرداب میں ڈال کر حیران چھوڑ دیتے ہیں۔

میرے نزدیک اسی بات کو ترجیح ہے کہ وَاِنْ کُنْتُمْ الخ پر اس کو عطف کیا جائے کیونکہ دو قسم کے لوگ تھے ایک تو وہ جو کہ اس کتاب کو منجانب اللہ تسلیم نہ کرتے تھے ان کی نسبت فرمایا وَاِنْ کُنْتُمْ الخ یعنی اگر تمہیں اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک وشبہ ہے تو اس کے رفع کرنے کا یہ طریق ہے کہ کوئی ایسی سورۃ بنا کر لے آؤ جو کہ اس کی مثل ہو تو اگر نہ بناؤ اور یقیناً نہ بناؤ گے تو پھر تمہیں اس کو منجانب اللہ تسلیم کر لینا چاہئے اور اگر نہ کرو گے تو پھر اس آگ کا عذاب تمہیں دیا جاوے گا جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور کفار کے لئے تیار کی گئی ہے اور دوسری قسم وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کتاب کا منجانب اللہ ہونا تسلیم کر لیا تھا۔ اور ان کو اس کی منجانب اللہ ہونے میں نہ کسی طرح کا شک وشبہ تھا اور نہ کسی قسم کا انکار تھا اور اس یقین و تسلیم کے آثار ان پر نمایاں تھے۔ تو پہلی قسم کے بیان کے ختم کرنے کے بعد دوسری قسم کی نسبت وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ فرمایا یعنی جو لوگ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لے آئے ہیں ان کو اس جنت کی بشارت دو۔ جس کا بیان آگے آتا ہے۔

اٰمِنُوْا اور عَمِلُوْا بلفظ ماضی کیوں لائے:

اور اٰمِنُوْا اور عَمِلُوْا کا بلفظ ماضی لانا بھی صاف بتاتا ہے کہ اس ایمان سے ان کا ایمان مراد نہیں جو کہ پہلے نہ مانتے تھے اور پھر وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ الخ سننے کے بعد جب وہ کسی سورۃ کی مثل نہ بنا سکیں تو ایمان لے آویں۔ کیونکہ یہ ایمان اس وقت کے بعد ہونے والا تھا۔ پس اگر یہ مراد ہوتا تب یوں کہا جاتا کہ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ الخ یعنی بشارت دے ان لوگوں کو جو کہ مثل نہ بنا سکنے کے بعد اپنے کفر اور انکار پر جم کر اس آگ کے مستحق نہ بنیں گے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں بلکہ ایمان لاویں گے اور اس کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ بلکہ اس سے مراد ان کا ایمان ہے جو کہ پہلے ہی سے شک اور تردّد میں نہ تھے اور نہ منکر تھے بلکہ اس کے منجانب اللہ ہونے پر یقین رکھتے اور تسلیم کرتے تھے۔

ہاں یہاں پر اس کلام کے لانے سے ان لوگوں کے لئے بھی ایمان کی ترغیب ہے جو کہ

پہلے سے ہی اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان نہیں لائے بلکہ منکر رہے جیسی کہ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ایسے لوگوں کے لئے ترہیب ہے یعنی ڈرانا ہے کیونکہ جس طرح ان کو فَاتَّقُوا الخ میں یہ بتایا ہے کہ مثل نہ لانے پر بھی جو لوگ اس کتاب کو منجانب اللہ تسلیم نہ کریں گے ان کے لئے آگ کا عذاب ہے اسی طرح وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ میں یہ بتایا ہے کہ جس طرح پہلے ہی اس کو منجانب اللہ تسلیم کرنے والوں کے لئے ایسے جنات کی بشارت حقہ اور صادقہ ہے اسی طرح ان کے لئے بھی بعینہٖ یہی بشارت ہوگی جنہوں نے پہلے تو اس کو نہ مانا تھا لیکن جب وہ کوئی سورۃ اس کی مثل نہ بنا سکے تو پھر اس کے منجانب اللہ ہونے کو تسلیم کر لیا ہے۔ تو جس طرح خداوند کریم کی عام سنت ہے کہ اپنے بندوں کو عموماً ترغیب اور ترہیب کے ساتھ حق کی طرف بلایا کرتا ہے (تاکہ دعوت حق کا فائدہ عام اور شامل ہو جاوے کیونکہ انسانوں کے طبائع مختلف مذاق کی ہوتی ہیں بعض کے لئے طمع دلانا اور لطف و مہربانی اور انعام واکرام زیادہ موثر اور جاذب ہوتے ہیں اور بعض کے لئے خوف اور زجر و توبیخ اور انذار و تنبیہ زیادہ موثر ہوتی ہے تو جب دعوت حق دونوں پر مشتمل ہوئی تو دونوں قسم کے مذاق والے طبائع اس سے مستفید اور مستفیض ہو سکیں گی) جیسی کہ یہاں پر ریب والوں اور بے ریبوں کے لئے ترہیب و ترغیب کی گئی ہے تو اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی ترہیب و ترغیب کر دی ہے جو کہ پہلے سے اس کا منجانب ہونا تسلیم نہیں کرتے اور کوئی سورۃ اس کی مثل نہیں لا سکے ترہیب تو فَاتَّقُوا النَّارَ الخ میں کی ہے اور ترغیب وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ کے ساتھ دی ہے۔

بشارت کی تفسیر:

اور بشارت کی جو تفسیر **حضرت مولٰنا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ** نے بیان فرمائی ہے یہ امام سیبویہ کا قول ہے اور اس نے اس کی تفسیر میں اسی قدر کہا ہے کہ اس خبر کو کہتے ہیں جو کہ خوشی یا غم اور رنج کے لحاظ سے انسان کے منہ کی جلد پر اثر کرے عام اس سے کہ وہ خبر خیر ہو یا شر ہو۔ ہاں استعمال اس کا خیر میں بہت ہو گیا ہے لیکن اس کی مشہور تعریف اور ہے۔

بشارت کی مشہور تفسیر پر اشکال اور اس کا حل:

اور وہ یہ ہے کہ بشارت اس خوش کن خبر کو کہتے ہیں جس کا پہلے سے سامع کو علم نہ ہو عام اس سے کہ وہ خبر سچی ہو یا جھوٹی ہو ہاں بعض نے یہ شرط بھی ضروری ٹھہرائی ہے کہ وہ خبر سچی ہو۔ تو قرآن مجید میں فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (آل عمران:22)(پس ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے) وغیرہا اور آیتوں میں جہاں کہیں بِشَارَۃٌ کا لفظ عذاب پر بولا گیا ہے۔ امام سیبویہ والی تفسیر کی رو سے تو وہاں پر کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ اس تفسیر میں رنج دہ خبر کو بھی بِشَارَۃٌ کہا گیا ہے البتہ مشہور تفسیر کی رو سے ضرور مشکل پیش آتی ہے کیونکہ تفسیر مشہور میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ خبر خوش کن ہو اور عذاب کی خبر خوش کرنے والی نہیں۔ پس اس پر بِشَارَۃٌ کا بولنا اس تفسیر کے مطابق بظاہر درست نہیں ہے۔ مفسرین نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ عذاب پر بشارت کا اطلاق تہکم کے طور پر یعنی ان کے ذلیل اور شرمندہ کرنے کے لئے ہے جیسا قرآن مجید میں فرعون کے لیے آیا ہے۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (دخان:50)(چکھ کیونکہ تو باعزت اور بڑا ہے۔)

بَشِّرْ کے معنے:

پس پہلی تفسیر کے مطابق بَشِّرْ کے معنے ہوں گے تو مونہوں پر تغیر کر دینے والی خبر سنا اور دوسری تفسیر کے موافق اس کے معنے ہوں گے تو خوش کرنے والی خبر سنا۔

کیوں کفار کو خطاب کیا اور مومنوں کو نہ کیا:

یہاں پر ایک اور امر بھی قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند کریم مومنوں کے لئے خطاب فرماتا اور کفار کو خطاب نہ کرتا بلکہ ان کو غائب قرار دے کر ان کی نسبت ایسا کلام بولتا جس میں ان کو مخاطب نہ کیا جاتا تاکہ اس طرز کلام سے مومنوں کی عزت کا اظہار ہوتا کہ وہ خداوند عالم کے نزدیک اس قدر معزز ہیں کہ ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ [1](رحمٰن:28) خدا ان سے خطاب کرتا ہے اور کفار اس قدر ذلیل ہیں کہ رحیم و کریم خدا کے خطاب کے نہ لائق ہیں اور نہ وہ ان کو خطاب کرتا ہے اس بات کی تائید یہ

[1]۔ جلال اور عزت والا۔ (تفسیر صغیر)

آیت کریمہ بھی کرتی ہے کہ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (البقرۃ:175) (اور اللہ قیامت کے دن ان کے ساتھ بات نہ کرے گا) جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم کا خطاب باعث اعزاز ہے اور اس کا خطاب نہ کرنا موجب تذلیل و تحقیر ہے۔

اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں عموماً بعض مقامات پر مومنوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کے مقابل پر کفار کو مخاطب نہیں کیا اور وہاں پر مفسرین نے اس تفرقہ کی یہی وجہ بیان کی ہے جو کہ ہم نے ذکر کی ہے۔ لیکن یہاں پر ان سب امور کے خلاف کفار کو وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور فَاْتُوْا اور فَاتَّقُوْا وغیرہا فرما کر خطاب فرمایا ہے اور مومنوں کے لئے وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ میں خطاب کو ترک کر دیا ہے جس سے بالکل معاملہ برعکس ہو گیا ہے۔ مفسرین نے اس کی دو وجہ بیان کی ہیں ایک یہ کہ مومنوں کی تعظیم کے اظہار کے لئے خطاب کو ترک کر دیا ہے کیونکہ بڑوں کو خطاب نہیں کیا کرتے پس ترک خطاب ان کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور دوسری یہ کہ فریقین کے حالات میں تباین ظاہر کرنے کے لئے ایک کو مخاطب کیا ہے اور دوسرے کے لئے خطاب کو ترک کر دیا ہے۔

لیکن میرے خیال میں یہ دونوں وجہیں ٹھیک نہیں ہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ بے شک عظمت اور بڑائی کے لئے خطاب ترک کیا جاتا ہے پر اس مقام پر جہاں کہ مخاطب متکلم کی نسبت بڑا ہو یا کم از کم متکلم اس کو اپنے سے بڑا ظاہر کرنا چاہتا ہو لیکن جہاں پر متکلم بہت بڑا عظیم الشان ہو اور مخاطب اس کی نسبت اس قدر کم ہو کہ اس پر مصرعہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔[1] صادق آتا ہو اور متکلم بھی اپنے پر اس کی بڑائی ظاہر نہ کر سکتا ہو یا نہ کرتا ہو تو پھر ترک خطاب کے ساتھ تعظیم کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ خطاب کرنے کے ساتھ کیا جاتا ہے جن لوگوں نے بادشاہوں نوابوں اور امیروں کی مجلسیں دیکھی ہوئی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جب وہ اپنے ملازموں سے یا اپنی رعیت کے لوگوں سے کسی کو کچھ کہنا چاہتے ہیں تو جو ادنیٰ درجہ کے ملازم یا لوگ ہوتے ہیں ان کو ہرگز مخاطب نہیں کرتے اگرچہ وہ ان کے پاس ہی کھڑے ہوں بلکہ کسی اپنے مصاحب کو حکم دیں گے کہ تم

[1] ۔ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔ (از مرتب)

فلاں کو یہ بات کہو اور اپنے مصاحبوں وزیروں وغیرہم معززین کو خطاب کر کے بات کریں گے اور اپنے کسی مصاحب کی تعظیم ظاہر کرنے کے لئے کبھی خطاب کو ترک نہیں کرتے ہاں جب اپنے باپ یا اپنے شہنشاہ اور افسر سے بات کریں گے تو پھر بے شک اظہار تعظیم کے لئے ضرور خطاب کو ترک کر کے حضور یا جناب وغیرہ غائب کے عنوان کے ساتھ بات کرتے ہیں اور مومن اگرچہ اللہ کے نزدیک بڑے معزز ہیں جیسا کہ خداوند کریم نے خود فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون:9)(اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں ہی کے لئے عزت ہے ولیکن منافق نہیں جانتے) لیکن یہ محال ہے کہ احکم الحاکمین خدا سے زیادہ معزز ہوں یا وہ اپنے سے ان کی عزت کو زیادہ ظاہر کرنا چاہتا ہو بلکہ مومن کی عزت رب العزت کی اطاعت اور عبودیت سے ہے اور بس۔

پس اس سے صاف ثابت ہے کہ یہاں پر ترک خطاب اظہار تعظیم کے لئے نہیں۔ اور دوم اس وجہ سے ٹھیک نہیں کہ اس سے اس قدر تو ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کے حالات میں تفرقہ ظاہر کرنے کے لئے ایک میں خطاب ہو اور دوسرے میں نہ ہو لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اوّل یعنی کفار کے لئے خطاب کیوں اختیار کیا گیا اور دوم یعنی مومنوں کے لئے خطاب کا ترک کرنا کیوں پسند کیا حالانکہ اصل مقصود اس کا ثابت کرنا تھا۔ میرے خیال میں بات تو آسان ہے تھوڑی سی توجہ پر حل ہو سکتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ کفار اب تک نہ کتاب کو کتاب اللہ مانتے تھے اور نہ حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسول اللہ تسلیم کرتے تھے پس اس صورت میں یہ تو مناسب تھا ہی نہیں کہ اللہ جلشانہ آنحضرتؐ کو حکم دے کہ تم کفار کو آگ کے عذاب سے ڈراؤ اور مومن چونکہ آنحضرتؐ کو رسول اللہ برحق تسلیم کرتے تھے لہٰذا جو کچھ آپ ان کو فرماتے وہ مان سکتے تھے اس لئے مومنوں کی نسبت یہ فرمانا بالکل مناسب تھا کہ اے رسول تم مومنوں کو جنت کی بشارت دو باقی رہی یہ بات کہ جب کفار اس قابل نہ تھے کہ خداوند کریم ان کے ساتھ خطاب کرے تو پھر کیا کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار نا قابل خطاب اتمام حجت کے بعد ہوتے ہیں اور یہاں پر وَاِنْ كُنْتُمْ الخ تو اتمام حجت کے لئے ہی کہا گیا ہے پس اتمام حجت کرنے کے وقت خطاب منع یا نامناسب نہیں ہے۔

پس خلاصہ کلام یوں سمجھنا چاہئے کہ کفار اور مومنوں کے حالات کے تباین کے اظہار کے لئے یہ کیا گیا ہے پر وہ تباین یہ ہے کہ کفار تو وہ ہیں کہ رب العالمین خود ان کو فرماتا ہے اور وہ نہیں مانتے اور اس کی پرواہ تک نہیں کرتے اور ایک مومن ہیں کہ رب العالمین کی کیا اس کا رسول بھی اگر ان کو کوئی غیب در غیب بات کہے تو معاً مان لیتے ہیں اور ذرہ بھر تردّد نہیں کرتے۔ پس تباین احوال فریقین کے اظہار کے لئے کفار کو اپنا مخاطب بنایا ہے اور مومنوں کو اپنے رسول کریم کا مخاطب قرار دیا ہے۔

مفسرین نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ بَشِّرْ میں بشارت دینے کا کس کو حکم ہے کیا یہ حکم خاص بشیر ونذیر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے یا کہ ان سب لوگوں کے لئے عام ہے جو کہ یہ بشارت دے سکتے ہیں لیکن ٹھیک یہی ہے اور یہی عبارت کا اصل مقتضیٰ ہے کہ یہ حکم خاص نبی کریمؐ کے لئے ہے جیسا کہ ظاہر عبارت سے ثابت ہوتا ہے اور حضور کا بشیر ونذیر سے ملقب ہونا اس کی تائید کرتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ۔ جو، جن۔

اٰمَنُوْا۔ ایمان سے ہے جس کی تفسیر مفصل طور پر گذر چکی ہے اور اٰمَنُوْا کے معنے ہیں ایمان لائے وہ۔

وَ۔ اور۔ عَمِلُوْا۔ عَمَلٌ سے ہے جس معنے ہیں کرنا۔ تو عَمِلُوْا کے معنے ہوئے کیا (یا کئے) انہوں نے۔

اَلصّٰلِحٰتُ کے معنے حضرت مولٰنا صاحب کی تقریر میں پہلے لکھ آیا ہوں یعنی سنوار والی باتیں جمع پر جب ال کا لفظ داخل ہوتا ہے تو اکثر اس کے سب افراد مراد ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہاں پر سب افراد اگر لیے جاویں تو یہ لازم آوے گا کہ ایک انسان سب اعمال صالحہ بجا لائے اور یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کیونکہ بہت سے ایسے اعمال بھی ہوتے ہیں کہ ایک انسان کو ان کا موقع ہی نہیں ملتا اس طرف یہ پیشگوئی ان کے لئے خاص ہوگی جو کہ سب اعمال صالحہ بجالائیں تو اگر سب کو انسان کر بھی سکے گا تو ایسا انسان کوئی شاذ ونادر ہی ہوگا۔

تو پھر اس بشارت کا مصداق کوئی شاذ ونادر انسان ہی بنے گا پس یا تو یہ کہا جاوے کہ

یہاں پر سب اعمال صالحہ مراد نہیں بلکہ بعض مراد ہیں جن کا انسان کو موقع ملا اور کوئی مانع نہ ہوا اور یا کل ہی لئے جاویں لیکن یہ کہا جاوے کہ یہاں پر یہ معنے نہیں کہ ہر ایک انسان نے سب اعمال صالحہ کئے ہوں بلکہ یہاں پر مقابلہ اور تقسیم کے طور پر کرنا مقصود ہے اور یہ تین طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک جمع کا ایک فرد دوسری جمع کے ایک فرد کو لے جیسا کہا جائے رَکِبَ الْقَوْمُ دَوَابَّهُمْ (لوگ اپنے چارپائیوں پر سوار ہوئے) پس اس کے یہ معنے نہیں کہ قوم میں سے ہر ایک انسان سب چارپائیوں پر سوار ہوا ہے بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ پہلی جمع یعنی قوم سے ایک ایک نے دوسری جمع یعنی دواب کے ایک ایک فرد پر سواری کی ہے اور کبھی ایک جمع کے بہت بہت افراد دوسری جمع کے ایک ایک فرد کو لیتے ہیں۔

جیسے دَخَلَ الرِّجَالُ مَسَاجِدَهُمْ (لوگ اپنی مسجدوں میں داخل ہوئے) تو پہلی جمع یعنی رجال کے کئی کئی فرد دوسری جمع یعنی مساجد میں سے ایک ایک فرد یعنی ایک ایک مسجد میں داخل ہوئے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے جیسالَبِسَ الْقَوْمُ ثِيَابَهُمْ (لوگوں نے اپنے اپنے کپڑے پہنے) پس یہاں پر پہلی جمع سے ایک ایک فرد نے دوسری جمع یعنی ثیاب سے چند چند افراد پہنے ہیں قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ بھی اسی قسم کی ہے فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ (المائدۃ:7)(پس دھو اپنے مونہوں اور ہاتھوں کو) کیونکہ ہر ایک انسان کو اپنے دو ہاتھوں کے دھونے کا ارشاد ہے۔ اور یہاں پر بھی اگر تقسیم اور مقابلہ کے طور پر قرار دیا جاوے تو یہ بھی اسی قسم سے ہو گی یعنی مومنوں میں سے ہر ایک نے بہت بہت اعمال صالحہ کئے اور ایک ایک نے سب کے سب اعمال صالح نہ کئے ہیں اور نہ کر سکتا ہے اور نہ اس صورت میں سب اعمال صالح لینے سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر ایک نے سب کے سب کیے ہوں۔ ہاں یہ لازم آتا ہے کہ اگرچہ ایک ایک نے کچھ کچھ ہی کئے ہوں پر سب نے بحیثیت مجموعی سب کے سب اعمال صالحہ کئے ہوں اور یہ جو اس صورت میں لازم آتا ہے اور اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔ واقعہ میں نہ محال ہے اور نہ بعید از عقل ہے بلکہ ہو سکتا ہے اور عقل اس کو باور کر سکتی ہے۔

موصول کیوں لایا ہے:

اور بَشِّرْ کے بعد موصول یعنی اَلَّذِیْنَ اس لئے لایا ہے تاکہ بشارت کی علت کا اظہار ہو جاوے کیونکہ موصول علیت پر دلالت کیا کرتا ہے تو اب خلاصہ مطلب یوں ہو گا کہ ان لوگوں کو بشارت دو اس لئے کہ یہ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے سنوار والے عمل کئے ہیں۔

(حضرت مولٰنا حکیم الامتؒ) اَنَّ لَھُمْ اصل میں بِاَنَّ لَھُمْ تھا۔ اس لئے کہ جس چیز کی بشارت دی جاتی ہے عربی زبان میں اس پر ضرور بِا کا لفظ آیا کرتا ہے لیکن بِا اور اس کے ہم جنس حروف کا قاعدہ ہے کہ اکثر مقدر کر دیا کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں پر بھی بِا مقدر ماننی پڑی ہے۔ جس کے معنے ہیں ساتھ کے۔

جَنّٰتٌ کے معنے:

جَنَّاتٌ۔ جَنَّةٌ کی جمع ہے جس کے معنے باغ کے ہیں پر عام نہیں بلکہ وہ باغ کہ جس کے درخت زمین کو ڈھانپ دیں یا وہ زمین کہ جس میں ایسے درخت ہوں یعنی جنت کبھی باغ کے درختوں کو کہتے ہیں اور کبھی باغ کی زمین کو جیسا کہ لفظ بستان اور باغ کا حال ہے اور جنت کا مادہ یعنی جیم نون مشدد ستر اور ڈھانپنے پر دلالت کرتا ہے جیسا کہا جاتا ہے جَنَّ الظَّلَامُ (ظلمت نے جہان کو ڈھانپ لیا ہے۔) اور جُنَّةٌ۔ ڈھال کو کہتے ہیں جو کہ انسان کے اس عضو کو ڈھانپتی ہے جس پر کوئی وار کرتا ہے اور جنون دیوانگی کو کہتے ہیں جس میں عقل ڈھانپی جاتی ہے۔ اور جَنّٰت سات ہیں۔ فِرْدَوْسٌ، عَدْنٌ، نَعِیْمٌ، مَأْوٰی، عِلِّیُّوْنَ، دَارُ الْخُلْدِ، دَارُ السَّلَامِ۔

اور تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرۃ:26) میں جو مِنْ ہے یہ مِنْ ابتدائیہ ہے جیسی کہ مِنْ مَكَّةَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ (مکہ سے مدینہ تک) میں ہے لیکن عموماً مِنْ ایک ممتد چیز کی ابتداء کے لئے آیا کرتا ہے جس کے مقابل پر انتہاء ہوتی ہے۔ لہٰذا اس مِنْ کے مقابل پر اِلٰی آیا کرتا ہے جیسا کہ مثال مذکور میں آیا ہے لیکن یہاں پر محض اس بات پر دلالت کرنے کے لئے آیا ہے کہ جو چیز اس کے بعد ہے وہ ایسی چیز ہے کہ جس سے ایک دوسری چیز منفصل اور جدا ہوئی ہے لہٰذا یہاں پر اس کے بعد اِلٰی نہیں آیا۔

اور اَنْھَارٌ۔ نَھْرٌ کی جمع ہے اور نَھْرٌ، ھا کے سکون اور فتح کے ساتھ ہے اور فتح زیادہ فصیح ہے اور اصل میں یہ بمعنے شگاف اور چیر کے ہے اور اس کی ترکیب اور مادہ یعنی نون، ھا، را سے مرکب شدہ لفظ فراخی پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ معنوی ہی ہو جیسا نَھَرَ السَّائِلَ (سائل کو جھڑک دیا) یعنی وسیع زجر کی ہے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) اَنَّ۔ بے شک، تحقیق، ضرور۔

لَ۔ یہ وہی لام ہے جو کہ لِلّٰہِ وغیرہ میں زیر کے ساتھ تھا اور اصل یہی ہے کہ یہ زیر کے ساتھ آیا کرتا ہے لیکن جب یہ لام کسی ضمیر پر مثل لَہٗ، لَھَا، لَھُمْ، لَکَ، لَکُمْ وغیرہ کے آتا ہے تو اس وقت اس کو زبر دی جاتی ہے اور خواہ زیر کے ساتھ ہو یا زبر کے ساتھ ہو یہ بمعنے لئے اور واسطے کے ہوتا ہے اور اس پر بھی دلالت کیا کرتا ہے کہ اس کی پہلی چیز اس کے مابعد کے لئے نافع ہے۔

ھُمْ۔ وہ، ان۔ لَھُمْ کے معنے ہوئے ان کے لئے، ان کے واسطے۔

لَھُمْ کو جنت کے لئے لانے کی حکمت:

یہاں پر ایک بات غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ جَنّٰتٌ معنوں کے رو سے مبتدا ہے اور لَھُمْ خبر ہے پس حق تو یہ تھا کہ جَنّٰتٌ کو پہلے لایا جاتا اور لَھُمْ کو اس کے بعد لایا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس کیا گیا ہے اس کی وجہ جو مفسرین نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ تاکہ ضمیر کا مرجع قریب ہو جائے اور وہ ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ضمیر ھُمْ ہے جو کہ لَھُمْ میں مذکور ہے اور دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ جہاں پر مبتدا نکرہ ہو تو وہاں پر مشہور یہی ہے کہ خبر کو مقدم کر دیا کرتے ہیں اور یہاں پر بھی چونکہ مبتدا یعنی جَنّٰتٌ نکرہ تھی لہٰذا اس کی خبر یعنی لَھُمْ کو اس پر مقدم کر دیا ہے لیکن محض لفظی رعایات خالی از تکلفات اور مناسب شان رفیع فرقان حمید نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اس تقدیم کا دارومدار محض ان لفظی رعایتوں پر رکھ دینا مناسب نہیں بلکہ اس کے لئے کوئی اور معقول وجہ بیان کرنی چاہیے۔

پس واضح ہو کہ اس بشارت کے یہاں پر ذکر فرمانے سے اصل غرض تو ترغیب ہے

جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے اور ترغیب تب ہی ہو سکتی ہے کہ جو انعام واکرام انسان کے لئے مذکور ہو اس کا خاص اسی ہی کام کے صلہ میں ملنے کا اظہار کیا جاوے کہ جس کے لئے ترغیب دیجاتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ترغیب تب ہی پوری اور کارآمد ہو سکتی ہے کہ انعام واکرام موعود کا خالص انہی لوگوں کو دینے کا اظہار کیا جائے جو کہ اس کام کے کرنے والے ہوں کہ جس کی ترغیب اس انعام واکرام کے ساتھ دی گئی ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ اس کام کے سوا کوئی اور کام بھی اس انعام واکرام کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو یا اس کے کرنے والے کے سوا کوئی اور شخص بھی اس انعام کو پاتا ہو تو پھر اس کام کی ترغیب پوری نہیں ہوتی۔ نیز جب انعام میں خصوصیت کوئی نہ ہو یہاں تک کہ مشقت اٹھانے والے اور نہ اٹھانے والے اس میں یکساں برابر ہوں تو پھر نہ اس انعام کی کچھ قدر ہوتی ہے اور نہ اس نعمت میں کچھ لذت ہوتی ہے اور نہ ایسے انعام کے وعدہ سے کچھ ترغیب کسی کام کے کرنے کی پیدا ہو سکتی ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ خداوند کریم اس انعام کی علت اور باعث کا اظہار فرمادے اور یہ بھی ظاہر کر دے کہ یہ انعام خاص انہی لوگوں کے لئے ہے جو کہ اس کام کو بجالاتے ہیں جو کہ اس انعام کی علت اور باعث ہے اور ایسا ہی کر بھی دیا ہے۔

کیونکہ وَبَشِّرِ کے بعد اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرما کر بتایا ہے کہ اس بشارت کی علت اور اس کا باعث ایمان لانا اور اعمال صالحہ کا بجالانا ہے اور لَهُمۡ کو جَنّٰتٌ پر مقدم کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ انعام واکرام اور یہ بشارت انہی لوگوں کے ساتھ مختص ہے جو کہ ایمان لاتے اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اور اوروں کے لئے اس میں بالکل نہ کوئی حصہ ہے اور نہ کسی قسم کی شراکت ہے اور لَهُمۡ کے مقدم کرنے سے یہ بات اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ پیچھے کی چیز کا مقدم کرنا تخصیص پر دلالت کیا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ[1] (الفاتحۃ:5) کی تفسیر میں مفصل بیان کیا ہے۔ مثلاً اَلۡاَمۡرُ لِلّٰہِ کے معنے ہیں کہ حکم اللہ کے لئے ہے اور اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی دوسرے کے لئے

[1]۔ (اے خدا!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ (تفسیر صغیر)

نہیں بلکہ اللہ ہی کے لئے ہے اور لِلّٰہِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں اللہ ہی کے لئے حکم ہے اور اس کے سوا دوسرے کسی کے لئے نہیں اور یہ فرق محض تقدیم و تاخیر کی وجہ سے ہے اور بس۔ پس اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٌ کے معنے یہ ہوئے ضرور انہی کے لئے باغ ہیں۔

تَجْرِیْ۔ جَرَیَانٌ سے ہے اور جَرَیَانٌ کہتے ہیں کسی بہنے والی چیز کے بہنے کو۔ پس تَجْرِیْ کے معنے ہوئے بہتی ہیں یا بہیں گی۔

مِنْ۔ سے۔

حضرت مولانا صاحب کی تقریر میں یہ مِنْ محض ابتداء کے لئے ہے۔ یعنی جس چیز پر یہ مِنْ داخل ہوا ہے وہ کسی امر کا مبدأ ہے جس سے دوسری شے جدا ہوئی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے لوگوں کو اس کے نام سے دھوکا لگا ہے کیونکہ اس کا نام ابتدائیہ اتصالیہ ہے۔ تو ابتدائیہ کے لفظ سے انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابتداء کے لئے ہے اور پھر یہ شبہ پیدا ہوا کہ جو مِنْ بمعنے ابتداء ہوا کرتا ہے اس کے بعد تو اِلٰی آیا کرتا ہے اور اس کے بعد نہ وہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے تو اس شبہ کے دفع کرنے کی بھی ان کو ضرورت پیش آئی پس یاد رہے کہ اس کے نام سے ہرگز نہ خیال کرنا کہ یہ ابتداء کے لئے ہے بلکہ یہ محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شے پر یہ داخل ہوا ہے پہلے وہ کسی دوسری شے سے متصل تھی اور پھر اس سے منفصل اور جدا ہوئی ہے۔ جیسا کہا جائے خَلَقَ اللّٰہُ الْاَفْرَاخَ مِنَ الْبَیْضِ (اللہ نے انڈوں سے بچے پیدا کئے ہیں) اور یہ معنی مِنْ ابتدائیہ کے معنوں سے بالکل جدا ہیں لہٰذا اُس کے بعد اِلٰی آتا ہے اور اس کے بعد ہرگز نہیں آتا۔

تَحْتَ۔ نیچے اور تَحْتَ ظرف ہے اور ظروف پر عموماً مختلف حروف جارہ داخل ہوتے ہیں لیکن تَحْتَ پر بجز مِنْ کے اور کوئی حرف جر داخل نہیں ہوتا۔

ھَا۔ اس، اُن۔ یہ ضمیر جَنّٰتٌ کی طرف پھرتی ہے۔

ال۔ اہل زبان نے لکھا ہے کہ ال کے ساتھ جب ایک یا زیادہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو کہ متکلم اور مخاطب کو معلوم ہوں تو اس وقت اس ال کو عہد خارجی کے نام سے پکارتے ہیں اور ضروری ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان افراد کا ذکر آگیا ہو جس سے مخاطب کو ان

کا پتہ لگا ہو اور عموماً مفسرین نے اس ال کو بھی ایسا ہی بتایا ہے پس اَلْاَنْھَارُ کے معنے ہوں گے وہ خاص اور معین نہریں۔ تو اب ضروری ہوا کہ ان نہروں کا اس سے پہلے کسی دوسرے مقام پر ذکر آیا ہو اور مفسرین نے بتایا ہے کہ وہ اس آیت میں ہے۔ فِیْھَآ اَنْھٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ الخ (محمد:16) (ان جنتوں میں پانی کی نہریں ہیں) اور یہ آیت مکی ہے جو کہ ان آیات سے یقیناً پہلے ہے جو کہ مدنی ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں پر معین نہریں مراد نہیں بلکہ چند غیر معین نہریں مراد ہیں لیکن میرے خیال میں ایسے مقامات پر ال کے معنے عمدہ، کامل، عظیم الشان وغیرہا کے ہوتے ہیں پس سب کے معنے یہ ہوئے۔ ضرور ان کے لئے باغ ہیں (یا ہوں گے) جن کے نیچے سے عمدہ (عظیم الشان) نہریں بہتی ہیں (یا بہیں گی۔)

مفسرین نے یہاں پر دو بحثیں لکھی ہیں ایک یہ کہ نہر میں اختلاف ہے کہ نہر اس وسیع شق اور چیر کو کہتے ہیں جو کہ زمین میں ہوا ہے اور اس میں پانی بہتا ہوتا ہے یا کہ اس پانی کو کہتے ہیں جو کہ ایسے شق اور چیر میں بہتا ہے۔ بعض علماء کا پہلا مذہب ہے اور بعض کا دوسرا۔ لیکن مشہور پہلا ہی ہے پس یہاں پر اگر دوسرا مذہب اختیار کیا گیا تب تو تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ کے معنوں کے درست ہونے میں کچھ کلام نہیں لیکن اگر پہلا مذہب اختیار کیا جائے جو کہ مشہور ہے تو پھر نہروں کی طرف جاری ہونے کی نسبت درست نہیں ہو سکتی کیونکہ ظاہر ہے کہ وسیع شق اور چیر جو کہ زمین میں ہے وہ ہرگز جاری نہیں ہوا کرتا بلکہ اس میں پانی جاری ہوا کرتا ہے۔

پس اس صورت میں یا تو اَلْاَنْھٰرُ سے پہلے مِیَاہُ کا لفظ مقدر مانا جاوے گا اور عبارت یوں ہو گی تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا مِیَاہُ الْاَنْھٰرِ (ان کے نیچے سے نہروں کے پانی بہتے ہیں یا بہتے ہوں گے) اور یا تقدیر کوئی نہ نکالی جاوے گی اور کہا جاوے گا کہ انہار کے طرف جریان کی نسبت مجازی ہے جیسا کہا جاتا ہے۔ سَالَ الْمِیْزَابُ (پڑنالہ بہ گیا) لیکن میرے نزدیک ایسے مقامات میں دو مذہب نہیں ہوتے بلکہ دونوں معنے ہوتے ہیں ہاں کسی نے ایک معنے لکھے ہوتے ہیں اور کسی نے دوسرے اور کوتاہ نظر لوگ یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے کہ یہ دونوں معنے ہیں کہ کبھی ایک لئے جاتے ہیں اور کبھی دوسرے

اور کہہ دیتے ہیں کہ یہاں پر دو یا چار مذہب ہیں اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک لفظ کے بہت معنے ہوتے ہیں تو قرائن کے ساتھ اس کے معنوں کی تعیین کی جاتی ہے۔ پس یہاں پر یوں کہنا چاہئے کہ نہر کے دو معنے ہیں شق وسیع اور اس میں بہنے والا پانی لیکن جریان کا منسوب ہونا چونکہ اس امر کو چاہتا ہے کہ یہاں پر اس کے دوسرے معنے لئے جاویں لہٰذا یہاں پر نہر بمعنے شق وسیع کے نہیں بلکہ بمعنے پانی ہے اور پانی لینے کی صورت میں کوئی نقص باقی نہیں رہتا۔

دوسری بحث یہ کی ہے کہ جَنَّةٌ سے مراد اگر درخت ہیں تب یہ تو درست ہے کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں لیکن آیت کے الفاظ سے ایسا پایا جاتا ہے کہ سب درختوں کے نیچے بہتی ہوں اور یہ درست نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک درخت کے نیچے ایک نہر بہتی ہو اور اگر جنت سے مراد زمین ہو تو پھر اس کے نیچے نہروں کا بہنا کسی طرح سے درست نہیں ہو سکتا اور جواب میں عموماً مفسرین نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ جَنّٰتٌ سے یہاں پر درخت مراد ہیں اور اس کے ثبوت میں وہ صحیح اثر بیان کیا ہے جو کہ مسروق سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت کی نہریں خندقوں میں جاری نہیں بلکہ ایسی زمین کے اوپر جاری ہیں جس کے کنکر موتی اور یاقوت ہیں بہت پاکیزہ اور خوش نما اور جی کو پسند آنے والی ہے اور اس اثر سے جیسا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت سے درخت مراد ہیں ایسا ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سب درختوں کے نیچے کس طرح وہ جاری ہیں کیونکہ جب زمین کے اوپر وہ جاری ہوئیں تو ظاہر ہے کہ سب درختوں کے نیچے ان کا جاری ہونا اب کچھ بعید معلوم نہیں ہوتا اور یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ جنت سے زمین مراد ہو اور مِنۡ تَحۡتِهَا کی تقدیر یہ ہو کہ مِنۡ تَحۡتِ اَشۡجَارِهَا (ان باغوں کے درختوں کے نیچے) پس زمین لینے کی صورت میں بھی مطلب وہی رہے گا جو کہ درخت لینے کی صورت میں تھا اور یہ بھی کہا ہے کہ جنت سے زمین مراد ہے اور تَحۡتَ کے معنے نیچے کے نہیں بلکہ جانب اور طرف کے ہیں جیسا کہا جاتا ہے دَارِیۡ تَحۡتَ دَارِ فُلَانٍ (میری حویلی فلاں شخص کی حویلی کے جانب یا پاس ہے) تو اب یہ معنے ہوں گے ایسے باغ کہ جن کے پاس نہریں بہتی ہیں۔

مِنْ کے معنی:

یہ وہ باتیں ہیں جو کہ مفسرین نے لکھی ہیں لیکن ان سب توجیہات میں مِنْ کے معنے ترک کئے گئے ہیں اور مِنْ سے جو بات ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سب توجیہات اس کے بالکل خلاف ہیں لہٰذا مجھے ان توجیہات سے اتفاق نہیں ہے۔ افسوس کہ اکثر مترجمین نے بھی مِنْ کے معنی اوّل تو ادا نہیں کیے بلکہ بالکل چھوڑ دیئے ہیں اور اگر کسی نے ترجمہ میں اس کے معنی ادا بھی کئے ہیں تو مطلب بیان کرنے کے وقت وہی مطلب بیان کیا ہے جو مِنْ کے ترک کرنے کی صورت میں اور مفسرین نے بیان کیا ہے۔ اب میں پہلے ناظرین کے سامنے مِنْ کے معنے لے کر اور ترک کر کے دو ترجمے لکھتا ہوں تا کہ یکجائی نظر کرنے سے ناظرین پر ان دونوں معنوں کے مطلب کا تفرقہ کھل جاوے۔

مِنْ کے سواء جَنّٰتٌ الخ کا ترجمہ یہ ہے۔ ایسے باغ کہ جن کے نیچے عمدہ نہریں بہتی ہیں یا بہیں گی۔ مِنْ کے ساتھ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ایسے باغ کہ جن کے نیچے سے عمدہ نہریں بہتی ہیں یا بہیں گی۔ اب ناظرین غور کریں کیا ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا کہ دونوں کا مطلب ایک اور متحد ہے۔ ہر گز متحد اور ایک نہیں ہے بلکہ ضرور یہ جدا جدا ہیں اور ضرور دونوں کے مطلب میں بین تفرقہ ہے اور ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّل سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان باغوں کے نیچے اور تلے وہ نہریں جاری ہوں جیسا کہ قرآن مجید کی ایک اور آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے اور وہ یہ ہے اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:19) (جبکہ وہ تیری بیعت کرتے تھے اس درخت کے نیچے) تو یہاں پر یہی مراد ہے کہ عین اس درخت کے تلے اور نیچے اور اس کے سایہ میں بیعت کرتے تھے۔ نہ یہ کہ جہاں پر وہ بیعت کرتے تھے وہ جگہ درخت کے سایہ میں نہ تھی۔ بلکہ اس کے قریب کوئی پست جگہ تھی۔

پس جس طرح مِنْ کے نہ ہونے سے یہاں پر یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس درخت کے تلے اور نیچے یعنی اس کے سایہ میں وہ بیعت کرتے تھے۔ اسی طرح یہاں پر بھی جب مِنْ کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور ترجمہ یہ کیا جائے کہ ایسے باغ جن کے یا جن کے درختوں کے تلے اور نیچے عمدہ نہریں بہتی ہیں یا بہتی ہوں گی تو اس کا مطلب بھی یہی ہو گا کہ ان باغوں کے سایہ یا ان کے

درختوں کے سایہ میں نہریں بہتی ہیں۔ لیکن اگر مِنْ کو ملحوظ رکھا جائے جیسی کہ وہ قرآن مجید میں صاف صاف موجود ہے تو پھر نہ یہ ترجمہ ہو گا کہ ایسے باغ جن کے نیچے یا جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور نہ یہ مطلب ہو گا کہ ان کے سایہ میں وہ بہتی ہیں بلکہ ترجمہ یہ ہو گا کہ ان کے یا ان کے درختوں کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور مطلب دو ہو سکیں گے اوّل یہ کہ ان زمینوں یا ان درختوں کے نیچے سے ندیاں بہتی ہیں یعنی وہ زمینیں ایسی عمدہ ہیں کہ ان کے درخت ہمیشہ سرسبز رہتے ہیں اور کبھی وہ آبپاشی کی محتاج نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان درختوں کے نیچے اور اس سطح زمین کے نیچے اس قدر پانی ہی پانی ہے کہ اس سے بڑی بڑی ندیاں بہتی ہیں اور ان معنوں کی تائید ایک اور آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ (البقرۃ:75) (اور بے شک کچھ ان پتھروں سے وہ ہیں کہ جن سے ندیاں پھوٹتی ہیں اور بے شک کچھ ان میں سے وہ ہیں کہ ضرور پھٹتے ہیں تو نکلتا ہے ان سے پانی۔)

پس جس طرح یہاں پر مِنْ لانے سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ندیاں ان پتھروں سے نکلتی اور ان سے بہتی ہیں اور پانی ان سے نکلتا اور بہتا ہے۔ اسی طرح یہاں پر اس مِنْ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ندیاں ان درختوں کے نیچے کی زمین سے یا اس سطح زمین کے نیچے کی زمین سے نکلتی اور بہتی ہیں اور دوسرے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ باغ کسی اونچی جگہ پر ہوں اور اس کے نیچے اس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں جیسی کہ کوئی بستی کسی پہاڑی کے اوپر واقع ہو اور دامن کوہ میں ندیاں بہتی ہوں تو انسان کہہ سکتا ہے کہ ہماری بستی کے نیچے سے ندیاں بہتی ہیں اور اس کی تائید بھی قرآن مجید کی ایک آیت کریمہ سے ہوتی ہے جس میں فرعون کی بات حکایۃً بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (الزخرف:52) (اور فرعون نے منادی کی اپنی قوم میں۔ کہا اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میرے لئے نہیں اور یہ نہریں میرے نیچے سے نہیں بہتیں) تو اس آیت میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ کا یہی مطلب لیا گیا ہے کہ اس نے ایک باغ بنایا ہوا تھا اور اس میں اونچا محل بنا کر اس کے نیچے سے نہر کو گذارا تھا جو کہ جاری رہتی تھی اور قرآن مجید کی اور

آیتوں سے اس کا پتہ بھی لگتا ہے کہ جنت اونچی جگہ اور بلند سطح پر ہیں۔ چنانچہ سورۂ غاشیہ میں ہے فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ (الغاشیۃ:11) (اونچی اور بلند باغ میں۔)

پس جبکہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ جنت بلند جگہ پر ہیں اور بلند مقام پر کی شے کی نسبت جب مِنْ تَحْتِہٖ آتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوا کرتے ہیں کہ اس کے دامن میں اور اس کے آگے کے پست مقام میں۔ تو اب یہاں پر یہ معنے ہوں گے کہ ان جنتوں کے نیچے سے یعنی ان کے دامن اور ان کے آگے کی پست جگہ میں عمدہ ندیاں بہتی ہیں۔

یہ ہیں وہ دو معنے جو کہ مِنْ کے ملحوظ رکھنے سے ہوتے ہیں۔ اور ان دو معنوں کے لینے سے کوئی دقت پیش نہیں آتی خواہ جنت سے مراد درخت ہوں یا زمین ہو۔ ہاں یہ بات رہی کہ ان دو باتوں کو تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ایزاد فرما کر کیوں بیان فرمایا ہے تو اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ پہلے معنوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں پر وہ درخت ہیں وہ ایسی عمدہ زمین ہے کہ سرسبزی کے لئے آبپاشی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس کے سطح کے نیچے اس قدر پانی ہے کہ اس میں سے ندیاں بہتی ہیں اور دوسرے معنوں سے علاوہ اس کے خوشنما منظر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

تو اب سب کا ترجمہ یہ ہوا اور مومنوں پر تغیر ظاہر کر دینے والی خبر دے (یا خوشخبری دے) ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے سنوار والی باتیں کیں اس کی کہ بے شک (ضرور) ان کے لئے باغ ہیں (یا ہوں گے) جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں (یا بہیں گی۔)

آیت26: كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔

(حضرت مولٰنا حکیم الامتؒ) اس سے یا تو مبالغہ تشبیہ میں مراد ہے اور تشبیہ ان پھلوں کے ساتھ ہے جو ان کو پہلے دیئے گئے تھے۔ یعنی وہ پھل ان پہلے پھلوں کے ساتھ ایسے سخت مشابہ ہوں گے کہ ان کے کھانے والے مومن کہہ اٹھیں گئے کہ یہ وہی ہیں جو کہ ہم کو پہلے دیئے گئے تھے اور یا ان پھلوں کی جنس کی طرف ہدایت ہے۔ بعض افراد کے محسوس کرنے کے ساتھ یعنی جب ان کو کچھ پھل دیئے جاویں گے تو مومن ان کے دیکھتے ہی معلوم کر جاویں گے کہ یہ فلاں قسم اور جنس کے ہیں اور کہہ دیں گے کہ یہ تو وہی ہیں جو کہ ہم کو پہل دیئے گئے تھے۔ پس اگر هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (یہ وہی ہیں جو کہ ہم کو پہلے دیئے گئے تھے) یہ مراد ہوئی کہ یہ ان پہلے پھلوں کے ساتھ ایسے مشابہ ہیں گویا کہ یہ بعینہٖ وہی پہلے پھل ہیں تب تو اسے مقصود تشبیہ میں مبالغہ ہو گا اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ یہ پھل پہلے پھلوں کی جنس اور قسم سے ہیں تب اس سے بعض افراد کہ احساس سے ان کی جنس کا پتہ لگانا اصل مقصود ہو گا اور جن پھلوں کی نسبت وہ کہیں کہ جو ہم کو پہلے دیئے گئے تھے۔

ان میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ ان سے کون سے پھل مراد ہیں بعض نے کہا ہے کہ ان سے وہ جنت کے پھل مراد ہیں جو کہ اس دفعہ سے پہلے ان کو دیئے گئے تھے لیکن اس میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ كُلَّمَا (جب کبھی) کا کلمہ عموم کو چاہتا ہے یعنی جب کبھی ان کو جنتوں میں کوئی پھل دیا جاوے گا تو وہ یہ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ تو اب چاہئے کہ جنت میں داخل ہوتے ہی پہلی دفعہ جو ان کو پھل دیا جاوے اس پر بھی یہی کہیں۔ پر جب پہلے پھلوں سے جنت کے ہی پھل مراد ہوئے تو پہلی دفعہ کے پھلوں پر ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا حالانکہ كُلَّمَا چاہتا ہے کہ ان پر بھی یہ کہیں گے۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ پہلے پھلوں سے جنت کے پھل ہر گز مراد نہیں ہو سکتے اور

بعض نے کہا ہے کہ دنیا کے پھل مراد ہیں یعنی وہ یہ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو کہ ہم کو دنیا میں ملے تھے تو اس پر وہ اعتراض تو وارد نہیں ہوتا جو کہ پہلے قول پر وارد ہوتا ہے لیکن اس سے یہ لازم آوے گا کہ جنت کے پھل دنیوی پھلوں میں منحصر ہوں حالانکہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ گواہ ہیں کہ جنت میں ایسے پھل بھی ہوں گے جن کا انسان کو دنیا میں علم نہیں ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ:18) (پس کوئی جی نہیں جانتا جو کچھ ان کے لئے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا مخفی کیا گیا ہوا ہے۔)

اور حدیث صحیح میں جنت کی تعریف میں آیا ہے مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ ۔ (جو کہ نہ آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کانوں نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گذرا ہے۔)

(صحیح البخاری کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ حدیث نمبر 3244)

پس جب کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ دنیا کے پھلوں کے علاوہ بھی جنت میں پھل ہوں گے جو کہ دنیا میں نہیں اور پہلے پھلوں سے دنیوی پھل مراد لینے سے لازم آتا ہے کہ اخروی پھل دنیوی پھلوں میں منحصر ہوں لہٰذا ثابت ہوا کہ دنیوی پھل لینے بھی درست نہیں ہیں اور بعض کا یہ قول ہے کہ وہ پہلے پھل اعمال صالحہ ہیں یعنی جب ان کو جنتوں میں کوئی پھل ملے گا تو ان کی طبیعت تاڑ جاوے گی کہ یہ ہمارے فلاں عمل کی جزاء ہے تو اس وقت کہیں گے یہ تو وہی اعمال ہیں جو کہ ہم کو دنیا میں دیئے گئے تھے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) كُلَّمَا ظرف زمان ہے جس کے معنے كُلَّ حِيْنٍ (جب کبھی، ہر وقت) ہیں۔ اور ظرف کا تعلق کسی فعل سے ہوا کرتا ہے جو کہ اس میں واقع ہوتا ہے۔ تو یہاں پر اس کا تعلق قَالُوْا (کہیں گے) سے ہے یعنی کہیں گے وہ کہ یہ وہی ہے جو کہ ہم کو پہلے سے دیا گیا تھا (اور یہ کب کہیں گے) جب کبھی اور ہر ایک وقت کہ ان کو جنتوں سے کسی قسم کا رزق دیا جاوے گا۔

رُزِقُوْا ۔ رِزْقٌ سے ہے۔ اور رزق کے اصلی معنے دینے کے ہیں۔ جیسا کہا گیا ہے مَنْ

رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّ جَمَالًا (جس کو اللہ نے مال اور جمال دیا ہو) اور زیادہ تر رزق بمعنے مرزوق آیا کرتا ہے۔ چنانچہ اردو زبان میں ہمیشہ رزق بمعنے مرزوق ہی مستعمل ہے اور یہی حال فارسی زبان کا ہے۔

پس رُزِقُوْا کے معنے ہوئے، دیئے گئے وہ۔ لیکن چونکہ امور اخروی میں عموماً آتا تو فعل ماضی ہے لیکن معنے اس کے مستقبل کے ہوتے ہیں اور اہل زبان نے یہ بھی لکھا ہے کہ کُلَّمَا کے لفظ کے بعد فعل ماضی بمعنے مستقبل ہوا کرتا ہے لہٰذا یہاں پر اس کے معنے ہوں گے وہ دیئے جاویں گے یعنی ان کو دیا جاوے گا اور ظاہر ہے کہ دینا اور دیا جانا دو چیزوں کو چاہتا ہے اوّل وہ کہ جس کو دیا جائے۔ دوم وہ چیز جو دی جاوے۔ اوّل کہ جس کو دیا جاوے گا وہ تو مومن ہوئے جن پر رُزِقُوْا کی واو دلالت کرتی ہے کیونکہ یہ جمع کی ضمیر ہے جو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کی طرف پھرتی ہے اور دوم جو کہ دی جاوے گی وہ وہ رِزْقًا ہے جو کہ مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ کے بعد مذکور ہے اور جس کے معنے یہاں پر دینے کے نہیں ہیں بلکہ مرزوق کے ہیں جس کو اردو زبان میں رزق کہا کرتے ہیں تو کُلَّمَا اور رِزْقًا کے رُزِقُوْا کے ساتھ ملانے سے اب یہ معنے ہوئے جب کبھی ان کو کوئی رزق دیا جاوے گا اور اگر اس کے معنے دینے کے یہاں پر کئے جاویں جیسے کہ بعض مفسرین نے کئے ہیں تو پھر رِزْقًا دوسری شئے نہ ہوگا جو کہ ان کو دی جاوے گی بلکہ اس صورت میں رِزْقًا رُزِقُوْا کے لئے ایسا ہی تاکید ہوگا جیسا کہ اُعْطِیْنَا اِعْطَاءً (ہم دیئے گئے (یعنی ہم کو دیا گیا) ٹھیک طور پر دیا جانا) میں اِعْطَاءً اُعْطِیْنَا کی تاکید ہے اور اس وقت اس کے معنے یہ ہوں گے۔ جب کبھی وہ دیئے جاویں گے (یعنی ان کو دیا جاوے گا) ٹھیک ٹھیک دیا جانا اور دوسری چیز جو کہ ان کو دی جاوے گی یا تو وہ مِنْ ثَمَرَةٍ کے قرینہ سے مقدر کی گئی ہے یعنی ثَمَرَةٌ تو معنے ہوئے جب کبھی وہ دیئے جاویں گے کوئی پھل ٹھیک طور پر دیا جانا۔ یا وہ مِنْهَا ہے کیونکہ مِنْ بمعنے بعض ہے یعنی بَعْضًا مِنْهَا اور مِنْ ثَمَرَةٍ کا مِنْ بیانیہ ہے جو بمعنے یعنی ہوتا ہے تو اب معنے یہ ہیں گے اور جب کبھی وہ دیئے جاویں گے جنتوں سے کچھ یعنی پھل ٹھیک ٹھیک دیا جانا۔

اب رہا یہ کہ جب رِزْقًا کو بمعنے مرزوق لے کر دوسری چیز رُزِقُوْا کے لئے قرار دیا تو

پھر مِنۡهَا اور مِنۡ ثَمَرَةٍ کے مِنۡ کے کیا معنے ہوں گے اور ان کا کس سے تعلق ہے اور اس کلام سے ان کا کیا علاقہ ہے۔

تو واضح ہو کہ مفسرین نے یہاں پر بہت سی وجہیں لکھی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ دونوں مِنۡ ابتدائیہ اتصالیہ ہیں جو کہ محض اس بات پر دلالت کیا کرتی ہے کہ کوئی شے اس کے بعد کی شے سے جدا ہوئی ہے اور بس جیسا فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ (البقرۃ:250) (تو جو پیئے گا اس نہر سے) میں ہے اور یہ دونوں یعنی مِنۡهَا اور مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا سے حال ہیں۔ تو اب معنے یہ ہوں گے۔ جب کبھی وہ دیئے جاویں گے کوئی رزق (اس حالت میں) کہ وہ جنتوں سے ہو گا (اور جنتوں سے ہونا اس کا اس حالت میں کہ) وہ پھلوں سے ہو گا اور دوم یہ کہ یہ دونوں مِنۡ ہیں تو ابتدائیہ اتصالیہ لیکن حال نہیں بلکہ رُزِقُوۡا کے ساتھ متعلق ہیں تو اس صورت میں معنے یہ ہوں گے۔ جب کبھی وہ دیئے جاویں گے۔ جنتوں سے پھلوں سے کوئی رزق۔

سوم یہ کہ پہلے مِنۡ ابتدائیہ اتصالیہ ہے اور رُزِقُوۡا کے ساتھ متعلق ہے اور دوسری بیانیہ ہے اور حال ہے رِزۡقًا سے تو اس صورت میں معنے یہ ہوں گے۔ جب کبھی وہ دیئے جاویں گے جنتوں سے کچھ رزق جو از قسم پھل ہو گا۔

تفسیر روح المعانی والے نے اگرچہ اوّل وجہ کو سب پر ترجیح دی ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے جن جن صورتوں میں کسی مِنۡ کو حال بنایا گیا ہے وہ سب ٹھیک نہیں ہیں اور اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ حال ہونے کی صورت میں مِنۡ کا متعلق ضرور مقدر نکالا جاوے گا خواہ وہ ثَابِتًا ہو یا كَائِنًا وغیرھما ہو اور یہ مسلم قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی مذکور چیز کسی کا متعلق بن سکتی ہو تب تک مقدر نہ نکالنا چاہئے اور یہاں پر رُزِقُوۡا موجود ہے جس کے ساتھ یہ دونوں متعلق ہو سکتی ہیں اور دوسری یہ وجہ ہے کہ حال تو وہ ہوتا ہے جو کہ فاعل یا مفعول کی حالت بیان کرے لیکن نہ عام طور پر بلکہ وہ حالت جو کہ فاعل سے فعل صادر ہونے اور مفعول پر فعل واقع ہونے کے وقت جو ان دونوں کی حالت ہو اس کو حال بیان کیا کرتا ہے اور یہ دونوں جیسی حالت بیان کرتے ہیں اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

تو اب مذکورہ بالا تین صورتوں میں سے اوّل اور سوم ٹھیک نہ رہیں اور فقط دوسری ہی

صورت قائم رہی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں مِنْ ابتدائیہ اتصالیہ ہیں اور دونوں رُزِقُوْا کے ساتھ متعلق ہیں۔ ہاں اس پر ایک اعتراض کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان عرب کے جاننے والوں کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ دو حرف جَر۔ جن کے معنے ایک ہی ہوں ایک چیز کے ساتھ متعلق نہیں ہوسکتے اور اس صورت میں یہ بات لازم آتی ہے اس لئے کہ اس صورت میں دونوں مِنْ ابتدائیہ اتصالیہ ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے معنے تو ایک ہی ہیں۔ اور دونوں رُزِقُوْا کے ساتھ متعلق ہیں اس کا اگرچہ بعض نے جواب دیا ہے کہ اوّل مطلق رُزِقُوْا کے ساتھ متعلق ہے اور دوم مطلق کے ساتھ نہیں بلکہ اس رُزِقُوْا کے ساتھ متعلق ہے جو کہ مِنْهَا کے ساتھ مقید ہے۔

پس ایک کا متعلق مطلق رُزِقُوْا ہوا اور دوسرے کا وہ رُزِقُوْا متعلق ہے جو کہ مِنْهَا سے مقید ہے لیکن زبان پھر خصوصاً زبان عرب کے عام اصول کی بنا ایسے باریک در باریک تکلفات پر رکھنا انصاف سے بالکل بعید ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ ہے کہ مِنْهَا کا مِنْ تو ابتدائیہ اتصالیہ ہے اور رُزِقُوْا کے ساتھ متعلق ہے اور مِنْ ثَمَرَةٍ کا مِنْ ابتدائیہ اتصالیہ ہے اور مِنْ ثَمَرَةٍ مِنْهَا کا بدل ہے یا یہ مِنْ بیانیہ ہے جو کہ مِنْهَا میں سے هَا یعنی جنات سے مراد کی تعیین کرتی ہے اور چونکہ بدل بھی حقیقت میں پہلی چیز کی ایک طرح سے تفسیر ہی ہوتا ہے اور اردو زبان میں اس کے معنے یعنی یا بلکہ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں لہٰذا ان دونوں صورتوں میں معنے یوں ہوں گے جب کبھی وہ دیئے جاویں گے باغوں یعنی پھل کی قسم سے کوئی رزق۔ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان پر مذکورہ بالا اعتراضوں سے کوئی بھی لازم نہیں آتا کیونکہ بیانیہ ہونے کی صورت میں دونوں کے معنے جدا جدا ہیں اور بدل ہونے کی صورت میں اگرچہ دونوں مِنْ ایک ہی معنے رکھتی ہیں لیکن بدل میں دو چیزوں میں سے ایک ہی محض مقصود ہوتی ہے اور بس۔

یہاں پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خداوند کریم بجائے مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ کے مِنْ ثَمَرَتِهَا فرماتا تو یہ مضمون بھی ادا ہو جاتا اور دو مِنْ لانے کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ پس کیا وجہ ہے کہ خداوند حکیم نے یہ نہ فرمایا اور مِنْ کا مکرر لانا پسند کیا۔

(ضمیمہ ریویو آف ریلیجنز اردو جلد 6 نمبر 8 صفحہ 61 تا 80 سن 1907ء)

مفسرین کا جواب:

اس کا جواب بعض مفسرین نے دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مِنْهَا تو یہ فائدہ دیتا ہے کہ جنتوں کے رہنے والے جنتوں کے علاوہ کسی اور کی طرف محتاج نہیں ہیں کیونکہ ان میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جن کو وہ چاہتے ہیں اور مِنْ ثَمَرَةٍ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لذات اور نعمتیں تو وہاں پر اور بھی ہیں جن میں سے کچھ پہلے بیان ہوئی ہیں اور کچھ اس کے بعد بیان ہونگی لیکن یہاں پر خوردنی اشیاء کا بیان کرنا مقصود ہے جو کہ سب پھلوں کو شامل ہیں اور مِنْ ثَمَرِهَا سے یہ دونوں فائدے حاصل نہیں ہوتے لہٰذا بجائے مِنْ ثَمَرِهَا کے مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ فرمایا ہے لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح مِنْ ثَمَرِهَا سے اس بات کی طرف اشارہ نہیں ہوتا کہ جو جو وہ چاہیں گے وہ سب کچھ جنتوں میں موجود ہوگا اسی طرح مِنْهَا سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا اور ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قدر بھی اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ جب کبھی ان کو کچھ دیا جائے گا تو انہی سے دیا جاوے گا۔ ہاں اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان جنتوں سے جب کبھی دیا جاوے گا تو وہ یہ کہیں گے تو ظاہر ہے کہ اس میں یہ احتمال بھی باقی رہتا ہے کہ ان کو جنتوں کے علاوہ کہیں اور جگہ سے بھی کچھ دیا جائے کیونکہ اس کے اسی قدر معنے ہیں کہ جنتوں سے جب کبھی ان کو کچھ دیا جاوے گا تو وہ کہیں گے رہا کہیں اور سے ملنا تو نہ اس کا اثبات ہے نہ نفی ہے۔

پس میرے خیال میں سوال مذکور کا جواب یہ ہے کہ بعض وقت دو عبارتوں کے معنے ایک ہی ہوتے ہیں لیکن تاہم ان میں اس قدر فرق ہوتا ہے کہ ایک عبارت کسی امر کے اہم اور مقصود ہونے کا اظہار کرتی ہے اور دوسری نہیں کرتی تو جب اس امر کی اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو ان دونوں عبارتوں میں سے وہ اختیار کی جاتی ہے جو کہ اس کی اہمیت پر دال ہوتی ہے تو یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ مِنْ ثَمَرِهَا اور مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ دونوں عبارتیں دو امر پر دال ہیں ایک یہ کہ جو چیز کہ ان کو دی جاوے گی تو وہ اس کی نسبت هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کہیں گے وہ از قسم پھل ہوگی اور دوم یہ کہ جن پھلوں کے دینے پر وہ یہ کہیں گے وہ جنتوں کے پھل ہوں گے لیکن عبارت اوّل امر دوم کی اہمیت پر دال نہیں بخلاف دوسری

عبارت کے کہ وہ اس کی اہمیت پر کھلی کھلی دال ہے کیونکہ مِنْ ثَمَرٍ هَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ پھل جنت کے ہوں گے لیکن بالتبع اور مِنْهَا اس پر اصالۃً دلالت کرتا ہے اور اس ہی اصالۃً دلالت کرانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متکلم کو اس امر کا ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ پھل جنت کے ہوں گے۔

رہا یہ کہ اس بات کے اظہار کی ضرورت کیا پڑی تو واضح ہو کہ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے هُمُ الْخٰسِرُوْنَ تک خداوند کریم نے دو امر بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ جنت اور اس کی نعمتیں ایسی اعلیٰ درجہ کی ہیں کہ دنیا میں نہ وہ نعمتیں موجود ہیں اور نہ ان کی کوئی نظیر موجود ہے (جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جنت وہ چیز ہے کہ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔

(صحیح البخاری کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ حدیث نمبر 3244)

یعنی جنت وہ چیز ہے جو کہ نہ آنکھ نے دیکھی نہ کان نے سنی اور نہ کسی انسان کے خیال میں گذری) لہٰذا ان کے سمجھانے کے لئے جو کچھ بیان ہو گا وہ بطور تمثیل ہو گا اور دوسرا امر یہ کہ جنت ایمان لانے والوں اور اعمال صالحہ بجالانے والوں کو ملے گا کیونکہ جنت انہی کا پھل اور نتیجہ کیا بلکہ ان کا عین ہے تو جب ایک طرف یہ بتایا گیا کہ جنت کی نعمتیں جو کہ جسمانی ہوں گی ایسی اعلیٰ درجہ کی ہوں گی کہ دنیا میں ان کی نظیر نہیں اور دوسری طرف ان کو اعمال صالحہ کا عین قرار دیا گیا اور ظاہر ہے کہ پہلے تو اعمال کا مجسم ہی ہونا انسان کی عقل سے بالا امر ہے پھر ان معمولی اعمال کا ان بے نظیر و بے مثل نعمتوں کا عین ہونا تو بہت ہی بالا ہے اور انسانی طبائع کی عادت ہے کہ ایسی صورتوں میں ضرور کچھ نہ کچھ تاویل کر دیا کرتی ہیں مثلاً جب کوئی ادنیٰ درجہ کا آدمی یہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے یہ کہا ہے یا سرکار نے یہ حکم دیا ہے تو چونکہ یہ شخص ایسا ادنیٰ ہے کہ بادشاہ کا اس کے ساتھ کلام کرنا یا براہ راست اس کو حکم دینا عادۃً نہیں پایا جاتا لہٰذا یہاں پر سنتے ہی یہ تاویل کر دیں گے کہ بادشاہ کے ملازم نے یہ کہا یا یہ حکم سنایا۔

پس ایسے مواضع پر ضرورت پڑتی ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ یہاں پر وہی معنے مراد ہیں جو الفاظ کے ظاہر سے ظاہر ہوتے ہیں نہ وہ تاویلی معنے جو کہ عموماً ایسے مواضع پر کیا

کرتے ہیں اور اس امر کا اظہار ان معنوں پر زور دینے سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ تاکید کے رنگ میں ہو یا کسی اور پیرایہ میں ہو۔ لہٰذا یہاں پر بھی اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جن پھلوں کی نسبت وہ یہ کہیں گے کہ یہ وہی ہیں جو کہ ہم کو پہلے دیئے گئے تھے وہ کوئی اور پھل نہ ہوں گے جن کا اعمال صالحہ واخلاق حمیدہ کا عین ہونا بعید از عقل عامی نہ ہو بلکہ وہ جنت ہی کے پھل ہوں گے جن کی نسبت وہ یہ کہیں گے نہ اور۔

قَالُوْا۔ قَوْلٌ سے ہے، جس کے معنے کہنے اور ظاہر کرنے کے ہیں۔ پس قَالُوْا کے معنے ہوئے انہوں نے کہا لیکن چونکہ احوال قیامت کے بیان میں آئندہ کے افعال کے لئے بھی عموماً فعل ماضی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے وقوع کو ایسا یقینی ظاہر کیا جاوے گویا کہ وہ ہو ہی چکا ہے اور نیز قاعدہ ہے کہ لفظ کُلَّمَا کے بعد بھی ماضی بمعنے مستقبل آیا کرتی ہے لہٰذا یہاں پر بجائے انہوں نے کہا یا ظاہر کیا کے یہ معنے کئے جاویں گے کہ وہ کہیں گے یا ظاہر کریں گے۔

ھٰذَا۔ یہ۔ یہ اس رزق کی طرف اشارہ ہے جو کہ جنت کے پھلوں کی قسم سے مومنوں کو جنتوں میں دیا جاوے گا۔

اَلَّذِیْ۔ جو۔ رُزِقْنَا۔ دیا گیا تھا ہم کو۔

مِنْ۔ سے، قبل، طرف ہے، جس کے معنے پہلے کے ہیں۔ زمانے اور مکان دونوں کے لئے آتا ہے اور یہاں پر زمانہ کے لئے ہے۔

پس مِنْ قَبْلُ کے معنے ہوئے پہلے سے۔ سارے کا ترجمہ ہوا وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو دیا گیا تھا ہم کو پہلے سے۔ یہاں پر دو مطلب ہوسکتے ہیں اوّل یہ کہ وہ کہیں گے کہ یہ رزق جو ہم کو اب دیا گیا ہے بعینہٖ یہ وہ شے ہے جو کہ ہم کو اس دفعہ سے پہلے دی گئی تھی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ رزق جو کہ ہمیں اب دیا گیا ہے یہ وہی ہے جو کہ پہلے سے ہمیں دیا گیا ہوا ہے اور ظاہر نظر میں اگرچہ یہ دونوں مطلب ایک ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں ان دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متکلم کی اصل غرض دونوں دی ہوئی چیزوں میں کمال مشابہت یا اتحاد کا اظہار ہے اور دوم سے یہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متکلم کی

اصل غرض اس بات کا اظہار ہے کہ جو چیز اب ہمیں ملی ہے یہ نہیں کہ یہ ابھی ہمیں دی گئی ہے بلکہ یہ تو پہلے سے ہمیں مل چکی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان دونوں مطلبوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

مفسرین نے عموماً پہلا مطلب لے کر اس پر بحث کی ہے کہ وہ پہلا رزق کہ جس کے ساتھ جنت کے پھلوں کو مشابہ یا متحد بتائیں گے وہ کون سا رزق ہے کیا اس سے وہ پھل مراد ہیں جو کہ جنت میں پہلے پہلے ملیں گے یا دنیا کے پھل مراد ہیں یا اعمال صالحہ مراد ہیں اور یہ بحث مفصل طور پر ہم پہلے لکھ آئے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسی کو ترجیح ہے کہ اس سے مراد اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ہیں اور دوسرے مطلب کو مفسرین نے چھیڑا تک نہیں حالانکہ زبان کے لحاظ سے اَلَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ سے یہی دوسرا مطلب مفہوم ہوتا ہے تو اگر یہ مطلب لیا جاوے تو پھر اس امر کے دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ پہلا رزق کون سا تھا کیونکہ اس صورت میں دو رزق تو ہوتے ہی نہیں بلکہ ایک ہی رہتا ہے ہاں اس ایک رزق کی نسبت وہ کہیں گے کہ یہ ہمیں پہلے سے ملا ہوا ہے تو اب دیکھنا ہے کہ وہ رزق یعنی جنت کے پھل ان کو پہلے کب دیئے گئے اور ان کے پہلے دیئے جانے کے کیا معنے ہیں تو واضح ہو کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جنت کوئی اور چیز نہیں بلکہ ایمان اور نیک اعمال اور اخلاق حمیدہ ہی اس جہاں میں جسمانی رنگ پکڑ کر جنت اور جنت کی سب نعمتیں اور سب پھل بن جاویں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ قیامت کو یا قبر میں حاصل نہیں ہوتے بلکہ یہ ہدایت اور سعادت جس کو دی جاتی ہے تو دنیا ہی میں دی جاتی ہے تو جب قیامت ہوگی اور جنتی جنت میں داخل ہو جاویں گے تو جب کبھی ان کو کوئی پھل ملے گا تو فوراً وہ پہچان جاویں گے کہ یہ ہمارا فلاں عمل یا فلاں خلق مجسم ہو کر یہ پھل بنا ہوا ہے تو معاً وہ پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی عمل یا خلق ہے جو کہ ہم کو پہلے سے مل چکا تھا لیکن تعجب ہے کہ پہلے نہ اس کی یہ حقیقت تھی اور نہ یہ کیفیت تھی جو کہ اب ہے۔ پس ہر ایک پھل ملنے پر یہ کہنے کا موجب یہی تعجب ہے جو ان کو لاحق ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ خواہ اوّل مطلب ہو یا دوم لیکن خداوند کریم نے اس موقع پر مومنوں کی اس حالت اور اس قول کو کیوں بیان فرمایا ہے تو واضح ہو کہ دونوں صورتوں میں

یہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ جس جنت کی مومنوں کو بشارت دی جاتی ہے اس کے یا اس کی بشارت کے حاصل کرنے کا ایمان لانے اور عمل صالحہ بجالانے کے سوا اور کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں ہے۔ اس بات کو پہلے تو بَشِّرْ کے بعد اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرما کر ظاہر کیا کیونکہ موصول کے ساتھ بیان کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ما قبل کے لئے علت ہے۔

پس پہلے تو اس سے ثابت ہوا کہ جنت کی بشارت کی علت ایمان لانا اور اعمال صالحہ بجالانا ہے۔ اس کے بعد کُلَّمَا رُزِقُوْا الخ ذکر فرما کر یہ ظاہر کیا کہ جنت کے پھل تو یہی ایمان اور اعمال صالحہ ہوں گے نہ اور جو کہ دنیا ہی میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ پس جب جنت یہی ایمان اور اعمال صالحہ ہیں جو کہ دنیا ہی میں حاصل کئے جاتے ہیں تو جو شخص دنیا میں ان کو حاصل نہ کرے گا آخرت میں نہ اس کو جنت ملے گی اور نہ کبھی اس کو اس کی بشارت دی جاوے گی۔

اب ایک بات اس بحث کے متعلق باقی رہتی ہے کہ مومنوں کو یہ پتہ کس طور پر لگے گا کہ یہ وہی پھل ہیں جو کہ ان کو پہلے دیئے گئے تھے یعنی یہ پتہ کیونکر لگے گا کہ یہ پھل فلاں فلاں عمل یا خلق ہے کیا کوئی ان کو بتائے گا یا ان پھلوں پر کچھ لکھا ہوا ہو گا یا اس کے لئے کوئی علامت ہو گی یا کوئی اور ذریعہ ہو گا۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا سے مراد:

تو خداوند کریم نے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا فرما کر خود ہی اس بات کو بیان فرما دیا ہے جس کی ابھی تفصیل آتی ہے۔

وَ۔ اور۔ اُتُوْا۔ اِتْیَانٌ سے ہے، جس کے معنے آنے کے ہیں اور جب اس کے بعد بَا آ جاتی ہے تو اس کے معنے لانے اور دینے کے ہو جاتے ہیں اور یہاں پر بھی دینے کے معنے ہیں تو اُتُوْا کے معنے یہاں پر ہوئے دیئے جاویں گے وہ یعنی ان کو دیا جاوے گا۔

بِ۔ محض فعل کے معنے بدلنے کے لئے ہے۔

ہٖ۔ وہ یعنی رزق جو کہ جنت کے پھلوں سے مومنوں کو دیا جاوے گا اور وہ اعمال صالحہ جو کہ ان کو پہلے دیئے گئے ہیں۔

مُتَشَابِہٌ۔ تَشَابُہٌ سے ہے، جس کے معنے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا پس مُتَشَابِہٌ کے معنے ہوئے ایک دوسرے ملتے جلتے۔

سب کا ترجمہ ہوا اور دیا گیا (یا دیا جاوے گا) ان کو وہ آپس میں ملتا جلتا یعنی یہ پتہ ان کو اس طور پر چلے گا کہ جنتوں کے پھلوں میں اور ان اعمال میں جو کہ مجسم ہو کر وہ پھل بنیں گے کمال تشابہ ہو گا جس سے مومن لوگ معلوم کر لیں گے کہ یہ پھل وہی اعمال ہیں جو کہ ہم کو پہلے دیئے گئے تھے۔ پس کُلَّمَا سے مُتَشَابِہًا تک کا ترجمہ یہ ہے کہ جب کبھی وہ دیئے جاویں گے ان (باغوں) یعنی پھل کی قسم سے کوئی رزق (یا پورے طور پر دیا جانا) (تو) وہ کہیں گے (یا ظاہر کریں گے) کہ یہ وہ ہے جو کہ پہلے سے ہم کو دیا گیا ہے اور ان کو وہ ملتا جلتا دیا گیا (یا دیا جائے گا۔)

مفسرین نے یہاں پر لکھا ہے کہ خداوند کریم نے یہاں رزق اور پھل دینے والے کا ذکر نہیں کیا اور اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ جب کسی فعل کا فاعل معلوم ہوتا ہے تو پھر اس کو ذکر نہیں کرتے تو چونکہ یہاں پر بھی دینے والا معلوم تھا لہٰذا اس کو ذکر نہیں کیا گیا۔ اور پھر بحث کی ہے کہ وہ حقیقت میں کون ہے تو کسی نے کوئی بتایا اور کسی نے کوئی اور پھر فیصلہ کیا ہے کہ سب سے بہتر اور ظاہر ترین یہی ہے کہ اس کے دینے والے غِلْمَانٌ اور وِلْدَانٌ ہیں جو کہ جنت میں جنتیوں کے خدام ہوں گے۔ بلکہ کہا کہ قرآن مجید میں تو اس کی تصریح موجود ہے چنانچہ سورۂ واقعہ میں فرمایا ہے یَطُوْفُ عَلَیْہِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ۔ بِاَکْوَابٍ وَّ اَبَارِیْقَ وَ کَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ۔ لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْہَا وَ لَا یُنْزِفُوْنَ۔ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ۔ وَ لَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَہُوْنَ (الواقعۃ:18 تا22) (ان پر جوان لڑکے آبخورے اور آفتابے اور مصفّٰی شراب کے پیالے جس سے نہ ان کے سر دکھائے جاویں گے اور نہ بکواس کریں گے اور چیدہ پھلوں سے میوے اور جی بھاتے گوشتوں سے پرندوں کے گوشت لئے پھریں گے۔)

پس یہاں پر صاف تصریح ہے کہ پھل دینے والے اور ان پر پھرنے والے وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ہوں گے لیکن یہ درست نہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ نفس فاعل کا معلوم ہونا اس کے نہ ذکر کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں صاف صاف آیا ہے کہ اگر

مشرکوں سے بھی دریافت کرو کہ زمین وآسمان کو کس نے پیدا کیا ہے۔ تو ضرور وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ زمین وآسمان کے خلق کا فاعل موحد کیا مشرک بھی جانتے تھے کہ اللہ کریم ہے لیکن پھر بھی قرآن مجید میں جہاں خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ[1] (الانعام:2) آتا ہے وہاں پر اس کا فاعل (جو کہ اللہ ہے) مذکور ہوتا ہے۔ تو اگر فاعل کا جاننا اس کے ذکر سے مانع ہوتا یا بلفظ دیگر اس کے عدم ذکر کو چاہتا تو خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا فاعل سارے قرآن مجید میں کبھی مذکور نہ ہوتا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ فاعل کے ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ صحیح نہیں کہ وہ معلوم ہے بلکہ اس کی کوئی اور وجہ ہے۔

دوم اس میں یہ نقص ہے کہ انہوں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ یہاں پر رُزِقُوْا اور رُزِقْنَا اور اُتُوْا بِہٖ کا فاعل غِلْمَانٌ اور وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ہیں اور اس میں ان کو غلطی لگی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے آگے جنت کے پھل پیش کرنے والے قرآن مجید نے غِلْمَانٌ اور وِلْدَانٌ بتائے ہیں تو اس سے انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کے دینے والے بلکہ ان اعمال اور اخلاق کے دینے والے بھی وہی غِلْمَانٌ ہیں جن کی نسبت وہ کہیں گے کہ جو ہم کو پہلے دیئے گئے تھے حالانکہ سارے قرآن مجید میں فعل رزق کا فاعل اللہ کریم کے سواء غِلْمَانٌ اور وِلْدَانٌ کو یا کسی اور کو ہرگز ہرگز نہیں بنایا گیا اور نہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا دینے والا یعنی ان کی توفیق عنایت کرنے والا بجز اللہ کریم کے دوسرا کوئی بتایا ہے تو جب رزق کی اور اعمال صالحہ کی توفیق دینے کا فاعل ایک اللہ کریم ہی ہے اور دوسرا کوئی نہیں ہے تو پھر پہلے تو یہ بحث ہی غلط ہے کہ اس کا فاعل کون ہے اور پھر دوسری غلطی یہ کی کہ اللہ کریم کے سواء غِلْمَانٌ وَوِلْدَانٌ کو فعل رزق اور توفیق اعمال کا فاعل بنا دیا۔

پس اصل بات میرے نزدیک یہ ہے کہ ان فعلوں کا فاعل تو یقیناً اللہ کریم ہے نہ اور۔ اور فاعل کے عدم ذکر کی وجہ میرے خیال میں یہاں پر یہ ہے کہ مومنوں کو جو کچھ انعامات یا توفیق اعمال وغیرہ ملتی ہے اس کا اصل موجب تو فضل الٰہی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں

[1]۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ (تفسیر صغیر)

کہ اس فضل کے لئے ایمان واعمال صالحہ واخلاق فاضلہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کبھی تو ان کو فضل الٰہی بتاتا ہے اور کبھی ان کو جزاء ایمان واعمال صالحہ قرار دیتا ہے۔ پس جہاں پر ان کو فضل بتایا جاتا ہے وہاں پر تو ان کا فاعل یعنی دینے والا اَللّٰہُ۔ اَلرَّحْمٰنُ۔ اَلرَّحِیْمُ۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ وغیرہ عنوانوں کے ساتھ خداوند تعالیٰ کو ظاہر کیا جاتا ہے اور جہاں پر ایمان واعمال صالحہ کا خالص دخل اور ان کی ضرورت بیان کرنی مد نظر ہوتی ہے وہاں پر یہی مناسب ہوتا ہے کہ فاعل کو نہ ذکر کیا جاوے تا کہ ایمان واعمال کی ضرورت ثابت ہو جاوے۔

اور اگر کسی عنوان کے ساتھ فاعل کو ذکر کیا جاتا تو وہاں پر یہ خیال گذر سکتا ہے کہ اس وصف کے مقتضٰی سے یہ کچھ دیا گیا ہے لیکن جب فاعل ذکر ہی نہ ہوا بلکہ ایمان واعمال ہی کا ذکر ہوا تو پھر اسی قدر مفہوم ہو گا کہ ان اعمال کے عوض یا باعث سے یہ کچھ ملا ہے اور بس تو پھر جیسی ان کی ضرورت مد نظر ہے ویسی ہی ثابت بھی ہو گی اور ہم بتا چکے ہیں کہ یہ مقام ایمان واعمال کی ضرورت کے بیان کرنے کا ہے۔ لہٰذا اس مقام کے مناسب یہی تھا کہ فاعل کو کسی عنوان کے ساتھ ذکر نہ کیا جاوے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

آیت26: وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ۔

حضرت مولانا حکیم الامتؒ۔ اَزْوَاجٌ۔ زَوْجٌ کی جمع قلت ہے جو کہ دس سے کم افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

امام راغب نے کہا ہے کہ تَطْهِيْرٌ پاک کرنے کو کہتے ہیں اور یہ اجسام اور افعال اور اخلاق سب ہی میں استعمال ہوتی ہے یعنی جس طرح جسم کے پاک کرنے کو تَطْهِيْرٌ کہتے ہیں اسی طرح افعال اور اخلاق کے پاک کرنے کو بھی تَطْهِيْرٌ ہی کہتے ہیں۔ پس جہاں پر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مقید نہ ہو وہاں پر ان تینوں کے پاک کرنے پر دلالت کرے گی۔ جیسی کہ یہاں پر ہے اور مقام مدح ہونے کے لحاظ سے بھی یہی مناسب تھا کہ جسمانی اور فعلی اور خلقی ہر ایک قسم کی پاکی مراد لی جائے... توجب یہ لفظ خود اس پر دلالت کرتا ہے تو اب اس تاویل کی ضرورت نہ رہی کہ یہ مطلق ہے اور مطلق سے فرد کامل مراد ہوتا ہے اور پاکی کا فرد کامل یہی ہے کہ جسمانی اور فعلی خلقی سب قسم کی ہو۔

اور خُلُوْدٌ۔ مُكْثٌ طَوِيْلٌ یعنی مدت دراز تک ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف:177)(و لیکن وہ زمین کی طرف جھکا اور زمین سے لپٹا) مُخَلَّدٌ اس کو کہتے ہیں جو باقی رکھا جاوے یا جو کہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچ گیا ہو لیکن اس کے آثار جوانی میں کوئی تغیر نہ آیا ہو اور لفظ خُلُوْدٌ مصدر بھی آتا ہے اور کبھی خَالِدٌ کی جمع بھی ہوتا ہے۔

(محمد سرور عفی اللہ عنہ) وَ۔ اور۔

لِ۔ لئے۔ لِ کبھی نفع کے اظہار کے لئے ہوتا ہے یعنی اس بات کے بتانے کے لئے کہ اس کا مدخول کسی کے لئے نافع ہے اور کبھی ملکیت کے لئے یا استحقاق کے لئے یعنی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مدخول کسی کا ملک ہے یا کسی کو اس میں حق تصرف حاصل ہے یا کوئی اس کا زیادہ مستحق ہے اور یہاں پر نفع اور استحقاق بمعنے مذکور دونوں ہو سکتے ہیں۔

هُمْ۔ ان۔ فِيْ۔ بیچ۔ هَا۔ اس اور مونث کی جمع کی طرف بھی مفرد مونث کی ضمیر عربی میں استعمال ہوتی ہے چنانچہ یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ هَا مفرد یعنی اکیلی مونث کی ضمیر ہے

اور یہاں پر جنات کی طرف پھر رہی ہے جو کہ عربی زبان میں جمع مونث ہے تو ایسے موقع پر بجائے اس کے ان اس کے معنے کئے جاتے ہیں۔

پس فِیْہَا کے معنے ہوئے ان میں یعنی جنتوں اور باغوں میں۔

اَزْوَاجٌ۔ زَوْجٌ کی جمع قلت ہے جیسا کہ حضرت مولانا صاحب کی تقریر میں گذر چکا ہے اور اس کی جمع کثرت زَوْجَۃٌ ہے جیسا عَوْدٌ اور عَوْدَۃٌ ہے لیکن اس کا استعمال بہت کم ہے بلکہ دس سے زیادہ کے لئے بھی اَزْوَاجٌ ہی کو استعمال کرتے ہیں اور زَوْجٌ جوڑے کو کہتے ہیں خواہ نر ہو یا مادہ اور جوڑے میں سے ایک کو بھی زَوْجٌ کہتے ہیں اور جوڑے کے مجموعہ یعنی دونوں کو بھی زَوْجٌ ہی کہا کرتے ہیں اور بنی تمیم اور قیس قبیلہ میں سے اکثر مادہ کے لئے بجائے زَوْجٌ کے زَوْجَۃٌ استعمال کرتے ہیں اور زَوْجٌ کے مفہوم میں توالد کی شرط نہیں تاکہ یا قیامت میں توالد ماننا پڑتا یا قیامت کے ازواج پر اَزْوَاجٌ کا اطلاق صحیح نہ ہوتا تو جب اس کے مفہوم میں توالد کسی طرح سے داخل نہیں ہے تو اب ازواج قیامت پر اس کا اطلاق درست ہے اور یہاں پر اَزْوَاجٌ سے وہ بی بین مراد ہیں جو کہ ایک مرد سے مخصوص ہوں گی اور جو مرد عورتوں کے ساتھ خاوندی کا تعلق رکھیں گے وہ ان عورتوں کے لئے زَوْجٌ ہوں گے اور جس طرح دنیوی امور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مردوں کے احکام اور احوال اصالۃً بیان ہوتے ہیں اور عورتوں کے بالتبع مفہوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے کہ مردوں کے احکام اور احوال اصالۃً بیان فرمائے ہیں اور عورتوں کے بالتبع اور باوجود اس کے پھر اپنی کتاب میں تصریح کر دی ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا اجر ہے اور اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ ان کے احکام اور ان کے اجر بھی ہم شکل اور ہم رنگ ہی ہوں گے کیونکہ وہ دونوں آپس میں ہم جنس ہیں تو جب دنیوی احوال اور احکام کا تجربہ اور مشاہدہ اسی پر دلالت کرتا ہے اور خداوند کریم نے اس کی بار بار تصریح بھی کر دی ہے اور جس پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس نے احکام اور احوال میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ شریک اور ہم رکاب کر کے بتایا ہے اور اسی پر دنیا کا تعامل ہے تو پھر ان

جاہلوں کا یہ اعتراض ہر گز قابل توجہ نہیں رہتا کہ قرآن مجید نے نہ احکام میں عورتوں کو شریک کیا ہے اور نہ اجر میں ان کو ان کے ساتھ شامل کیا ہے۔

عورتوں اور مردوں کے حقوق میں فرق:

اور بعض ایسے جاہل بھی ہیں کہ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو لوگ عورتوں کے حقوق کو مردوں کے حقوق کے ساتھ مساوی قرار دینے کے بڑے دعوے دار ہیں اور رات دن اسی امر کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں اور مذہبوں پر منہ پھاڑ پھاڑ کر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ عورتوں کے حقوق کو مردوں کے حقوق کے ساتھ مساوی قرار نہیں دیتے اور اس وجہ سے ان کو ظالم، غاصب وغیرہ ناموں سے یاد کرتے رہتے ہیں وہ بھی اب تک نیچر اور فطرت کی تفریق کو اٹھا کر پوری مساوات نہیں کر سکے۔ مثلاً عورت حمل اٹھانے اور وضع حمل کی تکلیفیں برداشت کرنے اور دودھ پلانے کی مصیبت جھیلنے میں اکیلی ہے اور کبھی ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا کہ ایک دفعہ عورت ان تکالیف کو اٹھائے اور دوسری دفعہ وہ عورت سے ہاتھ بٹا کر خود ان امور کو اپنے پر لے لیویں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اور بہت سے امور ہیں جن میں فطرت اور قانون قدرت نے کھلی تفریق کی ہوئی ہے اور کوئی اس تفریق کو رفع نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود اس کے پھر یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ اچھا اگر قرآن مجید نے مردوں کے بالتبع عورتوں کے حقوق بیان کئے ہیں اور ان کے حقوق کو ان کے حقوق کے ساتھ مساوی قرار دیا ہے تب چاہئے کہ ایک عورت کے لئے بہت بہت خاوند ہوں جیسا کہ ایک مرد کے لئے بہت بہت عورتیں ہوں گی اور اگر ایسا نہیں تو پھر مساوات نہیں رکھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسے اعتراض کرنے والے علاوہ جہال ہونے کے معاند حق بھی ضرور ہی ہوا کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ عقل اور انصاف رکھتے تو ان کے اعتراض میں ہی اس کا جواب موجود ہوتا ہے۔ پر نہ وہ خود اس کو سمجھتے ہیں اور نہ کسی کے سمجھانے سے وہ حق کے قائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ اعتراض جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کے اندر ہی اس کا جواب ہے۔ اس لئے کہ اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ اگر عورتوں کے حقوق کو مردوں کے حقوق کے مساوی قرار نہیں دیا تب تو

عدم مساوات کی وجہ سے یہ مذہب اچھا نہیں اور اگر مساوات ہے تو اس صورت میں چونکہ لازم آتا ہے کہ ایک عورت کے لئے بہت خاوند ہوں جیسا کہ ایک مرد کے لئے بہت سی عورتیں ہوں گی تو اس صورت میں چونکہ ایک عورت کے لئے بہت خاوند ماننے پڑتے ہیں لہٰذا اس صورت کے موافق بھی یہ مذہب ٹھیک نہیں کیونکہ یہ ایک بری اور خلاف فطرت بات کا اقرار ہے۔

پس اس اعتراض ہی سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ معترض کے نزدیک ایک عورت کے بہت سے خاوند ہونے خلاف فطرت اور برا ہے اور یہ کہ ایسے امور میں مساوات درست نہیں اور یہ بھی کہ مساوات ضروری چیز ہے تو ان دونوں کے ملانے سے یہ ثابت ہوا کہ ایسے امور کے سواء اوروں میں مساوات ضروری ہے اور ایسے امور میں مساوات جائز نہیں ہے اور یہی وہ بات ہے جو کہ ہم روزمرہ قانون قدرت اور نیچر میں مشاہدہ کرتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے اور یہی وہ بات ہے جو کہ جاہل معترض اپنے منہ سے کہتا ہے پر نہ خود سوچتا ہے اور نہ سمجھانے سے سمجھتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید ان دونوں کے حقوق میں مساوات قرار دیتا ہے پر سواء ان امور کے کہ جن میں مساوات خلاف فطرت ہے یا کسی خرابی کو مستلزم ہے۔

اگر یہ معترض صاحب اس سے بھی نہ سمجھیں تو پھر پہلے ان کو خدا کے فعل اور قانون قدرت اور نیچر پر اعتراض کرنا چاہئے کہ ان دونوں کے حقوق میں کیوں کلی مساوات نہیں اور عورت ضعیف القویٰ کو بالخصوص کیوں بچہ پیٹ میں اٹھانے اور جننے اور دودھ پلانے کی تکلیفوں میں مبتلا کیا ہوا ہے اور مرد کو جو کہ قوی القویٰ ہے ان امور سے بالکل سبکدوش کر دیا ہے اور بعد ازاں پھر اپنے پر اعتراض کریں کہ اگر خدا نے یہ مساوات نہ کی تھی تو وہ خود کر دکھاتے اور باری کے ساتھ ایک دفعہ خود بھی کچھ عرصہ تک بچہ کو اپنے پیٹ میں رکھ کر نو ماہ کے بعد جنتے اور دو سال تک دودھ پلاتے یا کم از کم ایک ماہ کے لئے عورت کو ایام مخصوص کی تکلیف سے سبکدوش کر کے خود اس کی جگہ آپ پر ایام مخصوص گذارتے۔ پس جب وہ خود پوری مساوات کر دکھاویں گے تو پھر ان کو دوسروں پر اعتراض کرنے کا حق

حاصل ہو گا ورنہ اس سے پہلے ہر گز ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اصل پوچھو تو نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کچھ۔ فقط کتاب اللہ سے تمسخر منظور ہے اور بس۔

مُطَهَّرَةٌ کے معنی:

مُطَهَّرَةٌ۔ تَطْهِيْرٌ سے ہے اور حضرت مولانا صاحب کی تقریر میں امام راغب کے حوالہ گذر چکا ہے کہ اس کے معنے پاک کرنے کے ہیں خواہ وہ پاکی جسمانی ہو یا فعلی یا خلقی۔ پس مُطَهَّرَةٌ کا ترجمہ ہوا پاک کی ہوئی اور جب جمع کی صفت ہو جیسی کہ یہاں پر ہے تب اس کا ترجمہ ہو گا پاک کی ہوئی جماعت یا پاک کی ہوئیں اور پاک کس نے کیں خدا نے جیسا کہ فرمایا ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (النور:22) (ولیکن اللہ ہی پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔)

تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ خداوند کریم نے مُطَهَّرَةٌ فرمایا جس کے معنے ہیں پاک کی ہوئیں اور طَاهِرَةٌ نہ فرمایا جس کے معنے ہیں پاکیزہ کے۔ اس لئے کہ مُطَهَّرَةٌ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کو پاک کیا ہے اور ظاہر ہے کہ پاک کرنے والا خداوند کریم کے سواء اور کوئی نہیں ہے۔ پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدائے ذوالجلال کی پاک کی ہوئیں ہیں اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو خداوند کریم پاک کرے اس کی پاکی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے بخلاف طَاهِرَةٌ کے کہ اس سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ خداوند کریم کی پاک کی ہوئی ہیں تاکہ ان کی اعلیٰ درجہ کی پاکی ثابت ہو۔ پر ایک سوال یہاں پر اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ مانا کہ مُطَهَّرَةٌ کو طَاهِرَةٌ پر اس وجہ سے ترجیح دی گئی ہے لیکن اَزْوَاجٌ جمع ہے اور اس کی صفت مُطَهَّرَةٌ مفرد ہے اور قواعد کے لحاظ سے اگرچہ ایسے مواضع میں صفت کا جمع یا مفرد لانا درست ہوتا ہے لیکن تاہم ظاہر ہے کہ جمع کے مناسب جمع ہی ہوتی ہے مفرد کو اس پر ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ خاص ہونی چاہئے۔

پس واضح ہو کہ مفسرین نے اگرچہ اس سوال کو نہیں چھیڑا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ تاکہ اس کا مفرد لانا اس بات کو ظاہر کر دے کہ شخص واحد کے ازواج میں اگرچہ یگانگت نہیں ہوتی بلکہ نقار شدید کے باعث ان میں کمال درجہ کی مغائرت ہوتی ہے لیکن خداوند کریم ان کی ایسی کامل تطہیر کر دے گا کہ باوجود کمال

مغائرت اور نقار کی صورت کے ان میں اس قدر یگانگت اور اتحاد پید ہو جاوے گا کہ وہ فرد واحد کی طرح زندگی بسر کریں گی اور کسی قسم کی مغائرت ان میں باقی نہ رہے گی۔

وَ۔ اور۔ هُمْ۔ وہ۔ فِيْ۔ بیچ۔ هَا۔ اس یا ان۔

خَالِدُوْنَ۔ خُلُوْدٌ سے ہے، جس کے معنے حضرت مولانا صاحب کی تقریر میں مدت دراز تک ٹھہریں گے گذر چکے ہیں۔ پس خَالِدُوْنَ کے معنے ہوئے مدتوں ٹھہرنے والے۔ خُلُوْدٌ کے معنوں میں معتزلہ اور جہمیہ اور اہل السنۃ والجماعہ میں اختلاف ہے۔ معتزلہ تو خُلُوْدٌ کے معنے ہمیشہ رہنے کے کرتے ہیں اور جہمیہ کہتے ہیں چونکہ جنت اور دوزخ فنا ہونے والے ہیں کیونکہ خداوند کریم نے اپنے صفات میں سے هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (الحدید:4)(وہی اوّل اور آخر ہے) بھی بیان کی ہے اور آخر تب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے سواء سب اشیاء کسی وقت فنا ہو جاویں۔ تو جب جنت اور دوزخ دونوں فانی ہوئے تو پھر ضروری ہے کہ خُلُوْدٌ کے معنے ہمیشہ رہنے کے نہ ہوں بلکہ ایسی مدت دراز ٹھہرنا جو کہ ضرور ختم ہونے والی ہو اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک مدت دراز تک ٹھہرنا ہے خواہ وہ مدت ختم ہو یا نہ ہو۔

پس جہاں پر اس کے معنے ہمیشہ کے آتے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے معنے ہمیشہ رہنے کے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بھی مدت دراز تک ٹھہرنے کا ایک فرد ہے اور جو جہمیہ نے اَلْاٰخِرُ سے جنت کا فانی ہونا ثابت کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید تصریح کے ساتھ جنت اور اس کے نعماء کو عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (ھود:109)(بخشش غیر منقطع یعنی کبھی ختم نہ ہونے والی) فرمایا ہے۔ پس اس تصریح کے بعد کسی اشارہ وغیرہ سے اس کو فانی قرار نہیں دے سکتے۔

رہا هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الحدید:4) تو اس کے فقط اسی قدر معنے ہیں کہ اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء ہے نہ وہ اپنی ذات میں کسی کی طرف مستند اور محتاج ہے۔ نیز سورۂ حدید کہ جس میں هُوَ الْاَوَّلُ الخ آیا ہے اس کے پڑھنے سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ اوّل اور آخر اس عالم دنیا یعنی آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی اشیاء کے فناء سابق اور لاحق کے اظہار کے لئے یہ فرمایا ہے کہ اللہ سب سے پہلے تھا جبکہ ان اشیاء سے کچھ بھی نہ تھا پھر وہ بعد میں

بھی ہو گا جبکہ اس جہاں میں سے کچھ بھی نہ ہو گا اور قرآن مجید کے اور مقاموں سے بھی بڑی وضاحت سے اس امر کا پتہ لگتا ہے کہ اس ہی جہاں کی چیزوں کے فناء کا اظہار مد نظر ہے نہ ان اشیاء کا فانی ہونا جو کہ قیامت میں ہوں گی بلکہ ان کی نسبت اگر بیان کیا ہے تو یہی کہ وہاں پر موت اور فناء نہیں ہے مثلاً جہاں پر فناء کا ذکر فرمایا وہاں پر فرمایا ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن:27-28)(سب اشیاء جو کوئی زمین پر ہے وہ فنا ہونے والی ہے اور تیرے رب کی ذات باقی رہنے والی ہے جو کہ جلال اور عظمت والی ہے) پھر فرمایا كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص:89)(ہر ایک شے ہلاک ہونے والی ہے بجز اس کی ذات کے) پھر فرمایا اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (الزمر:31)(تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں) پھر فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران:186)(ہر ایک جی موت کو چکھنے والا ہے) اور قیامت کی نسبت آیا ہے وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ (فاطر:37)(اور جو کافر بنے۔ ان کے لئے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان پر فیصلہ کیا جاوے گا تا کہ وہ مر جاویں اور نہ ان سے اس کا عذاب تخفیف کیا جاوے گا۔ اسی طرح ہر ایک کافر کو ہم جزا دیں گے) پھر آیا ہے۔ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ۔ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى (الصّٰفّٰت:59-60) (کیا پس ہم نہ مریں گے مگر پہلی موت کے ساتھ) اور فرمایا ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى (الاعلیٰ:14)(پھر نہ اس میں وہ مرے گا اور نہ آرام کی زندگی بسر کرے گا) پھر فرمایا لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (الفرقان:15)(آج دن ایک ہلاکت نہ مانگو بلکہ بہت ہلاکتیں مانگو) پھر فرمایا عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (ھود:109)(غیر منقطع بخشش) پھر فرمایا فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (التین:7)(پس ان کے لئے لا انتہا اجر ہے جو ختم نہ ہو گا۔)

پھر یہ کھلی کھلی بات ہے کہ قرآن مجید میں جہاں پر حیات و ممات کا ذکر کیا ہے تو اس دنیوی حیات کے بعد ایک موت اور ایک حیات کا ذکر کیا ہے اور کہیں اشارہ تک بھی نہیں کیا کہ اس اخروی زندگی کے بعد پھر کوئی اور موت بھی ہونے والی ہے۔ تو جب خدائے عالم الغیب نے حیات اخروی کے بعد کسی موت کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ لَا يَمُوْتُ وغیرہ فرمایا ہے

جس سے حیات اخروی کے بعد کی موت کی نفی ثابت ہوتی ہے تو پھر ایک انسان کو (جو کہ اپنے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے) کہاں سے یہ حق حاصل ہے کہ قیامت کے بعد کے حالات از خود بلکہ خلاف کتاب اللہ بیان کرے۔

جہمیہ لوگ جب قرآن مجید سے مذکورہ بالا استدلال کرنے میں عاجز آگئے تو انہوں نے یہ عقلی دلیل پیش کی کہ بدن انسانی اجزاء متضادہ سے مرکب ہے جو کہ تحلیل و تغیر کو مستلزم ہے اور تحلیل و تغیر اجزاء کے منفک اور جدا ہونے کو چاہتا ہے۔ پس باوجود اس کے وہ بدن کیونکر ہمیشہ قائم رہ سکتے ہیں اور یہ خیال نہ کیا کہ اوّل تو ان دونوں جہانوں میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے اور باوجود اس قدر فرق کے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا بعید از عقل ہے۔ دوم یہ کہ جب خداوند تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مختار ہے تو پھر کون سی مشکل باقی رہتی ہے۔

رہا اس کا ثبوت کہ اس کے معنے مکث طویل کے ہیں اور مکث دائم کے نہیں تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ اگر انسان خود غرضی کے جال میں نہ پھنسا ہوا ہو تو اس کا استعمال اس کو یقین دلا سکتا ہے کہ اس کے معنے مدت دراز تک ٹھہرنے کے ہیں نہ ہمیشہ ٹھہرنے کے۔

اور معتزلہ لوگ اس غلطی میں اس وجہ سے پڑے ہیں کہ پہلے انہوں نے جنت کی مانند جہنم کو بھی دائم قرار دیا اور پھر خُلُوْدٌ سے ان دونوں کا دوام ثابت کرنا چاہا ہے لیکن ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ جہنم جنت کی مانند دائم نہیں ہے اور اس کی مفصل بحث انشاء اللہ تعالیٰ ہم وہاں پر کریں گے جہاں پر جہنم کے لئے خُلُوْدٌ کا ذکر آئے گا۔

اور یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ جنت کے دائمی ہونے کا ثبوت خُلُوْدٌ کے سوا عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ[1] (ھود:109) وغیرہ آیات کریمہ پر ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ جنت کے دائم ہونے کے دلائل بھی کسی قدر مفصل طور پر ہم وہاں پر ہی لکھیں گے جہاں پر کہ جہنم کے غیر دائم ہونے کے دلائل ہم بیان کریں گے تاکہ مقابلہ کے طور پر بات کھل جائے اور خُلْدٌ اور خُلُوْدٌ کے یہ معنے بھی آتے ہیں کہ باوجود کبیر السن ہونے کے پھر بھی جوانی قائم ہے اور

[1]۔ (یہ ایسی) عطا ہے جو (کبھی) کاٹی نہیں جائے گی۔ (تفسیر صغیر)

کبھی اِخْلَادٌ بھی یہ معنے دیتا ہے تب خَالِدُوْنَ کے معنے ہوں گے باوجود بہت عمر گذرنے کے جوان رہنے والے۔ اور خُلُوْدٌ کے معنے مطلق قیام اور رہنے کے بھی آتے ہیں۔

پس خَالِدُوْنَ کے معنے ہوں گے، رہنے والے، اور اِخْلَادٌ کے بعد جب اِلٰی آتا ہے۔ تو اس کے معنے جھکنے اور میلان کے بھی آیا کرتے ہیں جیسا قرآن مجید میں آیا ہے وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف:177) (ولیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا) پس سب کا ترجمہ یہ ہوا۔ اور ان کے لئے ان میں پاک کردہ عمدہ جوڑے ہوں گے اور وہ ان میں بڑی مدت رہنے والے ہوں گے۔ (یا ان میں رہائش رکھنے والے ہوں گے۔ یا باوجود بڑا زمانہ گذرنے کے جوان ہوں گے۔

جنت کی نعماء:

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ۔ یہ جنّٰتٍ کی تیسری صفت ہے اور هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اس کی چوتھی صفت ہے۔ پہلی صفت یعنی تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے ساتھ ان باغوں کا سرسبز اور خوشنما اور عمدہ ہونا بتایا ہے اور دوسری یعنی كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ الخ کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ نہیں کہ وہ باغ محض خوشنما اور تماشہ گاہ اور سیر گاہ ہیں ہوں گے بلکہ جس طرح پینے کے لئے ان میں عمدہ نہروں کا پانی ہو گا اسی طرح کھانے کے لئے ان میں عمدہ سے عمدہ پھل ہوں گے۔ علاوہ اس کے صفت دوم کے ساتھ یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ ایسے باغ یا بلفظ دیگر ایسے پھل ایک ہی طریق سے حاصل ہوتے ہیں اور وہ طریق یہ ہے کہ اس دنیا میں ایمان راسخ اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ حاصل کرنے چاہئے کیونکہ قیامت کے باغ اور نہریں اور پھل کوئی اور شے نہ ہوں گے بلکہ یہی ایمان اور اعمال واخلاق مجسم ہو کر وہ اعلیٰ درجہ کے نعماء ہو جاویں گے۔

اور تیسری صفت یعنی وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ایسا نہیں کہ ان باغوں میں کھانے پینے ہی کی نعمتوں پر اکتفاء ہو اور زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ انس اور زوجیت کے تعلق سے جو اعلیٰ درجہ کی نعمت اور لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے وہاں پر مفقود ہو کر ایسی وحشت پیدا کردے جو کہ باقی سب

نعمتوں کو منغص کر دے بلکہ وہاں پر ان کے لئے ضرور ازواج ہوں گے اور وہ بھی ایسے نہ ہوں گے جو کہ اپنے خبث جسم خبث افعال اور سوء خلق کے باعث نعمت زوجیت کو وبال جان بنا دیں بلکہ ہر ایک طرح سے اور ہر ایک قسم کے خبث ظاہری اور باطنی سے مطہر و منزکی ہوں گی جس سے انس کی نعمت اور بھی ترقی پذیر ہو گی اور علاوہ اس کے اس میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ وہ ازواج حاصل کرنے کے لئے دنیا میں سچی طہارت اور کامل تزکیہ حاصل کریں کیونکہ زوجیت تجانس اور کفو کو چاہتی ہے اور وہاں کے ازواج مطہرہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ناپاک پاک کی نہ کفو ہوتا ہے اور نہ اس کے لئے ہم جنس ہوتا ہے لہٰذا وہاں کے ازواج حاصل کرنے کے لئے دنیا میں ہی کامل طہارت اور سچا تزکیہ حاصل کرنا چاہئے۔

اور صفت چہارم یعنی وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ کے ہم نے تین معنے بیان کئے ہیں ایک یہ کہ اور وہ ان میں آباد ہوں گے۔ دوم یہ کہ اور وہ ان میں مدتوں رہیں گے۔ سوم یہ کہ اور باوجود زمانہ دراز گذرنے کے وہ ان میں جوان ہی رہیں گے اور ان میں سے ہر ایک معنے کے لحاظ سے جدا جدا فوائد ثابت ہوتے ہیں۔

اور میں نے پہلے مفصل طور پر بتایا ہوا ہے کہ قرآن مجید میں بہت دفعہ ایسا لفظ اختیار کیا جاتا ہے جس کے بہت سے معنے ہو سکتے ہیں اور جس لفظ کے بہت معانی ہوتے ہیں اور اس مقام پر ان میں سے ایک معنے مراد ہوتے ہیں تو اس کی تعیین کے لئے ضرور ہی کوئی قرینہ رکھا جاتا ہے لیکن وہاں پر قرآن مجید کسی ایک معنے کی تعیین کے لئے کوئی قرینہ بھی نہیں رکھتا تو ایسے مقام میں قرینہ نہ لانے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہاں پر سب ہی معنے مراد ہو سکتے ہیں اور جہاں پر یہ بات مفصل طور پر بیان کی گئی ہے وہاں پر میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کے جامع ہونے کیلئے جو باتیں ضروری ہیں منجملہ ان سے ایک یہ بھی ہے کہ لفظ ایک ہو اور معانی بہت۔

پس اگر پہلے معنے لئے جاویں تب صفت چہارم کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وہ دنیا کے باغوں کی مانند نہ ہوں گے جو کہ اگرچہ دن کو بہت کچھ خوش کن ہوتے ہیں لیکن

رات کے وقت اپنی کار بانک کے لحاظ سے دشمن جان اور تباہ کن ہوتے ہیں بلکہ بعض موسموں میں اپنی مرطوب زمین اور ان کے موذی جانوروں کے مسکن ہونے کے باعث سے قابل رہائش بالکل نہیں ہوتے بخلاف قیامت کے باغوں کے کہ وہ سواء مفید اور خوش کن اور فرحت بخش ہونے کے ذرہ بھر بھی کسی ضرر پر مشتمل نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے باغ اگرچہ قابل رہائش نہیں پر قیامت کو مومن لوگ ان باغوں ہی میں رہائش رکھیں گے اور اگر دوسرے معنے لئے جاویں تب صفت چہارم کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان باغوں کی نعمتیں اور ان کی رہائش دنیا کی نعمتوں اور اس کی رہائش کی مانند نہیں کہ اوّل تو دنیا کی نعمتیں ہی پائیدار نہیں آج ہیں اور کل چھن گئیں اور اگر وہ پائیدار ہوں بھی تو پھر خود انسان کا وجود ہی ایسا نہیں کہ ان میں ہمیشہ رہے۔

آج اگر ناز و نعمت میں ہے تو کل ان کو دیکھ دیکھ کر دست تاسف ملتا ہوا مجبوراً ان سے جدا ہو جاتا ہے اور بجائے باغ و گلستان کے بیابان گورستان اس کا مسکن ہوتا ہے اور ریشمی فرشوں کے عوض قبر کی مٹی اس کا بستر ہوتی ہے۔ بخلاف ان باغوں کے اور ان کی نعمتوں کے اور ان کی رہائش کے کہ نہ ان باغوں پر کوئی ایسا وقت یا موسم آئے گا کہ دنیا کے باغوں کی مانند فرحت بخش اور قابل رہائش نہ رہیں اور نہ کبھی ان نعمتیں اور ان کے پھل منقطع ہوں گے اور نہ کبھی ان کے رہنے والوں سے وہ چھینے جاویں گے اور نہ وہ خود کبھی ان کے کسی نقص کے باعث یا کسی اور ضرورت کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر ان کے عوض کوئی دوسرا مکان اختیار کریں گے اور نہ کبھی فنا کا دھکا ان کو ان سے باہر نکالے گا۔

اور اگر تیسرے معنے لئے جاویں تب اس صفت چہارم سے یہ ثابت ہو گا کہ ان کی وہاں کی رہائش دنیوی رہائش کی مانند نہ ہو گی کہ اوّل دنیوی نعمتیں ہی سریع الزوال ہوتی ہیں اور اگر وہ کچھ عرصہ کے لئے باقی بھی رہیں تو پھر انسان کی زندگی ہی وفا نہیں کرتی اور عین نعمتوں سے متمتع ہونے اور ان سے لذت اٹھانے کے وقت پر آکر کوچ اور الوداع کا نقارہ بج جاتا ہے اور مجبوراً دست حسرت و تاسف ملتے ہوئے پُر آب آنکھوں کے ساتھ اسے جدا ہونا پڑتا ہے اور اگر نعمتیں بھی کچھ عرصہ کے لئے باقی رہ جاویں اور دنیوی سریع الزوال زندگی

بھی کسی قدر لمبی اور دیر پا ہو جائے تو پھر بڑھاپے کی تکلیفیں ان سب نعمتوں کو بدمزہ کر دیتی ہیں۔ کسی شاعر نے کہا وَلَذَّاذَۃُ الْعُمْرِ الطَّوِیْلِ یَشُوْبُھَا نَغْصُ الشَّمَتِ (اور لمبی عمر کے مزہ کے ساتھ بڑھاپے کی بدمزگی مل جاتی ہے) بلکہ اوّل تو اس وقت بہت سی نعمتوں سے بالکل محروم ہی ہو جاتا ہے اور چند ایک نعمتیں اگرچہ ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کو وہ استعمال تو کرتا ہے لیکن نہایت بدمزگی سے۔ کیونکہ اس کے قویٰ سب کے سب بہت کمزور ہو جاتے ہیں مثلاً وہ کھانا کھاتا ہے پر معدہ کمزور ہونے سے اوّل تو اشتہاء ندارد پھر دانتوں کا نہ ہونا یا کمزور ہونا علاوہ بدمزگی پیدا کرنے کے ہضم کو اور بھی تباہ کرتا ہے۔

پس پہلے اشتہاء کا نہ ہونا نعمت کے مزہ سے محروم کرتا ہے اور پھر کھانے کے بعد ہضم نہ ہونا اور بھی اس کو وبال جان بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اور قویٰ کا بھی حال ہے اور یہی وجہ ہے کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا (الحج:6) (اور تم میں سے بعض تو نہایت ذلیل ترین عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تاکہ جاننے کے بعد (ایسے اَن جان ہو جائیں) کہ کچھ بھی نہ جانیں) غرض کہ دنیا کی رہائش کا تو یہ حال ہے کہ اوّل تو نعمتیں جواب دے دیتی ہیں اور اگر وہ جواب نہ دیں تو پھر خود انسان کی زندگی جواب دے دیتی ہے اور اگر وہ بھی جواب نہ دے تو پھر انسان کے قویٰ جواب دے دیتے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان ان نعمتوں سے متمتع ہوتا یا ان سے لذت اٹھاتا ہے تب اس وقت وہ اس کے لئے بجائے مفید اور باعث لذت ہونے کے موجب حسرت یا بعث دکھ اور وبال جان ہو جاتی ہیں لیکن بخلاف اخروی رہائش کے کہ باوجود مدت دراز گذر جانے کے مومن لوگ پہلی عمر کے مانند جوان کے جوان ہی رہیں گے اور نہ ان میں بڑھاپے کا کوئی اثر ظاہر ہو گا اور نہ ان کے قویٰ اور اشتہاء میں کسی قسم کا تغیر اور نقص وضعف پیدا یا ظاہر ہو گا لہٰذا وہاں پر خواہ ان کی بے حد عمر گذر جائے پر نعمتوں سے متمتع ہونے اور ان سے لذت اٹھانے میں ذرہ بھر بھی ان کے اندر فرق اور تغیر نہ آئے گا۔

اور ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ یہ تینوں معنے یہاں پر مراد ہیں لہٰذا صفت چہارم سے بلحاظ ہر ایک معنے کے جو امور ثابت ہوتے ہیں وہ سب کے سب ہی صفت چہارم سے یکجا ثابت

ہیں اور جب ان سب امور کو جو کہ صفت چہارم سے ثابت ہوتے ہیں اور سب امور کے ساتھ ملایا جائے جو کہ صفت اوّل اور دوم اور سوم سے ثابت ہوتے ہیں تو پھر ان باغوں کی اور ان کی نعمتوں اور ان کی رہائش کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعریف ثابت ہوتی ہے جس پر نظر کرنے سے ثابت ہوتا ہے وہ باغ اور وہ نعماء اور ان کی رہائش بالکل بے مثل ہیں اور دنیوی باغ اور نعمتیں اور اس کی رہائش ان کے مقابلہ پر بالکل ہیچ ہیں۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ اس بشارت کا ظہر ہے یعنی وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خَالِدُوْنَ تک کا ظہر ہے اور ہم حضرت رسول اکرم ﷺ کی حدیث سے ثابت کر آئے ہیں کہ قرآن مجید کے لئے ظہر بھی ہے اور بطن بھی ہے۔

پس اب ہم اس کا بطن بیان کرتے ہیں لیکن اس کے بطن کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک بات کا جاننا ضروری ہے لہٰذا ہم اس کو پہلے بیان کر دیتے ہیں اور وہ بات قرآن مجید کے بہت سے ایسے مقامات کے فہم کے لئے چابی ہے لہٰذا ناظرین اس کو توجہ سے سنیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا طرز اور کتابوں سے بالکل نرالا ہے۔ جن کتابوں کی نسبت آسمانی اور الہامی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ سب کی سب محض دعاوی پر اکتفاء کرنے والی ہیں اور جس بات کے منوانے پر بڑا زور دینا ہو تو زیادہ سے زیادہ اس میں یہ ایزاد کیا جاتا ہے کہ اسرائیل کا خدا یا خداوند خدا یا ایشور یہ کہتا ہے یا اس کے لئے کوئی تمثیل بیان کی جاتی ہے بخلاف قرآن مجید کے کہ یہ اپنے ہر ایک دعوے کے لئے نہایت روشن اور قوی ترین براہین اور دلائل بیان کر دیتا ہے اور قرآن مجید کی ہزاروں خصوصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے اور قیامت اور اس پر ایمان لانے کا ذکر عموماً ان کتابوں میں کیا گیا ہے جن کو الہامی کہا جاتا ہے اور اس کی نسبت دو قسم کے دلائل درکار تھے ایک تو وہ کہ جن سے یہ ثابت ہو کہ قیامت ہو سکتی ہے کیونکہ مابعد الموت پھر زندہ ہونے وغیرہ کو بہت سی طبیعتیں بعید از عقل اور ناممکن خیال کرتی ہیں پس ایسے دلائل کا ہونا ضروری تھا جو کہ یہ ثابت کر دیں کہ مابعد الموت پھر زندہ ہونا وغیرہ ممکن ہے اور اس قسم کو امکان قیامت کے دلائل کہنا چاہئے۔

دوم یہ کہ قیامت ضرور ہی ہو گی اور ان کو قیامت کے وجود کے دلائل کہنا چاہئے۔

پہلی قسم کے دلائل تو عقل تجویز کر سکتی ہے لیکن دوسری قسم کے دلائل کا مہیا کرنا انسانی عقل اور طاقت سے بہت بعید ہے کیونکہ دلیل تو وہ ہونی چاہئے جس سے قطعی اور یقینی ثبوت حاصل ہو اور موجودہ دنیا نے (جس کے لئے ان دلائل کی ضرورت ہے) فیصلہ کر دیا ہے کہ ایسی دلیل وہی ہوتی ہے جس کی بنیاد مشاہدات پر ہو۔ رہے وہ دلائل جو کہ پرانے فلسفہ کے دلائل کی طرح محض خیالی باتوں سے مرکب ہوتے ہیں تو وہ اس زمانہ میں کام نہیں دے سکتے اور نہ وہ حقیقت میں یقین کے حاصل کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں اور قیامت کے وجود کے لئے ایسے دلائل اس لئے انسان مہیا نہیں کر سکتا کہ نہ وہ خود اس وقت موجود ہے اور نہ اس کے آثار موجود ہیں جن کا مشاہدہ ہو سکے بخلاف اور ایمانیات کے مثلاً خداوند تعالیٰ اگرچہ وراء الوراء ہستی اور باطن اور غیب در غیب وجود ہے لیکن چونکہ وہ موجود ہے لہٰذا اگرچہ غیب ہونے کی وجہ سے اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ہزاروں ہزار آثار مشاہدہ ہوتے ہیں جن سے اس کی ہستی پر استدلال کیا جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس فرشتے اگرچہ عام طور پر مشاہدہ نہیں ہوتے پر ان کے آثار اور تحریکات مشاہدہ ہوتی ہیں جن سے ان کے موجود ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے۔

پس وجود قیامت کے لئے ایسی دلیل ہو تو کس طرح لیکن خداوند تعالیٰ تو علیم و حکیم اور قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے تو ایسے دلائل کا مہیا کرنا ہرگز ناممکن یا مشکل نہیں ہو سکتا۔ پس قرآن مجید کے سوا اور کتابوں نے اگرچہ قیامت کے دونوں قسم کے دلائل سے پہلو تہی اختیار کی ہے لیکن قرآن مجید کی شان سے تو بعید تھا کہ وہ اس کے دونوں قسم کے دلائل سے درگذر کرتا اور ان کو بیان نہ کرتا۔ لیکن پہلی قسم یعنی امکان قیامت کے دلائل چونکہ بہت آسان تھے اس لئے وہ تو چند ایک بیان کئے ہیں اور دوسری قسم کے دلائل چونکہ بہت دشوار تھے اس لئے وہ تو بڑی کثرت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ امکان کے دلائل تو اس طرز کے ہیں کہ دیکھو تم مابعد الموت کی زندگی کو اس خیال اور وجہ سے ناممکن خیال کرتے ہو کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جاویں گے تو پھر اس سے ہمارا جسم کیونکر تیار ہو سکتا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ ہم نے تم کو پہلے مٹی سے بنایا ہے اور پھر وہی مٹی (پھل اور دانوں کی شکل میں

ہو کر انسانی غذا بنی پھر تغیرات کے بعد نطفہ بنی) پھر نطفہ سے بنایا (یعنی منی کے اندر جو کیڑے ہوتے ہیں ان میں تغیر ہو کر جما ہوا خون بنا جس کو علقہ کہتے ہیں) پھر علقہ سے پھر گوشت کے ٹکڑہ سے تغیر ہوتے ہوتے تم بچہ بن کر پیدا ہوتے ہو پھر کچھ تغیرات کے بعد مضبوط اور جوان انسان بن جاتے ہو۔

پس جب ہم نے تم کو پہلی دفعہ مٹی وغیرہ سے پیدا کیا ہے تو کیا دوبارہ توڑ پھوڑ کر بنانا ہمارے لئے کچھ دشوار ہو سکتا ہے اور زمین کے سرسبز ہونے کے بعد پھر خشک ہونے اور اس کے بعد پھر سرسبز کرنے کے ساتھ بھی مذکورہ بالا امکان سمجھایا ہے وعلیٰ ہذا القیاس اور دوسری قسم یعنی قیامت کے وجود کے دلائل کا طرز یہ رکھا ہے کہ قیامت کے ساتھ ملا کر ایک ایسے امر کے آئندہ ہونے کی پیشگوئی کی جاتی ہے جو کہ قیامت کی مانند نہ خود موجود ہوتا ہے۔ نہ اس کے آثار موجود ہوتے ہیں اور نہ اس کے ہونے کا پتہ لگانے کے لئے کوئی قرینہ وغیرہ ہوتا ہے بلکہ ایسے قرائن بعض وقت موجود ہوتے ہیں یا اس کی حالت ہی ایسی ہوتی ہے کہ مادی نظر اور عقل اس کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔

غرض کہ قیامت کی طرح غیب اور عام نظر میں ناممکن یا مادی عقل سے بالا ہوتا ہے لیکن وہ امر دنیا ہی میں ہونیوالا ہوتا ہے تو جب وہ پیشگوئی کے مطابق ٹھیک ٹھیک ہو جاتا ہے تو جن لوگوں کو اس امر کے ظہور کا یقینی علم ہو جاتا ہے ان کی نسبت قیامت کے وجود کا ثبوت بھی پورا پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب ایک شخص نے دو ہم رنگ چیزوں کی اس وقت خبر دی ہے جبکہ دونوں غیب اور وراء الوراء تھیں اور عام نظروں میں دونوں ناممکن یاد شوار تھیں اور مادی لوگ دونوں کے موجود ہو جانے سے یکساں انکار پر اصرار کرتے تھے۔ اور پھر ان دو امروں میں سے ایک کھلے کھلے طور پر پیشگوئی کے مطابق معرض ظہور میں آگیا اور لوگوں نے بچشم خود اس کو مشاہدہ کر لیا تو اس سے دوامر کا ثبوت ہو جاتا ہے ایک اس کا کہ یہ پیشگوئی اور خبر اس خدا کی طرف سے ہے جس کے سواء اور کوئی غیب کو ہرگز ہرگز نہیں جان سکتا۔

اور دوم اس کا کہ اس دوسرے امر کی پیشگوئی بھی ضرور سچی ہے جو کہ اسی ہی پیشگوئی

کرنے والے نے اس پیشگوئی کے ساتھ ایک ہی عبارت میں کی تھی اور پھر یہ بھی نہیں کہ قرآن مجید نے کسی ایک امر کو ایک آدھ جگہ پر بیان کر کے بس کر دی ہو بلکہ ہر ایک زمانہ کے لئے جدا جدا کئی کئی امور کو قیامت کے ساتھ ملا کر پیشگوئی کی ہوئی ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں جو پیشگوئی پوری ہوتی ہے وہ پچھلے زمانہ کے لئے قصوں کے رنگ میں ہو جاتی ہے اور جو بعد کے زمانہ میں پوری ہو گی وہ اب تک پوری نہیں ہوئی اور وجود قیامت کے دلائل کی ضرورت ہر ایک زمانہ کے لئے مساوی تھی لہٰذا قرآن مجید نے کثرت کے ساتھ ایسے امور کو قیامت کے ساتھ ملا ملا کر پیشگوئیاں کر دی ہیں تا کہ ہر ایک زمانہ کے لئے ایسی پیشگوئیوں کی کافی تعداد موجود ہو تا کہ وہ پیشگوئیاں اپنے اپنے وقت میں پوری ہو کر ہر ایک زمانہ کے لوگوں کے دلوں میں وجود قیامت کی نسبت یقین کامل پیدا کر دیں یا کم از کم ہر ایک زمانہ کے لوگوں پر حجت پوری ہو جائے۔ اور قرآن مجید کے پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں قیامت کا بہت کثرت کے ساتھ ذکر موجود ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جہاں کہیں قیامت کا ذکر ہوا ہے وہاں پر ضرور ہی کسی ایسے امر یا امور کی اس کے ساتھ پیشگوئی بھی موجود ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ ایسے مواضع پر ہم ایسے امور اور ایسی پیشگوئیوں کو کچھ کچھ بیان کر دیا کریں گے۔ یہاں پر بھی جس بطن کے بیان کرنے کا میں نے ذکر کیا تھا وہ یہی ہے کہ بظاہر اگرچہ یہاں پر مومنوں کو قیامت کے باغوں کی بشارت دی گئی ہے یا یوں کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بشارت دینے کا حکم دیا ہے لیکن ساتھ ہی عراق عرب اور عراق عجم اور فارس اور شام وغیرہ کے باغوں کی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بشارت دینے کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آثار میں بڑی وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جب ان ملکوں کی طرف رُخ کیا تھا تو وہ یہی کہا کرتے تھے کہ یہ وہ سرزمینیں ہیں کہ جن کے دینے کا خداوند کریم نے ہم سے وعدہ کیا ہوا ہے بلکہ حضرت عمرؓ نے تو فوج روانہ کرتے وقت اپنے عام خطبہ میں فرمایا تھا کہ یہ وہ سرزمین ہے کہ جس کا خداوند کریم نے تم سے عہد کیا ہوا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں کو صحابہؓ موعود فرمایا کرتے تھے اور عرب کے نزدیک یہ ملک بے شک جنت ہی تھے اور ان میں دجلہ اور فرات وغیرہ نہریں جاری تھیں اور موعود پھر خدا کے موعود ہونے کی وجہ سے کامل ایمان والے صحابہؓ ان ملکوں اور ان باغوں اور ان پھلوں کو پہلے ہی سے دیئے ہوئے یقین کرتے تھے اور ایسی عظیم الشان پیشگوئی کے صدق سے سچے مومنوں کو جو مزہ حاصل ہوتا ہے اس ہی کے لئے جب کبھی ان کو ان باغوں کے پھل ملتے تو اصل پیشگوئی کو یاد کر کے کہتے هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ پھر ان کو وہاں پر ازواج مطہرہ بھی ملیں یہاں تک کہ بعض کم درجہ کے صحابہؓ کے گھر میں بڑے بڑے بادشاہوں کی لڑکیاں آئیں اور پھر ان ملکوں میں اہل اسلام نے یہاں تک رہائش اختیار کی کہ ان کے دارالخلافے بھی انہی ملکوں میں قائم ہو گئے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے اپنے سچے وعدے کے مطابق ان کے اس خوف کو (جو مفتوحہ بلاد میں فاتح قوم کے لازم حال رہتا ہے) سچے امن سے تبدیل کر دیا ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ جس طرح عرب کی نظروں میں قیامت کا وجود ایک ناممکن امر تھا اس ہی کی مانند بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ناممکن تھا کہ محمد (فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَرُوْحِیْ وَعِرْضِیْ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ ﷺ[1]) اور آپ کے ضعیف و قلیل بے سرور سامان ناتجربہ ساتھی عرب اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے اور ان کے مذہب اور رسومات قدیمہ اور راسخہ کے فاتح ہو کر ان پر ایسی حکمرانی کریں گے جیسی کہ وہ کر گئے ہیں بلکہ وجود قیامت سے بڑھ کر وہ اس سے انکار کرتے کہ محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) خالی مکے والوں پر غالب ہو جائے جو کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پوشیدہ طور پر بھاگ کر بڑی مشکل سے ان کے بطش شدید سے ایک وقت میں جاں بر ہوا تھا یا بلفظ دیگر جس کو جبراً انہوں نے اپنے شہر اور ملک سے بدر کر دیا تھا چہ جائے کہ عرب کے علاوہ وہ قیصر و کسریٰ کی زبردست سلطنتوں کو فتح کر لے اور پھر اس وقت اور اس حالت میں قرآن مجید نے بہت سی مکی اور مدنی سورتوں میں قیامت کے ساتھ ملا کر ایک ہی عبارت میں قابل از وقت قیامت کے ہونے اور مومنوں کو

[1]۔ اس پر میرے ماں باپ اور میری جان و مال اور میرے اہل و عیال قربان ہوں۔ (از مرتب)

ایسے ملک دینے کی خبر دی تا کہ جب صحابہؓ کو یہ املاک ملیں اور دو ہم رنگ پیشگوئیوں میں سے ایک کھلی کھلی ان کے سامنے پوری ہو جائے تو اس وقت دوسری خبر کے صدق کا بھی یقین ہو جائے اور منکروں پر اتمام حجت ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پس یہ ہے بطن اس کا جس سے اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان کا پتہ لگتا ہے اور قیامت کے وجود کا اعلیٰ درجہ کا ثبوت ہوتا ہے جس سے مومن کا دل یقین سے بھر جاتا ہے چنانچہ اس ہی سے ان کو وہ یقین حاصل ہوا تھا۔ جس سے وہ اپنے مال و جان کو اللہ کی راہ میں خاک کی طرح اڑاتے اور پانی کی مانند بہاتے تھے۔

انڈیکس

تفسیر سروری جلد 1

1۔ آیات 1

2۔ احادیث والہامات 13

3۔ مضامین 15

4۔ اسماء 21

5۔ مقامات 24

6۔ کتابیات 25

آیات

سورۃ الفاتحہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (2) 383

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (5) 473

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (6-7) 316

سورۃ البقرۃ

الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (2) 95، 104

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (3) 95، 104، 425

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (4) 13، 31، 95

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (6) 316، 339، 350

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (7) 316

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَ عَلٰی سَمْعِھِمْ وَ عَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (8) 302، 316

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ (9) 317، 374

وَ لَھُمْ ... بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ (11) 248، 302

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (12) 291

اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ ... مَعَکُمْ (15) 144، 235

اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ (16) 235

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ (17) 301، 317

ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ (18) 302

صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (19) 105، 121، 217، 243، 264، 375

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ (21) 229، 299، 312

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ (22) 194، 395، 384، 425

جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (23) 194، 376، 384، 395، 398، 425

وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ (24) 96، 105، 108، 210، 399، 408، 425

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ (25) 390، 449، 454

کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْھَا (26) 231، 471

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ (27) 31، 135، 376

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ (30) 204، 205، 369

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (31) 360

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ (33) 277، 360

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ (41) 47

اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ (46) 161

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ (49) 390

وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ... قِیْلَ لَھُمْ (59) 66

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (60) 66، 69

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ (62) 46، 47، 316، 331

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ (68) 235، 242، 277

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ (75) 478
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ (76) 105، 375
وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (77) 326
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (89) 58
فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى (91) 46، 353، 414، 426
وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (96) 446
وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (102) 352
اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (127) 56
وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ (128) 211، 375
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ (129) 56
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ (130)
56، 100، 106، 108، 211
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا (137) 143
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (144) 59
يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (147)
398، 399، 403، 407، 426
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ... رٰجِعُوْنَ (156، 157) 61
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ (166) 134، 378، 380
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (175) 467
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ ... هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (178) 114
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى (186) 119
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (192) 261
فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ (195) 116، 278
وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (202) 390
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ (205 تا 207) 326
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ (214) 156
عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا (217) 65
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ الخ (218) 351
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ (250) 483
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (258) 42، 351
وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا (279) 134
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (283) 8، 117
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ الخ (286) 182

سورۃ آل عمران

ذُوانْتِقَامٍ (5) 6
لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ (6) 277
مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ... عِنْدِ رَبِّنَا (8) 85
اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ ... (18,16) 115
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (20) 15
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (22) 466
وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (31) 230
يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (41) 315
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ (59) 99
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ... (62) 231
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ (63) 99، 275، 276، 423
اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (65) 204
مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (98) 56، 57
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (111) 42، 73

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ...(134تا136) 115
وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا...(140) 134
لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (155) 320
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (156) 272
يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ (168) 320،239
حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (180) 229
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (186) 499

سورۃ النساء

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمْ (6) 265
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (49) 276
اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (59)126،149،180
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ (60) 34،133
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ...(61،62) 321
فَلَا وَرَبِّكَ...وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (66) 32
اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ (70) 34،41،198
وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (73تا74) 321
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ (77) 134
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (80) 362
لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ (83) 234،369
اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ (84) 261
فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ...(89) 329
وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ...(90-91) 329
سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ...(92) 330
اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ (99) 141
اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ...(118-119) 451
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (123) 229
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ (137) **133**
بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ (139تا142) 328
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (143)237،238،243
مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ (144) 263
فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (146-147)
263،264،326،339
بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا (156) 215،216
وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً...الْاُنْثَيَيْنِ (177) 141

سورۃ المائدۃ

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ (7) 470
قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ (16) 113
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ (25) 65
اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (28) 116
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ (34) 331
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى...الظّٰلِمِيْنَ (52) 242
فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ...دَآئِرَةٌ (53) 321
لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (55) 345
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ (63) 318
كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ (65) 36،299
وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (68) 187
وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (82) 134
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (109)350

وَاِذْ تَخْلُقُ... كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (111) 369

هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ (113) 66، 67

وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا (114) 67

تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ (117) 230

سورۃ الأنعام

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (2) 491

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (26) 226

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (38) 412

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (55) 230

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ (60) 357

عَالِمُ الْغَيْبِ (74) 160، 188، 206، 229

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (85) 42، 198

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (91) 336

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ (92) 44

هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (93) 99

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (102) 369

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (125) 360

تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (155) 87

سورۃ الأعراف

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (44) 31

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ (54) 86

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (55) 205

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا (79) 55

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (86) 134

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا (90) 55

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ... (95، 96) 207، 355

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (129) 116

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ (139) 68

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ (158) 113

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ (159) 120

وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (177) 493، 501

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (181) 5، 153

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (187) 31

فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ (195) 51

وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ (200) 159

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ (202) 60

سورۃ الأنفال

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا... (2، 4) 135

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ (18) 13

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ (22) 322

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ (26) 390

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (30) 117

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (32) 428، 436، 449

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ (33) 64

يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (42) 15، 18

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (43) 57، 102، 356

زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (49) 240

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ (50) 322

فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (59) 204

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا (74) 134

سورۃ التوبہ

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (4) 116

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ (5) 12

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ (7) 12

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ (14) 225

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (28) 12

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (44تا58)
322، 237، 141، 417

مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ (61) 226، 324

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ (64) 240، 269، 291

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (67) 243، 324، 339

وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا (69) 295، 339

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ (73)
241، 264، 328، 333

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (74) 339

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ (75تا77) 230، 270، 271، 324

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ... (79) 325

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ (81) 325

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ (89) 459

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ... (83) 328

وَلَا تُصَلِّ... مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (84) 328

اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ (92) 253

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا (97) 325

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ (98) 325

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (101) 325

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا (107) 325

وَاِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (111) 378

اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (112) 149

كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (119) 84

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (124) 7

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (128) 264

سورۃ یونس

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (2) 103

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى (38) 433

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا (39) 419، 421

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (43) 226

اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ (60) 176

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ (89) 55

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (90) 55

اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (92) 59

سورۃ ھود

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (2) 103

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ (7) 177

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ
مِّثْلِهٖ (14، 15) 419، 421، 434

اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ (46) 50، 61، 198

إِنَّنَا لَفِي شَكٍّ...إِلَيْهِ مُرِيبٍ(63) 58

قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا...(92) 58

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ(108) 315

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ(109) 498، 499، 500

سورۃ یوسف

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ...تَعْقِلُوْنَ(2تا3) 103

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ(25) 198

فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ(33) 100

أَنِّيْ لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ(53) 144

أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ(65) 50، 229

إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ(89) 198

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ(110) 182

سورۃ الرعد

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ(2) 103، 104

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ(17) 368

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (22) 144

سورۃ ابراہیم

الٓرٰ كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ(2) 103

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ (8) 74

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ(14) 54، 62

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ...عَنِيْدٍ(16) 54

رَبَّنَآ إِنِّيْٓ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ(38) 56

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ(40) 56

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ(51) 451

سورۃ الحجر

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ(2) 103

مَآ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ...مَّعْلُوْمٌ(5) 101

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ(46) 116

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ(88) 50

سورۃ النحل

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ(9) 369

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ...(31تا32) 117

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ(65) 119

لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ(68) 146

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ(90) 357

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا...أُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ(107تا109) 216

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ(126) 263

سورۃ بنی اسرائیل

لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ...(5، 6) 53

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ(12) 64

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ(89) 419

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ...مَلَكًا رَّسُوْلًا(96) 412

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ(102) 68

سورۃ الکہف

لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا(50) 218

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (66) 415
اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ (95) 53
اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (111) 431
وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ (100) 457

سورۃ مریم

اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا (4تا7) 55
یٰزَكَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ یَحْیٰی (8) 56
فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (27) 446
لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (33) 343
یٰٓاَبَتِ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ (46) 388
وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا (50) 354

سورۃ طٰہٰ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (9) 5
اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ (13) 78
اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (51) 30،32
اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰی (71) 58
قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (115) 8

سورۃ الانبیاء

لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (23) 307
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (31) 313
وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (33) 373
كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (34) 396
اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (45) 258
اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (49تا50) 115
اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (74) 30
اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (99) 450،451

سورۃ الحج

وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا (6) 504
خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ (12) 208

سورۃ المؤمنون

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (15) 368
رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ (119) 443

سورۃ النور

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا (13) 231،364
وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ...عَظِیْمٌ (17) 364
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (22) 497
اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ...(27) 363
وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ (34) 101
اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ (52) 133
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (56) 43،356،359،362

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ(63) 132

سورۃ الفرقان

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً(33) 412
لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًا(15) 499
هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ(45) 228
وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ(61) 12

سورۃ الشعراء

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ...لَغَآىِٕظُوْنَ(55،56) 62
وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ(60) 354
فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَتْحًا(119 تا 121)54،55
بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ(196) 85

سورۃ النمل

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ(15)
37،58،128،217،398،426
وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ(17) 354
اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ(30) 101
اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ(31) 420
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ(53) 146
اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ(63) 40
لَا یَعْلَمُ.....الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ(66) 88
اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً(83) 90

سورۃ القصص

بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰی(15) 204
فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ(18) 446
اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ(31) 78
اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ(57) 30
كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ(89) 499

سورۃ العنکبوت

وَمِنَ النَّاسِ...اٰمَنَّا بِاللّٰهِ(11) 319،325
وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا(18) 369
قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ(31) 55
وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً(36) 55
فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ(41) 355
اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ
(46) 125،150،155،160
فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ(66) 58
وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا
(70) 8

سورۃ الروم

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ(49) 372

سورۃ لقمان

هُدًی وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ(4) 119
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ...لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ(26) 395
وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ(35) 88

سورۃ السجدۃ

الٓمّٓ ۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ

الْعٰلَمِیْنَ(2تا3) 104،107

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ(16-17) 133

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ(18) 481

سورۃ الاحزاب

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ(13) 319

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ(14تا17) 319

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ(19) 141

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ(36) 140،143،456،460

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ(37) 133

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ(41) 41

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا(44) 5

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا(63) 36،334

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا(68) 273

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ(61تا63) 328

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ(73) 149،180،242

سورۃ فاطر

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ(4) 275،368

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ(37) 499

عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(39) 277

سورۃ یٰس

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَیَمَسَّنَّكُمْ(19) 62

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ(7) 211

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ(82) 369،385

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ... اَوَّلَ مَرَّةٍ(78تا80) 385

سورۃ الصافات

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ(24) 31

فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ(56) 204

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ... الْاُوْلٰی(59-60) 499

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ(82) 198

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ(158) 101

سورۃ ص

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ(50) 116

سورۃ الزمر

یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ(7) 369

اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ(31) 499

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ(34) 115

قُلْ یٰعِبَادِیْ(54) 13

قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ(65تا68) 83،380

قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ(73) 457

سورۃ المؤمن

وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ(10) 390

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا(52) 231،338

ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ(61) 61

ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا(68) 295

هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (69) 220
وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ (79) 181
فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ (84) 316، 317

سورۃ حٰمٓ السجدۃ

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (11) 204
اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ (18) 30
وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا (27) 217
اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ... نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ (31 تا 33) 13، 78، 125، 197، 229، 399
وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (47) 218

سورۃ الشوریٰ

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (12) 36، 236، 244، 379
اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (30) 315
اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (38) 253
اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ (40) 253
جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (41) 242
اِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (53) 30

سورۃ الزخرف

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (32-33) 360
وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ (36) 116
وَ نَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ ... (52) 478

سورۃ الدخان

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ (50) 466

سورۃ الجاثیہ

وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (20) 116
وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (24) 222

سورۃ الاحقاف

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (10) 334
وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (11) 58

سورۃ محمد

اَلَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی (18) 7، 31
فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ (16) 475
وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (31) 241

سورۃ الفتح

وَ یُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ ... جَهَنَّمَ (7) 6، 329
اِنَّ الَّذِیْنَ ... یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (11) 13
سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ (12) 325
اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (19) 477
وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (29) 343

سورۃ الحجرات

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (11) 134
قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ... اَسْلَمْنَا (15) 140، 142
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (16) 132

سورۃ ق

وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (10) 372
خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (34) 144

سورۃ الذاریات

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ...(16تا20) 116

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ...(36تا37) 140،142

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ(57) 366

سورۃ الطور

نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ(31) 102

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ(35) 419

سورۃ النجم

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى(3) 34

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى(7) 204

سورۃ القمر

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ.....بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ (11تا12) 54

سورۃ الرحمٰن

اَلرَّحْمٰنُ.....عَلَّمَهُ الْبَيَانَ(2تا5) 5،7

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ(27،28) 198،466،499

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ(30) 25

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (42) 330

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ(47) 125،197

سورۃ الواقعہ

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ(18تا22) 490

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ(80) 8

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ(83) 176

سورۃ الحدید

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (4) 498

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ(14تا16) 327

كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ(21) 201

سورۃ المجادلۃ

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ(23) 134

فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ(19) 240،326

سورۃ الحشر

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ(10) 390

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ(13تا17) 320

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ(20) 43

سورۃ الجمعۃ

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا(3تا4)2،183

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ(6) 185

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا(12)253

سورۃ المنافقون

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ...مُّسْتَكْبِرُوْنَ(2تا6)318،345

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ(7) 327

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ...يَنْفَضُّوْا(8) 230،318

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ(9)231،318،349،468

سورۃ الطلاق

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا(3) 116

سورۃ التحریم

نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (7) 454

سورۃ المعارج

عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (24) 154

هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (35) 154

سورۃ نوح

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (20) 372

سورۃ الجن

فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا (9) 415، 416

وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (16) 452

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ... رَصَدًا (28) 416

سورۃ المزمل

كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (16) 43

سورۃ القیامۃ

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ (18) 9

سورۃ الدھر

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (7) 458

سورۃ المرسلات

لِيَوْمِ الْفَصْلِ... لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (14 تا 16) 16

سورۃ عبس

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ... بَرَرَةٍ (14 تا 17) 9

سورۃ الانفطار

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (18) 15

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (20) 15

سورۃ المطففین

بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (15) 215

سورۃ الاعلیٰ

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (14) 499

سورۃ الغاشیۃ

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (11) 479

سورۃ الضحیٰ

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ (6) 407

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (8) 31، 33

سورۃ التین

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (7) 499

سورۃ العلق

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (2) 4، 111

سورۃ الھمزۃ

لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ... الْاَفْـِٕدَةِ (5 تا 8) 453

سورۃ النصر

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ (3) 268، 376

سورۃ الاخلاص

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (2) 275، 276

لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (5) 36

سورۃ الناس

اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ... الْخَنَّاسِ (2 تا 5) 60

احادیث

الا ان اعجب الخلق ایمانا (دلائل النبوۃ) 144
اتقوا فراسة المؤمن (ترمذی) 290
اتقوله مرائیا (مسند احمد) 227
اذا دخل البیت قال بالسواك 227
اسلمت علی ما اسلفت (مسلم) 210،209
اطولکن یدا (بخاری) 90
ألا هل بلغت 87
امامکم منکم (بخاری) 173
امرت ان اقاتل الناس... (بخاری) 130
امنت باللہ و ملائکته و کتبه (ترمذی) 229،54،53
انما الاعمال بالنیات (بخاری) 2
ثلاث من اصل الایمان (ابوداؤد) 130
حبك الشیئ یعمی و یصم (ابوداؤد) 260
حتی تملوا (بخاری) 69
حتیٰ یقول هکذا (بخاری) 226
خیر القرون قرنی..... ثم یفشی الکذب 11
الدعا مخ العبادة (ترمذی) 50
سبحان اللہ و بحمدہ..... 28
علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل 41،43
قال بیدہ هکذا (تفسیر الدر المنثور) 227
القلب بین اصبعی الرحمٰن (ترمذی) 214
لا یزنی الزانی حین یزنی (بخاری) 131
ما انا علیه و اصحابی (ترمذی) 34
ما فاتکم فاتموا (بخاری) 169
ما لا عین رأت (بخاری) 486،39
مثلی کمثل الرجل استوقد... (مشکوٰۃ) 296
من صلّ صلاتنا ... (بخاری) 130
من قتل قتیلا فله سلبه (ترمذی) 119
من کذب علیّ متعمدا (بخاری) 11
من یهدی اللہ فلا مضل له (ابوداؤد) 252
یا معاذ أأنت فتان (بخاری) 171

احادیث بالمعنی

ابو بکرؓ کی بے مثال مالی قربانی (ترمذی) 179
ایسے بیمار بھی نماز کے لئے آتے... (نسائی) 168
ایک صحابی کا کہنا کہ میں رات کو نماز پڑھ رہا تھا تو ایک روشنی اوپر سے ظاہر ہوئی (مسلم) 131

اس نے ایمان کامل کرلیا.....(ابوداؤد) 137
ایک نابینا کو اذان / باجماعت نماز کے متعلق فرمایا کہ...(مسلم) 167
ایمان اس امر کی شہادت ہے.....(مسند احمد) 136
ایمان اس کا نکل کر اس کے سر پر سایہ بان (ترمذی) 132
ایمان کا نشان انصار کی محبت ہے (بخاری) 137
ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں (مسلم) 137
آنحضرتؐ نے منع فرمایا کہ مقتدی امام سے پہلے سجدہ میں جائے (مسلم) 169
تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا (بخاری) 135، 136
تمہارے ایمان کی کیا نشانی ہے (الایمان۔ ابن تیمیہ) 138
جو نماز کے لئے نہیں آتے.....(ترمذی) 167
حضرت جبرائیل نے دریافت کیا کہ ایمان کیا ہے؟ (بخاری) 135
زانی جب زنا کرتا ہے.....(مسند احمد، عبدالرزاق) 136، 137
سجدہ میں بندہ اپنے رب کے بہت قریب ہوتا ہے (مسلم) 164
صلح حدیبیہ میں بسم اللہ لکھنے پر اعتراض 12
فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرتؐ نے ابوسفیان سے فرمایا: اب بھی تم پر ثابت نہیں ہوا کہ بت اپنے پرستاروں کی مدد نہیں کرسکتے 18
کونسی ایمان افضل ہے (مسند احمد) 137
مجھ سے مومن ہی پیار کرے گا (مسلم) 137
مغضوب علیہم یہود اور ولا الضالین نصاریٰ 46
منافق / نفاق کی علامات (تفسیر الدر المنثور) 249
منافق / نفاق کی علامات (در منثور) 249
مومن وہ ہے (نسائی) 136
نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (نسائی) 161
نماز عشاء کو عتمہ نہ کہا کرو (مسند احمد) 153
نماز مؤمن کی معراج ہے (مرقاۃ المفاتیح) 161
ہر سورۃ کے اوّل میں بسم اللہ نازل ہوتی رہی 9
ہر آیت کا ظاہر اور بطن (المعجم الکبیر) 387

الہام

كُلُّ بَرَكَةٍ مِّنْ مُحَمَّدٍ ﷺ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ (تذکرہ ص194) 2
اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (تذکرہ ص230) 2
اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ اَوْلَادِیْ (تذکرہ ص325) 2
یَحْمَدُكَ اللّٰهُ مِنْ عَرْشِهٖ (تذکرہ صفحہ 371) 2
جَرِیُّ اللّٰهِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَاءِ (تذکرہ صفحہ 63) 2، 263

مضامین

اتباع
مقتدیوں پر امام کی اتباع ضروری ہے 168
احمدی
احمدی غیر احمدی کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ 172
ازواج مطہرات
ازواج مطہرات کی نسبت بد گوئی..... 363
استخارہ
اسلام میں استخارہ کا طریق 63
استہزاء
استہزاء کے اعتراض کے جواب کا خلاصہ 281
اسلام
اسلام کا صحیح مفہوم 139
اسلام میں استخارہ کا طریق 63
اہل اسلام جنگ کے ساتھ نہیں دعا کے ساتھ غلبہ ہو گا 53
ایمان اور اسلام میں ارتباط 140
حقیقی اور غیر حقیقی اسلام 142
قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور اسلام کے فطرتی مذہب ہونے کی دلیل 126
اسم اشارہ
اسم اشارہ کی بحث 98
اعتراض
استہزاء کے اعتراض کے جواب کا خلاصہ 281
آسمان سے متعلق قرآنی نظریہ پر اعتراض اور جواب 396
شیعہ کا قرآن کی بابت بیاض عثمان کہنے کی وجہ 10
شیعہ مذہب کی تردید-الحمدللہ سے..... 40
قرآن مجید پر زیادہ اعتراضات کی وجہ 232
لاریب فیہ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب 108
ھدی للمتقین پر ایک اعتراض 118
یؤمنون بالغیب کے معنی پر ہونے والا ایک اعتراض وجواب 144
اللہ تعالیٰ
اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات 79
قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں کیوں شک نہیں 104
خدا کے علی کل شیئ قدیر سے مراد 312
بعض عربی الفاظ جو خدا کی نسبت استعمال ہوئے تو اس کے معانی میں مفسرین کو پیش آنے والی دقّت 6
خلیفہ بنانے کا اختیار صرف خدا کا ہے 360
اقامت
صلوٰۃ کی اقامت سے مراد 154

امام
امام کو باجماعت نماز میں رعایت کرنی چاہیئے 170
مقتدیوں پر امام کی اتباع ضروری ہے 168
نماز باجماعت میں امام بنانے کی غرض 172
امانت
اس کا ایمان نہیں جس کے لئے امانت نہیں 136
امت
امت محمدیہ میں منعم علیہم 40
پہلی امتوں اور اس امت کو سکھلائی جانے والی دعا میں فرق 65
امن
بیت اللہ کے امن اور حج و حرمت کی قبولیت کی نظیر کہیں اور نہیں 57
ایمان
ایمان بالغیب 76
ایمان اخروی کے تین معانی 131
ایمان کے چار معنے 138
ایمان اور اسلام میں ارتباط 140
ایمان کے معنے 128
اس کا ایمان نہیں جس کے لئے امانت نہیں 136
بدگوئی
ازواج مطہرات کی نسبت بدگوئی..... 363
بسم اللہ
سورۃ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ 11
بصر
بصر، قلوب اور سمع کو مقدم رکھنے کی حکمت 222
بیاض عثمان
شیعہ کا قرآن کی بابت بیاض عثمان کہنے کی وجہ 10
پیشگوئی
مسلمانوں کے تنزل کی پیشگوئیاں 52
تجارب
صحیح اور سچے تجارب کا حصول 84
ترقی
سورۃ الفاتحہ میں ترقی کا بیان 13
تفسیر
تفسیر کا اصول 186
فاتحہ قرآن کا متن اور باقی اس کی شرح ہے 212
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر 4
الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر 15
الحمد للہ سے شیعہ مذہب کی تردید 40
ریب کے معانی 101
تقویٰ
تقویٰ کے آثار و ثمرات 116
تقویٰ کے معنی اور مراتب 113
تقیہ
شیعہ کے نزدیک حضرت علیؓ نے تقیہ کیا 332

تکرار

الرحمٰن الرحیم کے تکرار کی وجہ 20

تواتر

قرآن مجید تواتر کے ساتھ ہمارے تک پہنچا ہے 10

توحید 83

توکل علی اللہ 80

تین گروہ

سورۃ الفاتحہ میں تین گروہوں کے ذکر میں ترتیب 47

جنگ

اہل اسلام جنگ کے ساتھ نہیں دعا کے ساتھ غلبہ ہو گا 53

جھوٹ

حضرت ابراہیمؑ کی بابت تین جھوٹ منسوب کرنے کی روایات 11

حج

بیت اللہ کے امن اور حج و حرمت کی قبولیت کی نظیر کہیں اور نہیں 57

حدیث جو کتاب اللہ کی کسی آیت کے خلاف ہو وہ مردود ہے 10

قیامت کی نسبت ایک حدیث..... 38

وضعی احادیث 11،10

خاص عبادت

صلوٰۃ (نماز) ایک خاص عبادت 153

خلافت

خلافت کے متعلق شیعہ عقائد کا ردّ 361

رسالت و خلافت میں فرق 353

خلیفہ بنانے کا اختیار صرف خدا کا ہے 360

دعا 80

سورۃ الفاتحہ جامع دعا ہے 50

حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں 56

خدا ساری دعائیں قبول نہیں کرتا 59

دعا مُخُّ العبادات 62

اہل اسلام جنگ کے ساتھ نہیں دعا کے ساتھ غلبہ ہو گا 53

پہلی امتوں اور اس امت کو سکھلائی جانے والی دعا میں فرق 65

قرآن کے شروع کرتے وقت ضرور دعا مانگنی چاہیئے 64

نماز کے بعد کی دعائیں 175

دلیل

قرآن کے لاریب ہونے کی دلیل 105

دماغ

علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟ 223

رحمت کے اصل معانی 7

رسالت و خلافت میں فرق 353

رفع یدین 167

رکعت

فوت شدہ رکعات کو کیسے پورا کیا جائے؟ 169
زبان عربی زبان کی خصوصیت 5
زمانہ کی حالت
مسیح موعودؑ سے قبل زمانہ کی حالت 184
زمانہ نبوت
مسیح موعودؑ کا زمانہ زمانہ نبوت ہے 185
سجدۂ سہو 174
سعی اور محنت 82
سمع
بصر، قلوب اور سمع کو مقدم رکھنے کی حکمت 222
سورت / سورتیں
سورۃ الفاتحہ امّ القرآن ہے 50
سورۃ الفاتحہ جامع دعا ہے 50
سورۃ الفاتحہ میں ترقی کا بیان 13
الفاتحہ میں تین گروہوں کے ذکر میں ترتیب 47
الفاتحہ میں مذکور چار صفات کے انتخاب کی وجہ 19
سورۃ الفاتحہ میں یہود و نصاریٰ کا ذکر 46
سورۃ الفاتحہ قرآن کا متن اور باقی اس کی شرح ہے 212
سورۃ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ 11
رسول اللہؐ نمازوں میں کون سی سورتیں پڑھا کرتے (بخاری، ترمذی، مسلم، درمنثور، ابن ماجہ) 171، 172
سورتوں کے آغاز اور سورۃ توبہ کے آغاز کا فرق 8
شیعہ عقائد
بعض شیعہ عقائد اور ان کی تردید 341 تا 364
شیعہ کا قرآن کی بابت بیاض عثمان کہنے کی وجہ 10
شیعہ کے نزدیک حضرت علیؓ نے تقیہ کیا 332
شیعہ مذہب کی تردید – الحمد للہ سے..... 40
شیعہ خلافت کے متعلق شیعہ عقائد کا ردّ 361
صادق / صداقت
صادقوں کی معیت 84
صداقت کا معیار 441
صفات
اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات 79
الفاتحہ میں مذکور چار صفات کے انتخاب کی وجہ 19
غضب کی صفت اللہ کی نسبت درست نہیں 35
صلح حدیبیہ 11
طریق نماز
مسیح موعودؑ کا طریق نماز 157 تا 167
عبادت کی اہمیت 82
عربی زبان کی خصوصیت 5
علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟ 223
عورتوں اور مردوں کے حقوق میں فرق 495
غضب کی صفت اللہ کی نسبت درست نہیں 35
غلبہ
اہل اسلام جنگ کے ساتھ نہیں دعا کے ساتھ غلبہ ہو گا 53

غیر المغضوب سے مراد یہود ہیں 47
فوت شدہ رکعات کو کیسے پورا کیا جائے؟ 169
قادر خدا علی کل شیئ قدیر سے مراد 312
قرآن مجید
قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں کیوں شک نہیں 104
قرآن کے شروع کرتے وقت ضرور دعا مانگنی چاہیئے 64
قرآن کے لاریب ہونے کی دلیل 105
قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور اسلام کے فطرتی مذہب ہونے کی دلیل 126
قرآن مجید پر زیادہ اعتراضات کی وجہ 232
قرآن مجید تواتر کے ساتھ ہمارے تک پہنچا ہے 10
قرآن مجید میں مکررات کی وجہ 22
سورۃ الفاتحہ امّ القرآن ہے 50
قرآنی نظریہ
آسمان سے متعلق قرآنی نظریہ پر اعتراض اور جواب 396
قلب / قلوب
علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟ 223
بصر، قلوب اور سمع کو مقدم رکھنے کی حکمت 222
قیامت کی نسبت ایک حدیث..... 38
کافروں کی نشانیاں 202
کتاب کے معنے 101
متشابہ بھی محکم ہو جاتی ہے / مثال 88، 89
متشابہات کے معنی کسی کو معلوم ہو سکتے ہیں یا نہ 86
متقی کی صفات 114
مثال
متشابہ کے محکم ہونے کی مثال 89
مجرب نسخہ
اقامت صلوٰۃ ایک مجرب نسخہ ہے 160
مذہب
قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور اسلام کے فطرتی مذہب ہونے کی دلیل 126
مرد
عورتوں اور مردوں کے حقوق میں فرق 495
مرکز
علوم کا مرکز قلب ہے یا دماغ؟ 223
مسلمان / مسلمانوں
مسلمانوں کے تنزل کی پیشگوئیاں 52
مسیح موعودؑ
مسیح موعودؑ سے قبل زمانہ کی حالت 184
مسیح موعودؑ کا زمانہ زمانۂ نبوت ہے 185
مسیح موعودؑ کا طریق نماز 157 تا 167
مسیح موعودؑ کو نبی اللہ کا خطاب (مسلم) 185
معجزہ

حضرت موسیٰؑ کا عصا اور ید بیضا کا معجزہ 427

معنی

الحمد کے معانی 102

والله یعصمك من الناس کے دو معنی 187

مفسرین

عربی الفاظ جو خدا کی نسبت استعمال ہوئے تو اس کے معانی میں مفسرین کو پیش آنے والی دقّت 6

مقطعات

الحمد حروف مقطعات 85

حروف مقطعات اور سورت قرآنی 103

حروف مقطعات کے معانی 91

مکررات

قرآن مجید میں مکررات کی وجہ 22

منافق کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے سے مراد 301

منعم علیہم

امت محمدیہ میں منعم علیہم 40

نبی اللہ

مسیح موعودؑ کو نبی اللہ کا خطاب (مسلم) 185

نزاع لفظی اور نزاع حقیقی میں فرق 128

نصاریٰ

سورۃ الفاتحہ میں یہود و نصاریٰ کا ذکر 46

نماز

نماز باجماعت میں امام بنانے کی غرض 172

نماز کے بعد کی دعائیں 175

نماز کے متفرق مسائل 174

احمدی غیر احمدی کے پیچھے نماز؟ 172

اقامت صلوٰۃ ایک مجرب نسخہ ہے 160

امام کو باجماعت نماز میں رعایت کرنی چاہیئے 170

باجماعت نماز کی سخت تاکید 167

رسول اللہ ﷺ نمازوں میں کون سی سورتیں پڑھا کرتے 171، 172

صلوٰۃ (نماز) ایک خاص عبادت 153

صلوٰۃ کی اقامت سے مراد 154

فوت شدہ رکعات کو کیسے پورا کیا جائے؟ 169

مسیح موعودؑ کا طریق نماز 157 تا 167

وتر

وتروں کی ادائیگی کا طریق 175

ہدایت

ہدایت کے چھ معانی 30

ہمدردی

ہمدردی خلائق 83

یہود

سورۃ الفاتحہ میں یہود و نصاریٰ کا ذکر 46

غیر المغضوب سے مراد یہود ہیں 47

اسماء

آ/ا

آتھم 151

حضرت آدمؑ 393,261,111,97,83,69

حضرت ابراہیمؑ 1,11,43,54,56,62,74,
97, 103,100, 106, 166, 211,
451,388,375,335,334

ابن اسحاق 205

ابن تیمیہ 97

ابن خزیمہ 136

ابن عباسؓ 92,93,94,99,113,177,
272,274,367,371,374

ابن عربی 129

ابن کثیر 374

ابن ماجہ 135,172

ابو جہل 151,207

ابو حنیفہ 139,158,169,268

ابو سلیمان دارانی 138

ابو عوانہ 136

حضرت ابو بکرؓ 3,173,179,267,340,
341,342,344,345,346,349,
351,357,361,362,442

ابو سفیان 18

ابو عبیدہ 99

امام احمد 136,137

انخفش 92,99,421

حضرت اسماعیلؑ 56,106,211,353,374,375

اقلیدس 21,22,77,147

امرأ القیس 442

انس بن مالکؓ 204

ب/پ

بریدۃ الاسلمی 227

بنگالی بابو 148

بیہقی 9,144

پطرس صاحب 67

ج/ح/خ

جبرائیل 98,135,141,142,143,202,
415,416

امام حسین 288,335,343

خلیل 93

د/ر/ز

داؤدؑ 354

دھرم پال 243

امام راغب 154,493,497

ربیع بن انس 92

زکریا 62,56,55,53
زید بن اسلم 94

س/ش

شیخ سعدی 440,439,437,247
سعید بن جبیر 92
حضرت سلیمانؑ 420,354,138
سہیل 12
امام سیبویہ 466,465,392,97,93
شافعیؒ 169,139
شاہ ولی اللہ دہلوی 138,132,129
امام شعبی 92
حضرت شعیبؑ 55

ض/ع

ضحاک 391,92
عائشہ 364,363,352,332,137
عبدالرحیم صاحب، ماسٹر 192
عبدالرزاق 136
عبدالقیس 143,141,136
عبداللہ ابن عباسؓ 178,154,143,136,
289,245,214,205,195,182,
459,457,391,381,374
عبداللہ بن مسعودؓ 178,177,113,92,
450,387,289,272,245,214,182
عبدالقاہر جرجانی 273
مولوی عبدالکریم صاحبؒ 442
عبداللہ بن عمر بن خطابؓ 153
حضرت عثمانؓ 442,351,346,344,342,340,8
عدی بن حاتم 46
عزیر 203,79,43
عزیز مصر 91
عکرمہ 93,92
حضرت علیؓ 341,340,335,285,137,92,6,
342, 344, 345, 346, 347, 348, 349,
362,361,357,351,350
شیعہ کے نزدیک حضرت علیؓ نے تقیہ کیا 332
حضرت عمرؓ 346,344,341,340,185,
508,442,351,348
حضرت عیسیٰؑ 349,173,59

ف

حضرت فاطمہؓ 359,348,346,341
امام فرّاء 407,205,99,97
فرعون 334,151,128,68,59,43,18,
478,466,426,398,354

ق/ک

قاضی بیضاوی 97
قتادہ 92
قیصر 509
کسریٰ 509

ل

لبید 201
لقمان 395,195,119,104,88
حضرت لوطؑ 142,55
لیکھرام 151

م

مجاہد 450,182,99,95,94
مجدد الف ثانی 184
محمد بن اسمٰعیل بخاری 268
محمد سرور شاہ صاحب 3, 15, 46, 50, 96, 154, 177,183,194,204,205,214,227,232,245,248,249,253,256,267,272,273,274,289,293,301,302,304,367,372,402,410,412,413,417,418,423,433,444,446,450,463,472,481
محمد شاہ رنگیلے 42
حضرت مریمؑ 53,55,173,203,343,354
مسیلمہ کذاب 448
معاذ بن جبلؓ 137
امیر معاویہ 342
مفتی محمد صادق صاحب 189
حضرت موسیٰؑ 18,41,42,55,58,59,65,66,68,79,235,276,334,427
موسیٰؑ کا عصا اور ید بیضا کا معجزہ 427
مولانا روم 70,299
مولوی عبد الکریم صاحب 441

ن

حضرت نوحؑ 334,371
نور الدین صاحب، حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ (حکیم الامت) 3, 40, 45, 49, 91, 96, 99, 132,140,144,154,176,178,181,189,201,204,212,214,215,226,230,245,248,253,255,265,266,272,274,289,293,295,296,302,303,304,314,316,365,368,374,391,402,407,409,410,411,413,417,418,423,432,441,446,450,463,471,480,493

ہ

حضرت ہارونؑ 55,58

ی

یحییٰ 53,56
یہود اصاحب 67
حضرت یوسفؑ 3, 4, 33, 50, 91, 100, 103,144,182,198,229
حضرت یونسؑ 55, 58, 59, 103, 176,226,419,433

مقامات

ارض مقدسہ 66
انڈیا 137
بٹالہ 175
بریلی 192
بیت اللہ 211,57
بیروت 11, 46, 130, 136, 137, 144,
296,249,204,179,161,153
پنجاب 440
دار الاماں (قادیان) 122
دجلہ 509
دمشق 227
ریاض 136
شام 508,354,38
عراق 508
فارس 508,152
فرات 509
گجرات 137
گورداسپور 175
لاہور 441,189
مدینہ 255,261,318,319,328,341,
471,349
مصر 478,354,100,79,68

کتابیات

الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ 11
انجیل 432,191,122,9
الانوار فی شمائل النبی المختار 227
الایمان لابن تیمیہ 138
تفسیر ابن جریر 154
تفسیر ابن کثیر 182
تفسیر الدر المنثور 249,227,172
تفسیر روح البیان 179
تفسیر روح المعانی 497,483,444
تفسیر صافی 10
تفسیر صغیر 1,2,4,5,6,7,8,9,12,13,15,16,18,
25,30,31,32,33,34,36,37,40,41,42,43,
44,46,47,50,53,54,55,56,57,58,59,60,
61,64,66,67,68,69,71,74,78,83,85,87,
88,90,95,96,99,104,107,108,114,115,
116,117,126,142,143,150,153,159,
160,182,188,198,199,206,207,208,211,
212,222,229,238,244,246,253,263,275,
276,278,301,302,315,317,331,350,351,
352,375,379,383,403,426,434,443,446,
449,451,459,460,466,473,491,500
تورات 41,110,122,123,185,199
الجامع لشعب الایمان 136
حجۃ اللہ البالغہ 129
خیر التابعین فی التفسیر مجاہد 92
دلائل الاعجاز 35,273
دلائل النبوۃ 144
رسالہ تعلیم الاسلام 11,42,84,99,122,
129,154,171,186,197,212,231,
245,278,280,315,321,331,364
رسالہ تعلیم اسلام کا انٹروڈکشن 1
رسالہ تعلیم اسلام 42،84
رسالہ تعلیم الاسلام کے موضوع کی اہمیت
عظمت وضرورت 3
ریویو آف ریلیجنز 233,394,425,454,484
سنن ابن ماجہ 135،171،172
سنن ابو داؤد 137,252,260
سنن الترمذی 34,47,50,94,119,132,
137,167,171,179,214,229,290
سنن النسائی 136,161,168
شافیہ 443

شعب الایمان 137,136,9
صحیح البخاری 1, 11, 12, 39, 69, 90, 93,94,
130, 131, 135, 136, 137,157, 169,
171,173,201,226,296,481,486
صحیح مسلم 39,93,131,135,137,164,
167,169,172,185,210,296
صراح–لغت کی کتاب 33
عمدۃ القاری 136
کافیہ 443
کتاب السیبویہ 35
مثنوی 299
مرقاۃ المفاتیح 41,43,130,161
مستخرج أبی عوانۃ 136
مسند احمد بن حنبل 46,136,137,153,
204,227
مشکاۃ المصابیح 41,43,130,296
مصنف عبد الرزاق 137
المعجم الکبیر 18,387
المکتبۃ الشاملۃ 136,138
نحو میر 443
وید 110,122,123,232,243,276,432